جلد 45 • شمارہ 11 • نومبر 2015 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط و کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

مدیرِ اعلیٰ
عذرا رسول

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

عزیزانِ من... السلام علیکم!

نومبر کا شمارہ ملک کے شمالی علاقوں میں سرمائی طوفانِ بادوباراں کی خبروں اور پھر ہولناک زلزلے کی خون آشام بازگشت کے پس منظر میں پیشِ خدمت ہے... دس برس پہلے آٹھ اکتوبر اور اب چھبیس اکتوبر نے نجانے کتنی انسانی زندگیوں کو نگل لیا ہے... مواصلات کے ذرائع برباد ہو گئے ہیں... دور افتادہ علاقوں سے مسلسل اندوہناک خبریں آ رہی ہیں... دنیا میں کئی ممالک کی معیشت کا انحصار سیاحت کی صنعت پر ہے جس میں تھائی لینڈ پیش پیش ہے... ہر ملک اپنے سیاحتی اور تفریحی مقامات کو سجا بنا کر اور قابلِ رسائی بنا کر ملکی و غیر ملکی سیاحوں کو راغب کرتا ہے جس کے نتیجے میں ان علاقوں میں خوش حالی اور استحکام پیدا ہوتا ہے اور کسی ناگہانی آفت کے آ جانے پر فوری رابطے اور امدادی سرگرمیوں کا آغاز آسان ہوتا ہے... لیکن ہمارے اربابِ اقتدار نے اس شعبے کو ہمیشہ سے نظر انداز کیا ہوا ہے... بس ایک مری پر بھرپور توجہ دی گئی ہے جس کے کئی ناگفتنی اسباب ہیں... سندھ میں گورکھ ہل سے لے کر دیر، چترال، گلگت اور کوہستان کا پورا علاقہ توجہ سے محروم ہے... بھلا ہو چینیوں کا جنہوں نے عطا آباد کی نومولود جھیل پر پل اور سرنگیں بنا کر شاہراہِ ریشم کا منقطع رابطہ بحال کر دیا ورنہ برسوں یہاں کے باسی اور سیاح جان پر کھیل کر کشتیوں کے ذریعے جھیل کو پار کر کے آتے جاتے رہے... ان علاقوں میں زندگی کا تمام تر انحصار پرائیویٹ ٹرانسپورٹ پر ہے۔ بس، ٹرک اور ویگن میں خوفناک پہاڑی راستوں پر ٹوٹی پھوٹی سڑکوں پر سفر کیا جائے تو اپنی پسماندگی پر رونا آتا ہے... حکمراں جہازوں اور ہیلی کاپٹروں میں اوپر سے گزر جاتے ہیں... بے چاروں کو پتا نہیں ہوتا کہ نیچے بسنے والے خاک نشین کیسی کٹھن زندگی گزارتے ہیں... موٹروے اور رنگارنگ میٹرو ضرور بنائیں اور چلائیں لیکن خدارا اپنے جیسے انسانوں کی اُن الم رسیدہ بستیوں پر بھی توجہ دیں جو ہر قدرتی آفت کو قسمت کا لکھا سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کر لیتے ہیں... اُف تک نہیں کرتے، کبھی جلوس نکالتے ہیں نہ دھرنا دیتے ہیں... حکمرانوں سے اس التجا کے بعد چلتے ہیں اپنی محفل میں جہاں قارئین کا دھرنا ہے...

میانوالی سے احسان سحر کی پسند ناپسند ''ٹھنڈے اور اپنی طرح کے میٹھے دن، جاسوسی دل کی دھڑکن کی طرح دھک دھک کرتا ہمارے نرم وجود کا حصہ بنا۔ اپنا حصہ سب کو پیارا لگتا ہے۔ خوب صورت چیزوں سے نظریں آسانی سے نہیں ہٹتیں۔ ٹائٹل گرل کی خوب صورتی ہی ایسی تھی کہ نظریں ضدی بن کر جمی رہیں، پورا وجود سحر زدہ ہو گیا۔ بس یہی کہیں گے صورت ہے تیری سہانی اور ٹائٹل کی ہے تو رانی... محفل تیری میری کی جانب قدم بڑھائے۔ عذرا ہاشمی محفل کی نمائندگی کرتی نظر آئیں۔ اسی بات کے ساتھ آپ کو مبارک دیتے ہیں کہ آج آپ کی تو کل ہماری باری ہے۔ طاہرہ گلزار، بہت سے پڑھنے والے جس کہانی کو فیس بک پر فضول اور بور کہتے ہیں، خطوط میں اتنا ہی مرچ مسالا لگاتے ہیں یہی ان کا دوغلا پن ہے۔ بلقیس خان، دو ماہ تک تو بات ٹھیک ہے زیادہ غیر حاضری اچھی بات نہیں۔ معروف ہم بھی رہتے ہیں پر جہاں چاہت ہو وہاں مجبوریاں کچھ خاص نہیں لگتیں۔ باقی تبصرے ٹھیک تھے۔ کہانیوں پر زیادہ بحث ہو تو اچھا ہے۔ کہانیوں میں منظر امام کی کہانی اکیلے دکیلے سے آغاز کیا۔ پرانی کہاوت کو اور واقعات کو نئے ماحول میں پیش کیا گیا۔ لالچیوں کا کر دیا خالہ نے کام تمام، ہوس جب حد سے بڑھتی ہے تو ہوش ہی گم کر دیتی ہے۔ نفس کا غلام بنا دیتی ہے۔ بکرا برائے تاوان، بہت ہی بور اور ٹائم پاس کہانی۔ کچھ بھی نہ ہوا وہی فضول کی بونگیاں ماری گئیں اور بس منہ ماری ہی رہی۔ کہیں بھی دلچسپی نہیں پائی گئی۔ الوداعی تحفہ وہی میاں بیوی کا کمینہ پن جو ہر ماہ مسلسل شائع ہوتا رہتا ہے۔ شدید قسم کی نفرت ہے مجھے ایسی کہانیوں سے۔ لالچ، ڈاکٹر روبینہ کی کمینی فطرت، پیسے کے لالچ میں اپنوں سے بھی گئی اور خود سے بھی۔ کیونکہ ایسے کاموں اور طریقے سے حاصل کردہ پیسا کسی کام کا نہیں ہوتا۔ آخر انجام وہی ہوتا ہے جو ہوتا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ڈبل کراس یہاں بھی دولت کی ہوس رہی اور انجام بد سے بدتر ہوا۔ ہیزل کے لالچ کے پرخچے اڑ گئے۔ سعی لاحاصل، بہت ہی اچھی کہانی ثابت ہوئی۔ ٹینا کی اداکاری اچھی رہی۔ ہر شخص اپنی خواہشوں کا غلام نظر آیا (شکر ہے کچھ تو ہمارا بھرم رہا) رنگوں میں پہلا رنگ پڑھا، بڑا کام، زندگی بے وفا ہی سہی لیکن جب تک یہ وفادار رہتی ہے انسان اس سے بے وفائی کرتا رہتا ہے افسوس جب یہ مہربان ہوتی ہے تو ہم اس کی قدر نہیں کرتے۔ بے قدری سے اس کو گزارتے ہیں اور گنواتے ہیں اور جب یہ وفائی کرنے لگتی ہے تو روتے ہیں، پچھتاتے ہیں۔ سکندر جیسے لوگ ہی ہوتے ہیں جو نہ صرف اپنی زندگی کو اذیت ناک بنائے رکھتے ہیں بلکہ دوسروں کا بھی جینا دوبھر کرتے رہتے ہیں۔ دوسرا رنگ یوم حساب، کایا پلٹنے میں دیر نہیں لگتی، اچھا انسان پل میں برا اور برا انسان پل میں اچھا بن جاتا ہے۔ اولین صفحات کا شاہکار ناول آخر تمام ہوا۔ اس ناول کے دوران میرے ساتھ بہت سے واقعات ریکتے رہے۔ کبھی طبیعت خراب، کبھی شادیاں اور کبھی حسین اور خوب صورت واقعات، کوئی بھی کام ناممکن نہیں ہوتا، ہاتھ پاؤں مارتے رہو آسانیاں آپ کے وجود سے چمٹی چلی جائیں گی۔ مریسا کا کٹھن، دشوار اور مشکلات سے بھرپور ہنگامہ خیز سفر خوشگوار کامیابی کے ساتھ تمام ہوا۔ آصف ملک کی کہانی پڑھی۔ نیک عورت اللہ کا بہترین تحفہ ہے۔ نیک عورت جس گھر میں ہو وہ جنت کے مانند ہوتا ہے۔ بدکار عورتیں جہنم کا دوسرا روپ ہیں۔ انگارے، ایک دفعہ پھر آزمائشوں کا ٹولا شاہ زیب کا منتظر رہا۔ جہاں خوب صورت تلاش ختم ہوئی، وہاں پر کڑی آزمائش کا دور بھی شروع ہو چکا ہے۔ اور جب کڑی آزمائش کا وقت شروع ہو تو بہت سے تلخ اور شیریں واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ آوارہ گرد، ایک نئی سمت تیزی سے بڑھنا شروع ہو چکی ہے۔ پڑھتے ہوئے واقعات کا تسلسل... بہت

زیادہ تیزی بھی کہانی کو بور بنا رہی ہے۔ اس سے تھوڑا پرہیز کریں۔"

ضلع خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کا خراجِ تحسین "اکتوبر کا جاسوسی 3 تاریخ کو ملا۔۔۔۔۔ سرورق کو خوب صورت طریقے سے سجایا گیا تھا۔ کہانیوں کی فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے ہم چینی نکتہ چینی میں جان پہنچے جہاں آپ سراپا احتجاج اور سراپا مذمت نظر آئے۔ بہت بڑا ظلم کیا۔ ظالموں نے مسجد میں نمازی کو بھی نہ چھوڑا۔ پاکستان کا چپّا چپّا ہمارے لیے قیمتی ہے لیکن کسی جگہ سے خاص انسیت ہوتی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو گا بڈھ بیر کیمپ میں رہتے ہوئے 4 تبصرے ارسال کیے تھے، بہت اچھا وقت گزرا تھا یہاں۔ کافی اچھے دوست بھی ملے۔ انہی میں سے ایک دوست محمد افضل آف ملتان نے جامِ شہادت نوش کی۔ میں تمام شہدا کو خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔ اللہ تمام لواحقین کو صبرِ جمیل اور اجرِ عظیم عطا فرمائے۔ محترمہ عذرا ہاشمی کی بہت عمدہ تبصرہ نگاری تھی۔ سجاد خان آف موچھ کا مختصر مگر اچھا تبصرہ، اللہ پاک سے دعا ہے کہ آپ کو جلد سے جلد رہائی نصیب ہو۔ باقی تمام دوستوں نے بھی اچھے تبصرے کیے۔ امجد رئیس کی ایبولا میں مریسا نے کمالِ بہادری اور جرأت مندی سے اپنے دشمنوں بلکہ کئی علاقوں میں موت پھیلانے والے درندوں کا نہ صرف مقابلہ کیا بلکہ کیفرِ کردار تک بھی پہنچایا، آخر میں نورس کی قسمت بھی کھل گئی۔ منظر امام اکیلے وکیلے لے کر آئے۔ بالے، شکور اور اکرم نے اس کہاوت کو مثال بنا کر اچھا مال کمایا۔ سکندر علیم کی ڈھونگ میں جونی نے تھوڑا سا دماغ استعمال کر کے بلیک میلر قاتل کو جیل پہنچوا دیا۔ کاشف زبیر بکرا برائے تاوان لے کر آئے۔ اس دفعہ کافی مزاحیہ رہی یہ اسٹوری۔ گدھے کی عظمت بڑھ گئی ہے جو پاکستان میں بیشتر ہوٹلوں میں مٹن کڑاہی بن کر عوام الناس کے پیٹ میں جا رہا ہے۔ انگارے کی چوتھی قسط نسبتاً دھیمی رہی، ہلکی پھلکی فائٹ پڑھنے کو ملی پر سب سے بڑا کہ شاہ زیب کو اس کی محبوبہ مل گئی۔ جمال دتی کی الوداعی تحفہ، فریڈرک نے ہاروے کو جہنم پہنچانے کا اچھا طریقہ ایجاد کیا۔ پرویز بلگرامی کی لالچ میں روبینہ نے بہت برا کیا۔ سلیم انور کی ڈبل کراس میں لینی ایڈمز کو لالچ نے دنیائے فانی سے دنیائے ابدی میں جلدی پہنچا دیا۔ آوارہ گرد میں اس بار شہزی کو اپنا ماضی جاننے کو ملا اور بیگم صاحبہ کو اپنی ساس سے ملنے کا موقع اور عابدہ بھی امریکیوں کے چنگل میں بری طرح پھنس گئی ہے۔"

بگرام سے کاشف عبید کی رودادِ خود شناسی "اس بار جاسوسی ڈائجسٹ 9 تاریخ کو بگرام بک اسٹال سے ملا۔ سرورق اچھا تھا۔ اس بار پینٹنگ اور زر گلزار ذاکر صاحب نے کینوس پر پھینک دیا تھا۔ فہرست معمول کے مطابق جبکہ اداریہ قابلِ غور تھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔ ہم آپ سے نفرت تھوڑی کرتے ہیں بلکہ آپ تو سینئر ہیں۔ ہم عزت کرتے ہیں آپ کی۔ میں نے آپ کو مبارک باد دی تھی جب آپ کو انعامی شمارہ ملا تھا مگر ادارے والوں نے خط میں شائع نہیں کیا تھا۔ آپ جاب کرتی ہیں تو رسالہ خریدتی ہیں۔ میں اسٹوڈنٹ ہوں اور اپنی پاکٹ منی سے ایک مہینے میں آٹھ رسالے خرید لیتا ہوں۔ آپ سب قارئین خود سوچیے کہ جاسوسی میں، میں واحد تبصرہ نگار ہوں جو سب سے زیادہ رقم خرچ کرتا ہے۔ (اللہ آپ کی پاکٹ منی اور بڑھائے تاکہ کتابوں سے دوستی قائم رہے) خیر چھوڑیے اس بات کو اب کہانیوں کی طرف چلتے ہیں۔ ایبولا کا آخری حصہ زبردست تھا۔ انگارے اس بار ہنگامہ خیز رہی۔ طاہر جاوید واقعی ایک اچھے ناول نگار ہیں۔ طاہر جاوید صاحب ویلڈن۔ اور آوارہ گرد یہ قسط بھی جاندار تھی۔ سرورق کا پہلا موتی بڑا کام، سرور اکرم صاحب نے ایک اچھی تحریر لکھی اور دوسرا موتی یوم حساب بھی ایک پُراثر کہانی تھی۔ مریم کے خان صاحب ویلڈن۔ اس بار اتنا ہی پڑھ پایا ہوں کیونکہ خالہ کی شادی تھی، اس میں مصروف تھا۔" (ہماری طرف سے مبارک قبول فرمائیں)

ہری پور ہزارہ سے حارث محبوب عباسی کی خواہش "میں نے جاسوسی تب سے پڑھنا شروع کیا جب سے طاہر انکل کی کہانی انگارے اسٹارٹ ہوئی ہے۔ میں یہ کہانی ہر ماہ پڑھتا ہوں۔ کیونکہ اس کہانی میں مجھے شاہ زیب کا کردار بہت اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ وہ WWF کا کھلاڑی ہے اور یہ مقابلے میں ٹی وی پر بڑے شوق سے دیکھتا ہوں۔ انکل میری عمر صرف دس سال ہے اور ابھی صرف پانچویں کلاس میں ہوں اگر میرے خط میں کوئی غلطی ہو تو درست کرلیں۔ پلیز میرا یہ خط شامل کر کے مجھے مزید لکھنے کے لیے حوصلہ افزائی کریں۔" (خوش؟)

اسلام آباد سے عزیز بن یٰسین کی ستائش "جاسوسی سے میری وابستگی کم و بیش تین چار سال پرانی ہے۔ ہر ماہ باقاعدگی سے ڈائجسٹ پڑھتا ہوں۔ مگر خط لکھنے کی جسارت آج پہلی بار کسی کے کہنے پر کر رہا ہوں۔ اس امید پر کہ اسے شاملِ ردّی نہیں کیا جائے گا۔ جاسوسی ڈائجسٹ 5 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل ہمیشہ کی طرح منفرد اور اچھا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے انگارے پڑھی۔ عاشرہ اور عارف ملک سے باہر چل دیے۔ شاہ زیب کو بھی آخر تاجور مل گئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ پہچان پائے گی بھی یا نہیں۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ بکرا برائے تاوان میں جلیل اور راجا کی ساری محنت بیکار گئی۔ مگر کہانی نے کافی محظوظ کیا۔ گدھے کے گوشت کے متعلق جو کچھ بھی کہانی میں بیان کیا گیا، وہ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے کی بھیانک حقیقت ہے اور نہ جانے کتنے لوگ اس مکروہ دھندے میں ملوث ہیں۔ آوارہ گرد کی پہلی کچھ اقساط بہتر تھیں اب زیادہ تر کہانی حقیقت سے دور ہوتی جا رہی ہے۔ الوداعی تحفہ جیسے کو تیسا کی عملی مثال تھی۔ لالچ میں انسپکٹر کی ذہانت نے بالآخر ڈاکٹر روبینہ اور ڈاکٹر رشید کو بے نقاب کر دیا۔ ڈبل کراس اچھی کہانی تھی اور انجام کافی پسند آیا۔ بڑا کام میں سرکار نے آخرکار ایک بڑا کام کر ہی دیا اور سکندر جیسے شیطان کو جہنم واصل کر دیا۔ سرورق کا دوسرا رنگ یوم حساب بھی بہت خوب تھا۔ سعی لاحاصل، آئینے کا سچ، نامعلوم اور اکیلے وکیلے بھی بہت اچھی تھیں۔ باقی کترنیں بھی بہت خوب تھیں۔" (شکریہ)

دراین کلاں سے مرحا گل کی پسندیدگی "سب سے پہلے ٹائٹل پر بھرپور طریقے سے نظر ڈالی۔ اس دفعہ دوشیزہ خاصی خوب صورت بنائی گئی غلطی سے، نیچے صنفِ کرخت ہاتھ میں پستول پکڑے اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ حسینہ ذرا سنبھل کے چل ورنہ۔۔۔ ٹائٹل نے تمام اگلے پچھلے ریکارڈ توڑ دیے اور اس کے ساتھ ہی ہمارے غصے کے ریکارڈ پھوٹ پڑے جب محفل میں اپنا لیٹر نہ پایا نہ ہی بلیک لسٹ میں اب اسے ڈاکیے کی غلطی کہیں یا۔۔۔ اتنا

زبردست طویل تبصرہ صنفِ کرخت کے ہاتھوں ضائع ہو گیا۔ پتا نہیں کہاں اٹکا ہوا ہے؟ شکر ہے اس مرتبہ صنفِ نازک ٹاپ آف دی لسٹ رہیں۔ عذرا ہاشمی مبارک ہو۔ ٹائٹل پر شاعرانہ تبصرہ بے حد پسند آیا۔ چوہدری محمد سرفراز صاحب کا تمبر کا تبصرہ بہت مزے کا تھا اور یاد کرنے کا شکریہ۔ معراج محبوب عباسی آپ کی نوازش ہے کہ ہم کو یاد کیا، دل و دماغ سے موسٹ ویلکم۔ محمد احتشام مرتضیٰ محفل میں نظر نہیں آ رہے کچھ ماہ سے کہیں رنگین سنگین حادثہ تو نہیں ہو گیا میرا مطلب ہے شادی خانہ۔۔۔ امجد رئیس ویلڈن ویلڈن بس قلم الفاظ لکھنے سے قاصر ہے جو اس کی تعریف میں بنتے ہیں۔ انگارے کی یہ قسط کافی شاندار اینڈ پیار بھری تھی۔ آوارہ گرد بھی ایکشن سے بھرپور تھی۔ ہم نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ شہزی اینڈ لئیق شاہ بھائی ہیں اب تو زہرہ بھی بھابی بن گئیں۔ لالچ ایک تلخ تحریر تھی جو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔"

سجاد علی شگری کے گلگت سے شکریہ کلمات "جس طرح ایک تھکا ہوا مسافر اسٹاپ پر کھڑے ہو کر بس کا انتظار کرتا ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی شدت اور بے چینی سے پیارے ڈائجسٹ کا انتظار کرتے ہیں۔ جاسوسی ڈائجسٹ جب ہمیں ملتا ہے تو اس وقت بہت خوشی ہوتی ہے اور ساری تھکاوٹ دور ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلی خوشی اس بات کی ہوئی کہ طاہر جاوید مغل کی سلسلے وار کہانی انگارے کی وجہ سے کچھ تبدیلی آئی ہے۔ جاوید صاحب آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ بہت ٹاپ اسٹوری لکھنے پر اور میری ڈھیر ساری دعائیں آپ کے لیے۔ آوارہ گرد بھی بہت اچھی اسٹوری ہے۔ پڑھ کر کبھی ہنستا ہوں کبھی روتا ہوں، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب، ویری گڈ ٹاپ اسٹوری لکھنے کا۔ ہمیں شدت سے اگلی قسط کا انتظار رہتا ہے اور ساری کہانیاں بہت اچھی تھیں۔"

سندیلیانوالی سے ابرار وارث کی الجھنیں "زندگی کی الجھنوں سے نبرد آزما ہوتے، مشکلات کا مقابلہ کرتے دن یوں گزرتے جا رہے ہیں کہ کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ ایک حادثہ ختم، تو ملکی حالات کی طرح دوسری پریشانی سر ابھار رہی ہوتی ہے۔ ایسے میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور دماغ کی اس سرزنش کو پس پشت ڈال کر (کہ وقت بہت کم ہے اور کام زیادہ) 8 تاریخ کو جاسوسی لینا ہی پڑا۔ دلکش سرورق کے بعد اوراق کی ورق گردانی کرتے سیدھا انگارے کی طرف جمپنگ کی اور ایک ہی نشست میں ختم کر لی۔ عجیب صورتِ حال پیدا ہو گئی ہے کہانی میں۔ پچھلے تمام ابواب ختم کر کے کہانی کو ایک نئے موڑ پر لایا گیا جو خوشگوار ہے۔ اس کے بعد میرے پاس محض دو گھنٹے تھے اور مجھے اپنی باقی پسند کے رائٹرز کو پڑھنا تھا جن میں سرفہرست مریم کے خان تھیں۔ مریم جی نے اس دفعہ تو کمال کر دکھایا۔ پوری گزری لائف میں، میں نے ایسی زبردست کہانی نہیں پڑھی۔ احسن نے بہت پاورفل کردار ادا کیا۔ جابر کو آخری چوبیس گھنٹوں میں جو مہلت ملی، اس نے بہت زبردست کام کیے۔ اس کہانی میں کہیں کوئی جھول دیکھنے کو نہیں ملا، بہت مکمل اور حیرت انگیز کہانی تھی۔ منظر امام کی اکیلے دکیلے پڑھی، لالچ اور اس کے انجام اور دوسروں پر بھروسا بلاوجہ کرنے کے نقصانات کا احاطہ کرتی پرانی ضرب المثل کی زندہ تصویر تھی۔" (ہم اجازت کے بغیر کسی مصنف کا فون نمبر نہیں دے سکتے۔ آپ ادارے کی معرفت خط لکھ سکتے ہیں)

معراج محبوب عباسی کا ہری پور ہزارہ سے سوال "اکتوبر کا جاسوسی حسبِ سابق 3 تاریخ کو ہی دستیاب ہوا۔ سرورق کی معصوم صورت لڑکی دیدے پھاڑ پھاڑ کے مجھے دیکھ رہی تھی جبکہ ایک مسلح ہاتھ بھی مجھے اپنے نشانے پر رکھے ہوئے تھا۔ محبت ونفرت کی اس آمیزش پر کارنر میں موجود کرخت صورت انسان مسکرا رہا تھا۔ ویلڈن ذاکر چاچو۔ اب دیتے ہیں جی عذرا ہاشمی کو مبارک باد۔ خانیوال سے محمد صفدر معاویہ کے انکشاف نے ہمیں بھی محتاط کر دیا ہے۔ آئندہ کسی پر بھی اعتبار کرنا ہوا تو پہلے اس کی آنکھوں کا معائنہ کریں گے۔ میانوالی سے ملک رحمت کی خوشناسی کی داد دیتے ہیں اور تبصرے کی پسندیدگی پر شکریے کا نذرانہ قبول کریں۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان اس ناچیز کو اتنا بانس پر نہ چڑھاؤ کہ اس عمر میں بتیسی تڑوا بیٹھوں اور باقی پہاڑ جیسی زندگی پوپلی باتیں کرتے بیتے۔ انور یوسف زئی صاحب واقعی وہ تبصرہ نگار ہیں جو اس محفل کی رونق سمجھے جاتے ہیں۔ زندگی میں اس قدر مصروف ہیں کہ ہر ماہ ایک گھنٹا محبوب ڈائجسٹ کے لیے نکالنا بھی ان کے لیے شاید ممکن نہیں رہا۔ اس کے علاوہ باقی یارانِ محفل نے بھی خوب رنگ جمایا۔ کہانیوں میں اس مرتبہ حسبِ معمول کے بجائے خلافِ معمول پہلے کاشف زبیر کو خوش آمدید کیا۔ کاشف انکل کا بکرا عید کا تحفہ گو کہ تاخیر سے موصول ہوا مگر دیر آید درست آید، کہانی زبردست رہی مگر نتیجہ کھودا پہاڑ، نکلا چوہا کے مصداق۔ جلیل اور اس کے یارِ غار کی بھاگ دوڑ تو بے کار گئی ساتھ ساتھ جلیل اس بار جیب خرچ بھی نہ بنا سکا۔ اس کے بعد ڈاکٹر آف ایکشن اینڈ تھرل کی آوارہ گرد پڑھی۔ اس قسط کے بعد مس عارفہ کا کردار کافی حد تک مشکوک ہو گیا ہے۔ جبکہ شہزادہ احمد خان عرف شہزی کو ریڈی میڈ بھابی کی دستیابی پر مبارکباد کے ساتھ بھائی کی موت پر تعزیت۔ انگارے میں مسٹر شاہ زیب بن بجنوں نے آخر کار لیلیٰ کا سراغ پا ہی لیا اور اس کی مدد پر بھی آمادہ ہو گئے اور کیوں نہ ہوتے آخر کو کہانی کو طول جو دینا ہے طاہر انکل نے۔۔۔ لیکن عاشرہ اینڈ فیلی کا مستقبل شاہ زیب نے محفوظ کر دیا ہے۔ مریم کے خان کی یومِ حساب میں ہمارے اردگرد موجود کرداروں کو قلم کی طاقت سے اجاگر کیا گیا۔ ہم ہر گناہ اس امید پہ کرتے ہیں کہ ابھی بہت زندگی ہے توبہ کر لیں گے اور پھر اچانک کسی دن ہمارا یومِ حساب آ جاتا ہے اور پھر ہمیں خیال آتا ہے کہ کاش ہمیں کچھ مہلت مل جاتی۔ جابر کو قدرت کی طرف سے جو مہلت ملی، اس نے اس کے دوران اپنے اعمال درست کر لیے مگر صد افسوس کہ لوگ آج کے زمانے میں دوسروں کے انجام سے اس وقت تک عبرت حاصل نہیں کرتے جب تک وہ سب خود ہمارے اپنے اوپر نہ بیتے اور جب ہم پہ وہ مصیبت آ جاتی ہے۔ تو پھر سنبھلنے کا وقت نہیں رہتا۔ سعی لاحاصل میں سراغ رساں کپ نے محض وقت ہی برباد کیا کیونکہ ٹینا اس کی سوچ سے بڑی اداکارہ نکلی، رہی بات قاتل کی تو مقتول جس انجام کا مستحق تھا اس کا وہی انجام ہوا اور اس میں ٹینا حق بجانب تھی۔ لالچ میں وہی پرانے تین "ز" کی کہانی مگر نئے انداز اور نئے کرداروں کے باعث متاثر کن رہی۔ ڈاکٹر روبینہ اور ڈاکٹر رشید، ڈاکٹروں کے روپ میں ڈاکوؤں سے بھی بدتر نکلے۔ دیانت دار آصف ملک کی ہمارے معاشرتی حالات کی عکاس زبردست تحریر۔ ہم نے برداشت نام کی چیز کو گھر سے کیا بلکہ ملک بدر کر دیا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پہ جھگڑے، تشدد اور مار کٹائی وقتل وغارت گری ہماری روایت بنتی

جاری ہے آخر میں اہم بات آپ چھوٹے دکانداروں کو رسائل فراہم نہیں کرتے۔'' (آپ کے شہر میں کیپٹل بک ہاؤس سے رسائل حاصل کیے جاسکتے ہیں)

عبدالجبار رومی انصاری کی لاہور سے انکساری'' ٹائٹل اس دفعہ پُراسرار لگ رہا تھا۔ اداریہ متاثر کن تھا۔ لیئق شاہ اور شہزی بھائی ہیں۔ عذرا ہاشمی کی پیش گوئی میں بھی وزن لگتا ہے، سوچ کی فراوانی ہے۔ تبصرہ ایک دم سے زبردست ہے۔ میرا تبصرہ پسند کرنے کا شکریہ۔ مسز ڈاکٹر عمران فاروق کی حجابانہ گفتگو اچھی لگی، محمد صفدر معاویہ آنکھیں، باوفا ہوں یا بے وفا لیکن آنکھوں میں تو دم ہے نا۔ سجاد خان اللہ تعالیٰ آپ کی قسمت اور بھی اچھی کرے۔ انور یوسف زئی 4 دن میں پرچہ پڑھ لیا اور تبصرہ اتنا مختصر؟ فلک شیر ملک کا جذبۂ حب الوطنی پسند آیا۔ طاہرہ گلزار آپ دل پہ پتھر نہ رکھیں۔ پھول رکھیں اور اپنی باتوں سے سب کو معطر کریں، تبصرہ زبردست ہے، بہت اچھا لگا۔ انگارے تو اس دفعہ ہیر رانجھا کی اسٹوری لگی جیسے رانجھا ہیر کے گھر میں کامابن کے رہتا ہے ایسے ہی شاہ زیب بھی دیہاتی روپ میں ٹریکٹر ڈرائیور بن کے اپنے محبوب کے گھر پہنچ جاتا ہے۔ کہانی تو پہلے بھی زبردست تھی۔ اب دیہاتی پس منظر میں اور بھی اچھی لگنے لگی۔ ایبولا میں مریا جتنی نرم و نازک دوشیزہ تھی، ویسا ہی اس نے زبردست کام کیا۔ ایبولا کے متعلق ہر شخص کو بے نقاب کیا اور اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہوئی، زبردست کہانی تھی۔ ہم نے تو سنا تھا جٹھوں دی کھوتی، اوتھے آن کھلوتی۔ پر کاشف زبیر نے تو وہاں کھوتے (گدھے) کو کھڑا کردیا، ہنسا ہنسا کے لوٹ پوٹ کردیا۔ بکرا برائے تاوان عمدہ کہانی تھی۔ انسان جو کرتا ہے، اسے اس کا حساب دینا ہوتا ہے۔ جس دن جواب دینا ہوتا ہے وہی یومِ حساب ہوتا ہے اور جنہوں نے جرم کیا تھا، وہ یوم حساب کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ مریم کے خان کی کہانی بھی بہترین رہی۔ ریاض کی چھوٹی سی غلط عادت نے اسے مجرم بنادیا مگر وہ کب تک نامعلوم رہتا آخر پکڑا گیا اور مشتاق کا خون بھی رنگ لایا، آصف ملک کی تحریر بھی زبردست رہی۔ لالچ بری بلا ہے روبینہ نے بھی لالچ میں آکر جرم کیا تھا سو اسے بھی دھرلیا گیا۔ بے شک اس پہ بھی ظلم ہوا تھا لیکن اس نے انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے جو طریقہ اختیار کیا، وہ بھی غلط تھا۔ پرویز بلگرامی کی لالچ بھی ٹھیک رہی۔''

ہری پور سے محمد قاسم رحمان کی تبصرہ نگاری'' اکتوبر کا مہینہ یوں تو مجھے بہت پسند ہے کیونکہ گرمی کے سبب نہ پسینے بہتے ہیں اور نہ ہی ٹھنڈ رگوں میں گھستی ہے۔ ایسے مہینے کی ابتدا میں ہی جاسوسی مل گیا تو مزہ دوبالا ہوگیا۔ ٹائٹل پر دلن اپنی پسٹل ہماری طرف کرکے چلا رہا تھا کہ میری محبوبہ (ٹائٹل گرل) کی طرف نگاہِ غلط مت ڈالنا ورنہ جیسے اوپر والا بندہ چلا رہا ہے، ویسے تم بھی چلاؤ گے۔ سو ہم نے عبرت پکڑی اور فہرست کی طرف بھاگے۔ آپ نے بالکل ٹھیک کہا کہ ہماری خوشیاں شہیدوں کے لہو کی مرہونِ منت ہیں۔ عذرا ہاشمی مبارک ہو جی۔۔۔ ٹائٹل پر آپ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ جھنگ سے مسز عمران فاروق لگتا ہے کہ کسی باغ میں بیٹھ کر آپ نے تبصرہ لکھا ہے۔ جب ہی اتنی خوب صورت باتیں کیں آپ نے۔ ملک رحمت آپ کا پہلا خط تو بڑا دبنگ تھا مگر اس بار اتنے پولائٹ کیوں؟ کبیر عباسی کی ٹانگ بھی نہیں کھینچی اس مرتبہ آپ نے؟ عبادت کاظمی لگتا ہے کہ آپ کو مغرور حسینائیں پسند ہیں۔ محسن علی طاب اور ناظم آباد سے ادریس احمد خان اچھی تبصرہ نگاری کر گئے۔ انور یوسف زئی آپ کا نام تو بڑا پُرجلال ہے۔ عبدالغفور خان و نیلم بیگ۔ شمس الحق نے بھی کہانیوں پر خوب تبصرہ کیا۔ طاہرہ گلزار سرورق پر موجود دلن آپ کو ہمیشہ ہمایوں سعید ہی کیوں لگتا ہے۔ واہ کینٹ سے بلقیس خان آپ تو مجھے زویا اعجاز کی بہن لگتی ہیں کیونکہ آپ دونوں کا طرزِ تحریر یکساں ہے۔ طاہر چوہدری اور احسان سحر کے تبصرے بہترین تھے۔ کہانیوں کی ابتدا انگارے سے کی۔ شاہ زیب نے شکیل داراب کو خوب نچایا، مزہ آگیا۔ فرح کے توسط سے شاہ زیب کو اپنی ''وہ'' تو مل گئی لیکن مشکلات کے بھنور میں پھنسی ہوئی۔ کچھ نئے کرداروں کی کہانی میں انٹری ہوئی۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ مریم کے خان لکھتی تو کم ہیں لیکن جب لکھتی ہیں تو۔۔۔ اتنا زبردست کہ قاری کہانی کے کرداروں کے ساتھ سفر کرنے لگتا ہے۔ چوبیس گھنٹوں میں جابر نے اپنی زندگی بھر کے گناہوں کا کفارہ ادا کردیا۔ ایبولا زبردست ناول تھا۔ سسپنس، ایکشن اور تھرل سے بھرپور ناول واہ واہ، امجد رئیس بہت اچھے مترجم ہیں۔ سرور اکرام کا پہلا رنگ زبردست تھا۔ سرکار نے سکندر کو قتل کرکے واقعی بڑا کام کیا۔ کاشف زبیر نے اس مرتبہ پھر راجا اور جلیل سے ملاقات کروائی۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔ ڈھونگ پڑھ کر حیرت سی ہوئی۔ جونی سینڈرز کو اسی وقت سمجھ جانا چاہیے کہ بلیک میلر اندھا نہیں ہے جب وہ روڈ کراس کررہا تھا۔ الوداعی تحفہ میں فریڈرک نے ایوا کو ٹھکانے لگانے کے لیے خوب پلاننگ کی لیکن ہاروے نے بھی اپنا حصہ ڈالنا مناسب سمجھا۔ دولت ہمیشہ انسانی رشتوں کے تقدس کو پامال کرتی ہے۔ ڈاکٹر روبینہ ایک انتہائی کمزور عورت ثابت ہوئی۔ لالچ میں آکر اپنی بہن کو سلو پوائزن دیتی رہی لیکن اینڈ میں انور نے سارا بھانڈا پھوڑ دیا۔ سلیم انور کی ڈبل کراس نے خوب انٹرٹین کیا۔''

کورنگی کراچی سے شمس الحق کی حق گوئی'' پہلی تاریخ کی تپتی دوپہر میں جاسوسی کا دیدار نصیب ہوا۔ ٹائٹل گرل تو اچھی خاصی تھی لیکن پتا نہیں ڈاکر انکل کو صنفِ وجاہت سے کون سا خاص بیر ہے جو وہ ان کو ہی اتنے کرخت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ بزمِ دوستاں میں عذرا ہاشمی صاحبہ کو مسندِ صدارت سنبھالے ہوئے دیکھا، تبصرہ اچھا تھا اور اندازِ بیاں بھی بہترین تھا۔ مسز ڈاکٹر عمران صاحبہ آپ نے بالکل بجا فرمایا لیکن آج کل لوگوں کے دل صاف ہوتے ہیں۔ ملک رحمت صاحب لیجیے اس دفعہ پستول کا نشانہ سیدھا آپ کی طرف ہے۔ محسن علی بھائی آپ نے شاید دل سے نہیں پڑھا، ٹائٹل کاشف انکل کی دہری چال کا تھا۔ معراج محبوب کی لفاظی کے کیا کہنے۔ معراج بھائی ہم ٹیوشن لینے آئیں کیا؟ باقی دوستوں میں سجاد خان، صفدر صاحب، فلک شیر ملک، طاہرہ گلزار صاحبہ، طاہر چوہدری اور احسان سحر صاحب کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ اس دفعہ ایبولا پہلا نمبر لینے میں کامیاب رہی۔ واقعی کچھ درندے سامنے آئے بھی اور درندگی نے شکست بھی کھائی، ہمدردی، محبت، انسانیت، سچائی اور محنت جیت گئی۔ انگارے میں اس دفعہ ایکشن کا فقدان تھا۔ شاہ زیب کی محبت اسے مل گئی، کہانی کا دوسرا موڑ شروع ہوگیا ہے اور آگے پڑھنے میں مزہ آئے گا۔ کاشف انکل کی بکرا برائے تاوان نے بے ساختہ ہمارے ہونٹوں پر مسکراہٹیں بکھیر دیں، راجا اور جلیل کی نوک جھوک بہت اچھی لگی، عیدِ قرباں کے [illegible] طرح بھی کم نہیں تھی۔ آگے زیرِ مطالعہ ہے۔''

رحیم یار خان سے فلک شیر ملک کا افسوس ''اکتوبر کا شمارہ جلدی مل گیا تھا۔ حسبِ معمول سرورق خوشنما تھا۔ بڈھ بیر میں پہلے بھی خونریزی ہو چکی ہے مگر اس دفعہ تخریب کاروں نے کوئی منظم منصوبہ بنایا۔ شاید سرنگ کھودی گئی تھی۔ وہ تو سب کے سب واصلِ جہنم ہو گئے اور دفاعِ وطن پر شہید ہونے والے جنتی بستروں پر سو کر معطر خوشبوؤں سے لطف اندوز ہو رہے ہوں گے۔ عذرا ہاشمی گڑھ موڑ کا تبصرہ بھرپور انداز لیے ہوئے تھا۔ طاہرہ گلزار، پشاور کی جاسوسی سے محبت اچھی لگی۔ بہن آپ بڑی نرم دل سی لگتی ہیں۔ یہی ایک ایسی خصوصیت ہے جو ہر کسی کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے۔ بلقیس خان واہ کینٹ، جب آپ کوئی تحریر جاسوسی میں بھیجیں اور وہ چھپ نہ سکی تو پھر آپ کو پکا پکا جواب کی سمجھ آ جائے گی۔ (مطلب) احسان سحر آپ بھی کوشش کرتے رہیں، ایک نہ ایک دن کامیاب ہو جائیں گے۔ اس دفعہ سب تحریریں جاندار تھیں۔ ایبولا کے بعد منظر امام کی اکیلے دکیلے مختصری مگر دلچسپ تحریر پڑھ کر مزہ آیا۔ حرام کی کمائی دولت کبھی وفا نہیں کرتی۔ ڈھونگ بھی صحیح تھی، ہر کسی پر اعتبار کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر دھوکے اور فریب کا جال بچھا ہوا ہے۔ بکرا برائے تاوان، زبردست مزاحیہ انداز اور... طنز و مزاح سے بھرپور تحریر نے گدھا گاڑی والوں کے کچے چٹھے کھول دیے۔ انگارے، کی بات ہے، طاہر مغل نے کمال کر دیا۔ یہ قسط بہت شاندار تھی۔ لگتا ہے مغل صاحب کو تاجور کی دولتیں جو کہ شہد رنگ بھی ہیں، بہت پسند ہیں۔ لالچ، میں انسپکٹر انور کا کردار جاندار تھا جس نے اس انوکھے قتل کے دونوں مجرموں رشید اور روبینہ کو پکڑا۔ ڈبل کراس، ایک خوب صورت تحریر تھی۔ جرم کی داستان اور لیڈیز کا لالچ، آخر کار وہی لالچ اسے لے ڈوبا۔ آوارہ گرد، کی یہ قسط اچھی تھی، نوید اور عارفہ کا بھید کھل گیا۔ آئینے کا سچ، جرم اور قتل پر مبنی یہ شگفتہ تحریر تھی۔ جس میں محبت کا رنگ بھی نظر آیا۔ آصف ملک کی نامعلوم سسپنس سے بھرپور داستان تھی۔ رانیا اور ریاض کے کردار آج کل بھی نظر آتے ہیں اور کچھ پولیس والے ایسے بھی ہیں جو مشتاق علی جیسے نیک صفت، رشوت کے بغیر بھی اچھا گزارہ کر لیتے ہیں۔ آخری رنگ، یومِ حساب بہت ہی ٹاپ کی کہانی تھی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا، یہ تحریر پورے رسالے کی جان تھی۔ آخر تک اس اسٹوری کے انجام کے سسپنس میں رہا مگر جو میں نے سوچا تھا، وہ نہیں ہوا۔ احسن کی شادی نازیہ سے ہو جاتی تو کیا تھا چلو، تیمور کی قسمت۔''

بہاولپور سے بشریٰ افضل کی افسردگی ''3 اکتوبر کو جاسوسی ملا۔ ارے صنفِ مخالف کو کس نے گولی داغ دی، بہت ہی تکلیف میں ہے بے چارہ۔ صنفِ نازک حیران سی کس طرف دیکھ رہی ہے۔ اپنی محفل میں پہنچے، انکل کی کھری کھری باتیں سنیں۔ عذرا ہاشمی کا تبصرہ اچھا تھا۔ سجاد خان، عذرا ہاشمی سے کیا غلطی ہو گئی ہماری کی کسی نے محسوس نہیں کی، آپ سے اچھے تو سرگزشت کے ساتھی ہیں حال احوال تو پوچھ لیتے ہیں۔'' (ہم بھی پوچھتے ہیں، کیسی ہیں... اتنا مختصر سا خط کیوں لکھا ہے، ناراضی ہے؟)

سندری سے عابد اسلم کا شکوہ ''تین تاریخ کو جاسوسی ملا۔ ٹائٹل اس دفعہ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ اس کے بعد چینی نکتہ چینی پر پہنچے۔ تبصروں میں سب سے اچھا تبصرہ محمد صفدر معاویہ کا اور واہ کینٹ سے بلقیس خان، سینٹرل جیل میانوالی سے سجاد خان کا تبصرہ اچھا لگا۔ کہانیوں میں امجد رئیس کی ایبولا بہت اچھی لگی اور طاہر جاوید کی انگارے اچھی جا رہی ہے۔ آوارہ گرد کچھ زیادہ ہی فاسٹ جا رہی ہے اور باقی ڈائجسٹ کا مطالعہ باقی ہے۔ آپ سے مجھے بہت شکوہ ہے۔ پچھلی دفعہ خط لکھا آپ نے شائع نہیں کیا۔ کیا آپ جو پہلی بار خط لکھتے ہیں ان کا خط شامل نہیں کرتے۔'' (کوٹیشن علیحدہ صفحے پر بھیجا کریں)

چشمہ بیراج سے ساگر نکو کر کا خط ''وہ روایتی سا سرورق زخمی مرد، ایک عدد پستول اور عورت بوڑھی سی۔ میک اپ سے لتھڑی ہوئی۔ مدیرِ اعلیٰ کی باتیں پلّو سے باندھیں۔ عذرا ہاشمی کو مبارک باد دی۔ محفل میں اپنا خط نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ طاہرہ گلزار، عبادت کاظمی، معراج محبوب عباس اور صفدر معاویہ کو محفل میں دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ ایبولا واقعی ابتدائی صفحات کی حق دار تھی۔ امجد رئیس مغربی کہانی بہت خوب صورت لکھتے ہیں۔ اکیلے دکیلے بہت دلچسپ کہانی، بالکل شیخ سعدی کی حکایات جیسی لگی۔ ڈھونگ ٹائم پاس لگی۔ بکرا برائے تاوان نے مزاج خوش گوار بنا دیا۔ انگارے تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا، شاہ زیب ٹریکٹر ڈرائیور بن گیا۔ واہ رے عشق بالکل سچی سچی کہانی لگتی ہے۔ یومِ حساب بہت پُراثر کہانی لگی۔ پڑھ کر دل موم ہو گیا۔''

اسلام آباد سے انور یوسف زئی کی تشویش ''اس بار سرورق بس یونہی سا تھا شاید ذاکر صاحب نے نہیں بنایا کیونکہ ان کے دستخط موجود نہیں تھے۔ عذرا ہاشمی کو تبصروں میں سرفہرست آنے کی مبارک باد، ویسے بی بی عذرا میں ایک اچھے مصنف کی ساری خوبیاں موجود ہیں انہیں چاہیے کہ کہانیاں لکھا کریں۔ بی بی طاہرہ گلزار، بھائی صفدر معاویہ اور بی بی بلقیس خان کا اس ناچیز کو یاد آوری کا شکریہ۔ مغربی ناول ایبولا کا دوسرا حصہ بے حد دلچسپ تھا۔ مریسا تو ایک سُپر وومین ثابت ہوئی۔ امجد رئیس کا افسانوی انداز لیے ترجمہ شاندار تھا۔ اس ماہ کی بہترین کہانی بکرا برائے تاوان رہی گو کہ اس بار شنو کا کوئی کردار نہیں تھا۔ سرورق کی دوسری کہانی یومِ حساب عین جاسوسی کے معیار کی تھی اور پہلی کہانی بڑا کام گزارے لائق تھی۔ مغل صاحب کی قسط وار کہانی تو اب الف لیلیٰ بنتی جا رہی ہے۔ پتا نہیں وہ اتنے ڈھیر سارے کردار کس طور سیٹ پائیں گے۔ تاجور اور مولوی فدا محمد پُراسرار کردار ثابت ہوں گے۔ دیگر مغربی کہانیوں کے تراجم میں سعی لاحاصل ایک اچھی کہانی تھی۔ بھٹی صاحب کی آوارہ گرد اب ایک نازک موڑ پر آ گئی ہے کہ شہزی کو اپنے باپ کی تلاش کے نام کا پتا چل گیا ہے دیکھیں وہ اپنے لاپتا باپ کی تلاش کب شروع کرتا ہے۔''

جہلم کھیوڑا سے شفقت محمود کا تبصرہ ''اکتوبر کا جاسوسی اس دفعہ بہت جلدی مل گیا۔ 4 تاریخ کو جاسوسی ڈائجسٹ۔ ٹائٹل پر بنی ہوئی مہ وش خوابیدہ انداز سے پتا نہیں کیا دیکھ رہی تھی۔ اس کے پیچھے 3 ملنگ ٹائپ صوفی بزرگ کسی انجانے کلام پر سردھن رہے تھے۔ چینی نکتہ چینی میں جہاں ذرائع اور معدنیات کی ریل پیل اور ان کی ناقدری کا پڑھ کر افسوس ہوا وہیں اپنے شہر کھیوڑا کی نمک کی کان کا ذکر خوش کر گیا۔ بلاشبہ ضلع جہلم اور پاکستان کے لیے سب سے بڑی نعمت کہ ہزاروں سال کے لیے مفت نمک مل رہا ہے اور پھر سونے پہ سہاگا ہر ماہ ہزاروں وزیٹر سے کروڑوں روپے کی آمدنی ہو رہی ہے۔

خطوط میں چوہدری محمد سرفراز احمد صاحب کا خط پہلا نمبر لے گیا۔ اور سید شکیل حسین کاظمی کی تبصرہ نگاری پسند آئی اور خوش آمدید کہنے پر بہت بہت شکریہ۔ جہلم سے نوال اور مثال کا بھی شکریہ۔ عبدالجبار رومی صاحب کا خط بھی بہت پسند آیا۔ کہانیوں میں امجد رئیس صاحب کی ایبولا نے پسینے چھڑا دیے۔ بہت خوفناک اسٹوری تھی۔''

ڈیرہ اسماعیل خان سے سید عبادت کاظمی کی پریشانی ''بدلتے موسم میں بدلتے رنگوں کے ساتھ بدلے بدلے سے سرورق نے بہت اٹریکٹ کیا۔ جامنی رنگ ہمیشہ سے پسند ہے مجھے، حسینہ کی آنکھوں کی چمک سے ڈر سا لگا۔ ایک منفرد اور متاثر کن سرورق تھا۔ عذرا ہاشمی محفلِ دوستاں کی صدر بننے کے عہدے پر فائز تھیں۔ مبارک ہو۔ سینٹرل جیل میانوالی سے سجاد خان آف موچھ آپ کے تبصرے کا شدت سے انتظار تھا۔ تبصرہ پڑھ کر دل خوش بھی ہوا اور اداس بھی، سزائے موت کے قیدی کے بارے میں پڑھ کر وحشت ہوتی ہے، اللہ آپ کو رہائی عطا کرے، آمین۔ طاہرہ گلزار دور کے ڈھول سہانے۔ معراج محبوب عباسی کا تبصرہ بہترین تھا۔ دو ماہ کی غیر حاضری کے بعد بلقیس خان کی آمد اچھی لگی۔ اپنے جانے پہچانے بھائی طاہر چوہدری کو محفل میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ سید محی الدین اشفاق مختصر تبصرے کے ساتھ آئے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آوارہ گرد پڑھی۔ عابدہ کی قید سے خطرہ محسوس ہوا۔ لئیق شاہ، شہزی کا بھائی ہے جان کر اچھا لگا۔ کمیل داد اس دفعہ کی قسط میں غائب کیوں تھا۔ مجھے لگتا ہے عابدہ واپس نہیں آئے گی اور زہرہ بانو (میڈم جی) ہی شہزی کی ہیروئن بن جائے گی۔ انگارے نے یک دم رنگ بدل ڈالا۔ شاہ زیب واپس وطن جانے کے بجائے پاکستان میں رہ گیا۔ کاشف زبیر، جلیل نامہ کے ساتھ چھائے رہے مگر شنو، نازو، عارفہ یعنی تین ہیروئن غائب مزہ کرکرا ہو گیا۔ ایبولا کا خوب صورت اختتام ہوا۔ رنگوں میں مریم کے خان نے اچھا لکھا لیکن اس ماہ کی کہانی سرور اکرام نے لکھی۔ بڑا کام، سرکار نے بھائی کو مار کر بڑے پن کا ثبوت دیا۔ فہیم اور ریشماں سکندر کے چنگل سے بچ نکلے۔ ہوس کے پجاریوں پر مبنی کہانی حقیقت سے قریب ترین تھی۔ پرویز بلگرامی خونی رشتوں کی تلخ حقیقت سامنے لے کر آئے۔ ڈاکٹر روبینہ جیسوں کا یہی انجام ہونا چاہیے۔ نامعلوم آصف ملک کے قلم کی شاہکار کہانی تھی۔ آج کل کی نوجوان نسل اور درائنہ جیسی عورتیں معاشرہ خراب کرتے ہیں۔ کچھ پریشانیوں کا شکار ہوں دعا کی درخواست ہے۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کی فیملی کے لیے آسانیاں پیدا کرے، آمین)

واہ کینٹ سے بلقیس خان کی تفصیلات ''اس دفعہ 14 اکتوبر سے ہی آصف بک سینٹر کے چکر لگانے لگے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اپنے شہر میں ہمارا جاسوسی عام طور پر 5 تاریخ کو درشن کراتا ہے۔ بہرحال 15 اکتوبر کی خوش رنگ صبح جاسوسی کو لرزتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ پرس میں ڈالا اور تیزی سے گھر کی راہ لی۔ اداریہ حسبِ معمول ملکی حالات و واقعات پر ماتم کناں تھا۔ دہشت گرد ممنوعہ علاقے میں کیسے اور کیونکر داخل ہوئے؟ یہ جملہ غور طلب ہے اور فکر انگیز بھی۔ اس بار محفلِ یاراں نکتہ داں کی ملکہ عذرا ہاشمی ٹھہریں۔ تبصرہ مکمل تھا اور عمدہ بھی۔ طاہرہ گلزار، الفت نہ سہی نفرت ہی سہی۔ اس کو بھی محبت کہتے ہیں۔ اس ماہ بہترین تبصرے کا اعزاز رحیم یار خان کے حصے میں آیا جہاں طاہر چوہدری نے براہِ راست ہمیں نشانہ بنایا۔ مطلب یہ کہ چوہدری سرفراز کے بعد یہ دوسرے چوہدری ہیں جن کی عالمانہ سوچ اور باخبری نے متاثر کیا ہے۔ انتہائی دعا گو اور زبردست قسم کا تبصرہ تھا۔ البتہ منظر امام پران کی معلومات کمزور تھیں یا تو وہ باقاعدہ محفل اٹینڈ نہیں کرتے یا پھران کی عینک فوت شدگی کے مراحل میں داخل ہو چکی ہے اپنا نمبر تبدیل کریں۔ دیگر احباب میں احسان سحر کی دلنشیں باتیں معراج محبوب عباسی کی نکھری الفاظی کے ساتھ اپنی آمدِ بہاری بھی اچھی لگی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے ایبولا پڑھی۔ بلاشبہ ایبولا محمد صفدر معاویہ کے بقول اسٹوری آف دی منتھ رہی، مریسا کی ہمت، ہمتِ مرداں سے آگے کی چیز تھی، ارادے نیک ہوں تو قدرا اسی طرح مدد کرتی ہے۔ قدم قدم پر سسپنس اور سطر سطر سنسنی خیز، ٹیڈ اور نورس مشکوک لگے تھے ہمیں لیکن رالف پہ یقین راسخ تھا کیونکہ رالف کو کیسے گئے ہر فون پر P.A.C سے ایجنٹ حرکت میں آجاتے تھے۔ رابن کک کے ناول کا اپنے اسٹائل میں شاندار ترجمہ کرنے پر امجد رئیس کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہوں۔ ہمارے مغل بھائی، انگارے کو دیہی ماحول میں لے آئے ہیں۔ تاجور، شاہ زیب کے محبوب کی ہم شکل ہے یا جڑواں بہن ہے۔ قسط کا اختتام اچھوتے موضوع پر کیا، جس میں اقدارِ انسانیت اور احترامِ آدمیت پر مبنی اچھی سوچ کا درس دیا ہے اپنے پڑھنے والوں کو۔ آوارہ گرد کی موجودہ قسط ابتدا میں ماٹھی لیکن آخر میں کچھ جوش اور جذبہ پیدا کر ہی گئی۔ آخر رنگوں میں مریم کے خان کی یوم حساب نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ عذابِ محشر اور عذابِ قبر نے کپکپا دیا۔ اچھائی اور برائی کے دونوں پہلو لیے یومِ حساب یادگار اسٹوری ہے۔ سرور اکرام کی بڑا کام بھی نیک و بد افراد پر مشتمل خوب صورت تحریر تھی۔''

پشاور سے طاہرہ گلزار کی آمد ''3 اکتوبر کو اپنا سویٹ سویٹ جاسوسی مل گیا۔ مدیرِ اعلیٰ کا ایک ایک لفظ دل و دماغ پر گولی کی طرح لگا کیونکہ ان الفاظ کا ہمارے حکمرانوں اور دشمنوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا۔ محفل چیں بہ نکتہ چینی میں دروازہ کھول کے اندر گئے۔ دروازہ میری ہی صنفِ نازک عذرا ہاشمی نے کھولا، میں نے بھی دل کھول کے مبارک باد دی کیونکہ اس کا تبصرہ بہت زبردست تھا۔ صفدر معاویہ کا حسبِ عادت بہت پراثر تبصرہ موجود ہے لیکن مجال ہے جو باجی کو پوچھا ہو کیوں بھائی کیا ناراض ہو؟ بھائی سجاد خان کا تبصرہ بھی بہت اچھا لگا، میری دعا ہے اللہ آپ کو رہائی جلد دے۔ احمد اقبال کی کہانی تو اس ماہ کی سب سے اچھی کہانی تھی۔ عبادت کاظمی کا تبصرہ بہت اچھا رہا۔ بھائی پہلے پڑھائی پھر کچھ اور، سائنس کے سبجیکٹ اتنے آسان بھی نہیں۔ ادریس خان بھائی کا تبصرہ اچھا لگا۔ عبدالغفور خان صاحب تبصرہ تو بہت اچھا کرتے ہو کبھی پشاور آئے ہو۔ آپ کو معلوم ہے خوش حال خان خٹک نے اپنی قوم کے بارے میں کیا کہا ہے؟ کراچی کے شمس الحق کا توصیفی تبصرہ بہت پسند آیا۔ فلک شیر ملک بھی مجھے اپنی طرح ایک حساس اور محبِ وطن لگا۔ تبصرہ شاندار تھا۔ آصف محمود کا بکھرا بکھرا تبصرہ بھی متاثر کر گیا۔ واہ واہ بھائی معراج محبوب عباسی کا لاجواب تبصرہ شکر کرو آپ کے تبصرے کو ادارے نے شیطان کی آنت جیسا لمبا نہیں کیا۔ چوہدری سرفراز بھی اپنے تبصرے کے ساتھ موجود تھے۔ سرفراز صاحب صرف دس فیصد شوہر کچھ نہ کچھ حد تک مظلوم ہوتے ہیں۔ ...قیس خان، اپنے تیر مارنے والے انداز میں حاضر تھیں۔ تبصرہ شاندار تھا۔ اب پھر غائب نہ ہو جانا۔ طاہر چوہدری چیں بہ نکتہ چینی کا نام بھی

بدلے گا نہیں یہ کوئی F.BOOK کا فضول گروپ نہیں ہے۔ سکندر علیم کی تحریر ڈھونگ اچھی کہانی ہے۔ کاش ہمارے ملک کی پولیس بھی ایسی ہو جائے۔ میرے فیورٹ رائٹر کاشف زبیر ایک بار پھر ایک اچھی تحریر بگرا برائے تاوان لے کر حاضر تھے۔ ایک بہت اہم موضوع جانوروں کے گوشت پر تھا۔ آج کل ملک کے بہت سے حصوں خاص کر پنجاب میں گدھے، کتے اور سؤر کا گوشت بیچا جا رہا ہے۔ کیا یہ لوگ مسلمان نہیں ہیں۔ ایسی تحریر پر کاشف زبیر کو بہت بہت مبارک باد ویلڈن کاشی۔ محبتوں کے امین طاہر جاوید مغل اپنی تحریر انگارے کے ساتھ موجود تھے۔ مغلِ اعظم آخر شاہ زیب کو گاؤں کے ماحول میں لے ہی گئے۔ آخر شاہ زیب کو وہ لڑکی مل ہی گئی۔ انگارے بہت تیزی سے جاری وساری ہے۔ آوارہ گرد کی یہ قسط بہت زبردست رہی۔ ایکشن تو کم رہا لیکن شہزی کو دکھ اور سکھ کے درمیان خوب دوڑایا۔ عارفہ واقعی ایک حرافہ نکلی جو بے چاری عابدہ اپنی محسن کو پھنسا دیا اور اب دولت کے لالچ میں بوڑھے سسر کو اغوا کرا دیا۔ مریم کے خان اس بار ایک بہت حساس موضوع پر یوم حساب لے کر حاضر تھیں۔ سرورق کی پہلی کہانی سرور اکرام کی تحریر بڑا کام اس منافقت بھرے معاشرے کی عکاس کہانی جہاں سرکار جیسے لوگ آٹے میں نمک کے برابر۔"

جتوئی سے چوہدری محمد سرفراز کی گفتگو "ماہ اکتوبر کا جاسوسی خلافِ توقع جلد مل گیا۔ سرورق پر حسینہ اپنی تمام تر تابناکی کے ساتھ براجمان تھی۔ اس کی رنگت جیسے برف کا میدان ہو، جس کی سفیدی میں شفق کا سنہرا رنگ جھلملا رہا ہو، گردن کی نزاکت کے ساتھ براؤن براؤن سی آنکھیں طلسماتی اثر پیدا کر رہی تھیں۔ بیک گراؤنڈ میں ریوالور ٹائٹل کو مزید رنگین و سنگین بنا رہا تھا۔ عذرا ہاشمی صاحبہ! میں آپ سے اختلاف کرنے کی جسارت کروں گا۔ کوئی بھی تعلق ہو، دوستی ہو یا رشتے داری، ہلکی پھلکی نوک جھوک ہی اس رشتے کا حسن ہے اور میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ان جونکوں کو چینی نکتہ چینی سے چپٹے رہنا چاہیے۔ باقی آپ کا تبصرہ لکھنے کا انداز اچھا لگا۔ ڈاکٹر مسٹر عمران فاروق! مغل صاحب کو اتنا زیادہ پڑھا ہے کہ ان کا اندازِ تحریر اب ازبر ہو چکا ہے۔ لہٰذا ایسے اندازے عموماً درست ہی نکلتے ہیں۔ محمد صفدر معاویہ صاحب! آنکھوں سے وفا اور بے وفائی کے اندازے ہمیشہ غلط ہی ثابت ہوتے ہیں۔ یہ چیز تو انسانی سرشت میں پائی جاتی ہے اور عادات واطوار سے جھلکتی ہے۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کی داستان امیر حمزہ بھی خوب رہی۔ اتنا تفصیلی تبصرہ لکھنے کے لیے جو ٹائم چاہیے وہ کسی خاتون کے پاس ہی ہو سکتا ہے اور بات کچھ یوں ہے کہ جو مزہ مفت کی کتاب پڑھنے کا ہے، وہ اپنے پیسے لگا کر پڑھنے کا نہیں ہے۔ آزمائش شرط ہے۔ رہی بات چھیڑ چھاڑ اور مذاق کی، تو اس میں برا منانے والی کیا بات ہے۔ اتنی مصروف زندگی میں کسی سے نفرت کرنے کا ٹائم کس کم بخت کے پاس ہے۔ طاہر چوہدری صاحب! 60 روپے کا پرچہ خریدنے کے بعد رائے دیتے ہوئے اخلاقیات کو مدِنظر رکھنا بھی ضروری ہے۔ تنقید برائے تنقید کے بجائے تنقید برائے اصلاح ہونی چاہیے۔ باقی آپ کا شکوہ کرنے کا انداز اور تبصرہ لکھنے کا انداز دل کو بہت بھایا۔ مسلسل حاضری لگواتے رہا کریں۔ محفل کے اختتام پر احسان سحر نے بھی خوب رنگ جمایا۔ اس کے علاوہ جن ساتھیوں نے تبصرہ پسند کیا، ان سب کا بہت بہت شکریہ۔ ایبولا جیسی تحاریر دماغ پر انمٹ نقوش چھوڑ جاتی ہیں۔ ایبولا میں وہ سب کچھ موجود تھا جو ایسی تحاریر کا خاصہ ہوتا ہے۔ ایکشن، سسپنس، تھرل اور سب سے بڑھ کر رومانس کا تڑکا۔ ان سب نے مل کر تحریر کو لاجواب بنا دیا۔ امید ہے آئندہ بھی ابتدائی صفحات پر اس سے بھی بڑھ کر پڑھنے کو ملتا رہے گا۔ (انشاء اللہ) مغل صاحب کی انگارے میں عاشرہ اینڈ کمپنی کے واقعات جس قدر تیزی سے منظرِ عام پر آئے، اس قدر تیزی سے ہی اپنے منطقی انجام کو جا پہنچے اور اس سارے منظرنامہ میں شاہ زیب کا ہمدردانہ اور دوسروں کی بغیر لالچ کے مدد کرنے والا کردار کھل کر سامنے آیا۔ غالباً مغل صاحب نے ان واقعات کے ذریعے شاہ زیب کے کردار کی خصوصیات کو پیش کیا تاکہ بعد میں سامنے آنے والے منظرنامہ میں کچھ بھی غیر فطری نہ لگے اور اب جبکہ ایک نئی سچویشن جس کا تعلق شاہ زیب کے رومانوی ماضی سے ہے سامنے آ رہی ہے۔ دیکھتے ہیں یہ معاملات کس انداز میں آگے بڑھتے ہیں۔ پہلا رنگ کچھ خاص رنگ نہ جما سکا۔ مریم کے خان نے مار دھاڑ کے مناظر خوب صورتی سے دکھائے، ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی ایکشن مووی چل رہی ہو۔ تحریر کی جان صرف اور صرف جاندار منظر نگاری تھی۔ باقی اینڈ پر بھی تھوڑا سا ٹوئسٹ لا کر کہانی میں جان ڈالی گئی اور اوور آل اچھی تحریر رہی۔ عرصہ دراز بعد کاشف زبیر جلیل سیریز کے ساتھ حاضر ہوئے اور سیدھی سی بات ہے وہ مزہ نہیں آیا جو پہلے آتا تھا۔ جیسے جیسے جلیل سدھرتا جا رہا ہے ویسے ویسے مزاح کا عنصر کم ہوتا جا رہا ہے۔ منظر امام نے اکیلے دکیلے میں ایک پرانی کہاوت کا جدید ورژن دکھایا۔ وقت گزارنے کے لیے اچھی تحریر ثابت ہوئی۔ الوداعی تحفہ کا انجام وہی ہوا جو عموماً ایسی کہانیوں میں ہوتا ہے۔ دولت کا لالچ انسان کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ پرویز بلگرامی نے اپنی تحریر لالچ میں یہی سب کچھ دکھایا۔"

پتوکی سے الیف ایم کی حاضری "اس بار جاسوسی 6 تاریخ کو ہاتھ میں آیا مگر ہم نے دور سے ہی دیکھنے پر اکتفا کر لیا اور اگلے پندرہ دنوں تک یہی کرنا ہے۔ ٹائٹل دیکھنے میں اچھا لگا۔ لڑکی مدہوشی کے عالم میں اپنے عشق میں تپیا... تپیا... کرتے لڑکوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس طرح کا دیکھنا ہی اس کی خوب صورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔ چینی نکتہ چینی میں نئے نام نظر آتے ہیں۔ پرانے تبصرہ نگار تو کہیں غائب ہی ہو گئے ہیں۔ میں نے جاسوسی ایک بار چھوڑ کر پھر دوبارہ پڑھنا شروع کیا ہے، چھوڑنے کی وجہ طاہر صاحب کا للکار کے بعد غائب ہو جانا۔ اب جبکہ طاہر جاوید صاحب آئے ہیں تو ایک بار پھر سے جاسوسی سے تعلق جوڑ لیا ہے اور جب تک طاہر صاحب چاہیں گے یہ تعلق جڑا رہے گا۔ ان کے بغیر جاسوسی ایک دم سے پھیکا پڑ جاتا ہے۔ انگارے ہمیشہ کی طرح طاہر صاحب اپنے خوب صورت الفاظ کی صورت ہمیں جکڑنے کو بے تاب ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں تو جانے کس دیس کا قلم ہے جس میں اتنی بے ساختگی، روانی اور رومانیت پائی جاتی ہے جو ہمیں کسی اور کے قلم میں نظر نہیں آتی۔ کاشف زبیر صاحب بھی اچھا لکھتے ہیں۔ انکل! پروین زبیر سے زیادہ لکھوایا کریں، ان کی اسٹوریز بڑی زبردست ہوتی ہیں۔"

ان قارئین کے اسمائے گرامی جن کے محبت نامے شاملِ اشاعت نہ ہو سکے۔

محمد اقبال، کراچی۔ حنا کاشف، کوٹری۔ مظہر سلیم، بہاولپور۔ عنبرین خالد، حیدرآباد۔ آصف محمود، گوجرانوالہ۔ ہما انصار، کراچی۔ عمران ملک، ٹنڈو آدم۔

بلیک وارنٹ

سلیم فاروقی

ایوانِ اقتدار وسیاست میں کھیلے جانے والا ہولناک کھیل ہر کھلاڑی اپنی بازی جیت لینا چاہتا تھا...

بے ہوشی سے ہوش کی دنیا میں اس کی آنکھ کھلی تو اس کی دنیا ہی بدل چکی تھی... اسے نہیں معلوم تھا، وہ کون ہے... اس کا نام کیا ہے... اس کی شخصیت کیسی ہے... وہ اپنے چہرے کے پیچھے موجود شناخت کو کھو چکا تھا... وہ کمرا... وہ عمارت... وہ ماحول... در و دیوار... وہ شہر... غرض ہر شے بدل چکی تھی... نہیں بدلا تو اس کا ماضی... جس کی یاد دھند میں لپٹے خواب کے مانند اس کے ذہن کے پردے پر پرچھائیوں کی صورت ثبت تھا... وہ ماضی کو کھوجنے کی کوشش میں سرگرداں تھا... اور اس کا رشتہ حال سے جوڑنا چاہتا تھا... کل تک وہ طاقت و اقتدار کے کھیل کا سب سے بڑا کھلاڑی تھا... مگر اب وہ اجنبی شہر میں اجنبیوں کے درمیان مایوس و دل شکستہ تھا... بے سائباں و بے آسرا ہونے کے باوجود کچھ نظریں اس کے تعاقب میں تھیں... وہ اپنوں سے دور تنہا ذہنی و جسمانی کشمکش میں مبتلا دشمنوں سے صف آرا تھا...

ماضی وحال کے درمیان معلق ایک شخص کی زندگی کے گم گشتہ اوراق...

اس نے آنکھیں کھولیں تو ہر چیز دھندلی دھندلی سی تھی۔ اسے کچھ صاف نظر نہیں آرہا تھا۔ سر میں بھی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں اور دھمک ہو رہی تھی۔ اس نے پھر آنکھیں موند لیں۔

اسے اپنے اردگرد کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ”دیکھو مسٹر! میرا خیال ہے کہ بیڈ نمبر فائیو کے مریض کو ہوش آرہا ہے۔“ یہ واضح طور پر کسی ڈاکٹر کی آواز تھی۔

”ڈاکٹر صاحب! میرے بیٹے کا کیا حال ہے؟“
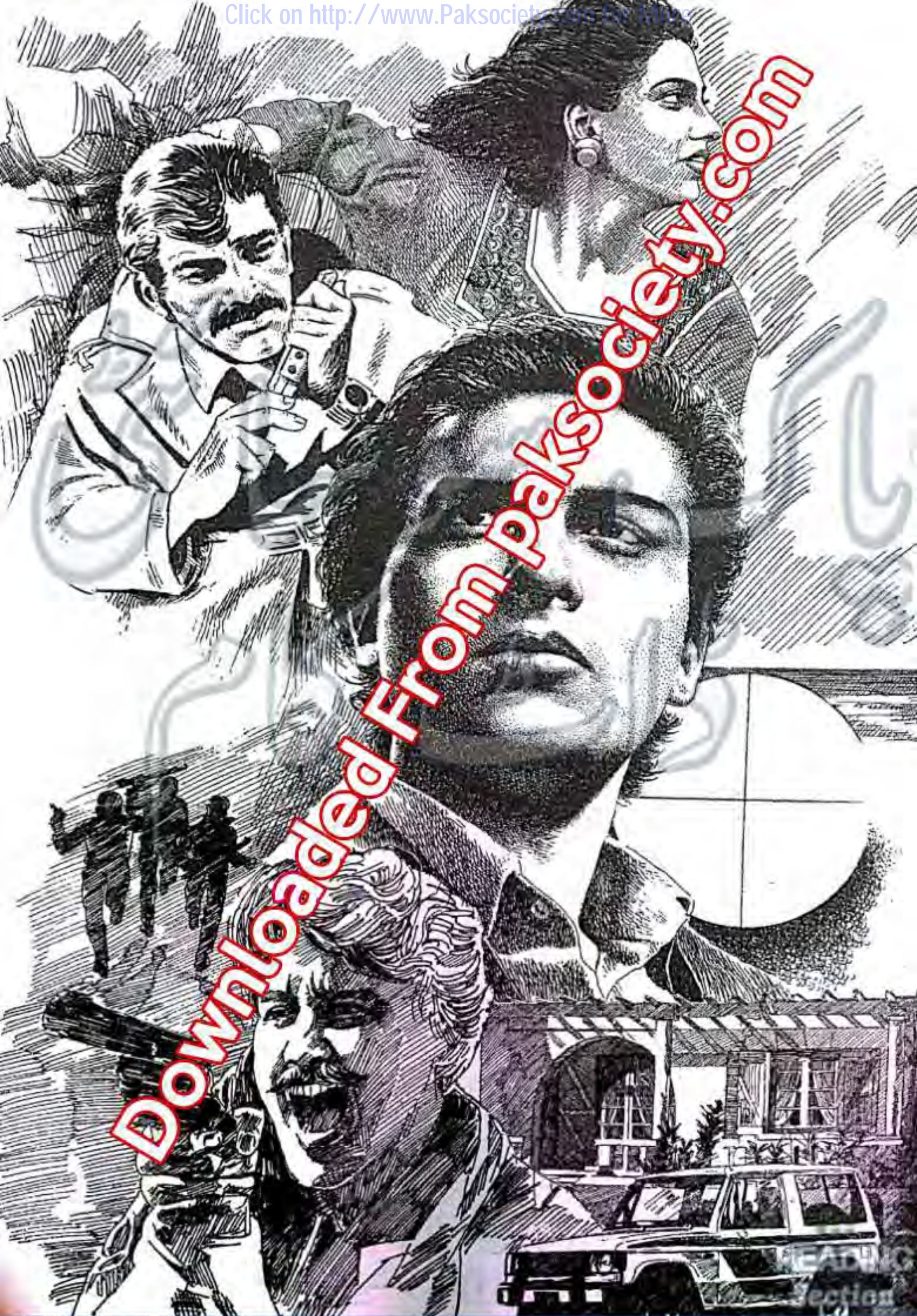
ایک خوشامد بھری آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ آواز کسی عورت کی تھی۔
''اماں جی!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ کے بیٹے کو ابھی تک ہوش نہیں آیا۔ اگر آئندہ بارہ گھنٹے میں اسے ہوش نہ آیا تو...''
''ڈاکٹر صاحب! ایسا نہیں ہوگا۔'' عورت کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ ''اسے کچھ نہیں ہوگا۔''
''اماں جی!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ پلیز باہر جا کر بیٹھیں۔ ابھی بڑے ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔''
اس کے ساتھ ہی قدموں کی آوازیں سنائی دیں پھر گہرا سناٹا چھا گیا۔
اس حالت میں نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ دس منٹ، بیس منٹ یا ایک گھنٹا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے لیٹا رہا۔ خاصی دیر بعد پھر وہاں کچھ ہلچل کے آثار ظاہر ہوئے۔ اس نے تجسس سے مجبور ہو کر پھر آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ اسے اتنی تکلیف نہیں ہوئی۔ سر میں اب بھی دھمک کے ساتھ ٹیسیں اٹھ رہی تھیں لیکن منظر واضح تھا۔
اس کے سامنے خوب صورت سی ایک نرس کھڑی تھی۔ نرس نے اسے آنکھیں کھولتے دیکھا تو بلند آواز میں بولی۔ ''ڈاکٹر! بیڈ نمبر فائیو کو ہوش آگیا۔''
فوراً ہی سفید کوٹ میں ملبوس باوقار سا ایک شخص اس کی طرف بڑھا اور جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے نرمی سے کہا۔ ''سسٹر! پیشنٹ کا بلڈ پریشر چیک کرو۔''
''او کے ڈاکٹر۔'' نرس نے کہا اور اسے اپنے بازو پر بلڈ پریشر بیلٹ بندھنے کا احساس ہوا۔
آہستہ آہستہ اس نے پوری آنکھیں کھول دیں اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ 'اس کے سامنے اور دائیں طرف مریض تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ میں کسی اسپتال کے وارڈ میں ہوں۔' اس نے سوچا۔
اسی وقت ڈاکٹر اس کی طرف بڑھا اور نرم لہجے میں بولا۔ ''اب کیسا محسوس کر رہے ہیں آپ؟''
''میرے سر میں شدید تکلیف ہے ڈاکٹر۔'' اس نے کہا تو اسے ایسا لگا جیسے اس کی آواز کسی کنویں سے آئی ہو۔
''اپنا نام پتا بتایئے تاکہ آپ کے عزیزوں کو انفارم کیا جا سکے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ڈاکٹر کے اشارے پر نرس پیڈ اور بال پوائنٹ لے کر اس کے نزدیک آگئی کہ اس کا بتایا ہوا پتا لکھ سکے۔

وہ خاموشی سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتا رہا۔
''آپ کا نام کیا ہے؟'' اس مرتبہ بھی ڈاکٹر کے لہجے میں نرمی تھی۔
''میرا... نام... نام...'' اس نے ذہن پر زور دیا تو ایک مرتبہ پھر اس کے سر میں شدید ٹیسیں اٹھیں اور اس نے کراہ کر آنکھیں موند لیں۔
''سسٹر! پیشنٹ کو انجکشن دے دو اور اسے بالکل ڈسٹرب نہیں کرنا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔
دوسرے ہی لمحے اسے اپنے بازو میں سوئی چبھنے کا احساس ہوا اور اس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔
اسے دوبارہ ہوش آیا تو وارڈ میں گہری خاموشی تھی۔ شاید رات کا وقت تھا۔ اب اس کے سر میں تکلیف بھی کم تھی۔
اس نے آنکھیں پوری طرح کھول کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ اس کے سامنے اور دائیں بائیں کئی بیڈ تھے۔ وہ غالباً کسی اسپتال کا جنرل وارڈ تھا۔ اچانک اسے شدید پیاس کا احساس ہوا۔ سر کی تکلیف نے اس کی دوسری تکلیفوں کو وقتی طور پر مٹا دیا تھا۔ اس کے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔
اس نے حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نہ نکل سکی۔ اس نے دوسری کوشش کی تو وہ کامیاب رہا اور حلق سے عجیب طرح کی آواز نکلی... پا... نی...'' اسے اپنی آواز خود بھی اجنبی محسوس ہوئی۔ اس نے ایک مرتبہ پھر جسم کا زور لگا کر آواز نکالی۔ ''پا... نی...''
اس مرتبہ اس کی آواز ڈیوٹی نرس تک پہنچ گئی اور وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور اس کے بیڈ کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر اسے پانی پلایا۔ پانی کا وہ گھونٹ صرف اس کا حلق ہی تر کر سکا۔
اس نے مزید پانی مانگا لیکن نرس نے خوش دلی سے انکار کر دیا۔ ''ابھی آپ کو صرف اتنا ہی پانی دیا جا سکتا ہے۔''
''او کے سسٹر۔'' اس نے نقاہت زدہ آواز میں کہا لیکن اب اسے بولتے ہوئے دقت نہیں ہو رہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد وہ پھر غنودگی میں چلا گیا۔

☆☆☆

اسے آج یہاں دس دن ہوگئے تھے۔ اسے خود تو اس کا اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ یہ بات اسے ڈاکٹر اور نرسوں نے بتائی تھی لیکن بہت کوشش کے باوجود اسے اپنا نام یاد نہیں

آسکا تھا۔ اسے ڈاکٹروں اور نرسوں کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ وہ مری سے راولپنڈی آنے والی ویگن میں سوار تھا جو کسی کھائی میں جا گری تھی۔ ویگن میں سوار اٹھارہ میں سے صرف دو مسافر زندہ بچے تھے۔ ان دو میں ایک وہ بھی تھا۔ دوسرا مسافر شدید زخمی تھا۔ اس کے گھر والے پہنچ چکے تھے۔

''میں کون ہوں؟'' وہ پھر خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''میں اس ویگن میں کہاں جارہا تھا؟ میرا گھر کہاں ہے؟''

یہ سوچ سوچ کے اس کا دماغ شل ہو چکا تھا۔ ڈاکٹروں کے مطابق اس کے سر میں چوٹ آئی تھی جس سے اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ اور ایک پاؤں میں ہلکا سا فریکچر تھا اور وہ سارا دن الجھتا رہتا تھا کہ میں ہوں کون؟ میری شناخت کیا ہے، میرا نام کیا ہے؟

☆☆☆

''آج آپ کے بازو اور پیر کا پلاسٹر کاٹ دیا گیا ہے۔ آپ دو چار دن میں بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اب آپ اسپتال کے لان میں چہل قدمی کر سکتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے اس سے کہا۔

''تھینک یو ڈاکٹر۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ویسے میں یہاں سے کب تک ریلیز ہو جاؤں گا؟''

''زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے بعد۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''لیکن... میں جاؤں گا کہاں؟ میرا گھر... میرا نام...'' وہ پھر الجھ گیا۔

اسے اسپتال کے لان میں ٹہلتے اور واک کرتے ہوئے دوسرا دن تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چل رہا تھا۔ اسپتال کا ایک وارڈ بوائے اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

اچانک کسی نے پکارا۔ ''خاور!''

وہ آواز پر دھیان دیے بغیر یونہی چلتا رہا۔

پھر ایک دراز قد اور ورزشی جسم کا نوجوان اس کے سامنے آگیا اور بولا۔ ''خاور! میں اتنی دیر سے تمہیں آوازیں دے رہا ہوں، تم سن ہی نہیں رہے ہو؟ خیریت تو ہے، یہاں کیسے آئے ہو؟''

اس نے نوجوان کو ایک نظر دیکھا، پھر الجھ کر بولا۔ ''معاف کیجیے گا، میں آپ کو پہچانا نہیں۔''

''کیا تو نے مجھے نہیں پہچانا؟'' نوجوان نے حیرت سے کہا۔ ''میں ساجد ہوں، ساجد۔''

وہ پھر الجھ کر بولا۔ ''کون ساجد؟''

''آپ انہیں جانتے ہیں؟'' وارڈ بوائے نے کہا اور اپنے مریض کو وھیل چیئر پر بٹھا کر اندر کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ وھیل چیئر پر بیٹھ کر اب یہ سوچ رہا تھا کہ میں خاور ہوں؟ مجھے یاد کیوں نہیں آرہا ہے کہ میں خاور ہوں؟

''خاور! تجھے ہوا کیا ہے؟'' ساجد نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''ساری تفصیلات آپ کو ڈاکٹر صاحب بتا دیں گے۔'' وارڈ بوائے نے کہا۔

☆☆☆

''حادثے میں ان کا ذہن متاثر ہوا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ اپنی یادداشت کھو چکے ہیں ساجد صاحب! آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''جی ہاں، میں انہیں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ہمارا بچپن ایک ہی گاؤں میں، ایک ہی اسکول اور کالج میں گزرا ہے۔''

''میں انہیں ڈسچارج کر رہا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ انہیں ماضی کی باتیں یاد دلائیں، گاؤں کی باتیں، اسکول کی باتیں۔ اس سے ان کی یادداشت واپس آسکتی ہے۔'' اچانک ڈاکٹر نے کہا۔ ''گاؤں میں ان کے گھر والے تو ہوں گے، ان کے والدین، بہن بھائی وغیرہ؟''

''ان کا اس دنیا میں اب کوئی نہیں ہے۔ پانچ سال پہلے اس کے والد کا انتقال ہو گیا تھا۔ اس وقت یہ ملک سے باہر تھا۔ ابھی دو مہینے پہلے اس کی والدہ بھی انتقال کر گئیں، بہن بھائی کوئی ہے نہیں۔''

''کوئی رشتے دار، عزیز؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''گاؤں میں اس کا صرف ایک چاچا ہے جس نے اس کے والد کے مرنے کے فوراً بعد ہی اس کی زمینوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ بھلا کیوں چاہے گا کہ اس کی یادداشت واپس آئے، وہ تو یوں بھی اس کی جان کا دشمن ہے۔ میں خاور کو اپنے ساتھ لے جاتا ہوں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ان کی کچھ دوائیں ابھی مزید ایک مہینا چلیں گی۔ وہ آپ انہیں پابندی سے دیتے رہیے گا اور پندرہ دن بعد انہیں چیک اپ کے لیے پھر یہاں لے آیئے گا۔''

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب۔'' ساجد نے کہا۔

اس دوران میں خاور یہ تمام گفتگو یوں سن رہا تھا جیسے وہ کسی اور کے بارے میں ہو۔

ساجد، خاور کو لے کر اسپتال سے باہر نکلا اور ایک کرولا کی طرف بڑھا، گاڑی کا دروازہ کھول کر اس نے

خاور سے کہا۔ ”چل بیٹھ یار۔“

خاور کسی روبوٹ کی طرح پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ساجد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو خاور نے کہا۔

”سوری دوست! میری وجہ سے تمہیں پریشانی ہو رہی ہے لیکن یقین جانو، مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔“

”تجھے اپنا گاؤں یاد ہے خاور؟“ ساجد نے کہا۔

”میں نے آپ کو بتایا نا کہ مجھے کچھ یاد نہیں۔“

”پہلے تو یہ ”آپ، جناب“ کا تکلف چھوڑ۔“ ساجد نے کہا۔ ”تو مجھ سے اس طرح بات کرتا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔“

”اچھا، اگر آپ... میرا مطلب ہے کہ تم کہتے ہو تو میں اس طرح بات نہیں کروں گا۔“ خاور نے کسی بچے کی طرح کہا۔

”گڈ!“ ساجد خوش ہو کر بولا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔“

یہ کہتے ہوئے اس کا دھیان خاور کی طرف تھا۔ اچانک اس کے سامنے ایک لینڈ کروزر آگئی یا ممکن ہے وہ گاڑی پہلے سے روڈ پر ہو اور اس نے اچانک بریک لگائے ہوں۔ روکتے روکتے بھی ساجد کی کرولا، لینڈ کروزر کے پچھلے حصے سے ٹکرا گئی۔ ہلکا سا دھکا سا ہوا، پھر شیشہ ٹوٹنے اور کرچیاں بکھرنے کی آواز سنائی دی۔

خاور کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا، پھر اس کا ذہن سادہ سلیٹ کی طرح ہو گیا۔

اس دوران میں ساجد گاڑی سے نیچے اتر کر گاڑی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی لینڈ کروزر میں سے دو لمبے تڑنگے افراد اترے۔ ان دونوں نے جینز اور ٹی شرٹس پہن رکھی تھیں۔ بڑے بڑے بال تھے۔ ان میں سے ایک کے چہرے پر خوف ناک مونچھیں بھی تھیں۔

”ڈرائیونگ نہیں آتی تو گاڑی لے کر روڈ پر کیوں نکلتے ہو؟“ مونچھوں والا غرا کر بولا۔

”سوری... وہ دراصل... آپ نے اتنا اچانک بریک لگایا کہ...“

”تو کیا تیری گاڑی میں بریک نہیں ہے؟“ وہ انتہائی حقارت سے بولا۔ ”پوری گاڑی کی ایسی کی تیسی کر دی۔“

”غلطی میری ہے۔“ ساجد نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”اس لیے آپ کا نقصان بھی میں ہی پورا کروں گا۔ آپ سے زیادہ نقصان تو میری گاڑی کا ہوا ہے۔“

”زیادہ باتیں مت بنا۔“ دوسرا آدمی غرا کر بولا۔ ”خاموشی سے بیس ہزار روپے دے اور دفع ہو۔“

”کس بات کے بیس ہزار روپے؟“ ساجد کو بھی غصہ آگیا۔ ”آپ میرے ساتھ کسی گیراج میں چلیں۔ وہاں جتنے بھی اخراجات ہوں گے، میں ادا کروں گا۔ میں آپ کو کیش کیوں دوں؟“

”تو شاید مجھے جانتا نہیں ہے۔“ مونچھوں والا غرا کر بولا۔ ”سیدھی طرح پیسے نکال۔“ ”میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تیرے ساتھ گیراجوں کے چکر کاٹتا رہوں۔“

”اگر میں آپ کو جانتا بھی ہوتا تو بیس ہزار آپ کے حوالے نہ کرتا۔“ ساجد نے بھنا کر کہا۔

”اس کا مطلب ہے تو پیسے نہیں دے گا؟“ مونچھوں والے نے کہا اور اچانک جیب سے ماؤزر نکال لیا۔

خاور کے ذہن میں پھر جھماکا سا ہوا۔ اس کے ذہن کی اسکرین پر کچھ چہرے ظاہر ہوئے جو اسے تصویر کے نیگیٹو کی طرح محسوس ہو رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے یہ منظر غائب ہو گیا۔ خاور غیر شعوری طور پر گاڑی سے باہر نکلا اور بولا۔ ”اپنے اس کھلونے کو جیب میں رکھ اور انسانوں کی طرح بات کر۔“

”اچھا۔“ مونچھوں والے نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تو پھر پہلے تیرا بندوبست کر دوں۔“ یہ کہہ کر اس نے ماؤزر کی نال خاور کی طرف سیدھی کی۔

خاور بجلی کی سی تیزی سے جھپٹا اور مونچھوں والے کے ہاتھ پر زوردار لات رسید کر دی۔ پھر اس نے برق رفتاری سے گھوم کر دائرے کی شکل میں دوسری لات دوسرے آدمی کے منہ پر ماری۔ مونچھوں والے کا ماؤزر اچھل کر دور جا گرا، دوسرا آدمی خاور کی زبردست لات کھا کر زمین پر گر گیا۔ مونچھوں والا پھر خاور کی طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن خاور نے اسے بڑھنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کی طرف جھپٹ کر اس کے چہرے پر اتنا زوردار گھونسا مارا کہ اس کے کئی دانت ٹوٹ گئے۔ دوسرا گھونسا اس نے مونچھوں والے کے سینے پر مارا، وہ کراہ کر زمین پر گر پڑا۔ خاور اس کے سینے پر بیٹھ گیا اور اس کے بال مضبوطی سے پکڑ لیے۔ دوسرا ہاتھ خاور نے اس کی ٹھوڑی پر رکھا اور اسے جھٹکا دینے ہی والا تھا کہ ساجد چیخا۔ ”خاور نہیں! چھوڑ دے اسے۔“

ساجد کی آواز پر خاور جیسے ہوش میں آگیا۔ اس نے مونچھوں والے کو چھوڑ دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ خاور نے کہا۔ ”ورنہ تم دونوں کو مار کے یہیں پھینک دوں گا۔“

وہ چلتی ہوئی سڑک تھی۔ بہت سی گاڑیاں ان کے قریب سے گزر گئیں۔ کسی نے بھی رکنے کی کوشش نہیں کی۔ کچھ لوگ رک بھی گئے تو خاور کے تیور دیکھ کر پیچھے ہٹ گئے۔

خاور نے ڈپٹ کر کہا۔ ''کیا بات ہے، یہاں کوئی تماشا ہو رہا ہے، جائیں اپنا کام کریں۔''

لوگ سہم کر بڑبڑاتے ہوئے پیچھے ہٹ گئے۔ ایک صاحب بولے۔ ''غلطی بھی کرتے ہیں، پھر بدمعاشی بھی کرتے ہیں۔''

''ہوں گے کسی جاگیردار یا ایم این اے، ایم پی اے کے آدمی۔'' دوسرا آدمی بولا۔

''نہیں صاحب! لینڈ کروزر والے نے میرے سامنے گن نکالی تھی۔''

اس دوران میں لینڈ کروزر والے اٹھ کر گاڑی میں سوار ہوئے اور وہاں سے رفو چکر ہو گئے۔

ساجد کی گاڑی کی ہیڈ لائٹ اور آگے کا بمپر ٹوٹ گیا تھا۔ ریڈی ایٹر کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ اس نے خاور سے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

''اب تم کہاں جا رہے ہو؟'' خاور نے پوچھا۔

''میں اپنے گھر جا رہا ہوں، لاہور۔'' ساجد نے ونڈ اسکرین پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے ایک دوست کی عیادت کرنے راولپنڈی آیا تھا۔ اس سے مل کر جا ہی رہا تھا کہ تجھ پر نظر پڑ گئی۔'' ساجد نے کہا پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''ویسے تو نے جی خوش کر دیا یار! مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تو نے مارشل آرٹ کی ٹریننگ بھی لے لی ہے۔''

''مارشل آرٹ!'' خاور کے ذہن میں پھر جھماکا ہوا، اس کے ذہن .... پر پھر کچھ ہیولے ابھرے اور غائب ہو گئے۔ اس نے پھر دہرایا۔ ''مارشل آرٹ! میں نے یہ لفظ کہاں اور کس سے سنا ہے؟''

''ابھی مجھ سے سنا ہے۔'' ساجد مسکرا کر بولا۔ ''یا پھر فلموں میں سنا ہوگا بلکہ دیکھا ہوگا۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''تو تو خود مارشل آرٹ کا ماہر ہے۔''

''میں... مارشل آرٹ کا ماہر؟'' خاور الجھ کر بولا۔

''یار! تو یادداشت کھونے کے بعد سب کچھ بھول گیا؟'' ساجد نے کہا۔ ''ڈرائیونگ آتی ہے؟''

''ہاں، مجھے ڈرائیونگ تو آتی ہے۔'' خاور نے الجھ کر کہا۔

''پہلے میں گاڑی کسی ورک شاپ میں دوں گا، پھر ہم کھانا کھائیں گے، اس وقت تک میری گاڑی بھی بن جائے گی، پھر ہم لاہور چلیں گے۔''

''لاہور کیا یہاں سے بہت دور ہے؟'' خاور نے پوچھا۔

''تجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ لاہور کہاں ہے؟'' ساجد نے حیرت سے کہا۔

''یار! مجھے اپنا نام معلوم نہیں ہے۔ تم لاہور کی بات کررہے ہو۔'' خاور نے سرد لہجے میں کہا۔ ''لاہور۔'' اس کے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا۔ ''ہاں، لاہور... میں جانتا ہوں لاہور...'' آہستہ آہستہ اس کے ذہن سے دھند چھٹتی جارہی تھی۔

ساجد نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا کیونکہ گاڑی ایک گیراج تک پہنچ گئی تھی۔ گاڑی گیراج میں چھوڑ کر وہ دونوں پیدل ہی وہاں سے کچھ فاصلے پر واقع ریسٹورنٹ میں گئے اور ساجد نے کھانا منگوالیا۔

کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد ساجد نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکالا، خاور بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ساجد نے سگریٹ ہونٹوں میں دبا کر لائٹر جلایا تو شعلہ دیکھ کر خاور کے ذہن میں پھر جھماکا ہوا۔ اس مرتبہ اسے کسی شخص کی واضح شکل نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں بھی لائٹر تھا اور وہ سگریٹ سلگانے کے بعد بولا۔ ''مشن کے دوران میں کوئی سگریٹ نہیں پیے گا۔''

وہ منظر اچانک غائب ہوگیا اور خاور سوچتا رہا کہ وہ سگریٹ پینے والا شخص کون تھا؟

''سگریٹ پیو گے؟'' ساجد نے خاور سے پوچھا۔

خاور نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے سگریٹ کا ایک ہی کش لگایا تھا کہ اس کے ذہن میں پھر تغیر رونما ہونے لگا۔ اس مرتبہ بھی نظر آنے والوں کی شکلیں واضح نہیں تھیں۔

وہ لوگ دوبارہ روانہ ہونے لگے تو ساجد نے کہا۔

''اب ڈرائیونگ تم کرو۔''

خاور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے جھٹکے سے آگے بڑھادی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی گویا خاور کے جسم میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ گاڑی کو بہت مہارت اور تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔ اس کی نظر سیٹ بیلٹ پر پڑی تو غیر شعوری طور پر اس نے سیٹ بیلٹ باندھ لی اور گاڑی کو جیٹ فائٹر کی طرح دوڑانے لگا۔

موٹروے پر چڑھنے کے بعد اس نے گاڑی کی رفتار کم کردی اور ساجد سے کہا۔ ''تم بھی سیٹ بیلٹ باندھ لو۔''

ساجد نے سیٹ بیلٹ باندھتے ہوئے کہا۔ ''او بھائی! یہ گاڑی ہے کوئی ہوائی جہاز نہیں ہے پھر موٹروے پر اسپیڈ کا خاص خیال رکھنا پڑتا ہے۔''

''ہوائی جہاز؟'' خاور کے ذہن میں پھر جھماکا ہوا۔ اس مرتبہ اس نے خود کو ہوائی جہاز کی سیٹ پر بیٹھے دیکھا۔ وہ پھر حال میں واپس آگیا اور بڑبڑایا۔ ''میں ہوائی جہاز بھی اڑا سکتا ہوں؟''

''تمہاری ڈرائیونگ سے تو یہی لگ رہا ہے۔'' ساجد نے کہا۔

حیرت انگیز طور پر خاور نے موٹروے پر رفتار کا دھیان رکھا تھا اس لیے وہ لوگ بغیر کسی چالان کے لاہور پہنچ گئے۔

لاہور پہنچ کر ساجد پھر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا کیونکہ خاور کو راستوں کا علم نہیں تھا۔

سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔ ساجد گلبرگ کے علاقے میں پہنچا تو چھوٹا سا ایک بنگلا دیکھ کر خاور کے ذہن میں پھر جھماکا ہوا اور وہ چیخا۔ ''گاڑی روکو۔''

ساجد نے گھبرا کر بریک لگادیے۔ بریک چرچرائے اور گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔ اس نے گھبرا کر خاور سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''گاڑی ریورس کرو۔'' خاور نے کہا۔

اس علاقے میں اتنا ٹریفک نہیں تھا۔ اِکا دُکا گاڑیاں گزر رہی تھیں اس لیے ساجد کو گاڑی ریورس کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ خاور نے اس بنگلے کے سامنے گاڑی رکوائی جسے دیکھ کر وہ چونکا تھا۔ وہ گاڑی سے اترا اور بنگلے کا گیٹ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ بنگلے کے آگے چھوٹا سا لان تھا، پھر پورچ تھا۔ لان کی گھاس بے ترتیبی سے بڑھ گئی تھی۔ پورچ میں بھی گرد اڑ رہی تھی۔

''یہ کس کا بنگلا ہے خاور؟'' ساجد نے پوچھا۔
خاور کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھتا رہا۔ پورچ سے گزر کر وہ برآمدے میں پہنچا۔ برآمدے میں بھی خاک اُڑ رہی تھی۔ خاور نے اردگرد کا جائزہ لیا پھر کچھ سوچ کر برآمدے میں رکھے ہوئے گملوں پر نظر ڈالی اور ایک گملے کے نیچے سے چابی نکال لی۔
ساجد حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔ خاور نے لاک کھولا اور اندر داخل ہوگیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ساجد بھی بنگلے میں داخل ہوگیا۔ ڈرائنگ روم کے صوفے گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ دیواروں پر قیمتی پینٹنگز تھیں۔ خاور وہاں سے سیدھا بیڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔
بیڈ روم میں سائڈ ٹیبل پر ایک فریم میں خاور کی تصویر لگی ہوئی تھی۔ سائڈ ٹیبل پر جو دوسرا فریم تھا اس میں خوب صورت سی ایک لڑکی کی تصویر تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر ساجد بری طرح چونک اٹھا۔ وہ نینا تھی، خاور کی منگیتر۔
خاور نے بیڈ روم میں پہنچ کر فریج کھولا تو وہ کھانے پینے کی چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے پانی کی بوتل نکالی اور بیڈ پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی نظر نینا کی تصویر پر پڑی تو وہ بری طرح چونک اٹھا۔

☆☆☆

بڑی سی میز کے گرد کئی کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ میز کے سرے پر سوٹ میں ملبوس ایک شخص بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں پانچ پانچ آدمی بیٹھے تھے۔
''تم لوگوں سے اب تک ایک چھوٹا سا کام نہیں ہوا۔'' سرے پر بیٹھا ہوا سوٹ پوش غرایا۔ ''ایک آدمی کا سراغ نہیں لگا سکے؟''
''ہم نے اسے بہت تلاش کیا باس۔'' ایک شخص آہستہ سے بولا۔ ''وہ لاہور میں ہے، نہ کراچی، ایبٹ آباد میں۔''
''یہ بات تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟'' سوٹ پوش غرا کر بولا۔
''میرے آدمیوں نے لاہور، کراچی، ایبٹ آباد، مری میں اس کا ہر ٹھکانا کھنگال لیا۔ وہ کہیں بھی نہیں ہے۔''
''کیا وہ ملک سے باہر چلا گیا؟'' سوٹ پوش غرایا۔
''شام تک یہ بھی معلوم ہوجائے گا باس۔'' اس کی دائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔
''دیکھو، وہ ہمارے لیے بہت اہم اور قیمتی ہے۔ اُسے ہر قیمت پر تلاش کرنا ہے۔ اسے آخری بار کہاں دیکھا گیا تھا؟'' سوٹ پوش بولا۔
''وکرم نے اسے آخری بار مری میں دیکھا تھا۔'' ایک دوسرا آدمی بولا۔
''شٹ اپ۔'' سوٹ پوش دہاڑا۔ ''یہاں لوگوں کو ناموں سے نہیں نمبروں سے پہچانا جاتا ہے۔ کیا یہ بات تم بھول گئے؟''
''سوری باس۔'' وہ آدمی سہم کر بولا۔ ''میرا مطلب ہے کہ...''
''تمہارا مطلب ہے کہ ون ون فائیو نے اسے آخری بار مری میں دیکھا تھا؟''
''یس باس۔''
''ون ون فائیو کو بلاؤ۔'' سوٹ پوش پھر غرایا۔ ''وہ میٹنگ میں شریک کیوں نہیں ہوا؟''
''اس کی طبیعت خراب تھی باس۔'' اسی آدمی نے جواب دیا۔ ''میں اسے بلواتا ہوں۔''
تھوڑی دیر بعد ون ون فائیو یا وکرم وہاں آگیا۔ اس نے بتایا کہ میں نے آخری بار ٹو او ٹو کو مری میں دیکھا تھا۔ وہ شاید اس وقت وہاں سے جا رہا تھا کیونکہ کپڑوں کا ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔''
''معلوم کرو کہ وہ مری سے کس طرف گیا؟'' سوٹ پوش غرایا۔
''اوکے باس۔'' ون ون فائیو نے جواب دیا۔

☆☆☆

''خاور! کچھ یاد آیا؟'' ساجد نے پوچھا۔
خاور کے ہاتھ میں نینا کی تصویر تھی اور وہ بری طرح الجھا ہوا تھا۔ ''یہ لڑکی...''
''یہ نینا ہے خاور... تمہاری منگیتر اور چچا زاد۔'' ساجد نے غور سے خاور کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''نینا!'' خاور بڑبڑایا۔ اس کے ذہن میں پھر جھماکے سے ہو رہے تھے۔
وہ دونوں وہاں سے گزرے تو ان میں سے ایک اچانک بولا۔ ''گاڑی روکو، ٹو او ٹو شاید واپس آگیا ہے۔''
''ٹو او ٹو واپس آگیا ہے؟'' گاڑی ڈرائیو کرنے والے نے پوچھا۔
''ہاں، میں نے اس کے بنگلے میں ابھی روشنی دیکھی ہے۔'' پہلا آدمی بولا۔
ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے آدمی نے گاڑی ریورس کی۔ بنگلے میں واقعی روشنی ہو رہی تھی۔

''باس کو اطلاع دے دو۔'' ڈرائیور نے کہا۔
''کیا ہم دونوں اسے قابو میں نہیں کر سکتے؟'' پہلا آدمی ناگواری سے بولا۔ ''یہ دوسروں کے سامنے نمایاں ہونے کا بہترین موقع ہے۔ وہ سب ابھی تک یہی معلوم نہیں کر سکے کہ ٹواوٹو ملک میں ہے یا ملک سے باہر چلا گیا۔''
''پھر بھی سوچ لو۔'' ڈرائیور نے کہا۔ ''اس میں خطرہ بہت ہے، ٹواوٹو بہت خطرناک ہے۔''
''وہ ہم سے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔'' پہلا آدمی بولا۔ ''تمہیں اگر ڈر لگ رہا ہے تو تم واپس چلے جاؤ۔ میں اس سے اکیلا بھی نمٹ سکتا ہوں۔''
''اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔'' ڈرائیور کھسیانا ہو کر بولا۔ ''گاڑی تو کسی محفوظ جگہ پر پارک کر دیں۔''

☆☆☆

ابھی رات زیادہ نہیں گزری تھی، صرف نو بجے تھے۔ ساجد نے کہا۔ ''یار خاور! مجھے تو اب بھوک لگ رہی ہے۔ چل آج فجے کے سری پائے کھاتے ہیں۔''
''فجے کے سری پائے؟'' خاور پھر چونکا۔ اسے پھر کچھ یاد آنے لگا تھا۔
''تو کھائے گا تو تجھے یاد آجائے گا کہ سری پائے کیا ہوتے ہیں۔'' ساجد نے ہنس کر کہا۔
وہ دونوں باہر نکلے۔ خاور گیٹ کھولنے کے لیے اس طرف چلا گیا۔
وہ گیٹ کھولنے والا تھا کہ اسے کسی کی آواز سنائی دی۔
''ٹواوٹو بہت خطرناک ہے۔'' جواب میں کوئی بولا۔ ''وہ ہم سے زیادہ خطرناک نہیں ہے۔ تمہیں اگر ڈر لگ رہا ہے تو تم واپس چلے جاؤ۔ میں اس سے اکیلا نمٹ سکتا ہوں۔''
''ٹو او ٹو!'' خاور بڑبڑایا۔ اس کے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ سر میں ایسے جھماکے ہو رہے تھے جیسے فلیش لائٹ بار بار جل رہی ہو۔ اچانک اسے یاد آگیا کہ میرا نام خاور ہے اور ٹواوٹو میرا کوڈ ہے۔
ساجد گاڑی کے پاس جا کر رک گیا۔ اس نے گھوم کر خاور کو دیکھا۔ وہ گیٹ کے پاس بالکل ساکت کھڑا تھا۔ وہ تجسس میں خاور کی طرف بڑھا۔ اس وقت کسی کی آواز آئی۔
''گاڑی تو کسی محفوظ جگہ پر پارک کر دیں۔'' پھر کسی گاڑی کے انجن کی آواز آئی تھی۔ گاڑی کے ہیڈ لیمپس آف تھے ورنہ ساجد کو روشنی ضرور دکھائی دیتی۔
''کیا ہوا خاور؟'' ساجد نے اس کے نزدیک جا کر پوچھا۔
''شش!'' خاور نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا پھر سرگوشی میں بولا۔ ''ساجد! تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟''
''ہتھیار؟'' ساجد نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔
خاور کو اچانک یاد آگیا کہ جس بنگلے میں ہے، وہ ایڈووکیٹ امجد جنجوعہ کے نام ہے۔ اس نے لیا تھا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے اندر کی طرف بھاگا اور دیوار پر لگی ہوئی پورٹریٹ ہٹا دی۔ اس کے پیچھے ایک تجوری برآمد ہوئی۔ نمبروں والی اس تجوری کو خاور نے برقی سرعت سے کھول لیا۔ اس میں ایک ماؤزر، SIG کی ایک فولڈنگ رائفل، ایک جرمن یوگر اور بے شمار میگزینز کے علاوہ اس تجوری میں بہت سے نوٹ بھی تھے۔
خاور نے پھرتی سے جرمن یوگر نکال کر اس پر سائیلنسر فٹ کیا اور اس کے دو تین فاضل میگزینز اٹھا کر اسی برق رفتاری سے باہر نکل گیا۔
ریوالور، پسٹل اور رائفل کا استعمال تو ساجد کو بھی آتا تھا۔ اس کے پاس ایک ماؤزر بھی تھا لیکن یہ محض اتفاق تھا کہ اس وقت وہ اس کے اپارٹمنٹ میں تھا۔ ساجد نے سوچا یقیناً خاور خطرہ محسوس کر رہا ہے۔ اس نے بھی ایک ماؤزر سائیلنسر اور دو تین میگزینز نکال کر باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔
خاور اسے گیٹ کے دائیں جانب بیٹھا نظر آیا۔ وہ آگے بڑھا تو خاور نے اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
ان لوگوں کا تعلق ایسے علاقے سے تھا جہاں اس قسم کی صورت حال کسی بھی وقت پیش آسکتی تھی۔ ساجد بھی غیر شعوری طور پر نیچے بیٹھ گیا اور جھکا جھکا گیٹ کی بائیں جانب چلا گیا۔ وہاں بیٹھ کر اس نے ریوالور پر سائیلنسر فٹ کیا اور اسے لوڈ کر دیا۔
اس وقت کسی نے باہر سے کہا۔ ''یار! ٹواوٹو کی گاڑی بھی موجود ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ واقعی اندر موجود ہے۔''
''تم گیٹ کھولو۔'' دوسری آواز آئی۔
لکڑی کے اس گیٹ پر اوپر کی طرف کنڈا لگا ہوا تھا۔ کسی نے وہ کنڈا کھول دیا اور دو آدمی اندر آگئے۔ وہ دونوں مزید آگے بڑھے تو خاور نے اچانک ان میں سے ایک کے پیر پر فائر کر دیا۔ بے آواز گولی سنسناتی ہوئی اس کی پنڈلی میں پیوست ہوگئی۔ وہ کراہ کر گرا تو دوسرا فائر ساجد نے کیا۔ ٹھک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ گولی دوسرے آدمی کے بازو میں پیوست ہوگئی۔ دونوں کراہ کر نیچے گر پڑے۔

خاور جھپٹ کر ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''اسی طرح زمین پر پڑے رہو اور اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو ورنہ تم دونوں کی کھوپڑیاں تربوز کی طرح بکھر جائیں گی۔ تمہیں باس نے بھیجا ہے؟'' خاور غرا کر بولا۔ اس وقت تک ساجد بھی وہاں پہنچ چکا تھا۔

''نہیں۔'' ان میں سے ایک کراہ کر بولا۔ ماؤزر کی گولی نے شاید اس کی ہڈی کو بھی متاثر کیا تھا۔

''پھر تم یہاں کیوں آئے تھے؟'' خاور نے درشت لہجے میں کہا۔

''تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم میں سے کوئی بھی اگر ایک ہفتے تک غائب رہے تو اس کے بلیک وارنٹ جاری کر دیے جاتے ہیں۔'' دوسرا آدمی بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ میرے بلیک وارنٹ جاری ہو چکے ہیں؟'' خاور غرا کر بولا۔ ''او کے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' میں تو خود اس کمینے کے ٹرانس سے نکل چکا ہوں۔ اس نے تو میرے بلیک وارنٹ جاری کیے ہیں نا؟ میں تمہارے ڈیتھ وارنٹ جاری کرتا ہوں... اور ان پر عمل درآمد بھی شروع کر رہا ہوں۔'' خاور نے انتہائی سرد اور سفاک لہجے میں کہا اور کہے کے بعد دیگرے دو بے آواز فائر کر کے ان دونوں کی کھوپڑیاں اُڑا دیں۔

وہ دونوں چند لمحے تک تڑپے پھر ساکت ہو گئے۔

''یہ تو نے کیا کیا خاور؟'' ساجد تشویش سے بولا۔

''بکومت۔'' خاور نے غرا کر کہا۔

ساجد کو ایسا لگا جیسے خاور کی شخصیت اچانک بدل گئی ہو۔

خاور دونوں لاشیں پھلانگتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے الماری میں سے بڑا سا ایک بیگ نکالا۔ اس میں اپنے استعمال کی کچھ چیزیں، اسلحہ اور کرنسی نوٹ بھرے اور ساجد سے بولا۔ ''اب یہاں سے نکل چلو اور وہ تمام جگہیں صاف کر دو جہاں جہاں ہمارے ہاتھ لگے ہیں۔''

ساجد کا منہ پھولا ہوا تھا۔ اسے خاور سے اتنے شدید رویّے کی توقع نہیں تھی۔ خاور نے بھی اس کی ناراضی کو محسوس کر لیا اور بولا۔ ''سوری یار! میں اس وقت بہت غصے میں تھا۔''

''تو اب تک کرتا کیا رہا ہے، یہ کون لوگ تھے اور کیسا بلیک وارنٹ؟'' ساجد نے پوچھا۔

''میں تجھے سب کچھ تفصیل سے بتا دوں گا۔'' خاور نے کہا۔ ''پہلے یہاں سے تو نکل۔'' پھر وہ بھی ایک تولیا لے کر اپنے ہاتھوں کے نشانات صاف کرنے لگا۔ ان دونوں نے ہر وہ امکانی جگہ صاف کر دی جہاں ان کے ہاتھ لگے تھے۔

پھر خاور نے بیگ اٹھایا اور ان دونوں کی لاشوں سے بچتا ہوا پورچ کی طرف چلا گیا۔ بنگلے کا مین گیٹ پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ ساجد نے گاڑی باہر نکالی اور تیزی سے ایک طرف روانہ ہو گیا۔

''ایک منٹ ذرا گاڑی روکو۔'' خاور نے کہا۔

ساجد نے گاڑی روک دی۔ خاور نے اپنا بیگ کھول کر اس میں سے ایک پاؤچ نکالا۔ اس میں مختلف سم کارڈز بھرے ہوئے تھے۔ نہ صرف پاکستانی سم کارڈز تھے بلکہ دبئی، سعودی عرب، یورپ اور امریکا وغیرہ کے سم کارڈز بھی تھے۔

خاور نے ایک مقامی سم نکالی اور ساجد سے سیل فون لے کر اسے سیل فون میں لگا دیا۔ پھر اس نے کوئی نمبر ڈائل کیا اور لائن ملنے پر بولا۔ ''ہیلو!''

''کون؟'' دوسری طرف سے کوئی غرا کر بولا۔

''میرے بہت سارے نام ہیں حرام زادے۔'' خاور نے کہا۔ ''ایڈووکیٹ امجد جنجوعہ، سکندر، شہزاد خان، بخت آور شاہ اور خاور لیکن فی الحال میں تیری موت ہوں۔''

''تو زیادہ دیر زندہ نہیں بچے گا خاور۔'' دوسری طرف سے کوئی بپھر کر بولا۔

''مجھے چھوڑ، فی الحال تو اپنے ان دو اُلّو کے پٹھوں کی لاشیں اٹھوا جو مجھے پکڑنے آئے تھے۔ ان کی لاشیں امجد ایڈووکیٹ کے بنگلے کے لان میں پڑی ہیں۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر کے سم نکالی اور اسے توڑ کر باہر پھینک دیا پھر وہ ساجد سے بولا۔ ''اب فوری طور پر یہاں سے نکلو۔''

ساجد نے گاڑی انتہائی تیز رفتاری سے دوڑانا شروع کر دی۔ ایک ریسٹورنٹ دیکھ کر خاور نے گاڑی رکوائی اور وہاں سے کھانے پینے کی بہت سی چیزیں لے لیں۔ کچھ فاصلے پر ایک انٹرنیٹ کیفے، موبائل اور کمپیوٹر شاپ بھی تھی۔ خاور نے وہاں سے دو انتہائی مہنگے موبائل خریدے اور وہ لوگ ایک مرتبہ پھر روانہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد وہ ساجد کے اپارٹمنٹ پر پہنچ گئے۔ وہاں کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد خاور اچانک بولا۔ ''یار ساجد! میرا ایک کام کر سکتا ہے؟''

''تجھے معلوم ہے کہ میں انکار نہیں کروں گا، تو کام بتا۔'' ساجد نے کہا۔

''تو کل صبح یہاں سے گاؤں کے لیے روانہ ہوجا اور نینا کو لے کر کراچی پہنچ۔ میں تجھے پتا بھی دے دوں گا کہ تجھے کہاں پہنچنا ہوگا۔''

''لیکن... نینا...''

''اگر کام تیرے بس کا نہیں ہے تو چھوڑ۔'' خاور نے کہا۔ ''میں خود گاؤں چلا جاؤں گا۔''

''اپنی ہی بکواس کیے جائے گا۔'' ساجد نے بھنّا کر کہا۔ ''میں نے کب انکار کیا ہے؟ میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اتنی ایمرجنسی کیا ہے؟ میں...''

''ایمرجنسی ہے۔'' خاور نے مضطرب ہوکر کہا۔ ''وہ لوگ نینا کو ماردیں گے۔ وہ جانتے ہیں کہ نینا میری کمزوری ہے۔ ان کے پہنچنے سے پہلے تو گاؤں پہنچ جا اور نینا کو وہاں سے نکال لے۔''

''اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی روانہ ہوجاتا ہوں۔'' ساجد نے کہا۔ ''لیکن پہلے تو یہ بتا کہ یہ سب کچھ کیا ہے؟''

''یہ پاکستان دشمن ایک گینگ ہے۔ اس میں زیادہ تعداد یہودیوں اور ہندوؤں کی ہے، بہت سے امریکی اور برطانوی بھی اس میں شامل ہیں۔ یہ لوگ نوجوانوں کو خوب صورت لڑکیوں کے ذریعے گھیرتے ہیں، ان کی برین واشنگ کرتے ہیں۔ پھر انہیں انتہائی کٹھن تربیت کے مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مختلف جسمانی ایکسرسائز، سوئمنگ اور گھوڑسواری کے علاوہ انہیں جدید اسلحہ چلانے کی مشق کرائی جاتی ہے جب وہ ماہر ہوجاتے ہیں تو انہیں ہوا بازی اور مختلف بوٹس چلانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہر نوجوان کو ہفتے میں ایک دفعہ ان ہی شیطانوں کا تیار کردہ پُراسرار مشروب پلایا جاتا ہے۔ اس مشروب سے ان کا ذہن صرف وہی کچھ کرتا ہے جو وہ لوگ چاہتے ہیں۔ اسی لیے اس گینگ کا قانون ہے کہ اگر ان کا تیار کیا ہوا کوئی نوجوان تین دن تک کہیں غائب ہوجائے تو اسے بہت بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اگر کوئی نوجوان ایک ہفتہ غائب رہے تو اس کے بلیک وارنٹ جاری کردیے جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ٹیم کا ہر ممبر اسے پکڑنے اور ٹیم کے بڑوں کے سامنے پیش کرنے کا ذمے دار ہوتا ہے۔ نوجوان اگر ان کے ساتھ جانے میں پس وپیش کرے تو وہ لوگ اسے ہلاک بھی کرسکتے ہیں۔''

خاور بول بول کر تھک گیا تو ایک گلاس پانی پیا اور کچھ بولنے ہی والا تھا کہ ساجد نے پوچھا۔ ''خاور! تو نے اب تک نہیں بتایا کہ ان کا مقصد کیا ہے؟''

''ان کا مقصد دہشت گردی، بم دھماکے، ٹارگٹ کلنگ، اغوا برائے تاوان اور ہر قسم کی لاقانونیت جس سے امن وامان کی صورتِ حال ابتر ہوسکے۔'' خاور نے کہا۔ ''یہ پاکستان دشمن لوگ ہیں۔ انہیں اسرائیل، بھارت اور امریکا کی یہودی لابی سے سرمایہ فراہم کیا جاتا ہے۔''

''پھر تیرے اتنے نام کیوں ہیں اور ہر نام سے کوئی مکان یا بنگلا بھی ہوگا؟''

''وہ تمام نام اور بنگلے، اپارٹمنٹ اور مکانات اسی گینگ کی ملکیت ہیں۔ جب کوئی ٹیم ممبر بہت پرانا ہوجاتا ہے اور ان کے احکامات نہ صرف مانتا ہے بلکہ دوسروں سے بھی منواتا ہے تو وہ سینئر ہوجاتا ہے۔ مختلف شہروں کے بنگلے اس کے حوالے کردیے جاتے ہیں۔ اس کا کام نئے اور پُرجوش نوجوانوں کو گھیرنا اور اس شیطانی تنظیم کا حصہ بنانا ہوتا ہے۔ ہر شہر میں ایک نیا شخص، ایک نیا نام ہوتا ہے تاکہ اگر کوئی قانون نافذ کرنے والوں کی گرفت میں بھی آجائے تو اپنا دفاع کرسکے۔''

''خدا کی پناہ۔'' ساجد نے کہا۔ ''اتنے خوفناک لوگ اور تو ان کے ساتھ کام کررہا تھا؟''

''میں نے بتایا تاکہ میں ان لوگوں کے ٹرانس میں تھا۔'' خاور نے جواب دیا۔

ساجد نے گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب میں نکل جاؤں۔ اس وقت ایک بجا ہے۔ اگر میں نے تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کی تو صبح چھ، ساڑھے چھ بجے تک گاؤں پہنچ جاؤں گا۔''

خاور نے اسے کراچی کا ایڈریس لکھوایا اور بولا۔ ''تو گاؤں سے نینا کو لے کر سیدھا کراچی پہنچنا۔'' اس نے بیگ میں سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور ساجد کے حوالے کردی۔

ساجد نے ضروری تیاری کی اور خاور سے گلے مل کر روانہ ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد خاور چند لمحے تک کچھ سوچتا رہا، پھر اس نے کھڑکیاں دروازے وغیرہ اچھی طرح بند کیے اور صدر دروازے میں ایک بوبی ٹریپ لگا دیا تاکہ اگر کوئی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو ہلکی قوت کا وہ بم پھٹ جائے۔ اس سے نہ صرف آنے والا یا والے زخمی ہوجاتے بلکہ خاور کو بھی معلوم ہوجاتا کہ کوئی اندر گھسنے کی کوشش کررہا ہے۔ پھر وہ ساجد کے بیڈروم میں گیا، دروازہ بند کرکے اطمینان سے سوگیا۔

حسبِ معمول صبح چھ بجے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سب سے پہلے بوبی ٹریپ نکالا اور تیار ہو کر باہر نکل گیا۔ اب اسے کسی اچھی اور مضبوط انجن والی گاڑی کی ضرورت تھی۔ اس نے گاڑیوں کے شوروم سے ٹویوٹا کی ڈبل کیبن پک اپ خریدی۔ وہ موجودہ سال ہی کا ماڈل تھا۔ گاڑی بہت کم چلی ہوئی تھی۔ خاور کو اس کی رفتار، روڈ گرپ اور بریک پسند آئے تھے۔

گاڑی اس نے شہزاد خان کے نام سے خریدی تھی۔

کراچی میں شہزاد خان ہی کے نام سے اس کا بنگلا بھی تھا۔

اس نے کھانے پینے کی اشیا، پانی کی بوتلیں اور دیگر ضروری چیزیں لیں جن میں ایک فرسٹ ایڈ کٹ بھی شامل تھی۔ پھر وہ کراچی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسلحہ اور کرنسی کا بیگ اس نے پسنجر سیٹ کے پائے دان میں رکھ دیا تھا۔ اس نے صرف ایک ماؤزر اور چند میگزینز نکالے تھے۔ اس ماؤزر پر سائیلنسر بھی فٹ تھا۔ وہ اس کے نزدیک ڈرائیونگ سیٹ پر رکھا تھا۔ اسے وہ پلک جھپکتے نکال سکتا تھا پھر اس نے کچھ سوچ کر اسلحے کا بیگ سیٹ کے نیچے خانے میں رکھ دیا۔ اس قسم کا خانہ ہر گاڑی میں نہیں ہوتا لیکن اس میں تھا۔

وہ بغیر رکے سہ پہر چار بجے تک ملتان پہنچ گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے یاد آیا کہ ملتان میں بھی اس کے پاس ایک بنگلا تھا۔ شجاعت گردیزی کے نام سے۔ وہ ملتان کی پوش آبادی تھی۔ اردگرد گیلانی، قریشی اور گردیزی آباد تھے۔

پہلے اس نے اپنے بنگلے کا ایک چکر لگایا کہ کہیں اس سے پہلے اس کے دشمن تو نہیں پہنچ گئے؟

گاڑی محفوظ جگہ پارک کرنے کے بعد وہ محتاط انداز میں بنگلے میں داخل ہو گیا۔

ابھی وہ چند قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ کسی طرف سے اس پر بے آواز فائر ہوا اور گولی اس کے سر سے گزرتی ہوئی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ خاور پھرتی سے زمین پر لیٹ گیا اور اپنا ماؤزر نکال لیا۔ پورچ کے سامنے لان تھا اور ڈم ڈم کی باڑھ تھی۔ وہ قلابازی کھا کر باڑ کے پیچھے چلا گیا۔ اسی وقت اس پر دوسرا فائر ہوا لیکن وہ اس فائر سے بھی بچ گیا۔ خاور سمجھ گیا کہ حملہ آور ایک ہی ہے ورنہ اب تک اس پر کئی فائر ہو چکے ہوتے اور وہ زخمی یا ہلاک ہو چکا ہوتا۔ وہ باڑ کی اوٹ میں بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ اچانک اسے برآمدے کے ایک ستون کے پیچھے کسی کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔ وہ چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس مرتبہ وہ شخص ذرا بھی حرکت کرتا تو خاور اس پر فائر کر دیتا۔

اس شخص نے آہستہ آہستہ سر باہر نکالا اور فوراً ہی ستون کے پیچھے دبک گیا۔ خاور نے بڑا سا ایک پتھر اٹھایا اور اسے ستون کی طرف اچھال دیا۔ پتھر کی پُرشور آواز سے حملہ آور بوکھلا کر باہر نکلا خاور نے فوراً نشانہ لے کر اس پر فائر کر دیا۔ ٹھک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ خاور کو حملہ آور کی کربناک چیخ بھی سنائی دی۔ وہ سمجھ گیا کہ حملہ آور ہلاک ہو چکا ہے۔ وہ اس قسم کی آوازیں اس سے پہلے بھی سن چکا تھا۔

وہ جھکا جھکا برآمدے کی طرف دوڑا۔ وہ اب بھی محتاط تھا کہ کہیں کوئی دوسرا آدمی بھی موجود نہ ہو۔ اس نے چند لمحے انتظار کیا۔ دوسرا آدمی موجود ہوتا تو اپنے ساتھی کی چیخ سن کر ضرور باہر آتا۔

خاور محتاط انداز میں برآمدے تک پہنچا۔ وہاں اس شخص کا جسم غیر فطری انداز میں پڑا ہوا تھا۔ گولی اس کے حلق میں لگی تھی اور گردن سے پار ہو گئی تھی۔ وہ زندگی کی بازی ہار چکا تھا۔ خون اس کے جسم سے نکل کر برآمدے کے فرش پر جمع ہو رہا تھا۔ بنگلے کا دروازہ بند تھا۔ شاید حملہ آور کے پاس چابی نہیں تھی۔ وہ صرف وہاں کی نگرانی کر رہا تھا اور خاور کا انتظار کر رہا تھا۔ یہاں بھی خاور نے ایک مخصوص گملے کے نیچے ہاتھ ڈال کر چابی نکالی اور دروازہ کھول لیا۔ وہ دروازہ کھول کر چند لمحے تک محتاط انداز میں اندر کی سن گن لیتا رہا۔ پھر اندر داخل ہو گیا۔ وہ سیدھا سیف کی طرف بڑھا اور بہت تیزی سے اسے کھول لیا۔ وہاں بھی سیف میں اسلحہ، کرنسی نوٹ اور سونے کے بسکٹ تھے۔ اس نے اسلحہ تو اسی طرح چھوڑ دیا لیکن کرنسی نوٹ اور سونا ایک بیگ میں بھر کر باہر نکلا۔

وہاں سے وہ اپنی گاڑی تک پہنچا اور ملتان میں قیام کا ارادہ ملتوی کر کے برق رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔

وہ تھوڑی دیر رحیم یار خان کے ایک ڈھابا نما ہوٹل پر رکا، وہاں اس نے کھانا کھایا، چائے پی اور وہاں پڑی ہوئی چارپائی پر لیٹ کر کچھ دیر کمر سیدھی کی تو اسے نیند آ گئی۔

اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ کوئی اس کے سر پر کھڑا تھا۔ دور سے ٹرک ڈرائیوروں کے ہنسی مذاق اور بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

خاور ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی بوکھلا گیا اور وہاں سے ایک دم بھاگ گیا۔ خاور نے اپنی جیبوں کا جائزہ لیا ہر چیز موجود تھی۔ وہ شاید کوئی چور تھا، اگر خاور کے دشمنوں میں سے ہوتا تو کھڑے ہونے کے بجائے ایک گولی اس کی کھوپڑی میں اتار کے وہاں سے بھاگتا۔ خاور نے کلائی پر

بندھی ہوئی گھڑی دیکھی، صبح کے تین بج رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ایک گھنٹے سے کچھ زائد عرصے تک سوتا رہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس نے بیگ سے سم کارڈز والا پاؤچ نکالا اور ایک مقامی کارڈ نکال کر سیل فون میں لگایا اور نمبر ڈائل کر کے بولا۔ ''ہیلو! چوہے تو اپنے بل میں بیٹھا رہ اور اپنے آدمیوں کو مرواتا رہ... تیرا ایک اور اُلّو کا پٹھا ملتان میں گردیزی کے بنگلے میں پڑا ہے۔ اس کی لاش اٹھا لے۔''

''دیکھ خاور! تو بہت پچھتائے گا۔ میں نے ابھی اپنے آدمیوں کو تیرے گاؤں کی طرف بھیجا ہے۔ اب تو اپنی چہیتی محبوبہ کو بچا سکتا ہے تو بچا لے۔''

''مجھے تجھ سے اسی قسم کی گھٹیا حرکت کی توقع تھی۔ میں ابھی گاؤں پہنچ رہا ہوں۔ دیکھتا ہوں کہ کس میں دم ہے جو نینا کو وہاں سے اٹھا سکے۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پہلے کی طرح سم نکال کر اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے گاڑی کے ڈیش بورڈ میں پھینکا اور دوسرے موبائل سے ساجد کا نمبر ملایا۔ سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔ ''ہاں ساجد کہاں ہو؟''

''میں ابھی نینا کو لے کر نکلا ہوں۔'' ساجد نے جواب دیا۔

''محتاط ہو کر جانا، میرے دشمن بھی گاؤں کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ تمہیں تو پہچانتے نہیں ہیں، نینا کو پہچانتے ہیں۔ کوشش کرنا کہ وہ نینا کو نہ دیکھ پائیں۔''

''تم پریشان مت ہو، میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔'' ساجد نے جواب دیا۔

خاور نے مطمئن ہو کر گاڑی ہائی وے پر ڈال دی۔

☆☆☆

باس حسبِ معمول میز کے سرے والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ اس کے دائیں بائیں بھی کئی افراد بیٹھے تھے۔ ان میں زیادہ تعداد غیر ملکیوں کی تھی۔ باس نے غرا کر کہا۔ ''تم لوگ ایک آدمی کو نہیں پکڑ سکتے تو دوسرے کام کیا کرو گے؟''

''باس! آپ جانتے ہیں کہ وہ...''

''میں اسے بھی جانتا ہوں اور تم لوگوں کو بھی۔ وہ کوئی ماورائی انسان نہیں ہے جو تم لوگوں کے ہاتھ نہیں آ رہا اور ہمارے قیمتی لوگوں کو ختم کر رہا ہے۔ جانتے ہو، ایک ممبر پر کتنی لاگت آتی ہے؟''

''جانتا ہوں باس۔'' دائیں جانب بیٹھے ہوئے آدمی نے آہستہ سے کہا۔ وہ وکرم تھا۔

''اب ایک ہی حل ہے اسے پکڑنے کا۔'' باس نے کہا۔ ''تم لوگ اس کی محبوبہ کو یہاں اٹھا لاؤ۔ وہ اسی طرح تمہارے قابو آ سکتا ہے۔ ویسے تو تم اسے پکڑنے سے رہے۔''

''باس! اس نے آخری بار لاہور سے کال کی تھی۔ میں نے وہ کال ٹریس کر لی ہے لیکن اب اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا ہے۔''

''تم سب ناکارہ ہو۔'' باس غرایا۔ ''اور اس نے آخری بار لاہور سے نہیں بلکہ ملتان سے کال کی تھی۔ میں اسے بلف سمجھ رہا تھا۔ لیکن اس نے ملتان میں واقعی ہمارے ایک انتہائی قیمتی آدمی کو ہلاک بھی کر دیا ہے۔''

''اب وہ کس طرف گیا ہے؟'' وکرم نے پوچھا۔

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟'' باس دہاڑ کر بولا۔ ''لگتا ہے، مجھے خود ہی میدان میں آنا پڑے گا۔'' باس چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''وہ اس وقت اپنے گاؤں کی طرف گیا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ اگر وہ ہم لوگوں سے پہلے گاؤں پہنچ گیا تو پھر اسے پکڑنا ناممکن ہو جائے گا۔''

''اس کے گاؤں کی طرف ہمارے دس بہترین آدمی گئے ہیں۔'' بائیں جانب بیٹھا ہوا ایک یہودی بولا۔ ''ان میں سے ایک آدمی دس پر بھاری ہے۔''

''بس شرط یہ ہے کہ وہ لوگ تو او تو سے پہلے گاؤں پہنچ جائیں۔'' باس نے کہا۔

''باس! کیا میں بھی اس کے گاؤں چلا جاؤں؟'' وکرم نے پوچھا۔

''تم وہاں جا کر کیا تیر مار لو گے؟'' باس نے طنزیہ

لہجے میں کہا۔ ”تم یہیں کے معاملات دیکھو۔“ پھر باس چونک کر بولا۔ ”اب ہمیں اپنے تمام مشن کچھ عرصے کے لیے ملتوی کرنا ہوں گے۔“

”کراچی کے لیے ہمارے آدمی نکل چکے ہیں۔ انہیں واپس بلانا بہت مشکل ہے۔“

”ہاں۔“ باس فکرمند لہجے میں بولا۔ ”اب ان لوگوں کو روکنا بہت مشکل ہے۔ تو پھر انہیں کور دینے کے لیے یہاں سے مزید لوگوں کو روانہ کرو۔ وہ لوگ خاص طور پر ٹو اوٹو کا خیال رکھیں۔“

”او کے باس۔“ دائیں جانب بیٹھے ہوئے غیر ملکی نے کہا۔ ”میں ابھی سب لوگوں کو الرٹ کر دیتا ہوں۔“

☆☆☆

ساجد اس وقت گاؤں سے نکل چکا تھا جب باس کے آدمیوں کا اس سے ٹکراؤ ہوا۔ ساجد اس وقت پنجاب کے روایتی جاگیردار کے روپ میں تھا۔ طرے دار پگڑی، بوسکی کا کرتہ اور گھیر والی لٹھے کی شلوار۔ باس کے آدمی ایک پجارو اور ایک ٹویوٹا ہارڈ ٹاپ جیپ میں تھے۔ ان لوگوں نے ساجد کو دیکھا لیکن اسے نظر انداز کرتے ہوئے گزر گئے۔ ساجد کو خود بھی یہ علم نہیں تھا کہ وہ باس کے آدمی ہیں۔ وہ وہاں سے جی ٹی روڈ پر چڑھا اور برق رفتاری سے گاڑی دوڑانے لگا۔

”ایسی کیا آفت آگئی ساجد؟“ نینا نے پوچھا۔ ”تم نے مجھ سے چلنے کو کہا اور خاور کا نام لیا تو میں فوراً تیار ہوگئی لیکن خاور خود کہاں ہے؟“

”وہ ہمیں کراچی میں ملے گا۔“ ساجد نے کہا۔ ”ابھی کچھ دیر پہلے اس سے بات تو ہوئی تھی۔“

”وہ کال خاور کی تھی؟“ نینا نے پوچھا۔

”ہاں، وہ خاور کی کال تھی۔“ ساجد نے جواب دیا۔

”تم دونوں نہ جانے کن چکروں میں ہو؟“ نینا نے منہ بنا کر کہا۔ ”تم نے تو مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ مجھے تمہارے ساتھ کہیں جانا بھی ہے۔ میرے ابا جی اور بھائی کیا سوچیں گے کہ نینا، ساجد کے ساتھ فرار ہوگئی۔“

”فضول باتیں مت کرو نینا۔“ ساجد نے کہا۔ ”انہیں کیا علم غیب ہے کہ انہیں یہ معلوم ہو جائے گا۔“

”مجھے گاؤں کے دو تین لوگوں نے تمہارے ساتھ دیکھا ہے۔ اب تک تو میری تلاش شروع ہو چکی ہوگی۔ ممکن ہے، وہ لوگ ہمارے پیچھے آرہے ہوں۔“

”آنے دو۔“ ساجد جھنجھلا کر بولا۔ ”میں ان سے بھی نمٹ لوں گا۔“

”خالی ہاتھ؟“ نینا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”تم تو اپنی جان سے جاؤ گے، وہ مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”نینا! اگر تم اتنی ہی خوف زدہ ہو تو تمہیں واپس گاؤں لے چلتا ہوں۔ تم سارا الزام مجھ پر لگا دینا کہ ساجد مجھے دھوکے سے گاڑی میں بٹھا کر لے بھاگا تھا۔ میں اسے گن پوائنٹ پر واپس لے کر آئی ہوں۔ میں تمہیں گن بھی دے دیتا ہوں۔“ ساجد کا لہجہ تلخ تھا۔

”دیکھو ساجد! اگر مجھے واپس ہی جانا ہوتا تو گاؤں سے نکلتے ہی تمہیں روکتی۔ اب جو ہونا ہے ہونے دو۔ میں واپس نہیں جاؤں گی۔“

پھر ان دونوں میں سے کوئی کچھ نہیں بولا۔

نینا کو خاور کا خیال آیا تو ماضی کے بہت سے در اس کے سامنے وا ہوتے چلے گئے۔

☆☆☆

”دیکھو بیٹا!“ نینا کے باپ نے خاور سے کہا۔ ”اپنی زمین تو بہت پہلے بھائی جی نے مجھے فروخت کر دی تھی۔“

”چاچا جی!“ خاور نے کہا۔ ”ابا جی نے مجھے یا اماں کو تو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔“

”اوئے تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں؟“ خاور کا چاچا بپھر کر بولا۔ ”میرے پاس زمین کے پکے کاغذات موجود ہیں۔ اوئے، ویسے تو تمہاری یہ چھوٹی حویلی بھی میرے نام ہے لیکن تم لوگ اس میں رہ سکتے ہو۔“

”لیکن چاچا جی۔“ خاور نے کہا۔ ”ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔“

”اوئے، تو نے چودہ جماعتیں پاس تو کر لی ہیں۔ اب اور کتنا پڑھے گا؟ اب تو کوئی کام کاج کر، تجھے فوج میں جانے کا شوق ہے نا، تو فوج میں چلا جا۔“

”جی چاچا جی۔“ خاور نے کہا اور چاچا کے گھر سے مایوس ہو کر اٹھ آیا۔ نینا نے اسے مایوس اور دل گرفتہ دیکھا تو دل مسوس کر رہ گئی۔ وہ بچپن سے خاور کے ساتھ منسوب تھی۔ یوں بھی وہ خاور کو بہت پسند کرتی تھی۔ خاور بھی اس کا دیوانہ تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔

شام کو خاور نے ماں سے کہا۔ ”اماں! تم جا کر چاچا جی سے میری اور نینا کی شادی کی بات کرو۔ ہم اب اس گاؤں میں نہیں رہیں گے۔ یہاں اب ہمارا کیا ہے، میں تمہیں اور نینا کو لے کر یہاں سے نکل جاؤں گا۔“

''یہ بات دروازے پر کھڑی نینا نے بھی سنی۔ وہ وہیں سے بولی۔ ''چاچی! آج تم نے میرے لیے کیا بنایا ہے؟''

''تو کیا کھائے گی بیٹی، میں ابھی بنا دیتی ہوں۔'' ماں نے کہا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔

نینا، خاور کے پاس چلی آئی اور بولی۔ ''اچھا، تو جناب یہاں سے شہر جانا چاہتے ہیں۔''

''اور میں کر بھی کیا سکتا ہوں نینا؟'' خاور نے منہ بنا کر کہا۔ ''میری پوری زمین تو تمہارے باپ نے ہتھیا لی۔ اب یہاں میرے لیے کیا ہے؟''

''میں تو ہوں۔'' نینا نے کہا۔

''تم نے سن تو لیا ہے کہ میں نے اماں سے ابھی کیا کہا ہے۔'' خاور ہنس کر بولا۔

''خاور!'' نینا اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ ''مجھے لگتا ہے کہ ابا جی اور بھائی جی اب یہ رشتہ نہیں کریں گے۔''

''نہیں تو، نہ سہی۔'' خاور نے بے نیازی سے کہا۔ ''لڑکیاں بہت، میں شہر جا کر کسی خوب صورت سی لڑکی سے شادی کر لوں گا۔''

''تم میرے بغیر گاؤں سے جا کر تو دکھاؤ۔'' نینا تنک کر بولی۔ ''میں اسی وقت اپنی جان دے دوں گی۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی پاگل لڑکی۔'' خاور نے کہا۔ ''میں تجھے بھگا کر لے جاؤں گا۔''

''شکل دیکھی ہے اپنی۔'' نینا جھینپ کر بولی۔ ''بڑا آیا بھگانے والا۔''

رات کو خاور کی ماں نینا کے رشتے کے لیے گئی تو نینا کے باپ اور بھائیوں نے صاف انکار کر دیا۔

''بھائی جی!'' ماں نے کہا۔ ''تم یہ بھی بھول گئے کہ نینا، خاور کی بچپن کی منگ ہے؟''

''یہ سب پرانے زمانے کی باتیں ہیں بھابی۔'' چاچا نے کہا۔ ''یہ نیا زمانہ ہے۔ میری نینا بارہ جماعتیں پاس ہے۔ میں اسے کسی نکمے کے حوالے تو نہیں کر سکتا۔''

''میرا بیٹا بھی تو چودہ جماعتیں پاس ہے اور...''

''بھابی!'' نینا کے باپ نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔''

رات میں نینا بوکھلائی ہوئی خاور کے گھر پہنچی اور اس سے بولی۔ ''خاور! تم یہاں سے کہیں چلے جاؤ۔ ابا جی اور بھائی تمہاری جان کے دشمن ہو رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تم اپنی زمین کے لیے ان پر مقدمہ کر سکتے ہو۔ ان کے پاس جھوٹے کاغذ ہیں۔ پھر نہ جانے کیسے اور کیوں انہیں یہ شبہ ہو گیا ہے کہ ملک سرور تمہارے ساتھ ہے۔ اللہ کے واسطے تم ابھی یہاں سے نکل جاؤ، جاؤ، جلدی کرو۔ وہ لوگ تمہیں آج ہی رات ختم کرنے کا پلان بنا رہے تھے۔''

''لیکن نینا... اماں!''

''تم چاچی کی فکر مت کرو۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے میں یہاں ہوں نا، بس تم نکل جاؤ۔''

''میرا انتظار کرو گی؟'' خاور نے پوچھا۔

''آخری سانس تک۔'' نینا نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

اس رات خاور گاؤں سے نکل گیا۔

☆☆☆

نینا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ساجد نے اس کی طرف دیکھا تو پریشان ہو گیا اور اس نے گاڑی روک لی۔

''کیا ہوا نینا؟'' ساجد نے پوچھا۔ ''اگر تمہیں واقعی پچھتاوا ہے تو میں اب بھی تمہیں واپس گاؤں چھوڑ سکتا ہوں۔''

نینا روتے روتے ہنسنے لگی۔ ''ایسی کوئی بات نہیں ہے ساجد۔'' اس نے کہا۔ ''...وہ مجھے کچھ یاد آ گیا تھا۔''

وہ دوبارہ گاڑی اسٹارٹ کرنے والا تھا کہ اس کے سیل فون کی بیل بجی۔ دوسری طرف اس کا دوست شفیق تھا۔ صرف شفیق کو اس بات کا علم تھا کہ نینا، ساجد کے ساتھ گئی ہے۔

ساجد نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ ''ہاں بھئی، خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے ساجد۔'' شفیق کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی۔

''کیا ہوا یار، کھل کر بتاؤ۔''

''یار کچھ لوگ چودھری نصیر کے گھر آئے تھے۔ انہوں نے نصیر اور اس کے دونوں بیٹوں کو ہلاک کر دیا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ کارروائی خاور نے کی ہے کیونکہ نینا کا کوئی پتا نہیں ہے۔ پولیس کو اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ پولیس کا خیال ہے کہ خاور کچھ لوگوں کے ساتھ گاؤں آیا، نینا کے باپ اور بھائیوں کو ہلاک کیا اور نینا کو لے کر فرار ہو گیا۔''

''چلو، یہ بھی ایک طرح اچھا ہوا۔'' پھر وہ بولا۔ ''اماں جی کا خیال رکھنا۔ میں ایک ہفتے میں واپس لوٹ آؤں گا۔''

اس نے سلسلہ منقطع کیا تو نینا بولی۔ ''کس کی کال تھی

ساجد؟‘‘

’’شفیق کی کال تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ تمہارے ابا جی اور بھائی ہمارے تعاقب میں روانہ ہو چکے ہیں۔‘‘ وہ نینا کو حقیقت نہیں بتانا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا تھا کہ یہ بات نینا کو خاور کے حوالے کرنے کے بعد بتائے گا۔

’’تو آجائیں۔‘‘ نینا نے کہا۔ ’’میں جیتے جی تو ان کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔‘‘

’’وہ جیتے جی لے بھی نہیں جائیں گے۔‘‘ ساجد نے کہا۔ ’’تم لوگوں کی خاطر میں بھی مارا جاؤں گا۔‘‘

’’ابھی تو بہت دعوے کر رہے تھے۔‘‘ نینا ہنس کر بولی۔ ’’اب ساری شیخی دھری کی دھری رہ گئی۔‘‘

’’ایسی بات نہیں ہے نینا۔‘‘ ساجد نے کہا۔ ’’مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ تمہارے ابا جی اور بھائی میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔‘‘

نینا نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ چند لمحے تک خاموش رہی، پھر وہ نارمل انداز میں بولی۔ ’’اچھا تم گاڑی تو چلاؤ۔ ہر وقت مرنے مارنے کی باتیں ہی کرتے رہتے ہو۔‘‘

ساجد نے مسکرا کر گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

باس غصے میں بری طرح بپھرا ہوا تھا۔ اس کے آدمی گاؤں سے خالی ہاتھ واپس آگئے تھے۔ اس کے آدمی اس کے سامنے سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ باس نے اس دفعہ انہیں بیٹھنے کی اجازت بھی نہیں دی تھی۔ وہ بپھر کر بولا۔ ’’تم سب نکمے ہو، تم سے ایک آدمی نہیں پکڑا جاتا... ایک آدمی۔‘‘

’’باس! وہ ہم سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر لڑکی کو لے گیا تھا۔‘‘ ایک آدمی نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

’’بکواس مت کرو۔‘‘ باس اتنی زور سے دہاڑا کہ اس کی آواز پھٹ گئی۔ ’’میں تم سب کے بلیک وارنٹ نکال دوں گا۔‘‘

’’ایک موقع دے دیں باس۔‘‘ وکرم نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

’’شٹ اَپ۔‘‘ باس نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ مار دیا۔ ’’تمہاری تو اس سے جان جاتی ہے۔ ایک کیا، تمہیں دس موقعے بھی دوں تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔ ابھی تک کتنے موقع ملے ہیں۔ وہ ابھی تک یوں ہی آزاد گھوم رہا ہے۔ تم لوگوں سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ مجھے کچھ اور ہی بندوبست کرنا ہوگا۔ دفع ہو جاؤ تم سب۔‘‘ وہ پھر دہاڑا۔

وہ سب ایک ایک کر کے وہاں سے نکل گئے۔

ان کے جانے کے بعد اس نے اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ’’ہیلو، ایڈی! تم کہاں ہو؟ تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ پہلی فلائٹ سے پاکستان پہنچو۔ اپنے دونوں ساتھیوں کو بھی لیتے آنا... باقی معاملات یہاں طے کریں گے، گڈ لک۔‘‘ اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور سیاہ سوٹ میں ملبوس ایک غیر ملکی اندر داخل ہوا۔

’’ہیلو مائیکل!‘‘ باس نے گرم جوشی سے کہا۔

’’ہائے... ہاؤ آر یو؟‘‘ نو وارد نے پوچھا۔ اس کا سر انڈے کی طرح شفاف اور سفید تھا۔ سیاہ سوٹ پر سفید سر الگ سے نظر آرہا تھا۔

’’تم کچھ پریشان لگ رہے ہو؟‘‘ گنجے نے پوچھا۔

’’ہاں یار! وہ خاور دردِ سر بنا ہوا ہے۔ ابھی تک کسی کے ہاتھ ہی نہیں آیا۔‘‘

’’یہ تو بہت خطرناک ہے۔‘‘ گنجا بولا۔ ’’اگر وہ حکومت کے پاس چلا گیا تو ہمارا اس ملک میں رہنا دوبھر ہو جائے گا اور تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔‘‘

’’میں نے دنیا کے خوف ناک دہشت گرد ایڈی اور اس کے ساتھیوں کو بلایا ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ وہ کسی کو پاتال سے ڈھونڈ کر بھی ختم کر دیتے ہیں۔‘‘

’’تم جلد بازی کر گئے۔‘‘ گنجا بولا۔ ’’ان سے بھی زیادہ خوف ناک لوگ میرے پاس ٹھہرے ہوئے ہیں۔ برڈ کا نام سنا ہے کبھی؟‘‘

باس چونک کر بولا۔ ’’انڈر ورلڈ میں برڈ کو کون نہیں جانتا؟ وہ کب آیا؟‘‘

’’اسے بھی میں نے اپنے ایک کام سے بلوایا تھا۔‘‘ گنجے نے کہا۔

’’تم برڈ کو میرے پاس بھیج دو۔‘‘ باس نے کہا۔

’’میں اسے ابھی بلا لیتا ہوں۔‘‘ گنجے نے کہا۔ ’’ہوٹل کی لابی میں موجود ہے۔‘‘ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی سے بات کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر دستک دے کر خوف ناک شکل کا ایک نیگرو اندر آگیا۔ ’’یس باس۔‘‘

باس نے اسے خاور کے بارے میں بتایا تو اس نے کھرکھراتی ہوئی آواز میں پوچھا۔ ’’وہ اس وقت کہاں ہے

سر؟"

"یہی تو معلوم کرنا ہے۔" باس نے کہا۔ "اگر یہ معلوم ہوتا تو میرے آدمی اسے اب تک ختم کر چکے ہوتے۔"

"اس کی کوئی تصویر؟" برڈ نے پھر کھر کھراتی ہوئی آواز میں کہا۔

"ہاں تصویر ہے۔" باس نے کہا اور اپنی دراز سے ایک ڈی وی ڈی نکال کر کمپیوٹر میں لگا دی۔ دوسرے ہی لمحے مانیٹر پر خاور کی تصویر ابھری۔ وہ خاور کی مختلف تصویریں تھیں۔

"یہ دراز قد آدمی ہے۔" باس نے کہا۔ "اپنے رنگ روپ سے ایرانی یا ترک لگتا ہے لیکن پاکستانی ہے۔ رسٹ واچ بائیں کے بجائے دائیں کلائی میں پہنتا ہے، گاڑی ڈرائیو کرتے وقت صرف دایاں ہاتھ اسٹیئرنگ پر رکھتا

"اسے آخری بار کہاں دیکھا گیا تھا سر؟" برڈ نے پوچھا۔

"آخری بار اسے ملتان میں دیکھا گیا تھا، پھر یہ ایبٹ آباد کے ایک گاؤں میں گیا تھا لیکن وہاں اسے دیکھا کسی نے نہیں۔"

"سر! مجھے ان تصویروں کے پرنٹ مل جائیں گے؟" برڈ نے پوچھا۔

"ضرور۔" باس نے کہا۔ "ہاں، بقیہ معاملات مسٹر مائیکل سے طے کر لینا۔"

"او کے سر۔" برڈ نے پھر ڈراؤنی آواز میں کہا۔

☆☆☆

نینا اور ساجد کراچی پہنچ چکے تھے۔ کراچی پہنچ کر اس نے خاور کو کال کی۔ خاور نے جواب دیا۔ "تو شیرٹن میں دو کمرے بک کرا کے مجھے اطلاع دے۔"

ساجد نے گاڑی کا رخ ہوٹل شیرٹن کی طرف موڑ دیا۔

خاور بھی کراچی پہنچ چکا تھا۔ یہاں شہزاد خان کے نام سے ڈیفنس میں اس کا بنگلا تھا۔ اس بنگلے کے سیف میں اس خفیہ تنظیم کے انتہائی اہم کاغذات اور کچھ ڈی وی ڈیز تھیں۔ خاور وہ تمام اسٹف وہاں سے نکال کر حکومت کے حوالے کرنا چاہتا تھا اور چار دن بعد کراچی پورٹ پر تنظیم کے متوقع حملے اور دہشت گردی کو روکنا چاہتا تھا۔ وہ اپنی ڈبل کیبن پک اپ ہی میں کراچی تک آیا تھا اور ابھی تک کہیں بھی قیام نہیں کیا تھا۔ وہ دو دن سے اسی پک اپ میں تھا۔

اس نے ڈیفنس فیز فائیو کا ایک چکر لگایا اور محتاط انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا، پھر وہ اپنی اسٹریٹ پر پہنچا۔ وہاں بھی کوئی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی۔ اس کے بنگلے کا گیٹ بند تھا اور اسے یاد نہیں آرہا تھا کہ اس نے اس گیٹ کی چابی کہاں رکھی تھی؟ وہ سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔ آخر اس نے بنگلے کی پشت سے اندر داخل ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی گاڑی ایسی جگہ پارک کی کہ اگر اسے ہنگامی طور پر وہاں سے نکلنا پڑے تو آسانی سے نکل جائے۔ اس بنگلے میں اس نے زیادہ قیام نہیں کیا تھا لیکن اس کی عادت تھی کہ جہاں بھی رہتا تھا، وہاں کی ایک ایک چیز، ایک ایک گوشے کو بہت توجہ اور غور سے دیکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بنگلے کی پشت پر آم، بیری اور نیم کے کئی درخت ہیں۔ گاڑی پارک کر کے وہ پیدل ہی بنگلے کی پشت پر پہنچا۔ باؤنڈری وال زیادہ اونچی نہیں تھی یا یوں کہہ لیں کہ خاور کے لیے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ حالانکہ وہ اٹھارہ فٹ اونچی تھی۔ اس کے ساتھ والے بنگلے میں واقع نیم کی گھنی شاخیں خاصی نیچے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اکثر لوگ بنگلے لے کر بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ چوکیداروں کو درختوں اور خودرو جھاڑیوں کے بڑھنے کی فکر نہیں ہوتی۔

وہ ساتھ والے بنگلے تک پہنچا، اردگرد کا جائزہ لیا اور اچھل کر نیم کی ایک جھکی ہوئی شاخ پکڑ لی۔ شاخ اس کے وزن سے نیچے کی طرف آئی تو خاور کو یوں لگا جیسے وہ اس کا وزن نہیں سہار پائے گی لیکن شاخ خاصی مضبوط اور لچکدار تھی۔ خاور اسی شاخ پر جھول کر دیوار تک پہنچ گیا۔ وہاں سے اس کے بنگلے کی دیوار زیادہ دور نہیں تھی۔ بیچ میں مشکل سے چھ فٹ کا فاصلہ رہا ہوگا۔ خاور ایک مرتبہ پھر نیم کی شاخ پر جھولا اور اچھل کر اپنے بنگلے کی دیوار تک آگیا۔ اپنی دیوار پر پہنچتے ہی وہ اس پر بیٹھ گیا اور اردگرد کا جائزہ لیا۔ پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بنگلے کے نیم کے درخت تک آیا اور اس کی ایک مضبوط شاخ پکڑ کر جھول گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ اندر کی طرف کچی زمین پر کودا اور رینگتا ہوا خودرو جھاڑیوں تک چلا گیا جو بے تحاشا بڑھی ہوئی تھیں۔

کچھ دیر بیٹھا وہ اردگرد کی سن گن لیتا رہا، پھر اس نے اپنے بغلی ہولسٹر سے دو ماؤزر نکالے، ان پر سائیلنسر فٹ کیے۔ ماؤزر کے فاضل میگزینز بھی اس کی جیبوں میں موجود تھے۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا ایک دستی بم اور اسموک بم بھی موجود تھا۔ اسے یہاں سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ یہاں اس خفیہ تنظیم کے خلاف اس نے اچھا خاصا مواد ڈی وی ڈیز، یو ایس بی اور بہت سے میموری کارڈز میں محفوظ کیا تھا۔ اس کو اس مواد کا علم تو نہیں ہوسکتا تھا لیکن اسے یہ ضرور اندازہ ہوگا کہ لاہور اور ملتان کے بعد اب خاور کراچی یا راولپنڈی کا رخ کرے گا۔ اس نے دونوں جگہ اپنے آدمی نگرانی کے لیے لگا دیے ہوں گے۔

یہ صرف خاور کا اندازہ تھا لیکن ایسا ہونے کا قوی امکان بھی تھا۔

وہ دبے قدموں بنگلے کی پشت سے اقامتی حصے کی طرف بڑھا اور برآمدے کی طرف بڑھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کا پیر راستے میں پڑے ہوئے ایک پتھر سے ٹکرایا اور وہ لڑکھڑا کر نیچے کی طرف گرا۔ یہ اس کی خوش قسمتی بھی تھی کیونکہ اسی وقت ایک بے آواز فائر ہوا تھا اور گولی اس کے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔

وہ برقی سرعت سے زمین پر لیٹ گیا اور چھپکلی کی طرح تیزی سے رینگتا ہوا خودرو جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔

فوراً ہی برآمدے میں کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

برآمدے میں موجود شخص ایسی پوزیشن میں تھا کہ خاور اسے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ اسی لیے وہ شخص اتنے اعتماد سے آگے بڑھ رہا تھا۔

خاور رینگتا ہوا مزید آگے بڑھا اور ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے وہ برآمدے میں موجود شخص کو نشانہ بنا سکتا تھا لیکن اب اسے برآمدے میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ شخص غالباً برآمدے کے ستون کے پیچھے چھپ گیا تھا۔

اچانک خاور کو اس کا ہاتھ دکھائی دیا۔ اس نے بہت

تیزی سے اس جگہ فائر کیا جہاں اس کے خیال میں خاور کو ہونا چاہیے تھا پھر فوراً ہی اس کا ہاتھ ستون کی طرف غائب ہوگیا۔

اسی وقت خاور کو برآمدے میں ایک اور آدمی نظر آیا۔ وہ ستون کے پیچھے چھپے ہوئے شخص سے اشارے میں کچھ پوچھ رہا تھا۔

خاور نے اس شخص کو نشانہ بنانا چاہا، پھر کچھ سوچ کر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ دونوں اس کے نشانے کی زد پر آجائیں تاکہ دونوں کو ایک ساتھ ہی ٹھکانے لگا سکے۔ اگر وہ اس شخص کو نشانہ بنالیتا تو ستون کے پیچھے چھپا ہوا شخص مشکل ہی سے اس کے نشانے پر آتا۔ برآمدے میں آنے والا شخص اب بہت اعتماد سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھک کر ایک پتھر اٹھایا اور سامنے کی طرف اچھال دیا تاکہ خاور کوئی حرکت کرے۔ خاور اس کی حرکتوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ اس نے پھر برآمدے کا ایک چکر لگایا اور اپنے ساتھی سے بولا۔ ”یار! یہاں تو کوئی نہیں ہے۔ تو کس پر فائرنگ کر رہا تھا؟“

”میں نے اسے خود یہاں دیکھا تھا۔“ دوسری آواز آئی۔

”یار! اس وقت تو دن ہے۔ تجھے دن میں بھی خاور کا بھوت نظر آرہا ہے۔ وہ اگر ہوتا تو اب تک کم سے کم مجھے تو ختم کر ہی چکا ہوتا۔ وہ کوئی بلی ہوگی یا پھر کوئی اُچکا، خاور اتنی دیر انتظار نہیں کرتا ہے۔ وہ تو فوری ایکشن کا عادی ہے۔“

ستون کے پیچھے چھپے ہوئے شخص نے سر نکال کر ڈرتے ڈرتے اس طرف دیکھا جہاں اس نے خاور پر فائر کیا تھا۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

”یار! اگر کوئی آیا ہوگا تو اس کے پیروں کے نشان تو ہوں گے۔ چل تو ارد گرد پر نظر رکھنا، میں دیکھتا ہوں کہ تو نے واقعی خاور کو دیکھا تھا یا یہ تیرا وہم ہے۔“

وہ دونوں اچانک خاور کے نشانے پر آگئے۔ خاور نے دونوں ہاتھوں سے نشانہ لے کر ایک ساتھ دو فائر کیے اور وہ دونوں کراہتے ہوئے برآمدے کی طرف الٹ گئے۔ ان کی چیخ سن کر دو آدمی مزید وہاں ظاہر ہوئے۔ خاور نے ان دونوں کو بھی پلک جھپکتے میں مار گرایا۔

اس نے کچھ دیر انتظار کیا اور پیٹ کے بل رینگتے ہوئے اپنی جگہ تبدیل کر لی کیونکہ اس کے ماؤزر سے نکلتے ہوئے دھوئیں کی لکیر ابھی تک وہاں چکرا رہی تھی۔ کسی عام آدمی کو تو اندازہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن خاور جیسا تجربے کار آدمی اندازہ لگا سکتا تھا کہ جہاں دھوئیں کی ایک باریک سی لکیر چکرا رہی ہے۔ ہوا بالکل بند تھی ورنہ اب تک وہ دھواں ہوا میں تحلیل ہوگیا ہوتا۔

خاور نے کچھ دیر انتظار کیا۔ اب بنگلے میں بالکل سناٹا تھا، موت کا سا سناٹا۔ خاور محتاط انداز میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اندر کی طرف بڑھا۔ یہاں ان لوگوں نے بنگلے کا لاک بھی کھول لیا تھا اور اس بنگلے کی بھی خوب اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ صوفوں کے کشن ادھڑے ہوئے تھے۔ بیڈ کا میٹرس بھی ادھڑا ہوا تھا اور اس کی الماریاں بھی خالی تھیں۔ اس کے کپڑے باہر بکھرے ہوئے تھے۔

وہ منظر دیکھ کر خاور مسکرایا۔ اس نے الماری کو ایک طرف سرکایا۔ وہ اصل میں تین پٹ والی الماری تھی۔ اس کا ایک حصہ علیحدہ ہو کر دوسری طرف چلا گیا۔ الماری کے نیچے پہیے لگے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے ایک دروازہ نمودار ہوا۔ خاور نے دروازہ کھولا تو اس کے پیچھے سیف تھا۔ وہاں تک ان لوگوں کی رسائی ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے جلدی سے سیف کا لاک کھول کر مطلوبہ اسٹف نکالا اور اسے چھوٹے سے ایک پاؤچ میں رکھ لیا۔ یہاں بھی سیف میں بہت سے کرنسی نوٹ تھے۔ ان میں مقامی کرنسی کے علاوہ پاؤنڈز، ڈالرز اور ریال بھی تھے۔ خاور نے وہ کرنسی بھی ایک بیگ میں بھر لی اور سیف بند کر کے الماری کو دوبارہ اس کی جگہ پر لگا دیا۔ الماری میں لگے ہوئے مستطیل آئینے میں اسے کسی کی جھلک دکھائی دی۔ وہ تیزی سے زمین پر گر گیا اور چشم زدن میں ماؤزر نکال لیا۔

”جہاں ہو، وہیں پڑے رہو۔“ کوئی درشت لہجے میں بولا۔ وہ انگلش میں بول رہا تھا۔ ”ذرا سی بھی حرکت کی تو گولیوں سے چھلنی کر دوں گا۔“

خاور ساکت ہوگیا۔ اس نے الماری میں لگے ہوئے آئینے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اسے بولنے والے کے صرف ہاتھ نظر آرہے تھے۔ اس کے ہاتھ میں لمبی نال والا خوفناک جرمن لیوگر تھا۔ اچانک خاور نے برق رفتاری سے قلابازی کھائی اور فائر کر دیا۔ یہ لمحوں کا کھیل تھا اگر خاور کو ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو دوسری لاشوں کے ساتھ اس کی لاش بھی پڑی ہوتی۔ حملہ آور نے بھی عین اسی وقت فائر کیا تھا۔ بس ایک لمحے کا فرق تھا۔ اس کی گن سے فائر ضرور ہوا لیکن گولی سامنے والی الماری میں پیوست ہوگئی۔ خاور کی چلائی ہوئی گولی حملہ آور کے سینے میں پیوست ہوگئی تھی۔ وہ اب بھی زندہ تھا اور فرش پر گرا گہرے گہرے سانس لے

رہا تھا۔ خاور نے دوسرا فائر اس کی کھوپڑی پر کیا اور بنگلے سے باہر نکل آیا۔ حملہ آور کی گن پر سائیلنسر نہیں تھا اس لیے زوردار دھما کا ہوا تھا۔ دھماکا سن کر کوئی بھی ادھر آسکتا تھا۔

خاور برق رفتاری سے اسی طرف بڑھ گیا جدھر سے آیا تھا۔ باہر نکلنا زیادہ آسان تھا۔ اس نے اچھل کر نیم کی مضبوط شاخ پکڑی اور اس کے سہارے دیوار پر پہنچ گیا۔ پھر اس نے وہاں سے چھلانگ لگادی۔ اسے چھلانگ لگانے کی بھی مشق تھی۔ ورنہ اتنی بلندی سے چھلانگ لگانے پر وہ زخمی بھی ہوسکتا تھا۔

وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور تیزی سے اس طرف دوڑا جہاں اس کی گاڑی پارک تھی۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی اس نے تیزی سے اسے سڑک پر نکال لیا۔ مین روڈ پر کافی آگے جانے کے بعد وہ ٹریفک کے ہجوم میں شامل ہوگیا۔ جہاں سے ایک سروس لین پر مڑ کر وہ قدرے سنسان جگہ پر پہنچا اور اپنے کپڑوں کا جائزہ لیا کہ کہیں خون کا کوئی چھینٹا تو اس کے لباس پر نہیں ہے۔ اس کی ایک آستین پر خون کا ایک دھبا تھا۔ اس نے آستین الٹ کر دیکھی۔ اس کے بازو سے خون رِس رہا تھا۔ یہ زخم اسے شاید اس وقت لگا تھا جب اس نے باؤنڈری وال سے چھلانگ لگائی تھی۔ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھے ہوئے ٹشو پیپرز سے خون صاف کیا اور شرٹ کی آستین فولڈ کرلی۔

پھر اس نے اپنے بیگ سے سم کارڈز والا پاؤچ نکالا اور باس سے بات کرنے کے لیے سیل فون میں لگانا چاہا پھر کچھ سوچ کر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کردیا اور برق رفتاری سے شیرٹن کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس نے اپنا سیل فون نکال کر ساجد کو کال کی تو معلوم ہوا کہ ساجد، نینا کو لے کر شیرٹن پہنچ چکا ہے۔ اس نے خاور کی ہدایت کے مطابق دو کمرے بھی بک کرلیے تھے۔ ایک کمرا مسٹر اور مسز شہزاد خان کے نام سے تھا اور دوسرا کمرا ساجد ملک کے نام سے۔ اس نے مزید احتیاط کے طور پر شرٹ کے اوپر جیکٹ بھی پہن لی۔ موسم زیادہ گرم نہیں تھا۔ وہ پورچ میں پہنچا تو ہوٹل کا ایک پورٹر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے دونوں بڑے بیگ گاڑی سے نکال کر اسے دے دیے اور ڈی وی ڈیز والا پاؤچ اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اس نے پورٹر کو بتایا کہ میں شہزاد خان ہوں۔ میری مسز یہاں پہنچ چکی ہوں گی۔ مجھے اسی کمرے میں جانا ہے۔

پورٹر نے استقبالیہ کلرک کو اس کے بارے میں بتایا، وہ مسکرا کر بولی۔ ”روم نمبر فورٹو ون سر۔“

جواب میں خاور بھی مسکرایا اور پورٹر کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اسی وقت ہوٹل کا ایک شخص دوڑا ہوا اس کے پاس آیا۔ ”سر! آپ کی گاڑی...“

”او یس۔“ خاور نے کہا اور گاڑی کی چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ”روم نمبر فورٹو ون۔“

”او کے سر۔“ پارکنگ لاٹ والے نے مؤدب ہوکر کہا اور باہر کی طرف بڑھ گیا۔

کمرے کے پاس پہنچ کر اس نے پورٹر کو سو روپے کی ٹپ دے کر رخصت کردیا۔ اس کے جانے کے بعد خاور نے کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ فوراً ہی دروازہ تھوڑا سا کھلا اور اسے نینا کا خوب صورت اور معصوم چہرہ نظر آیا۔

وہ بھی مبہوت ہوکر اسے دیکھ رہی تھی۔

خاور نے ہنس کر کہا۔ ”مجھے اندر تو آنے دو یا دروازے ہی پر کھڑی مجھے تکتی رہوگی؟“

نینا جیسے ہوش میں آگئی۔ اس نے شہزاد کے لیے راستہ چھوڑ دیا۔ شہزاد خان نے اپنے دونوں بیگ اٹھائے اور اندر داخل ہوگیا۔

نینا آگے بڑھ کر اس کی بانہوں میں جھول گئی اور بلک بلک کر رونے لگی۔

”ارے ارے، اب کیوں رو رہی ہو؟ اب تو میں آگیا ہوں؟“

نینا روتے روتے ہنسنے لگی اور بولی۔ ”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔“

خاور اسے سہارا دے کر بیڈ تک لایا اور آہستگی سے بیڈ پر بٹھادیا۔ پھر نینا سے بولا۔ ”ساجد کہاں ہے؟“

”وہ سامنے والے کمرے میں ہے۔“ نینا نے کہا۔

”میں اسے بلاؤں؟“

”پہلے میں تم سے تو مل لوں۔“ خاور نے ہنس کر کہا اور نینا کو اک مرتبہ پھر بانہوں میں لے لیا۔

☆☆☆

باس کسی چوٹ کھائے ہوئے ناگ کی طرح پھنکار رہا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے صرف گنجا مائیکل موجود تھا۔ اس نے مائیکل سے کہا۔ ”اس باسٹرڈ نے پھر ہمارے پانچ آدمی ماردیے۔“

”تمہارے آدمی کیا اُلو کے پٹھے ہیں جو اس کا سامنا ہوتے ہی گردن ڈال دیتے ہیں۔“ مائیکل نے درشت لہجے

میں کہا۔ ''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تم نے اپنی صلاحیتوں سے یہاں بہترین فائٹر تیار کیے ہوں گے لیکن یہ تو سب بکری کے بچے ہیں۔ انہیں مر ہی جانا چاہیے۔''

''مائیکل! تم میری انسلٹ کر رہے ہو۔'' باس غرا کر بولا۔

''ابھی تو میں انسلٹ کر رہا ہوں، بہت جلد اوپر سے جواب طلبی ہوگی تو کیا کرو گے؟''

''تمہارا وہ خوف ناک چہرے اور آواز والا نیگرو کہاں مر گیا؟'' باس نے جھلا کر پوچھا۔ ''اس نے دعوے تو بہت کیے تھے۔''

''تم نے بھی تو انٹرنیشنل دہشت گردوں کو بلایا تھا، وہ کہاں مرے ہوئے ہیں؟''

''وہ اُلّو کا پٹھا اب تک میرے دس بہترین آدمی ہلاک کر چکا ہے۔'' باس نے کہا۔ ''گیارہواں وہ خود ہے۔ اب میرے پاس گنتی کے مخصوص آدمی ہیں۔ اس باسٹرڈ نے میری مہینوں بلکہ برسوں کی محنت پر پانی پھیر دیا۔''

''یہ بھی تمہاری ہی غلطی ہے۔ تم نے اپنے قیمتی آدمیوں کو اس جنگ میں جھونکا ہی کیوں؟ میں اسے جنگ ہی کہوں گا، جنگ میں افسر نہیں بلکہ جوان کام آتے ہیں۔''

اس وقت باس کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا، پھر سیل فون کان سے لگا کر بولا۔ ''ہاں، ایڈی! کیا خبر ہے؟''

''ہم کراچی پہنچ چکے ہیں۔ ہمارا ٹارگٹ بھی کراچی ہی میں ہے۔ میں آج ہی آپ کو خوش خبری سناؤں گا۔''

''میں اس خوش خبری کا انتظار کروں گا اور تمہیں خصوصی انعام بھی دوں گا۔'' باس نے کہا۔

''میں بھی معلوم کروں کہ برڈ کہاں ہے۔'' مائیکل نے کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔ وہ نمبر ڈائل کرتے ہی والا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ مائیکل ہنس کر بولا۔ ''ابھی میں نے برڈ کا نام لیا اور اس کی کال آگئی۔ خوش خبری تو برڈ سنائے گا۔'' اس نے سیل فون کی کال ریسیو کر کے کان سے لگا لیا اور بولا۔ ''ہاں برڈ بولو... کیا... تم برڈ نہیں ہو... پھر کون ہو تم؟ برڈ کے ساتھی ہو... برڈ کہاں ہے؟... کیا... جہنم میں جاؤ۔'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون میز پر پٹخ دیا۔

''کیا ہوا؟'' باس نے پوچھا۔

''یہ خاور واقعی کوئی بدروح ہے۔ اس نے برڈ کو بھی ہلاک کر دیا ہے۔''

اس کی بات سن کر باس پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔

''ہنسو مت۔'' مائیکل چڑ کر بولا۔ ''جو آدمی برڈ کو ہلاک کر سکتا ہے، وہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہو سکتا۔ تم نے اپنا ایک بہترین آدمی کھو دیا۔''

''وہ بہترین آدمی اب ایک ایک کر کے میرے تمام لوگوں کو مار رہا ہے۔ دیکھو، ایڈی کیا کرتا ہے؟''

''تم اب اس ملک سے اپنا بلکہ ہم سب کا بوریا بستر گول سمجھو، ایک آدمی نے تمہاری اس ناقابلِ تسخیر تنظیم میں دراڑیں ڈال دیں۔''

''اس آدمی کے لیے اب مجھے خود میدان میں نکلنا پڑے گا۔'' باس نے کہا۔

اس مرتبہ مائیکل کی ہنسی بہت طنزیہ تھی۔ ''تم... تم میدان میں نکل کر کیا کرو گے؟ کیا تم برڈ اور ایڈی سے زیادہ بڑے فائٹر ہو؟''

''پھر میں کیا کروں؟'' باس الجھ کر بولا۔

''میں نے کہا نا کہ اپنا بوریا بستر گول کرو اور یہاں سے نکل جاؤ۔''

''اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں۔'' باس نے کہا۔

''تو پھر یہیں بیٹھ کر اس وقت کا انتظار کرو جب خاور اپنے ملک کی کسی خفیہ ایجنسی کے پاس پہنچ کر تمہیں پولیس کے حوالے کر دے۔''

☆☆☆

وہ تینوں ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خاور شیو کرنے اور نہانے کے بعد خاصا نکھرا نکھرا نظر آ رہا تھا۔

''یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو خاور؟'' نینا نے کہا۔ ''اور یہ لوگ کون ہیں جو تمہارے دشمن ہیں؟''

''یہ بہت لمبی کہانی ہے نینو!'' خاور اسے پیار میں نینو کہا کرتا تھا۔ ''لیکن اب یہ چکر جلد ہی ختم ہونے والا ہے۔''

''پہلے مجھے بتاؤ کہ یہ کون لوگ ہیں اور تمہارے دشمن کیوں ہو رہے ہیں؟'' نینا نے منہ بنا کر کہا۔

''یہ لوگ۔'' خاور نے کہا اور اس کے سامنے ماضی کی فلم سی چلنے لگی۔

☆☆☆

''جب تم نے مجھے گاؤں سے فرار کا مشورہ دیا تھا تو میرے ذہن میں یہ تھا کہ مجھے لاہور یا کراچی میں کوئی ملازمت مل جائے گی۔

میں ملازمت کی تلاش میں دھکے کھا رہا تھا۔ اس دن

بھی میں ایک کمپنی سے مایوس ہو کر نکلا تھا اور پیدل ہی ایک طرف جارہا تھا کیونکہ اس وقت میرے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ میں بس میں سفر کرسکوں۔ میں عارضی طور پر اپنے ایک دوست کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس بے چارے کی بھی بہت معمولی سے ملازمت تھی۔ مہینے کے دس دن تو وہ خود ادھار پر کھانا کھاتا تھا۔ میں اس پر بوجھ کیسے بن سکتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس نے مجھے اپنے چھوٹے سے کمرے میں سونے کے لیے جگہ دے دی تھی۔

میں کچھ دور چلنے کے بعد ہی پسینے میں شرابور ہوگیا۔ لاہور میں یوں بھی بہت شدید گرمی پڑتی ہے۔ اچانک ایک کار مجھ سے کچھ فاصلے پر رکی۔ میں اس کے نزدیک پہنچا تو کار والے نے کہا۔ ''آپ کہاں جائیں گے آیئے، میں آپ کو ڈراپ کردوں۔''

اس وقت میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ آخر اس شخص کی مہربانی کا مقصد کیا ہے۔ وہ مجھے ملازمت کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ گلبرگ کا ایک بہت عالی شان بنگلا تھا۔ مجھے وہاں لے جانے والے نے بتایا کہ یہ ملک اکبر کا بنگلا ہے۔ وہ بہت بڑے ٹرانسپورٹر ہیں۔ یہاں تمہیں ملازمت مل جائے گی پھر واقعی مجھے ملازمت مل گئی اور میں ملک صاحب کی بسوں اور ٹرکوں کی آمدورفت کا ریکارڈ رکھنے لگا۔ پھر ملک صاحب نے مجھے ایک اور صاحب کے حوالے کردیا۔ وہ بظاہر کسی سیکیورٹی ایجنسی کے مالک تھے اور انہیں کچھ گارڈز کی ضرورت تھی۔ وہاں تنخواہ خاصی معقول تھی لیکن پہلے مجھے ٹریننگ کرنا تھی۔ وہاں مجھے بہت سخت ٹریننگ کرائی گئی۔ مجھے نشانہ بازی کی تربیت دی گئی۔ سوئمنگ اور گھڑسواری بھی اس تربیت میں شامل تھی۔ میں کبھی کبھی سوچتا تھا کہ وہ کیسی سیکیورٹی ایجنسی ہوگی جس میں اس قسم کے کمانڈو ٹائپ گارڈز ہوں گے۔ میں نے جان توڑ محنت کی۔ تربیت کے بعد مجھے ایک مخصوص قسم کا مشروب دیا جاتا تھا۔ یہ کہہ کر یہ توانائی اور قوت کے لیے بہت ضروری ہے۔

مزید دو مہینے بعد میں روبوٹ کی طرح ان لوگوں کے احکامات ماننے لگا۔ مجھے یاد نہیں کہ اس دور میں ان لوگوں نے مجھ سے کتنے غیر قانونی کام لیے۔ مجھ سے ٹارگٹ کلنگ کرائی گئی۔ میں نے کئی جگہ دھماکے بھی کیے۔ میرے ساتھ بائیس لڑکے اور تھے۔ وہ سب بھی میری طرح تربیت یافتہ اور ان کے احکامات کی پابندی کرنے والے تھے۔ ان کا وہ مشروب بلاناغہ ہر لڑکے کو دیا جاتا تھا۔ پھر مجھے صرف یہ یاد رہتا تھا کہ مجھے باس کے ہر حکم کو ماننا ہے۔ ایک سال بعد میرا شمار باس کے سینئر اور قریبی لوگوں میں ہونے لگا۔ اس نے میرے سپرد ایک نئی ڈیوٹی کردی۔ مجھے مختلف شہروں میں رہ کر وہاں سے نوجوانوں کو گھیرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے باس نے مختلف شہروں میں میرے لیے بنگلوں کا بندوبست کیا۔ نوجوانوں کے علاوہ میرا کام سرکاری اہلکاروں کو بھی گھیرنا تھا۔ اس مقصد کے لیے باس نے مجھے لاکھوں روپے دیے اور میں نے بے شمار سرکاری اہلکاروں کو رشوت دے کر باس کے غیر قانونی کام کرائے۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ میں کب اس تنظیم کا حصہ بنا اور کب اس کے سینئر لوگوں میں شمار ہونے لگا۔ ان لوگوں کا ایک اصول یہ تھا کہ اگر کوئی ممبر تین دن تک غائب رہتا تھا تو اس پر جانوروں کی طرح تشدد کیا جاتا تھا اور اسے وارننگ دے کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ کوئی ممبر ایک ہفتے تک غائب رہے تو تنظیم کے بڑوں کی طرف سے اس کے بلیک وارنٹ جاری کردیے جاتے تھے۔ اب دوسرے ممبرز کی یہ ذمے داری تھی کہ وہ اس ممبر کو تلاش کر کے لائیں۔ اگر وہ آنے میں پس و پیش کرے تو اسے ہلاک کردیا جائے۔ کئی لوگوں کو میں نے بھی ہلاک کیا، بہت سے ممبرز پر بہت شدید تشدد کیا۔

اس دن میں مری سے واپس پنڈی آرہا تھا کہ میری ویگن کھڈ میں گرگئی۔ میرے پاس گاڑی بھی تھی لیکن میں.... نہ جانے کیوں ویگن کے ذریعے مری گیا تھا اور ویگن میں واپس آرہا تھا۔

میں اس حادثے میں بچ تو گیا لیکن میری یادداشت جاتی رہی۔ اسپتال میں مجھے ساجد نے پہچان لیا۔ اس سے آگے کی کہانی تو ساجد نے تمہیں سنائی ہوگی؟'' خاور بولتے بولتے تھک گیا تھا۔

''تم اتنے غیر قانونی کام کرتے رہے اور تمہیں کچھ یاد نہیں ہے؟'' ساجد نے پوچھا۔

''مجھے سب کچھ یاد ہے۔ ہاں، اس وقت شاید میرا دماغ ماؤف ہوتا تھا جب میں وہ کام کررہا ہوتا تھا۔ کبھی کبھی میں بالکل ہوش میں آجاتا تھا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا تھا۔ یہ ڈی وی ڈیز، میموری کارڈ اور یو ایس بی میں نے ضمیر کی اسی خلش سے بچنے کے لیے بنائے تھے۔ میرے لاشعور میں تھا کہ میں غلط کررہا ہوں اور یہ لوگ بھی غلط ہیں۔ میں نے ان لوگوں کے خلاف ایسے ایسے ثبوت ان ڈی وی ڈیز میں محفوظ کیے ہیں کہ جب یہ ملک کی کسی خفیہ ایجنسی یا حکومت کے ہاتھ لگیں گے تو ملک میں بھونچال آجائے گا۔

اس تنظیم میں بڑے بڑے، نیک نام لوگ ملوث ہیں۔ انہیں بھی شاید بلیک میل کیا گیا ہے یا پھر پیسے کا لالچ دے کر خریدا گیا ہے۔'' خاور نے اس اسٹف کا پاؤچ نینا اور ساجد کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''کل میں یہ اسٹف حکومت کے کسی ذمّے دار شخص کے حوالے کردوں گا۔''

''اور وہ شخص اگر غیر ذمّے دار ہوا تو؟'' ساجد نے کہا۔

''اس وقت بھی دو ادارے پاکستان میں بہت دیانت داری سے اپنا کام کررہے ہیں۔ عدلیہ اور فوج۔'' خاور نے کہا۔ ''میں یہ اسٹف یا تو ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے حوالے کروں گا یا پھر پاکستان آرمی چیف کے حوالے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ لوگ فوری ایکشن لیں گے اور اس شیطان تنظیم کے ہر آدمی کو سلاخوں کے پیچھے پہنچائیں گے۔ میں تم لوگوں سے بھی یہی کہہ رہا ہوں کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو تم لوگ بھی یہ اسٹف کسی ذمّے دار آدمی کے حوالے کردینا۔'' پھر خاور نے گھڑی دیکھی اور ہنس کر بولا۔ ''مسز شہزاد! آپ آرام کریں، مسٹر شہزاد اب ساجد کے کمرے میں جا کر سوئیں گے۔''

''ایسا کب تک چلے گا؟'' نینا نے کہا، پھر اپنی بات پر خود ہی جھینپ کر رہ گئی۔

''تمہیں بہت جلدی ہے؟'' خاور ہنس کر بولا۔ ''بس اس مشن سے فارغ ہوتے ہی ہم شادی کرلیں گے۔ میرے پاس اتنی دولت ہے کہ میں کراچی یا لاہور میں کوئی معقول قسم کا بزنس بھی کرسکتا ہوں۔''

☆☆☆

ایڈی اپنے دونوں ساتھیوں ناتھن اور البرٹ کے ساتھ ڈیفنس کے ایک بنگلے میں مقیم تھا۔ وہ بہت مکار اور عیار لوگ تھے۔ ان لوگوں نے معلوم کرلیا تھا کہ خاور نے لاہور سے ڈبل کیبن پک اپ خریدی ہے۔ اب ان کے ساتھی کراچی کے ہوٹلوں اور پوش علاقوں میں اس ڈبل کیبن پک اپ کی تلاش میں تھے جس پر لاہور کا رجسٹریشن نمبر ہو۔ ان لوگوں نے اس پک اپ کا رجسٹریشن نمبر بھی حاصل کرلیا تھا۔

''باس!'' ناتھن نے کہا۔ ''کراچی اتنا بڑا شہر ہے۔ ضروری تو نہیں کہ وہ لوگ کسی پوش علاقے یا فائیو اسٹار ہوٹل ہی میں ہوں۔''

''ہاں ضروری نہیں ہے۔'' ایڈی نے کہا۔ ''لیکن جو لائف اسٹائل خاور کا ہے، اس میں وہ کسی چھوٹے یا پسماندہ علاقے میں رہ ہی نہیں سکتا۔ ہر آدمی کی کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ خاور کی کمزوری یہ ہے کہ وہ تعیشات کا عادی ہے۔''

''باس! تم واقعی بہت دور تک سوچتے ہو۔'' البرٹ نے کہا۔

''کل صبح ناتھن ڈیفنس کا جائزہ لے گا، البرٹ کلفٹن کا جائزہ لے گا اور میں کراچی کے ہر اچھے ہوٹل کی پارکنگ لاٹ کا جائزہ لوں گا۔ مجھے امید ہے کہ ہمیں کل تک خاور کا سراغ مل جائے گا۔''

☆☆☆

ان لوگوں نے صبح ہلکا پھلکا ناشتا کیا تھا۔ دوپہر کے وقت نینا نے کہا۔ ''اس ہوٹل کے پھیکے میٹھے کھانے کھا کر منہ کا ذائقہ خراب ہوگیا ہے، آج تو کہیں اور چل کر لنچ کریں گے۔''

''ابھی ہمیں باہر نہیں نکلنا چاہیے۔'' خاور نے کہا۔ ''میں ساجد کو بھیج کر کہیں کھانا منگوا لیتا ہوں۔ یہاں برنس روڈ پر بہت چٹ پٹے اور بہترین کھانے ملتے ہیں۔''

''میں نے برنس روڈ کا علاقہ دیکھا ہے۔'' ساجد نے کہا۔ ''بلکہ وہاں کئی ہفتے تک مستقل کھانا بھی کھایا ہے۔ میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ برنس روڈ سے کھانا لے کر آؤں۔''

...ہمہ آفتاب است

کرکٹ کے ایک کھلاڑی سے ٹیم کا منیجر خاصا نالاں تھا اور دیکھ رہا تھا کہ وہ اپنے غیر ملکی دورے میں کھیل پر توجہ دینے کے بجائے لڑکیوں اور عورتوں میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہے۔ اس نے کھلاڑی سے وعدہ لیا کہ وہ صرف کھیل پر دھیان دے گا اور لڑکیوں سے دور رہے گا۔ کھلاڑی نے وعدہ کرلیا مگر اگلے ہی دن منیجر نے اسے ایک عورت کے ساتھ ایک پارک میں تفریح کرتے دیکھ لیا۔ وہ برافروختہ ہو کر اسی وقت ان دونوں کے سروں پر جا پہنچا اور آگ بگولا ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا حرکت ہے تمہاری...؟''

''جناب گرمی کھانے سے قبل آپ میری بات تو سن لیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں یہ لڑکی کوئی غیر نہیں میری بیوی ہے۔ کل شام کو ہی یہاں پہنچی ہے۔'' کھلاڑی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

منیجر نے انتہائی خون خوار اور غصیلے لہجے میں تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ ''اچھا تو یہ جناب کی بیوی ہے۔ کم بخت! یہ میری بیوی ہے، میری بیوی۔ میں نے کل ہی اس سے کورٹ میرج کی ہے!''

اس نے اپنی گاڑی کی چابی اٹھائی اور ہوٹل سے نکل گیا۔ وہ ٹہلتا ہوا پارکنگ لاٹ میں پہنچا تو اسے خاور کی ڈبل کیبن پک اپ نظر آئی۔ وہ گاڑی تمام گاڑیوں میں نمایاں تھی۔ ساجد کی کرولا اور ڈبل کیبن پک اپ کے درمیان دو گاڑیاں تھیں۔

اچانک پارکنگ لاٹ میں سیاہ رنگ کی ایک ہنڈا سوک داخل ہوئی اور وہ پارکنگ میں دائرے کی شکل میں گھومی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے ڈرائیور کو کسی مخصوص گاڑی کی تلاش ہو۔ پھر وہ خاور کی ڈبل کیبن پک اپ کے ساتھ آکر ٹھہر گئی۔ اس کا ڈرائیور گاڑی سے اترا تو ساجد چونک اٹھا۔ وہ کوئی غیر ملکی تھا۔ اس نے اشارے سے پارکنگ لاٹ میں کام کرنے والے لڑکے کو بلایا اور پوچھا۔ ”یہ ڈبل کیبن پک اپ کس کی ہے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال لیا۔

”مجھے ان صاحب کا نام تو معلوم نہیں ہے۔“ لڑکے نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ صاحب اپنی بیگم کے ساتھ یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ آپ کو کاؤنٹر سے معلوم ہوجائے گا کہ ان کا نام کیا ہے اور وہ کس روم میں ہیں۔“

ساجد کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور خاور کا نمبر ڈائل کر کے بولا۔ ”خطرہ، تم دونوں فوراً یہاں سے نکلو۔ میں پارکنگ میں موجود ہوں۔ کمرے کی چابی کاؤنٹر پر دے کر کہنا کہ ہم ایک ضروری کام سے حیدرآباد جارہے ہیں لیکن ہمارا کمرا ریزرو رہے گا۔ ہم کل تک واپس آئیں گے۔ جلدی کرو۔“ یہ کہہ کر وہ ایڈی کے پیچھے دوڑا اور بولا۔

”صاحب... صاحب... میری بات سنیں صاحب۔“

”کیا ہے؟“ ایڈی چلتے چلتے رک گیا۔

”آپ وہی ہیں نا صاحب جن پر میں نے شراب کے نشے میں ہاتھ اٹھایا تھا؟“

”وہاٹ ربش۔“ ایڈی نے کہا۔ ”میں وہ نہیں ہوں۔“

”صاحب! مجھے واقعی بہت افسوس ہے، پلیز مجھے معاف کردیں۔“

”کس بات کے لیے معاف کردوں؟“ ایڈی نے کہا۔

”میں نے آپ کو تھپڑ مارا تھا سر۔“ ساجد نے اس کی راہ میں حائل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ خاور اور نینا کو باہر نکلنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

ایڈی نے اسے گھور کر دیکھا اور بولا۔ ”جاؤ معاف کیا۔“

اس نے آگے بڑھنا چاہا تو ساجد پھر اس کے راستے میں آگیا۔ ”ایسے نہیں صاحب۔“ ساجد نے کہا۔ ”آپ نے مجھے دل سے معاف نہیں کیا۔ آپ بھی مجھے تھپڑ ماریں... مجھے ماریں پلیز۔“ وہ اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔

”کیا تو پاگل ہے؟“ ایڈی ہنس کر بولا۔ ”جاؤ معاف کیا، اب یہاں سے دفع ہوجاؤ۔“

”صاحب... آپ مجھ سے اب بھی ناراض ہیں۔“ ساجد نے کہا۔ اس نے خاور اور نینا کو پارکنگ لاٹ کی طرف آتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر ایڈی کے پیروں سے لپٹ گیا اور بولا۔ ”سر! آپ مجھے تھپڑ ماریں... مجھے ماریں سر۔“

”پیچھے ہٹ۔“ ایڈی نے ایک مرتبہ پھر ساجد کو دھکیلا۔ ”اب میں واقعی تھپڑ ماردوں گا۔“

ساجد بڑبڑاتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ ”کوئی میری بات ہی نہیں سنتا... کوئی مجھے معاف ہی نہیں کرتا... ساری دنیا مجھ سے ناراض ہے۔“

ایڈی کی نظروں سے اوجھل ہوتے ہی ساجد، خاور کی طرف دوڑا جو ڈبل کیبن پک اپ اسٹارٹ کر کے پارکنگ کے باہر جانے والے راستے کی طرف آرہا تھا۔ ساجد جھٹ پک اپ کی عقبی نشست والے حصے میں بیٹھ گیا اور خاور نے گاڑی برق رفتاری سے پارکنگ لاٹ سے نکال لی۔ مین روڈ پر آنے کے بعد اس نے ساجد سے پوچھا۔ ”یہ سب کیا تھا؟“

ساجد نے سب کچھ اسے تفصیل سے بتادیا۔

”اس کا مطلب ہے کہ اس پک اپ سے آج ہی پیچھا چھڑانا ہوگا ورنہ جانے کون کون اس گاڑی کے ذریعے مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔“

”صرف گاڑی ہی نہیں بلکہ ہمیں فوری طور پر وہ ہوٹل بھی چھوڑنا پڑے گا۔ اس شخص نے گاڑی کے ذریعے خاور کے بارے میں جاننے کی کوشش کی ہوگی اور استقبالیہ کلرک نے اسے بتادیا ہوگا کہ مسٹر شہزاد کس روم میں مقیم ہیں لیکن وہ لوگ ابھی ابھی حیدرآباد کے لیے نکلے ہیں۔ اب شاید وہ کل یا پرسوں واپس آئیں۔“

”یہ تم نے بہت عقل مندی کی کہ ہمیں ہوٹل سے باہر نکال لیا۔ دوسری عقل مندی یہ کی کہ اس شخص کا راستہ روک لیا۔“ خاور نے ہنس کر کہا۔ ”ویسے تم اس سے کیا کہہ رہے تھے؟“

جب ساجد نے اسے بتایا، وہ اس غیر ملکی سے کیا کہہ

رہا تھا تو خاور نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نینا تو اتنی ہنسی کہ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ وہ ہنستے ہنستے بولی۔ ''وہ بھی سوچ رہا ہوگا کہ کس پاگل سے میرا واسطہ پڑ گیا۔ وہ واقعی مار دیتا تو تم کیا کرتے؟''

''میں بھی جواب میں اس کے زوردار تھپڑ رسید کر دیتا یا پھر روتا ہوا اس کے پیروں میں لپٹ جاتا کہ ایک تھپڑ اور۔''

وہ لوگ باتیں کرتے ہوئے پی ای سی ایچ سوسائٹی میں واقع گاڑیوں کے ایک شوروم میں پہنچ گئے۔

وہاں پک اپ دے کر خاور نے ایک لینڈ کروزر خرید لی۔ اس میں اسے خاصا نقصان بھی ہوا۔ وہ تو بی ایم ڈبلیو یا پراڈو لینے کے چکر میں تھا لیکن ساجد نے اسے روک دیا کہ پھر اچھی گاڑی مت خریدو جو دوسری گاڑیوں میں نمایاں ہو۔ ایڈی کا اندازہ بہت درست تھا کہ خاور پُرتعیش زندگی گزارنے کا شوقین ہے۔ گاڑی تبدیل کرنے کے بعد وہ پھر ہوٹل پہنچے اور گاڑی کو باہر ہی ایک جگہ پارک کر کے وہ لوگ پیدل ہی ہوٹل میں داخل ہوئے۔

خاور سیدھا استقبالیہ پر پہنچا اور کلرک سے بولا۔ ''میں چیک آؤٹ کرنا چاہتا ہوں۔''

''او کے سر۔'' کلرک مسکرا کر بولی اور اس کا حساب بنانے لگی۔ اس دوران میں نینا اوپر جا کر پورٹر کے ذریعے خاور کے دونوں بیگ لے آئی۔

ساجد نے بھی اپنا سامان نکال لیا اور وہ بھی چیک آؤٹ کرنے کے لیے استقبالیہ پر پہنچ گیا۔ چیک آؤٹ کرنے کے بعد اس نے پارکنگ لاٹ بوائے کے ذریعے اپنی گاڑی منگوائی اور وہ لوگ اس گاڑی میں سوار ہو کر ہوٹل سے نکل گئے۔

☆☆☆

ایڈی دوبارہ ہوٹل پہنچا اور استقبالیہ کلرک سے شہزاد خان کے بارے میں پوچھا تو اس نے کی بورڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''جی ہاں موجود ہیں۔''

ایڈی لفٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کاؤنٹر کلرک کو خیال آیا کہ مسٹر شہزاد تو چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔ اس نے ایڈی کو بلانے کی کوشش کی لیکن وہ لفٹ میں داخل ہو چکا تھا۔

ایڈی سیدھا چوتھے فلور پر پہنچا کیونکہ خاور کا کمرا اسی فلور پر تھا۔ خاور کے کمرے کے سامنے پہنچ کر اس نے کی ہول سے جھانکنے کی کوشش کی۔

اسی وقت ایک ویٹر وہاں آیا۔ اسے کاؤنٹر کلرک نے بھیجا تھا تا کہ وہ ایڈی کو اطلاع دے سکے کہ مسٹر شہزاد چیک آؤٹ کر چکے ہیں۔ ویٹر نے ایڈی کو الٹی سیدھی حرکتیں کرتے دیکھا تو حیرت زدہ رہ گیا۔ ایڈی کی ہول سے اس کمرے میں جھانکنے کے بعد اب کال بیل بجا رہا تھا پھر وہ عجیب ہی آواز میں بولا۔ ''روم سروس پلیز۔''

ویٹر ایڈی کو پاگل سمجھ رہا تھا۔ اچانک اس نے عجیب سی گن نکالی اور کمرے کے لاک پر فائر کرنا چاہا تو ویٹر بے اختیار بولا۔ ''اے مسٹر! یہ کیا کر رہے ہو؟''

ایڈی نے گھوم کر ویٹر کو دیکھا تو ویٹر پلٹ کر نیچے کی طرف بھاگا اور دو دو سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتا ہوا نیچے کی طرف گیا۔

اس نے کاؤنٹر کلرک کو ساری حقیقت بتا دی۔ کاؤنٹر کلرک نے فوراً ہوٹل سیکیورٹی کو الرٹ کر دیا۔ دو گارڈز اور چیف سیکیورٹی آفیسر ہوٹل کے صدر دروازے کے پاس کھڑے ہو گئے۔

ایڈی اچانک ظاہر ہوا۔ وہ بے نیازی سے چلتا ہوا کاؤنٹر تک پہنچا اور استقبالیہ کلرک سے بولا۔ ''مسٹر شہزاد شاید موجود نہیں ہیں، وہ آئیں...''

''مسٹر شہزاد چیک آؤٹ کر گئے ہیں مسٹر۔ اس وقت مجھے خیال نہیں رہا تھا۔''
''او شٹ۔'' ایڈی نے کہا۔ ''اب اگر میں مسٹر شہزاد کے بجائے کسی اور کے روم پر یہ پٹاخہ چھوڑ دیتا تو وہ شاید مجھے پاگل سمجھتا۔''
''ہمارے ہوٹل میں آتش بازی اور دھماکے وغیرہ الاؤ نہیں ہیں سر۔'' کاؤنٹر کلرک سرد لہجے میں بولی۔
''سوری۔'' ایڈی نے کہا اور وہاں سے نکل گیا۔
ایڈی کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ شکار ہاتھ آ کر نکل گیا تھا۔ وہ لوگ اگر صبح مجھے مل جاتے تو میں اسی وقت ان کا کام تمام کر دیتا۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اپنے اپارٹمنٹ پہنچ گیا۔
وہ گھر میں داخل ہوا تو البرٹ نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ ''سر! ایک زبردست خبر ہے۔ میں نے آج اس ڈبل کیبن پک اپ کو دیکھ ہی لیا۔''
''کہاں؟'' ایڈی بے تابی سے بولا۔
''پی ای سی ایچ سوسائٹی کے ایک شوروم میں۔'' البرٹ نے جواب دیا۔
''میرے ساتھ چلو۔'' ایڈی نے کہا اور البرٹ کو لے کر باہر نکل آیا۔ اس نے ناتھن کو ہدایت کردی کہ تم یہیں رہنا۔
ایڈی اور البرٹ گاڑیوں کے شوروم پر پہنچے۔ وہاں ڈبل کیبن پک اپ واقعی موجود تھی۔
اسے دیکھ کر شوروم کا ایک سیلز مین اس کے نزدیک آ گیا۔
ایڈی نے ڈبل کیبن پک اپ کا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ ''یہ گاڑی...''
''بہت بہترین گاڑی ہے سر، لیٹسٹ ماڈل ہے اور...''
''میں جانتا ہوں۔'' ایڈی جھنجلا کر بولا۔ ''میں یہ پوچھ رہا ہوں کہ یہ گاڑی میرے دوست شہزاد کی گاڑی ہے نا؟''
''سوری سر۔'' سیلز مین بولا۔ ''یہ ہمارے شوروم کی گاڑی ہے۔''
ایڈی اس کے جواب پر جھنجلا گیا لیکن ابھی اسے معلومات چاہیے تھیں اس لیے وہ اپنا غصہ پی گیا اور بولا۔ ''میرا مطلب ہے کہ یہ گاڑی میرے دوست شہزاد خان نے ہی فروخت کی ہے نا؟''
''مجھے اس بارے میں علم نہیں۔'' سیلز مین بولا۔ ''آپ فرمائیے کیا آپ کو یہ گاڑی چاہیے؟''

''تم ذرا منیجر کو یہاں بھیج دو۔'' ایڈی نے جھنجلا کر کہا۔
منیجر نے اسے بتایا کہ گاڑی مسٹر شہزاد نے بیچی ہے۔ اس کے بدلے میں انہوں نے جدید ماڈل کی لینڈ کروزر خریدی ہے۔ ایڈی کے زور دینے پر منیجر نے اسے گاڑی کا رجسٹریشن نمبر بھی بتا دیا۔
''دراصل، میں اپنے دوست کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ مجھے ایک پراڈو کی تلاش ہے۔ جدید ماڈل کی پراڈو۔''
''مل جائے گی سر۔'' منیجر خوش ہو کر بولا۔ ''گاڑی شام تک یہاں پہنچ جائے گی۔ آپ شام کو آ کر پتا کرلیں۔''
''اوکے، اوکے۔'' ایڈی نے کہا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

ساجد تو چاہتا تھا کہ کل کسی ذمے دار افسر کے پاس جائے لیکن نینا نے کہا کہ کل ہی کیوں؟ آج کیوں نہیں۔ جتنی جلدی ہمارے سر سے بوجھ اتر جائے، اتنا ہی اچھا ہے۔
''نینا ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' خاور نے کہا۔ ''لیکن پرابلم یہ ہے کہ اس وقت کوئی بھی اہم آدمی اپنے آفس میں ملے گا نہیں۔''
''ہاں، یہ تو ہے۔'' نینا نے کہا، پھر بولی۔ ''لیکن کل ہم پہلا کام یہ کریں گے کہ یہ اسٹف کسی ذمے دار افسر کے حوالے کر کریں گے، اس کے بعد کچھ کریں گے۔''
خاور اپنی عادت کے مطابق اس وقت بھی میریٹ ہوٹل کے ایک سوئٹ میں موجود تھا۔

☆☆☆

ایڈی، خاور کے بچ نکلنے پر بری طرح تلملا رہا تھا۔ اگر وہ پاگل بیچ میں نہ آتا تو شاید میں خاور کو پکڑ لیتا۔ اس نے سوچا۔
اچانک اس کے سیل فون کی بیل بجی۔ اس نے اسکرین پر نمبر دیکھا۔ پھر بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔
''ہیلو؟''
''ہائے ایڈی۔'' دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ''آئی ایم جون فرام مائیکل۔''
''ہائے جون۔'' ایڈی ہنس کر بولا۔ ''کیسے ہو؟''
''میں اور میرے تین ساتھی نیچے موجود ہیں۔'' جون نے کہا۔ تم مجھے اوپر بلاؤ گے تو کوئی حال احوال بتاؤں گا۔''
''اگر تم یہ بات پہلے بتا دیتے تو اتنا پرابلم نہ ہوتا، میں آ رہا ہوں۔''
جون نے کہا۔ ''میں چار دن سے کراچی میں ہوں۔ میں واپس جانے والا تھا کہ مجھے مائیکل کی کال موصول

ہوئی۔ اس نے کہا کہ جا کر ایڈی کی ہیلپ کرو۔"
"میری ہیلپ؟" ایڈی نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔
"اگر تمہیں اعتراض ہے تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔ ہیلپ سے مطلب ہے کہ میں تمہیں افرادی قوت فراہم کروں۔ میرے یہ تین ساتھی ایڈگر، وکرم اور جے مانے ہوئے فائٹر ہیں اور ایک آدمی بیس پر بھاری ہے۔ تم اگر برا مان رہے ہو تو تو پرابلم، میں جا رہا ہوں۔"
"ایک منٹ۔" ایڈی نے کہا۔ "مین پاور کی تو مجھے ضرورت ہے۔ آج مین پاور کی کمی کی وجہ سے خاور میرے ہاتھ آ کر نکل گیا۔"
"وھاٹ؟" جون نے کہا۔ "تم نے خاور کو دیکھا تھا؟"
"میں اس تک پہنچ گیا تھا لیکن وہ کم بخت عین وقت پر وہاں سے نکل گیا۔ نو پرابلم میں اس مرتبہ اسے نہیں چھوڑوں گا۔"
"تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟" جون نے پوچھا۔
"مجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں ہے۔ میں اس مرتبہ کوئی بھی رعایت کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ اسے گھیرنے کے لیے مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے گی۔"
"ضرور، ضرور۔" جون نے کہا۔

☆☆☆

صبح ناشتا کرنے کے بعد خاور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس کے گھر پر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے یہی طے کیا تھا کہ یہ اسٹف آفس میں نہیں بلکہ کسی ذمے دار آدمی کے گھر جا کر اس کے حوالے کرے گا۔ اس نے دونوں ہولسٹرز میں ماؤزر لگائے۔ کرنسی نوٹ اپنے والٹ میں رکھے، اس نے ایک ایک ماؤزر نینا اور ساجد کو بھی دے دیا کہ راستے میں اگر کوئی رکاوٹ ہو تو اسے بے دھڑک صاف کیا جا سکے۔

☆☆☆

ایڈی نے حسب معمول ہوٹل کے پارکنگ لاٹ کا راؤنڈ لگایا۔ گزشتہ کئی روز سے یہ اس کا معمول تھا کہ وہ بڑے بڑے ہوٹلوں کے پارکنگ لاٹس کا چکر لگاتا تھا۔
اس کی نظر اچانک لینڈ کروزر پر پڑی تو وہ چونک اٹھا۔ اس نے رجسٹریشن نمبر دیکھا۔ رجسٹریشن نمبر وہی تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے اپنے آدمیوں اور جون کو ٹیلی فون کر دیا کہ ہوٹل میریٹ پہنچ جاؤ، خاور کا سراغ مل گیا ہے۔ پوری تیاری کے ساتھ آنا۔
پندرہ منٹ کے اندر اندر اس کے آدمی اور جون کے آدمی وہاں پہنچ گئے۔ وہ انہیں ٹکڑیوں میں بانٹ کر ہوٹل کی طرف بڑھ گیا۔

تم سب نے مل کر میری یہ ہانڈی برباد کر دی......
کتنی امید سے میں نے بھاری معاوضے پر تم سب کو بلایا تھا!

☆☆☆

وہ لوگ جانے کے لیے تیار تھے۔ خاور نے اسٹف کا پاؤچ اپنے ہاتھ میں رکھا اور اس کا ایک سرا اپنی کلائی میں ڈال لیا۔
ساجد نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ اچھل کر اندر آ گرا۔ خاور نے نینا کو لے کر چھلانگ لگائی اور کمرے میں رکھے ہوئے بڑے سے صوفے کی اوٹ میں چلا گیا۔
دوسرے ہی لمحے ایڈی اور اس کے ساتھی اندر داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی فائرنگ کر کے ساجد کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ ساجد نے خاور کی طرف دیکھا، آخری ہچکی لی اور فرش پر گر گیا۔
نینا سوکھے پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ جواب میں خاور نے یکے بعد دیگرے تین فائر کیے اور ایڈی کے دونوں آدمی زمین پر گر گئے۔ ایڈی کی قسمت اچھی تھی کہ وہ بچ گیا۔ ورنہ خاور نے اس پر بھی فائر کیا تھا۔
وہ اچھل کر باہر بھاگا۔ خاور اس کے پیچھے بھاگا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ ایڈی اتنی زبردست تیاری کے ساتھ آیا ہوگا۔
خاور پر اچانک دائیں طرف سے کسی نے فائر کیا۔ گولی اس کے بازو میں لگی۔ اس نے پلٹ کر حملہ آور کو گولی کا نشانہ بنا دیا۔ پھر خاور کے ماؤزر نے تین دفعہ شعلے اگلے اور تینوں مرتبہ کربناک انسانی چیخیں سنائی دیں۔ وہ جون کے ساتھی تھے۔ جو بقول اس کے ایک آدمی بیس پر بھاری تھا۔
اچانک ایڈی پلٹ آیا۔ اس نے خاور پر فائر کر دیا۔

گولی خاور کے سینے میں پیوست ہوگئی۔ خاور کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے بمشکل تمام اسٹف کا پاؤچ نینا کے حوالے کیا اور آہستہ سے بولا۔ ''تم یہ پاؤچ کسی ذمے دار افسر تک ضرور پہنچا دینا۔''

''خاور۔'' نینا چیخ کر بولی۔ ''میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔''

اسی وقت ایڈی نے ایک فائر مزید کیا، گولی خاور کے حلق میں لگ کر پشت سے نکل گئی۔ اس نے ہچکی لی اور گردن ایک طرف ڈال دی۔ بالآخر ان لوگوں نے بہت سی جانیں ضائع کرنے کے بعد خاور کو شکار کرلیا تھا۔

نینا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے خاور کے ہاتھ سے پاؤچ لے لیا اور اس کا ماؤزر بھی لے لیا۔

ایڈی کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ نرم و نازک سی سہمی ہوئی لڑکی بھی خطرناک ہوسکتی ہے۔ نینا نے وحشت کے عالم میں دو فائر کیے۔ گولی ایڈی کی کھوپڑی توڑتی ہوئی نکل گئی۔ اس نے پیچھے کی طرف جون کو بھی دیکھ لیا تھا۔ اس نے خاور پر پہلا فائر کیا تھا۔ اس نے گھوم کر اچانک فائر کیا اور جون کا قصہ بھی تمام کردیا۔

ایڈی نے تنظیم کے ان لوگوں کو بھی ٹیلی فون کردیا تھا جو کراچی میں موجود تھے۔ وہ آج ہر قیمت پر خاور کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

نینا نے ان دونوں کو ہلاک کرنے کے بعد پاؤچ سنبھالا اور بھاگتی ہوئی لفٹ کی طرف بڑھی۔ اسی وقت باس کے دوسرے آدمی بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے نینا کو بھاگتے دیکھا تو وہ بھی اس کے تعاقب میں دوڑے۔

نینا گرتی پڑتی نیچے آئی اور بھاگتی ہوئی ہوٹل کی لابی سے باہر نکل گئی۔ وہ لوگ بھی مسلسل اس کے پیچھے تھے اور اس پر فائر بھی کررہے تھے۔

نینا کو اچانک ایسا لگا جیسے اس کی پنڈلی میں آگ بھر گئی ہو۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی بھاگی اور ایک ٹیکسی کو روک لیا۔

ٹیکسی والا صوبہ سرحد سے تعلق رکھتا تھا۔ نینا نے اس سے کہا۔ ''بھائی! مجھے ان لوگوں سے بچاؤ اور جسٹس ہائی کورٹ کے بنگلے پر لے چلو۔'' خاور نے اسے ان کے بنگلے کا پتا بتادیا تھا۔

''فکر مت کرو بہن، یہ خانہ خراب اب تمہارا کچھ نہیں بگاڑسکتا۔'' اس نے ٹیکسی گولی کی سی رفتار سے دوڑا دی۔ نینا کا تعاقب کرنے والے بھی دو گاڑیوں میں سوار تھے۔ وہ ٹیکسی پر بھی فائرنگ کررہے تھے۔ جسٹس کا بنگلا وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن فائرنگ کی وجہ سے ٹریفک کے نظام میں خلل پڑا تھا اس کے باوجود ٹیکسی ڈرائیور بہت مہارت سے راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ جسٹس کے بنگلے سے کچھ فاصلے پر ایک فائر ہوا جو ٹیکسی والے کی گردن میں لگا۔ ٹیکسی اس کے قابو سے باہر ہوکر وہاں کھڑی ہوئی ایک دوسری گاڑی میں گھس گئی۔ نینا دروازہ کھول کر نکلی اور لڑکھڑاتی ہوئی بنگلے تک بھاگی۔

جسٹس صاحب اس وقت شاید باہر نکلنے کی تیاری کررہے تھے۔ اس لیے ان کے بنگلے کا گیٹ کھلا ہوا تھا۔ نینا بے اختیار بھاگتی ہوئی ان کے بنگلے میں داخل ہوگئی۔ ان کا ڈرائیور گاڑی چلا چکا تھا۔ وہ گاڑی کے بونٹ سے ٹکرائی اور نیچے گر پڑی۔ دوسرے ہی لمحے جسٹس صاحب اور ان کے گارڈز اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس نے وہ اسٹف ان کے حوالے کیا اور خود بے ہوش ہوکر گرگئی۔

☆☆☆

تھوڑی دیر بعد ہر ٹی وی چینل سے یہی خبر نشر ہو رہی تھی کہ حکومت نے دہشت گردوں کے ایک بہت بڑے نیٹ ورک کا سراغ لگایا ہے..... رینجرز، پولیس اور دوسرے حساس ادارے ملک بھر میں چھاپے مار رہے ہیں۔

☆☆☆

گولی نینا کی پنڈلی کا گوشت ادھیڑتی ہوئی نکل گئی تھی۔ اس کی ہڈی کو نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ اسپتال سے نکلی تو سول اور پولیس کے اعلیٰ حکام نے اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ نینا نے کسی بھی قسم کا ایوارڈ لینے سے انکار کردیا اور بولی۔ ''میں اپنے گاؤں جانا چاہتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ میرے بھائی مجھے ماردیں گے لیکن اس کے باوجود میں گاؤں جانا چاہتی ہوں۔'' ابھی تک اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کا باپ اور بھائی یہ دنیا چھوڑ چکے ہیں۔

پھر وہ بوجھل قدموں سے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ جاتے ہوئے وہ بری طرح بلک بلک کررو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''خاور! تمہارا تو بلیک وارنٹ جاری ہوگیا تھا۔ تم تو مجھے چھوڑ کر چلے گئے، تم نے میرے ساتھ بہت دھوکا کیا ہے خاور! میں... اب کیا کروں... میرا بلیک وارنٹ کب جاری ہوگا... میں کس کے سہارے جیوں گی؟'' وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسے روتا دیکھ کر پولیس اور رینجرز کے اعلیٰ حکام کی آنکھیں بھی نم ہوگئیں۔ انہوں نے دل ہی دل میں خاور اور قوم کی اس بہادر بیٹی کو خراج تحسین پیش کیا جس نے اپنا سب کچھ گنوا کر بھی خاور کا مشن پورا کردیا تھا۔

تین تیرا

امجد رئیس

مکانات دیکھنے میں ایک ہی جیسی وضع قطع رکھتے ہوں تو دیکھنے والوں پر خوش کن تاثر چھوڑ جاتے ہیں... اس کالونی کے مکانات کا طرزِ تعمیر یکساں تھا... ہر مکان دیکھنے میں ایک ہی جیسا دکھائی دیتا تھا... وہ وہاں کا مستقل رہائشی تھا... مگر پھر بھی وہ غلطی کر بیٹھا... جس کی تلافی ممکن نہ تھی...

سسپنس اور تھرل سے بھرپور مختصر مگر یادگار شاہکار...

آدھی رات بیت چکی تھی۔ سب وے اسٹیشن سے گنتی کے لوگ برآمد ہوئے۔ ہیری عمداً سب سے آخر میں نکلا تھا۔ وہ ایک ہینڈسم اور وجیہہ شخصیت کا مالک تھا۔

اسٹیشن ''سنی ہلز'' سے قریب تھا۔ سنی ہلز، چھوٹے مکانات پر مشتمل... یہ پروجیکٹ وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔

ہیری کے پاس ٹوپی اور دستانوں کے علاوہ ایک چھری بھی تھی۔ یہ اشیا وہ ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ کب موقع ملے گا اس لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔ شاید آج رات موقع مل جائے یا پھر چند ہفتوں بعد... گارڈ کی نگاہوں سے بچنا ضروری تھا۔ گارڈ چند منٹ کے لیے بھی جگہ سے ہٹتا تو اسے موقع مل جاتا۔

ہیری کے منصوبے بے عیب ہوتے تھے۔ وہ خاصا ہوشیار تھا اور جلد بازی سے کام نہیں لیتا تھا۔ میری کے ساتھ اس نے تقریباً تین برس گزار لیے تھے۔ میری ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں پارٹ ٹائم ملازمت کرتی تھی۔ وہ ہر ہفتے معاوضے کا لفافہ ہیری کے حوالے کر دیتی۔ وہ اس بات پر خوش تھی کہ دونوں مل کر ایک بچت اکاؤنٹ کو ترقی دے رہے ہیں جبکہ ہیری جو کچھ کماتا، اپنی ذات پر خرچ کر دیتا تھا۔ اس کا اپنا اسٹائل تھا۔

شاید وہ کچھ عرصہ مزید میری کے ساتھ گزار لیتا، اگر ولما ان کے پڑوس میں نہ آتی۔ وہ کبھی نہیں سمجھ سکا کہ ولما جیسی کافر ادا، شعلہ جوالہ... کا سنی ہلز جیسی عام سی رہائش گاہ میں کیا کام تھا۔ اسے تو کسی محل یا ہالی ووڈ میں ہونا چاہیے تھا۔

ولما، بالکل ان کے برابر والے مکان میں آئی تھی۔ وہاں تمام مکان ایک جیسے اور ایک ہی سائز کے تھے۔ حتیٰ کہ رنگ و روغن بھی ایک ہی طرح کا تھا۔ بعض اوقات وہاں کے مکین اپنا مکان پہچاننے میں دھوکا کھا جاتے...

دونوں نے جس لمحے ایک دوسرے کو دیکھا، اسی وقت شعلہ بھڑک اٹھا۔ جیسے ہائی وولٹیج کے تار ایک دوسرے سے ٹکرا گئے ہوں۔ دونوں میں سے کسی نے بھڑکتے جذبات کے خلاف مزاحمت نہیں کی۔ ولما نے ہیری کو بتایا کہ اس کی شاندار ملازمت ختم ہوگئی ہے۔ وہ ایک مشہور نائٹ کلب میں اپنے ناز و انداز اور عشوہ طرازی کی قیمت وصول کرتی تھی۔ تاہم وہ پُراعتماد تھی کہ جلد ہی وہ دوسرے کلب میں جگہ بنالے گی۔ ہیری کو یقین تھا کہ وہ بہ آسانی ایسا کرسکتی ہے۔

چند روز بعد ہی ہیری نے اپنا تبادلہ نائٹ شفٹ میں کرا لیا۔ دن میں وہ ولما سے ملاقاتیں کرتا۔ اسے برابر والا اپنا مکان برا لگنے لگا اور میری بھی اسے اجنبی دکھائی دینے لگی۔ ایک مرتبہ اس نے ولما سے دل کی یہ بات کہہ دی۔ ”میری کا ایکسیڈنٹ ہو جائے تو اچھا ہے۔ ویسے تو جان چھوٹے گی نہیں۔“

”مطلب، جو تم کرو گے وہ بظاہر حادثہ معلوم ہوگا؟“ ولما نے معنی خیز انداز میں کہا۔

”اگر میں نے کچھ کیا تو صرف تمہارے لیے کروں گا۔“

”کیا طلاق بہتر نہیں ہوگی؟“ ولما نے سوال کیا۔ یہ سوال سے زیادہ ایک تجویز تھی۔

”طلاق میں مالی خسارہ ہے۔“ ہیری نے کہا۔ ”اور تم بھی سرمایہ پسند ہو۔ غلط تو نہیں کہا میں نے؟“

ولما نے جواب میں اپنی گھنیری پلکیں آہستہ سے اٹھائیں۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

☆☆☆

ہیری نے جلد ہی اپنی تیاری شروع کردی۔ اس نے چند DVDs خرید کر گھر پر رکھ دی تھیں۔ ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ سب وے اسٹیشن سے ہر بار وہ آخری ڈبے سے سب سے آخر میں نکلتا۔ احتیاط اچھی تھی۔ اس نے سب وے کی ٹرینوں کا شیڈول اچھی طرح اسٹڈی کیا۔ یہ بھی ضروری تھا۔ رات کی ٹرینوں میں پندرہ پندرہ منٹ کا وقفہ تھا۔

آج کی رات بھی سابقہ راتوں کی طرح تھی۔ وہ آخر میں نکلا۔ کسی نے دھیان نہیں دیا تھا۔ سناٹا تھا۔ ایک کیب ڈرائیور تھا۔ وہ بھی اسٹیئرنگ پر سر رکھے اونگھ رہا تھا۔ سڑک سنسان تھی۔ وہ حسبِ معمول سڑک پار کرکے، سی ہلز میں اپنے بلاک کی طرف چل پڑا۔ اس کا ایک ہاتھ جیب میں چھری کو محسوس کررہا تھا۔ گارڈ کے کیبن کے قریب اس کی رفتار بڑھ گئی۔ معاً نبض کی رفتار بھی بڑھ گئی۔ مائیک ہوگن اپنے کیبن میں نہیں تھا۔ ہنری کو یاد نہیں تھا کہ وہ چھری جیب میں لیے کتنی بار یہاں سے گزرا تھا اور آج اسے موقع مل گیا تھا۔ گارڈ واش روم میں تھا یا کہیں اور بہرحال وہ اپنے کیبن میں نہیں تھا۔

ہنری نے خود کو عجلت سے باز رکھا۔ ٹوپی سر پر لگا کے چہرے پہ جھکالی۔ کوٹ کے کالر کھڑے کردیے۔ وہ مکانات کے قریب ہوتا جارہا تھا۔ رات کے اس پہر کسی نے دیکھا بھی ہوگا تو پہچاننا دشوار تھا۔ اس نے چال بھی بدل ڈالی تھی۔

اپنے بلاک کے کونے پر پہنچ کر اس نے عقب میں جھانکا اور مکان کی طرف دوڑ لگادی۔ مکان کے قریب پہنچ کر اس نے ہیجانی کیفیت کو دبانے کی کوشش کی اور چھری نکال لی ۔ ۔ ۔ ۔ ہتھیلی پر نمی آگئی تھی۔ تاہم اس نے مضبوطی سے دستہ گرفت میں لے کر دوسرے ہاتھ سے چابی نکالی۔

ہیری نے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے چابی دروازے کے لاک میں گھمائی۔ وہ ضرورت سے زیادہ تناؤ محسوس کررہا تھا۔ وہ کوئی سفاک، ظالم شخص نہیں تھا۔ اس وقت وہ اگر میری کا چہرہ دیکھ لیتا تو ہچکچا جاتا۔ تاہم اسے یقین تھا کہ وہ حسبِ معمول خوابِ غفلت میں ہوگی۔

دروازہ کھول کر وہ دبے قدموں جانے پہچانے مکان میں داخل ہوگیا۔ وہ سیدھا خواب گاہ میں آیا۔ وہ کمبل اوڑھے سورہی تھی۔ اسے لمحہ بھر کے لیے حیرت ہوئی۔ وہ منہ ڈھانپ کر نہیں سوتی تھی۔ ”یہ بھی اچھا ہے۔“ ہیری نے سوچا۔ وہ میری کا چہرہ دیکھ کر کشمکش میں پڑ جاتا۔ یہ مشکل مرحلہ تھا، اسی لمحے سے وہ خوف زدہ تھا لیکن اور کوئی حل نہیں تھا۔ اسے بہرحال یہ کرنا تھا۔ اس نے خیالات جھٹک کر وحشیانہ طاقت سے پے در پے کئی وار کیے۔ آخر یہ دشوار مرحلہ گزر گیا۔ میری کو چیخنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ ایک آدھ کراہ کے سوا کچھ نہ تھا۔ شاید وہ پوری طرح بیدار بھی نہ ہوپائی تھی۔

ہیری خواب گاہ کی کھڑکی کے پاس آیا۔ دبیز دستانہ ہاتھ پر چڑھا کر اس نے گھونسا مارا اور کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا۔ کچھ آواز پیدا ہوئی، پھر مکمل سناٹا۔ وہ واردات کو نقب زنی کا رنگ دے رہا تھا۔

اس نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ وقت دیکھ کر اسے حیرت کے ساتھ خوشی ہوئی۔ اس نے محض چھ منٹ میں کام نمٹا دیا تھا۔ باہر نکل کر اس نے دروازہ بند کیا اور بلاک کا چکر کاٹ کر دوسرے راستے سے سب وے کا رخ کیا۔ وہ بے دھڑک بھاگ رہا تھا۔ کوئی گواہ اسے دیکھ لے تو اور اچھا ہوگا۔ پولیس کو گواہ یہی بیان دے گا کہ رات کے اس پہر اس نے کسی کو بھاگتے دیکھا تھا۔ یہ بھی ہیری کے منصوبے کا حصہ تھا۔ ضروری بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے دیکھ لے۔ تاہم اسے اپنے منصوبے کے مطابق عمل کرنا تھا۔ ۔ ۔ اسے ایک بار پھر گھر جانا تھا۔ معمول

کے راستے سے۔ اسے یقین تھا کہ اس مرتبہ روز کی طرح گارڈ سے ملاقات ہوگی...

بھاگتے ہوئے، ایک مخصوص مقام پر اس نے شارٹ کٹ کے لیے راستہ بدلا۔ وہ ایک ویران میدان کو کراس کررہا تھا۔ کوڑے کے ڈھیر کے قریب اس نے تینوں اشیا سے جان چھڑائی۔ پھینکنے سے قبل اس نے چھری کا دستہ، دبیز دستانے سے صاف کردیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اسٹیشن کی حدود میں داخل ہورہا تھا۔ شروع سے آخر تک سب کچھ اس کی منصوبہ بندی کے مطابق ہو گیا تھا۔ اس نے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی۔ اگلی ٹرین کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔

اچانک اسے چابیوں کا خیال آیا۔ اسے غصہ آگیا، یہ بات وہ کیوں بھول گیا۔ اگر پولیس تفتیش کے دوران رسمی طور پر اسے شک کے دائرے میں رکھتی ہے تو پھر پڑوس میں ولما کے گھر کی چابیاں اس کے پاس سے برآمد نہیں ہونی چاہئیں۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیتے ہوئے چابیاں نکالیں۔ ولما کی دی ہوئی چابیاں اس نے ٹرین کی پٹریوں پر ڈال دیں۔ ولما کی جانب سے اسے اطمینان تھا کہ وہ اپنا منہ بند رکھے گی۔

ذہن میں اس نے اب تک کی کارروائی کو دہرایا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ اس نے کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ وہ ایک طرف خالی نیوز اسٹینڈ کے قریب اندھیرے میں سرک گیا۔ ٹرین سر پر پہنچ گئی تھی۔

ٹرین سے گنتی کے مسافر برآمد ہوئے۔ وہ واپس روشنی میں آگیا۔ یوں لگ رہا تھا کہ وہ بھی اسی ٹرین سے اترا ہے۔ واپس جاتے ہوئے وہ کیب کے قریب سے گزرا۔ ڈرائیور بیدار تھا۔

ہیری نے اس کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور تھکے ہوئے انداز میں چلتا رہا۔ اس کا رخ معمول کے مطابق سی ہلز کی جانب اپنے رہائشی بلاک کی طرف تھا۔

وہ مائیک ہوگن کے کیبن کے قریب تھا، اس نے دیکھا کہ گارڈ اپنی جگہ پر ہے۔ اس نے ہوگن کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ یہ منصوبے کا آخری حصہ تھا۔ اسے گارڈ ہوگن کو گھر تک ساتھ لے جانا تھا۔

ہوگن نے بھی ہاتھ ہلایا۔ ہیری بہت پہلے سے تیاری کررہا تھا کہ گارڈ ہوگن سے بے تکلف رہے۔ وہ جانتا تھا کہ ہوگن کو کیسے گھر تک لے جائے گا۔ وہ ہوگن کے قریب چلا گیا۔

''کیسے ہو ہیری؟'' ہوگن نے دانت نکالے۔ ''ہمیشہ کی طرح بھرپور سے۔''

''شکریہ۔'' ہیری نے جواب دیا۔ ''چند ہفتوں کی بات ہے، پھر میں نارمل روٹین میں آجاؤں گا۔''

''پھر تو ہماری ملاقاتیں بھی ختم ہوجائیں گی۔''

''اوہ نہیں، ہاں کم ضرور ہوجائیں گی۔'' ہیری مسکرایا۔

''تمہارے لیے ایک خوش خبری ہے۔''

''وہ کیا؟'' ہوگن نے دلچسپی سے ہیری کو دیکھا۔

''تمہاری پسندیدہ ہیروئن، انجلینا جولی۔''

''کہاں ہے؟'' ہوگن کھڑا ہوگیا۔

''یار، گھر میں ہوگی یا کہیں شوٹنگ میں مصروف ہو گی... میرا مطلب تھا کہ میں تمہارے لیے اس کی DVDs لے آیا تھا۔ میرے گھر پر رکھی ہیں۔''

''ونڈرفل... ابھی چلوں؟''

''ہاں، کیوں نہیں لیکن تمہارا کمپیوٹر کب سے خراب پڑا ہے۔''

''میں اپنے دوست کے پاس چلا جاؤں گا۔ کمپیوٹر میں زیادہ مسئلہ ہے، ابھی ٹھیک نہیں کراسکتا۔'' ہوگن نے کہا۔

''ٹھیک ہے، آجاؤ۔ پانچ منٹ لگیں گے۔''

ہوگن، ہیری کے ساتھ چل پڑا۔

گھر کے قریب پہنچ کر ہیری نے چابیاں نکالیں۔

''آجاؤ۔'' اس نے ہوگن کو اشارہ کیا۔

ہیری نے ڈور لاک میں چابی گھمائی تو وہ پھنسنے لگی۔ اس نے چابی نکال کر جائزہ لیا۔ ''غلط چابی۔'' وہ بڑبڑایا۔

ہیری کو جھٹکا لگا۔ اس نے دوبارہ چابی لاک میں گھسیڑ کر زور لگایا۔ وہ بدحواس ہوچکا تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور میری کا چہرہ نظر آیا۔ اس نے گاؤن اچھی طرح لپیٹا ہوا تھا۔

''اوہ ڈارلنگ کتنا سکون ملتا ہے تمہیں دیکھ کے۔ چند منٹ پہلے میری آنکھ کھلی تھی۔'' میری نے خمار آلود آواز میں کہا۔ ''میں تمہارا انتظار کررہی تھی۔''

ہیری پر سکتہ طاری تھا۔ وہ ناقابلِ یقین نظروں سے اپنی بیوی کو گھور رہا تھا۔ چکر سا آیا اور اس نے ایک ہاتھ دروازے کی چوکھٹ پر رکھ دیا۔ معاً اس کے دماغ میں جھماکا ہوا۔ اس نے دہشت کے عالم میں برابر میں ولما والے دروازے کو دیکھا۔

میری کی آواز دور ہوتی چلی گئی... بہت دور... وہ کہہ رہی تھی۔

''برابر والی عورت کے ساتھ کچھ ہوا ہے ہیری... کسی آواز سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں خوف زدہ تھی اور تمہارا انتظار کررہی تھی۔ شکر ہے تم آگئے۔'' ہیری میں کچھ کہنے اور مزید سننے کی سکت نہیں رہی تھی...

شہر سے تقریباً اسی کلومیٹر دور مشرق کی جانب واقع وہ قصبہ اپنی خوبصورتی کی وجہ سے الگ پہچان رکھتا تھا۔ اس قصبے میں رہائش پذیر لوگوں کے گھروں کی روشنیاں شام ہوتے ہی روشن ہو جاتی تھیں اور سڑک سے ہی دکھائی دینے لگتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس قصبے سے آگے ایک جنگل اور دریا تھا جہاں شکار کھیلنے کے لیے لوگ شہروں سے اس جانب کا رخ کرتے تھے۔ اس قصبے میں دس کمروں کا ایک ہوٹل بھی تھا جہاں شکاری آکر ٹھہرتے تھے۔ وہ ہوٹل اس قصبے کی پہچان بن چکا تھا۔ اکثر رات کو سفر کرنے والے لوگ جب ڈرائیونگ سے تھک جاتے تھے تو رات گزارنے کے لیے اس قصبے کو جانے والی سڑک پر اُتر جاتے تھے اور اس ہوٹل میں کمرا لے کر رات گزارتے اور صبح ہوتے ہی اپنے سفر کا آغاز کر دیتے تھے۔

اُس رات شدید سردی تھی اور آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سڑک پر سفید کار تیزی سے دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر چالیس سال کی عمر کا ایک صحت مند اور جاذب نظر شخص کولن بارو بیٹھا تھا۔ وہ بار بار ونڈ اسکرین سے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا سفر طویل تھا اگر بارش شروع ہو گئی تو اس کے لیے ڈرائیونگ کرنا مشکل ہو سکتا تھا۔ اس کے برابر میں سنہری بالوں، نیلی آنکھوں اور خوبصورت چہرے کی مالک جینی براجمان تھی۔ اس کے چہرے میں ایسی کشش تھی کہ کوئی بھی پہلی نظر میں اس کی محبت میں گرفتار ہو سکتا تھا۔ جینی کی عمر پینتیس سال تھی لیکن اسے دیکھ کر ایسا ہی لگتا تھا جیسے وہ پچیس سال سے زیادہ کی نہ ہو۔ دونوں میاں بیوی تھے اور دونوں کی جوڑی کو دیکھ کر سب رشک کرتے تھے۔

آسمان پر بادل گرجا، بجلی چمکی اور ساتھ ہی بارش کے قطرے زمین کی طرف لپکے۔ اسی وقت کولن کی نظر فیول میٹر کی طرف گئی تو وہ بری طرح چونکا۔ اس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”اوہ... خدایا۔“

”کیا ہوا؟“ جینی فوراً اس کی طرف متوجہ ہوئی۔

”پیٹرول ختم ہونے کے قریب ہے۔ یہ کیسے ہو گیا؟“ کولن کو حیرت تھی۔

جینی نے برا سا منہ بنایا۔ ”کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ پیٹرول کم ہے؟“

”مجھے لگتا ہے کہ فیول میٹر کی سوئی میں گڑبڑ ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک یہ بالکل اپنی جگہ پر تھی اور اب اچانک یہ نیچے گر گئی ہے۔“ کولن کو فکر نے گھیر لیا۔

”ضروری نہیں ہے کہ فیول میٹر خراب ہو۔ ہو سکتا ہے

زخموں سے چور بدلے کی آگ میں جھلستے شخص کا فسانہ محبت...

اپنے محبوب کا حصول ہر انسان کی اولین خواہش ہوتی ہے... وہ غریب تھا... مگر جفاکش اور اَن تھک محنت کا متوالا تھا... وہ اپنی مالکن سے محبت کر بیٹھا... اسے پانے کی جستجو تھی... اور منزل قریب تر... مگر اچانک ہی گھائل ہو کے وہ زخم کھا بیٹھا جو بھر تو جاتا ہے... مگر اس کی کسک کبھی پل چین نہیں لینے دیتی...

زخم خوردہ

محمد فاروق انجم

کہ پیٹرول ختم ہو گیا ہو اور تمہیں غور سے دیکھنے کا خیال نہ رہا ہو۔'' جینی نے کہا۔

''ہاں تم بھی ٹھیک کہتی ہو۔ ہمیں سفر جاری رکھنے کے بجائے پیٹرول پمپ دیکھ لینا چاہیے۔''

اسی اثنا میں بارش نے زور پکڑ لیا اور موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ تیز ہوائیں چلنے لگیں اور کولن کے لیے ڈرائیونگ کرنا مشکل ہو گیا۔ اس نے کار کی رفتار آہستہ کر دی تھی۔ اچانک اس نے دائیں جانب دیکھا اور کار کا رخ اس جانب موڑ دیا۔

''ادھر کہاں جا رہے ہو؟'' جینی نے پوچھا۔

''اس طرف ایک قصبہ ہے۔ وہاں ایک ہوٹل بھی ہے جہاں ہم رات گزار سکتے ہیں اور ہمیں پیٹرول بھی آسانی سے مل جائے گا۔ اس طوفانی بارش میں سفر کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اگر اس سڑک پر گاڑی رک گئی تو ہمارے لیے مشکل ہو جائے گی۔'' کولن نے بتایا۔

اس کی بات سن کر جینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ پہلی بار اس قصبے جا رہی تھی، جبکہ کولن اس سے قبل ایک گھنٹے کے لیے اس قصبے میں رکا تھا۔ اس وقت اس کے ساتھ اس کے دوست تھے۔ وہ سفر کے دوران محض اس قصبے کو دیکھنے کے لیے وہاں چلے گئے تھے۔ وہ کچھ دیر کے لیے دریا پر بھی گئے تھے مگر کولن تاسف سے واپس آ گیا تھا کیونکہ کولن کو مچھلی کا شکار کرنے کا جنون تھا اور اس وقت ان کے پاس مچھلی شکار کرنے کا سامان اور وقت نہیں تھا۔

کولن کی کار قصبے میں داخل ہو گئی۔ دائیں بائیں گلیوں میں مکانات ایستادہ تھے اور گلیاں بالکل ویران تھیں۔ ہر گھر کے باہر روشنی کا خاص انتظام تھا جس کی وجہ سے وہ پورا قصبہ روشن دکھائی دے رہا تھا۔ بارش کی شدت میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ اچانک کولن کی کار نے ایک جھٹکا لیا اور کار اسی جگہ رک گئی۔ کولن اور جینی کے لیے اطمینان بخش بات یہ تھی کہ وہ قصبے تک پہنچ چکے تھے۔

جس مکان کے باہر کولن کی کار رکی تھی، وہ مکان اس گلی کے کونے پر تھا اور سب سے بڑا مکان تھا۔ اس مکان کے ساتھ ایک احاطہ سا بنا ہوا تھا۔ کولن نے اس مکان کی طرف دیکھ کر دل ہی دل میں تعریف کی کہ وہ باہر سے بھی کافی خوبصورت لگ رہا تھا۔

''اب کیا کریں؟'' جینی نے نیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بارش رکنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ ہوٹل اس جگہ سے کچھ دور ہے۔ سڑک پر بہت زیادہ پانی کھڑا ہو رہا ہے۔

اس بارش میں اگر کار سے باہر نکلے تو پانی میں شرابور ہو جائیں گے۔'' کولن نے جواب دیا۔

کولن کا جواب سن کر جینی نے طویل سانس خارج کی اور سامنے دیکھنے لگی۔ آسمان سے پانی ایسے برس رہا تھا جیسے یہ بارش کبھی نہیں رکے گی۔

جس گھر کے باہر کولن کی کار کھڑی تھی، وہ گھر ہیرس پاول کا تھا۔ ہیرس کی عمر اڑتیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اس کی آنکھوں پر نظر کا خوبصورت چشمہ ہر وقت ٹکا رہتا تھا۔ اس کا رنگ اتنا صاف نہیں تھا اور نہ ہی اس کے چہرے کو پُرکشش کہا جا سکتا تھا۔ وہ لنگڑا کر چلتا تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ آپریشن کے بعد وہ چلنے کے قابل تو ہو گیا تھا لیکن اس کی زندگی میں مستقل لنگڑا پن آ گیا تھا۔ اس نے شادی نہیں کی تھی اور یہ گھر اس نے خود بنوایا تھا۔ اسے شہر کی پُرہنگامہ زندگی سے نفرت ہو گئی تھی اس لیے وہ اس قصبے کے پُرسکون ماحول میں زندگی گزار رہا تھا۔

اسی قصبے سے کچھ دور اس کی کچھ زمین تھی جہاں وہ کھیتی باڑی کرتا تھا۔ وہ ایک آسودہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس گھر میں اس کے ساتھ اس کا ایک ملازم جیک رہتا تھا جو اس کا ہر حکم بجا لانے کے لیے مستعد کھڑا رہتا تھا اور ہیرس کا ہر طرح سے خیال بھی رکھتا تھا۔ کھانا پکانے کے لیے ایک خانساماں تھا جو اپنے وقت پر آتا اور کام ختم کر کے چلا جاتا تھا۔

ہیرس کو بارش پسند تھی۔ وہ اس وقت اوپر کے کمرے میں کھڑکی کے ساتھ کھڑا بارش کا نظارہ کر رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا کہ اس کے گھر کے باہر ایک کار رکی ہے۔ ہیرس کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ شاید کار میں سے کوئی اُترے لیکن جب دس منٹ گزرنے پر بھی کار سے کوئی باہر نہیں نکلا تو ہیرس لنگڑاتا ہوا میز کی طرف گیا اور وہاں پڑے بیل کے بٹن پر اپنی انگلی رکھی اور پھر کھڑکی کے پاس چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد جیک اندر آ گیا۔ ''ہمارے گھر کے باہر ایک کار کھڑی ہے۔ دیکھو کون ہے۔ اگر ان کو کسی مدد کی ضرورت ہے تو ان کی مدد کرو۔'' ہیرس نے اسے حکم دیا۔ جیک اسی وقت باہر چلا گیا۔

ہیرس لنگڑاتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ کمرا کافی ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ہیرس کو ایک بار پھر ناگواری سے اپنی جگہ سے اُٹھنا پڑا اور اس نے کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہی اس نے آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلنے کی آہٹ ہوئی تو ہیرس نے آنکھیں کھول کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جیک کھڑا تھا۔

''وہ میاں بیوی ہیں۔ ان کی کار میں پیٹرول ختم ہو گیا

ہے۔ میں انہیں اندر لے آیا ہوں۔'' جیک نے بتایا۔
''اچھا کیا... پیٹرول تو صبح ہی ملے گا۔ ان سے کہو کہ وہ کچھ کھانا پینا چاہتے ہیں تو بلا تکلف بتادیں اور بے فکر ہو کر یہاں رات بسر کریں۔'' ہیرس نے کہا اور جیک پھر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہیرس اپنی جگہ سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ ان دونوں سے ملنا چاہتا تھا۔

جب وہ نیچے آیا تو آتش دان روشن تھا اور اس کے پاس ہی کولن بیٹھا اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ جبکہ جینی وہاں نہیں تھی۔ ہیرس نے سوچا کہ جیک نے تو اسے بتایا تھا کہ وہ میاں بیوی ہیں لیکن اس وقت اکیلا مرد ہی وہاں براجمان تھا۔ ہیرس اس کے پاس پہنچا تو کولن یکدم چونک کر اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ ہیرس نے مصافحے کے لیے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھے ہیرس کہتے ہیں اور یہ غریب خانہ میری رہائش ہے۔'' کولن نے بھی فوراً ہاتھ بڑھایا اور خوش دلی سے بولا۔
''مجھے کولن کہتے ہیں۔ اس طوفانی بارش میں ہماری کار کا پیٹرول ختم ہوگیا تھا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ہماری مدد کی اور ہمیں اپنے گھر اس آتش دان کے سامنے بیٹھنے کا موقع دیا جس سے مجھے سکون کا احساس ہو رہا ہے۔''
''اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی کی مدد کر کے مجھے اچھا لگتا ہے۔'' ہیرس بولا۔
''آپ ایک اچھے انسان ہیں۔'' کولن نے اس کی تعریف کی۔ ''میں گاڑی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ اس طوفانی بارش میں ہم میاں بیوی کو اگر کوئی لوٹنے آگیا تو ہمارا کیا بنے گا؟'' کولن کہہ کر مسکرایا۔
''ایسا ممکن ہوسکتا تھا۔ کیونکہ یہ قصبہ خوبصورت ضرور ہے لیکن امن وامان کی صورتِ حال ایسی تسلی بخش نہیں ہے کہ یہاں کا رہائشی بے فکر ہوسکے۔ ویسے آپ کی بیوی آپ کے ساتھ دکھائی نہیں دے رہیں۔'' ہیرس نے بھی مسکرا کر کہا۔
''میری بیوی کو باتھ روم جانا تھا اس لیے آپ کا بااخلاق ملازم اسے واش روم میں لے گیا ہے۔''
''اس کا نام جیک ہے۔ وہ میرا بہت وفادار ملازم ہے۔'' ہیرس نے کہہ کر جیک کو آواز دی اور جیک فوراً سامنے آگیا۔ ''ان کے کھانے پینے کا کوئی انتظام کیا تم نے؟''
''دونوں نے صرف کافی پینے کی خواہش کی ہے۔''
''ان کے لیے کافی بنا رہے ہو تو ایک کپ میرے لیے بھی لے آنا۔'' ہیرس نے یہ کہہ کر کولن کی طرف گردن موڑی۔ ''کیا خیال ہے ہم اوپر کمرے میں نہ چلیں۔ وہاں بھی آتش دان ہے۔ ایک ساتھ بیٹھ کر باتیں بھی کریں گے اور کافی سے بھی لطف اندوز ہوں گے۔ آپ کی بیوی اگر ہمارے ساتھ بیٹھنا چاہیں تو ٹھیک ورنہ وہ یہاں بھی بیٹھ سکتی ہیں۔''

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، ویسے بھی میں زیادہ دیر چپ اور تنہا نہیں رہ سکتا۔'' کولن بدستور مسکرا رہا تھا۔
''آپ کے مزاج سے لگتا ہے کہ اس طوفانی بارش نے مجھے اچھا دوست دے دیا ہے۔'' ہیرس بولا۔
''آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی ہے۔'' کولن نے دانت نکالے۔

ہیرس نے جیک سے کہا۔ ''ہم اوپر جارہے ہیں۔ ہمارا آتش دان روشن کردو۔ اور جب ان کی بیگم آئیں تو انہیں بتادینا کہ ہم اوپر کمرے میں ہیں پھر جیسے ان کی مرضی۔''

دونوں سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ ان کے پیچھے جیک بھی تھا۔ اوپر والے کمرے میں جیک نے آتش دان روشن کردیا تھا۔ کمرے میں حرارت ہونے لگی تھی۔ اور تھوڑی دیر کے بعد ان کے ہاتھوں میں گرم کافی کے مگ بھی آچکے تھے۔ جینی ان کے پاس اوپر نہیں آئی تھی بلکہ وہ نیچے اسی آتش دان کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ کسی اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے ساتھ اس طرح گھل مل جانا اسے بالکل بھی پسند نہیں تھا۔

جینی کے برعکس کولن بہت جلد دوسروں کے ساتھ گھل مل جاتا تھا اور اعتماد بھی کرلیتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ہیرس کے ساتھ ہنس ہنس کر ایسے باتیں کر رہا تھا جیسے وہ دونوں پرانے دوست ہوں۔

دونوں اپنی اپنی کافی ختم کرچکے تھے۔ کولن کہہ رہا تھا۔ ''میرا دل چاہتا ہے کہ میں دو، تین دن آپ کے پاس رہوں اور اس قصبے میں گھوموں پھروں۔''
''کیوں نہیں، مجھے اچھا لگے گا۔ آپ کی وجہ سے مجھے ایک اچھی کمپنی مل جائے گی۔'' ہیرس نے فوراً کشادہ دلی کا مظاہرہ کیا۔
''مجھے بھی جانے کی کوئی ایسی جلدی نہیں ہے۔ میرا اپنا کاروبار ہے اور مجھے کوئی فکر نہیں ہے۔'' کولن نے کہا۔ ''میں یہاں پہلے بھی آچکا ہوں اور دریا پر مچھلی کا شکار کرنے کی حسرت لے کر واپس چلا گیا تھا۔''
''آپ کے آنے سے میرے گھر کی تنہائی دور ہوگئی ہے۔ آپ کی میزبانی کر کے مجھے اور بھی لطف آئے گا۔ ہم مچھلی کا شکار ہی نہیں بلکہ ہرن کا شکار بھی کریں گے۔''

کولن خوش ہوگیا اور اس نے پوچھا۔ ''آپ اس گھر میں اکیلے رہتے ہیں، آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

ہیرس مسکرایا۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ شادی کی لکیر... میرے ہاتھ میں تھی لیکن کسی نے مٹادی۔''

کولن اس کا جواب سن کر ہنسا۔ ''اور آپ نے اپنی شادی کی لکیر آسانی سے اسے مٹانے دی؟''

''اس وقت اس کا ستارہ عروج پر تھا اس لیے وہ اپنی مرضی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔'' ہیرس اپنی جگہ سے اُٹھا۔ ''میں آپ کو ماضی کے کچھ اوراق دکھاتا ہوں۔ اب دوستی ہوگئی ہے تو پردہ کیسا۔'' ہیرس نے کہا تو کولن نے بے تکلفی سے قہقہہ لگایا۔

''تم خود جا رہے ہو؟ وہ اوراق جیک سے کیوں نہیں منگوا لیتے۔'' کولن بولا۔

''میں نے اپنی ذاتی چیزوں کو جیک سے بھی چھپا کر رکھا ہے۔'' وہ ایک لمحہ رک کر مسکراتے ہوئے بولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

ہیرس کا بیڈروم نیچے تھا۔ بارش اس وقت بھی موسلا دھار ہو رہی تھی۔ ہیرس لنگڑاتا ہوا نیچے اُترا اور جیسے ہی وہ اپنے بیڈروم کی طرف جانے لگا، اس کی نگاہ جینی پر پڑی اور وہ ٹھٹک کر اسی جگہ رک گیا۔ اس کے چہرے پر ایک کرب سا آیا اور معدوم ہوگیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اتری اور تلخی کا روپ دھار کر مچلنے لگی اور پھر ہیرس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جینی کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جینی اپنے خیالوں میں گم سر جھکائے اپنے ہاتھ میں جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ ہیرس اس کے پاس کھڑا ہوگیا اور جینی کا انہماک ابھی تک قائم تھا۔

ہیرس نے اچانک کہا۔ ''اب اپنے ہاتھ کی لکیروں میں کسے تلاش کر رہی ہو جینی۔''

آواز سنتے ہی جینی ایسے چونکی جیسے اس کے پاس ہی کوئی دھماکا ہوگیا ہو۔ اس کی خیرہ نگاہوں میں عجیب سا رنگ بکھر گیا۔ اس کا چہرہ دم بخود تھا اور اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کے سامنے ہیرس ہی کھڑا ہے۔

''مجھے اُمید ہے کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا۔ ویسے بھی چار سال تین ماہ اور اُنیس دن پہلے ہی تو ہماری آخری ملاقات ہوئی تھی۔ اتنا طویل وقت نہیں ہوا ہے کہ تم مجھے بھول جاؤ۔'' ہیرس نے یہ بات ایسے کہی تھی جیسے وہ روز حساب کرتا ہو۔

جینی کی حیرت ابھی تک اس کے چہرے پر باہر ہوتی موسلا دھار بارش کی طرح برس رہی تھی۔

''دیکھو وقت نے چار سال تین ماہ اور انیس دن کے بعد ہم دونوں کو ایک بار پھر آمنے سامنے کھڑا کر دیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم ایک دن میرے گھر میں میرے سامنے موجود ہوگی۔ مجھے پورا یقین ہے کہ تم نے بھی کبھی ایسا تصور نہیں کیا ہوگا کہ تم مجھ سے دوبارہ ملو گی۔'' ہیرس کہہ کر اس کے اور بھی قریب ہوگیا۔ جینی محسوس کرنے لگی کہ شدید سردی میں آگ کے پاس بیٹھ کر وہ جو سکون محسوس کر رہی تھی، وہ اس کے لیے بے چینی کا باعث بن گیا ہے۔ اور اسے لگ رہا ہے کہ آگ کی تپش نے اس کا سارا جسم پسینے میں شرابور کر دیا ہے۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں کہہ پا رہی تھی۔ بس خیرہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

''مجھے بہت خوشی ہوئی ہے کہ تم میرے گھر میں موجود ہو۔ تمہارے دیے ہوئے زخم کو میں روز کھرچتا تھا۔ آج سے میرے زخم کو مرہم ملنا شروع ہوجائے گا اور تم کو میں وہ اذیت واپس کرنا شروع کر دوں گا جس کے ساتھ میں نے چار سال تین ماہ اور انیس دن گزارے ہیں۔ اب میرا وقت شروع ہوگا۔'' ہیرس کا لہجہ زہر آلود اور چہرے پر درشتگی جھلکنے لگی تھی۔ اس نے نفرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور لنگڑاتا ہوا وہاں سے چلا گیا جبکہ جینی حیرت کی تصویر بنی یوں ساکت بیٹھی تھی جیسے اس کے جسم سے جان نکل گئی ہے۔

☆☆☆

رات آدھی سے زیادہ بیت گئی تھی۔

بارش تھم چکی تھی۔ جینی اپنے شوہر کے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی جبکہ کولن کے خراٹے کمرے کی خاموشی کو توڑ رہے تھے۔ جینی کی سوچ کا محور ہیرس تھا۔

ہیرس اپنے کمرے میں آرام کرسی پر بیٹھا ہولے ہولے جھول رہا تھا۔ نیند اسے بھی نہیں آ رہی تھی۔ ہیرس کی نگاہوں میں جینی کی تصویر تھی اور پھر ماضی کا دریچہ ایک ایک کر کے اس کے سامنے کھلنے لگا۔

جینی بہت خوبصورت اور پُرکشش تھی۔ جینی کے مقابلے میں ہیرس اتنا حسین نہیں تھا۔ جینی کے باپ مسٹر فلپس کا بھینسوں کا باڑا تھا۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے بہت سے ملازم رکھے ہوئے تھے اور ان سب کا باس ہیرس تھا۔

مسٹر فلپس کو ہیرس پر نہ صرف بہت زیادہ اعتماد تھا بلکہ وہ اسے بہت پسند بھی کرتا تھا۔ مسٹر فلپس اور جینی اس بات سے بے خبر تھے کہ ہیرس اپنے دل میں جینی کی محبت کو کسی چھوٹے بچے کی طرح پال رہا ہے۔

ایک شام جب بہت اچھی ہوا چل رہی تھی اور ٹھنڈک کا احساس بھی زیادہ نہیں تھا، مسٹر فلپس اپنی بیٹی جینی کو لے کر فارم ہاؤس میں پہنچا تو اس نے امرود کے درخت کے نیچے کرسیاں لگوالیں اور وہاں بیٹھ کر وہ ہیرس سے بات چیت کرنے لگا۔ مسٹر فلپس کے برابر میں جینی براجمان تھی جسے ان کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ مسٹر فلپس کے مجبور کرنے پر ان کے ساتھ آگئی تھی۔ اس کا دھیان دائیں طرف تھا اور ہیرس کو باتوں کے دوران جب بھی موقع ملتا وہ جینی کو ایک نظر دیکھ لیتا تھا۔ اچانک ایک بات نے ہیرس کے ساتھ ساتھ جینی کو بھی چونکا دیا جب مسٹر فلپس نے اچانک باتوں کے دوران میں کہا۔

''تم بہت اچھے انسان ہو ہیرس اور بہت زیادہ محنتی بھی ہو۔ کیا تم میری بیٹی جینی سے شادی کرو گے؟''

ہیرس کا منہ تو حیرت سے کھلا ہی تھا جینی نے بھی یہ سنتے ہی گردن گھما کر مسٹر فلپس کی طرف دیکھا۔ اس کے لیے یہ بات بہت زیادہ حیران کن تھی۔

ہیرس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس بات کا کیا جواب دے۔ لیکن یہ ضرور تھا کہ یہ بات سنتے ہی اس کا دل خوشی سے کھل گیا۔ جس بات کو کرنے کی شاید اس کے اندر کبھی ہمت پیدا نہ ہوتی، وہ بات مسٹر فلپس نے خود کردی تھی۔ جب خاموشی نے طول پکڑا تو مسٹر فلپس نے دوبارہ پوچھا۔

''ہیرس کیا تم میری بیٹی سے شادی کرو گے اور میرا داماد بن کر اس سارے کام کو سنبھالو گے؟ جینی کے علاوہ میرا کوئی نہیں ہے۔ مجھے خوشی ہوگی کہ تم میرے داماد بن کر اس کاروبار کو سنبھالو۔''

ہیرس نے ایک نظر جینی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر مضطرب سلوٹیں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کی نگاہیں بدستور اپنے باپ کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ صاف عیاں تھا کہ اسے اپنے باپ کی بات بالکل بھی اچھی نہیں لگی تھی۔

''میں تو آپ کا غلام ہوں۔ جو آپ کا حکم ہوگا مجھے منظور ہوگا۔'' ہیرس نے کہا تو مسٹر فلپس نے قہقہہ لگایا۔

''زبردست... مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔''

''کیا آپ سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہے ہیں؟'' جینی نے پوچھا۔

''بالکل سوچ سمجھ کر فیصلہ کر رہا ہوں۔'' مسٹر فلپس بولا۔

پھر جیسے ہی ہیرس کسی کام سے وہاں سے اُٹھا تو جینی نے اپنی زبان کھولی۔

''یہ کیا کیا آپ نے؟''

''کیا، کیا ہے؟'' فلپس نے اس کی طرف دیکھا۔

''اپنے ملازم کو آپ میری زندگی کے ساتھ باندھ رہے ہیں۔ مجھے آپ کا یہ فیصلہ منظور نہیں ہے۔'' جینی نے احتجاج کیا۔

''اس میں برائی ہی کیا ہے۔ وہ اچھا ہے... محنتی ہے۔ اس میں کوئی عیب نہیں ہے۔'' فلپس نے کہا۔

''میں اس سے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔ وہ محض ایک معمولی ملازم ہے۔'' جینی کے چہرے پر حقارت تھی۔

''جینی تمہیں انکار کی اجازت نہیں ہے۔ یہ میرا فیصلہ ہے۔ اگر تم نے اس کے ساتھ شادی نہ کی تو میں اس کی شادی کسی اور لڑکی کے ساتھ کروں گا اور اپنی جائداد کا ایک بڑا حصہ ہیرس کے نام کردوں گا۔ کیونکہ ہیرس جیسا محنتی لڑکا ملنا بہت مشکل ہے۔ ہاں اگر تم کو اس میں کوئی عیب نظر آتا ہے تو مجھے بتاؤ پھر میں سوچ سکتا ہوں۔'' فلپس بھی اپنے فیصلے پر قائم تھا۔

جینی نے ایک ایک لفظ چبا کر کہا۔ ''میں آپ کے ملازم کے ساتھ شادی نہیں کروں گی۔''

''بے وقوف مت بنو۔ اتنے بڑے باڑے کو وہ سنبھالتا ہے ایک انچ کی ہیرا پھیری نہیں کرتا۔ تم سے شادی ہوجائے گی تو تمہیں ایک اچھا شوہر اور اس سارے کام کو سنبھالنے والا بہترین ملازم ہمارے پاس رہے گا۔'' فلپس نے اپنے دل کی بات کہی۔ جینی باپ کی بات سن کر خاموش ہوگئی۔

ہیرس نے ان کی باتیں پیچھے چھپ کر سن لی تھیں۔ فلپس اگر ایسا سوچتا تھا تو اسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جینی کی صورت میں اسے ایک خوبصورت بیوی مل جاتی... اور اسے پانے کے لیے وہ ساری عمر اس باڑے میں ملازم بن کر رہ سکتا تھا۔

جینی اُٹھ کر باڑے میں گھومنے پھرنے لگی۔ اچانک اس کے سامنے ہیرس آگیا۔ جینی نے اس کی طرف دیکھا اور بارعب انداز میں بولی۔

''مجھے اپنے باپ کا فیصلہ بالکل پسند نہیں ہے اور کسی غلط فہمی میں رہ کر میرے خواب مت دیکھنا شروع کردینا۔''

''مس جینی آپ کے خواب تو میں ایک عرصے سے دیکھ رہا ہوں۔'' ہیرس نے مسکرا کر گویا اس پر انکشاف کیا۔

"آئندہ بھی تم میرے خواب ہی دیکھو گے۔" جینی نے معنی خیز اور درشت لہجے میں کہا۔ ہیرس مسکرایا اور چلتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے پانی کی بالٹی اُٹھا کر ایک طرف گرادی اور پھر وہاں سے باہر نکل گیا۔

جینی کچھ دیر اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ جانے لگی تو اسے ستون کے ساتھ ایک مضبوط سریا دکھائی دیا۔ جینی نے وہ سریا پکڑا اور اس کا جائزہ لینے لگی۔ پھر اس نے وہ سریا دوسری جگہ پر رکھ دیا اور فلپس کے پاس جا کر پوچھا۔

"ہیرس یہاں کتنا کام کرتا ہے؟"

"اس جگہ ہمارے دس ملازم ہیں۔ لیکن وہ اکیلا ان دس ملازموں سے زیادہ کام کرتا ہے۔ وہ جب بھی بھینسوں کی طرف جاتا ہے اور کوئی کام دیکھتا ہے تو وہ کسی ملازم کو آواز نہیں دیتا بلکہ وہ کام خود کر دیتا ہے۔ اس کی ذمّے داری پر مجھے فخر ہے۔"

"اور شادی کے بعد اگر اس نے کام کرنا چھوڑ دیا تو؟" جینی نے سوالیہ نگاہوں سے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

"اس کی ہڈیوں میں کام ہے، وہ کام کے بغیر نہیں رہ سکتا۔" فلپس کو اس پر اعتماد تھا۔

"اور جس دن وہ کام کے بغیر رہنے لگا تو...؟"

"پھر تو وہ ہمارے لیے بیکار ہے لیکن ایسا نہیں ہوگا۔ وہ میرا بہت زیادہ مستعد گھوڑا ہے جس پر مجھے فخر ہے۔" فلپس یہ کہہ کر مسکرایا۔

"بہت زیادہ بھاگنے والا گھوڑا جب ناکارہ ہو جاتا ہے تو پھر اس کا کیا ہوتا ہے؟"

"وہ میدان سے باہر ہو جاتا ہے۔ لیکن تم ایسا کیوں سوچ رہی ہو۔ آؤ چلتے ہیں۔ شام ہو رہی ہے۔" فلپس یہ کہہ کر آگے چل پڑا اور جینی سوچتی ہوئی اس کے پیچھے قدم اُٹھانے لگی۔

☆☆☆

شام ہوتے ہی وہ دونوں گھر پہنچ گئے تھے۔ رات کے نو بجے تھے جب جینی اپنی کار میں اس جگہ پہنچی اور اس نے کار کی ہیڈ لائٹس بہت پہلے بند کر دی تھیں۔ اس نے کار ایک درخت کے پیچھے کھڑی کی اور باڑے کی طرف ہولی۔ اس نے بھینسوں کے باڑے میں داخل ہونے کے لیے پچھلا دروازہ استعمال کیا اور اندر جاتے ہی وہ اس طرف بڑھی جہاں ہیرس رہتا تھا۔

اس جگہ کام کرنے والے ملازم ایک جگہ بیٹھے پینے پلانے کے ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی کر رہے تھے۔ جینی نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی تو اندر سے ہیرس کی آواز آئی۔

"آجاؤ۔"

جینی دروازہ کھول کر جیسے ہی اندر گئی ہیرس جو بستر پر نیم دراز تھا، اچانک جینی کو دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

"جینی تم اس وقت؟"

"مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" جینی نے سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں، کہو کیا بات ہے۔" ہیرس بولا۔

"یہاں نہیں اسی جگہ چلتے ہیں جہاں ہم شام کے وقت ملے تھے۔" جینی بولی۔ ہیرس کو کچھ حیرت ہوئی لیکن وہ اس کے ساتھ اس جگہ کی طرف چل پڑا۔ جینی اس کے پاس خود چل کے آئی تھی، اس سے بڑھ کے اور کیا بات ہو سکتی تھی۔

اس جگہ ایک قطار میں بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔ جن میں بہت سی چارا کھا رہی تھیں، کچھ کھڑی اور کچھ بیٹھی ہوئی تھیں۔

"میرا باپ کہتا ہے کہ تم اس کے بہت دوڑنے والے گھوڑے ہو۔" جینی کہتی ہوئی ستون کے پاس چلی گئی۔

"کیا تم واقعی بہت زیادہ دوڑنے والے گھوڑے ہو؟"

"ایسا ان کا خیال ہے تو یہ میرے لیے اچھی بات ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ جب دوڑنے والا گھوڑا لنگڑا ہو جائے تو وہ بیکار ہو جاتا ہے۔ پھر اس کی حیثیت بھی ختم ہو جاتی ہے۔" جینی نے کہا۔

"مجھے اس بارے میں زیادہ علم نہیں ہے۔" ہیرس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جینی ایسی بات کیوں کر رہی ہے اس لیے اس نے جواب دینے کے بجائے سوال ٹالنے کی کوشش کی۔

اس دوران میں جینی نے برق رفتاری سے ستون کے ساتھ پڑے ہوئے موٹے سریا کو اُٹھا لیا۔ جینی نے سریا اُٹھاتے ہی پوری قوت سے ہیرس کے سر پر دے مارا۔ ہیرس کو اس کی توقع نہیں تھی۔ ہیرس نے فوراً اپنا سر تھام لیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اور اس کے بعد جینی نے جنونی انداز میں پوری قوت سے سریا اس کی ٹانگ پر مارنا شروع کر دیا۔ ہیرس سنبھل ہی نہیں پا رہا تھا۔ جب جینی نے مسلسل سریا برسا کر اس کی ٹانگ کو لہولہان

کردیا تو اس نے سریا ایک طرف پھینکا اور ہیرس کو تکلیف کی حالت میں چھوڑ کر تیزی سے اسی راستے کی طرف بڑھی جس راستے سے وہ آئی تھی۔ کسی ملازم کو پتا بھی نہیں چلا کہ ہیرس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔ سب پینے پلانے اور ہنسی مذاق میں مصروف تھے۔ جینی اپنا کام کر کے خاموشی سے نکل گئی۔

اس واقعے کے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ایک ملازم اس طرف بھینسوں کو دیکھنے کے لیے آیا تو اس کی نظر بے ہوش ہیرس پر پڑی اور اس نے شور مچا دیا۔

☆☆☆

ہیرس اسپتال میں داخل تھا۔ اس کی دائیں ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور اس کے علاوہ بھی ٹانگ کو کافی نقصان پہنچا تھا۔ اس کا فوری آپریشن کردیا تھا۔

مسٹر فلپس یہ جان کر کہ ہیرس کو کسی نامعلوم نے شدید زخمی کردیا ہے وہ بہت پریشان ہوئے۔ انہوں نے ایک ملازم سے سختی سے پوچھا کہ کون آیا تھا اور یہ سب کیسے ہوا؟ کسی ملازم کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ اب ہیرس ہی بچا تھا جس کے پاس اس سوال کا یقینا جواب تھا۔ وہ آپریشن تھیٹر میں تھا۔

اس دوران میں جینی بالکل مطمئن اور بے فکری سے اپنے معمول کے کام میں مصروف رہی۔

آپریشن کے کئی گھنٹوں بعد جب ہیرس کو ہوش آیا تو خیریت دریافت کرنے پر فلپس کا پہلا سوال یہ تھا۔

''تمہارے ساتھ یہ کس نے کیا ہے؟''

ہیرس کی نظروں کے سامنے فوراً جینی کا چہرہ آ گیا۔ اس خوبصورت چہرے کے پیچھے ایسی سفاکی پوشیدہ ہوگی، ہیرس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ جب فلپس نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو ہیرس نے نقاہت بھری آواز میں جواب دیا۔

''میں بھینسوں کا چارا دیکھ رہا تھا کہ اچانک کسی نے مجھ پر حملہ کردیا اور مجھے ہوش ہی نہیں رہا کہ میرے ساتھ کیا ہوا اور یہ سب کس نے کیا۔''

ہیرس کا جواب سن کر فلپس کو تشویش لاحق ہوگئی کہ کیا یہ اس کے کسی ملازم کا کام ہے؟ جسے یہ ناپسند ہو کہ ہیرس کی اہمیت ان سے کم ہے۔ فلپس نے کچھ اور کریدنے کی کوشش کی لیکن ہیرس کا وہی جواب تھا۔

جینی کو بھی پتا چل گیا تھا کہ ہیرس نے اس کے بارے میں بتانے کے بجائے بات گول کردی ہے۔ اس نے ایک عجیب سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر عیاں کردی تھی۔

ہیرس کو کئی ہفتے تک بستر پر رہنا پڑا۔ اس دوران فلپس نے ہیرس کی جگہ ایک سیاہ فام نوجوان کام کے لیے رکھ لیا۔ وہ ہیرس سے بھی زیادہ جفاکش اور محنتی تھا۔ اس کا جسم طاقت سے بھرا ہوا تھا۔ اور وہ ہیرس سے بھی کہیں زیادہ کام کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ مسٹر فلپس کے لیے وہ ہیرس سے بھی زیادہ قیمتی ثابت ہوا۔ شاید فلپس اس کا کام دیکھتے ہوئے اپنی سوچ کے مطابق اس نوجوان کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھنے کے لیے جینی کی شادی کی بات چھیڑ دیتا لیکن سیاہ فام ہونے کی وجہ سے اس نے اس بارے میں سوچا بھی نہیں۔

ہیرس چلنے پھرنے لگا تھا لیکن وہ ہمیشہ کے لیے لنگڑا ہوگیا تھا۔ اب وہ فلپس کے قابل نہیں رہا تھا۔ جینی نے فلپس کا گھوڑا ناکارہ کردیا تھا۔ اس لیے مسٹر فلپس نے اُس کی خدمت کے عوض بہت سا پیسہ دیا اور اُسے رخصت کردیا۔ ہیرس کو جو تنخواہ ملتی تھی وہ بھی مسلسل جمع ہوتی تھی کیونکہ وہ اکیلا تھا اور کھانا پینا فلپس کی طرف تھا اس لیے وہ رقم بھی اچھی خاصی اس کے اکاؤنٹ میں تھی۔ نوکری سے فارغ ہونے کا ہیرس کو رنج تھا۔

ہیرس اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں سے رخصت ہوا اور چند دن اس شہر میں رہنے کے بعد اس نے اس قصبے کا رخ کرلیا۔ وہاں اسے سستی جگہ مل گئی۔ اس نے ایک مکان تعمیر کرایا اور کچھ زمین خرید لی۔ اور ان تلخ یادوں کے ساتھ اپنی زندگی وہیں بتانے لگا۔ ہیرس ایک دن بھی جینی کو نہیں بھولا تھا۔ وہ ہر روز سو کر اُٹھنے کے بعد جینی کے دیے ہوئے زخم کو یاد کرتا تھا۔ بالکل ایسے جیسے روز کوئی اپنے زخم کو اپنے ناخنوں سے کھرچ کر اپنے زخم کو ٹھیک ہونے نہیں دیتا.... وہ روز زخم کھرچتا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ جینی اب بھی اسے نہیں ملے گی اور وہ خواہ مخواہ اس کو یاد کر کے کڑھتا رہتا ہے۔

لیکن وقت غیر متوقع طور پر جینی کو گھیر کر اس کے دروازے پر لے آیا تھا اور ہیرس کو جیسے مرہم مل گیا تھا۔

☆☆☆

رات گزر گئی اور جب کولن صبح سو کر اُٹھا تو اس نے دیکھا کہ جینی قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنے بالوں میں برش کررہی ہے۔ اس نے کولن کی طرف دیکھتے ہی کہا۔

''میں تم کو جگانے ہی والی تھی۔ میں تیار ہوں، اُٹھو اب ہم یہاں سے چلیں۔''

''ایسی بھی کیا جلدی ہے جینی؟ رات بہت دیر تک میں ہیرس کے ساتھ بیٹھا رہا تھا۔ ہم دونوں میں بڑی مزے

دار گپ شپ ہوتی رہی۔ ہیرس انتہائی دلچسپ انسان ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں کچھ دن اس کے پاس رک جاؤں۔'' کولن نے کہا۔

''ہمیں چلنا ہے۔ یہ ہمارے لیے اجنبی جگہ ہے اور اجنبی لوگ ہیں۔'' جینی نے جلدی سے اس کی بات کی نفی کر دی۔

''ہیرس اجنبی نہیں لگتا۔ دیکھو اس نے ہمارا کیسا خیال رکھا ہے۔ مجھے تو ایک لمحہ بھی یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کسی اور کے گھر میں ہوں۔'' کولن اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''تمہارے دوست کی شادی میں شرکت کے لیے ہم چار دن سے نکلے ہوئے ہیں۔ مجھے گھر یاد آرہا ہے اور مجھے جانا ہے۔'' جینی نے فیصلہ کن انداز اختیار کر لیا۔

''اچھا ابھی میں نہالوں اور پھر ناشتا کرنے کے بعد سوچتے ہیں۔'' کولن نے بات ختم کرنی چاہی۔

''سوچنا کچھ نہیں ہے بس چلنا ہے۔ ناشتا کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے تو بھوک ہے۔'' کولن کہہ کر باتھ روم میں چلا گیا اور جینی باتھ روم کے بند دروازے کو دیکھتی رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ اب ہیرس سے اس کا سامنا نہ ہو اور وہ اس جگہ سے جتنی جلدی ہو چلے جائیں۔ وہ کولن کی عادت سے بھی واقف تھی کہ وہ مست مزاج اور جہاں اس کے ساتھ کوئی ہنس کر بات کر لیتا تھا وہ اس کا دیوانہ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ کچھ ایسا ہی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

ناشتے کی میز کھانے پینے کے سامان سے بھری ہوئی تھی۔ اپنی مخصوص کرسی پر ہیرس بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی کولن اور جینی کے آنے کی آہٹ ہوئی ہیرس نے اخبار ایک طرف رکھ کر دونوں کی طرف دیکھا۔ جینی ہلکے میک اپ میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔

''گڈ مارننگ۔'' ہیرس نے خوشگوار انداز میں کہا۔

کولن مسکرایا۔

''گڈ مارننگ... رات موقع ہی نہیں ملا کہ میں اپنی بیوی کا تم سے تعارف کرا سکوں۔ بہر حال... یہ میری بیوی جینی ہے۔'' کولن نے خوشگوار انداز میں کہتے ہوئے جینی کی طرف اشارہ کیا۔

ہیرس اپنی جگہ سے اُٹھ کر جینی کی طرف بڑھا۔ جینی نے نظریں چرانے کی کوشش کی اور ہیرس نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تم تو خوش قسمت ہو کولن۔ تمہیں ایسی بیوی ملی ہے۔''

کولن اس کی بات سن کر فخر سے مسکرایا۔ ہیرس کا ہاتھ مصافحے کے لیے اس کی طرف بڑھا ہوا تھا لیکن جینی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ بہر حال بادلِ ناخواستہ اس نے اپنا ہاتھ ہیرس کے ہاتھ میں دے دیا۔

''آپ سے مل کر اچھا لگا۔ میں طوفانی بارش کا شکر گزار ہوں کہ جس کی وجہ سے مجھے کولن جیسا اچھا دوست مل گیا۔'' ہیرس کہہ رہا تھا اور جینی کی کوشش تھی کہ وہ کسی طرح سے ہیرس سے اپنا ہاتھ چھڑا لے۔ ہیرس نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ جینی دو قدم پیچھے ہٹ کر اپنی کرسی کی طرف بڑھی تو ہیرس بھی اپنی کرسی کی طرف چل دیا۔ کولن نے بھی ایک کرسی سنبھال لی۔

''آج کا ناشتا جینی کے نام۔'' ہیرس اپنا ہاتھ اُٹھا کر بولا۔

کولن نے خوش ہوتے ہوئے میز پر سجی کھانے پینے والی چیزوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ناشتا جینی کے نام ہی ہے۔ کیونکہ میز پر ہر وہ چیز موجود ہے جو جینی کو پسند ہے۔''

''اچھا...؟'' ہیرس نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''کیا واقعی ایسا ہے؟''

''بالکل... کیوں جینی تم جو چیز شوق سے کھاتی ہو کیا وہ تمہارے سامنے موجود نہیں ہے؟'' کولن نے جینی کی طرف دیکھا۔

جینی جواب دینے کے بالکل بھی موڈ میں نہیں تھی، اس کے باوجود اسے اثبات میں سر ہلا کر کہنا پڑا۔ ''ایسا ہی ہے۔'' اور پھر زبردستی مسکرائی بھی۔

''یہ تو ایک اور حسین اتفاق ہے۔'' ہیرس بولا۔

کولن نے اس کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تو کیا اس سے پہلے کوئی اور بھی حسین اتفاق ہو چکا ہے؟''

''ہاں... تم لوگوں سے ملنا پہلا حسین اتفاق تھا۔'' ہیرس نے کہا اور کولن نے ہنستے ہوئے پلیٹ اُٹھا لی۔ جینی ایک ایک چیز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہیرس نے ہر وہ چیز میز پر سجائی تھی جو جینی کو ناشتے میں پسند تھی۔ وہ ہر روز ایک ساتھ ایسی چیزیں نہیں کھاتی تھی لیکن وہ ان میں سے ہی ہر روز کسی ایک چیز کے ساتھ ناشتا کرنا پسند کرتی تھی۔ جب ہیرس کو جینی سے محبت ہو گئی تھی تو وہ ہفتے میں کم از کم ایک بار فلپس سے ملنے ضرور جایا کرتا تھا کیونکہ فلپس کی اسے یہی ہدایت تھی۔

تب وہ خانساماں سے بہانے بہانے سے جینی کی پسند اور ناپسند کے بارے میں جانتا رہتا تھا۔

وہ تینوں ناشتا کرنے لگے۔ ناشتے کے دوران میں کولن اور ہیرس آپس میں بے تکلفی سے باتیں بھی کر رہے تھے۔ جینی چپ تھی لیکن اسے کولن کا ہیرس کے ساتھ اتنا بے تکلف ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

ناشتے سے فارغ ہوکر ہیرس نے کہا۔ ''صبح ہوتے ہی جیک پیٹرول لے آیا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ اب ہم جاسکتے ہیں۔'' جینی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''اتنی بھی کیا جلدی ہے؟'' ہیرس نے فوراً متانت سے اس کی طرف دیکھا۔

''لیکن میں چاہتا ہوں کہ ابھی میں ایک دو دن اس قصبے میں رک کر تمہارے ساتھ مزے کروں۔'' کولن فوراً بولا۔ ''ابھی تو میں دریا پر بھی نہیں گیا اور مچھلی کا شکار بھی نہیں کیا۔''

''اب تو تم دونوں کو رکنا ہی پڑے گا کیونکہ تم دونوں کو روکنے کا کام ایک چور نے کر دیا ہے۔'' ہیرس مسکرایا۔

''چور نے...؟ کیا مطلب؟'' کولن کے ساتھ ساتھ جینی کو بھی حیرت ہوئی۔

ہیرس دونوں کو باہر لے گیا۔ گلی میں ان کی کار اسی جگہ کھڑی تھی جہاں کولن اور جینی نے چھوڑی تھی لیکن دونوں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے کہ ان کی کار اینٹوں پر کھڑی تھی اور اس کے چاروں ٹائر غائب تھے۔ جینی تو پریشان بھی ہوگئی تھی لیکن اچانک کولن ہنسا۔

''ارے یہ کیا...؟''

''یہ قصبے کے اس چور کا کام ہے جو کار کے بجائے ایسی چیزیں چرا کر اپنے آپ کو تسلی دینے میں کامیاب ہوجاتے ہیں کہ وہ چور ہیں۔'' ہیرس کی بات پر کولن کا قہقہہ بلند ہوگیا۔ اور جینی کو اس وقت کولن پر شدید غصہ آیا کہ وہ پریشان ہونے کے بجائے ہیرس کی باتوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔

''ایسی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جیک ایک ایسے چور سے واقف ہے جسے پتا ہوتا ہے کہ یہ ایریا کس چور کا ہے۔ لہٰذا جیک اس سے مل کر یہ پتا کروا لے گا کہ آپ کی گاڑی کے چاروں ٹائر کون اتار کر لے گیا تھا۔ تھوڑے سے ڈالرز کے عوض وہ چور آپ کے ٹائر واپس کر دے گا۔ اس لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' ہیرس نے بتایا۔

''لیکن ہمیں واپس جانا ہے۔ ابھی اور اسی وقت۔'' جینی جلدی سے بولی۔

''پھر آپ کو یہاں سے پندرہ کلومیٹر دور ایک دوسری جگہ جانا پڑے گا وہاں سے نئے ٹائر خریدنے پڑیں گے اور پھر آپ کار میں ڈال کر جاسکیں گے۔ اس کام کے لیے دوپہر ہوجائے گی اور تب تک لنچ ٹائم ہوجائے گا۔ اس لیے میرا مشورہ ہے کہ آپ اندر بیٹھیں گپ شپ کریں تب تک جیک وہاں جاکر ٹائر لے آتا ہے۔''

''آپ جیک کو بھیج کر نئے ٹائر منگوالیں۔'' جینی نے سپاٹ لہجے میں کولن سے کہا۔

کولن کا دل نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ ابھی قصبہ چھوڑ کر چلا جائے۔ اس نے کچھ کہنے کے بجائے سوالیہ نگاہوں سے جینی کی طرف دیکھا۔

''ویسے میرا مشورہ ہے کہ آپ اتنا خرچہ کرنے کے بجائے کچھ پیسے خرچ کر کے وہی ٹائر واپس منگوالیں۔'' ہیرس نے کہا۔

''ہاں میرا بھی یہی خیال ہے۔'' کولن فوراً بولا۔

''میرے پاس پیسے ہیں۔ کولن تم ابھی ٹائر منگوالو۔'' جینی نے متانت سے کہا۔

''ویسے بھی جیک جہاں سے نئے ٹائر لینے جائے گا وہاں اس کی محبوبہ کا گھر بھی ہے۔ اب محبوب اس کے شہر میں جائے اور اس سے ملے بغیر واپس آجائے تو یہ ممکن نہیں ہے۔'' ہیرس کہہ کر ہنسا تو کولن نے ہنسنے میں اس کا بھرپور ساتھ دیا۔

''اور میں تو کہتا ہوں کہ اگر اس سے ملے بغیر واپسی ہوئی تو اس سے بڑی کیا بے وقوفی ہوگی۔'' کولن کہہ کر زور سے ہنسا، اس بار ہیرس نے اس کا ساتھ دیا۔

''کولن... جو بھی کرنا ہے جلدی کرو۔ میں یہاں رک نہیں سکتی۔ ہمیں جانا ہے۔'' جینی کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ دونوں کا ہنسی مذاق اسے برا لگ رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ یہ ساری چال ہیرس کی ہے تاکہ وہ دونوں جانہ سکیں۔

''مسز کولن... رات کے تھکے ماندے چور اتنے سویرے نہیں جاگتے اس لیے انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔'' ہیرس بولا۔

''جینی دیکھو کتنا خوبصورت قصبہ ہے۔ ہم کو واپس جاکر کیا کرنا ہے۔ تسلی سے چلے جائیں گے۔ تم بے فکر ہوجاؤ۔ ہیرس اچھا انسان ہے۔ مجھے پرائی جگہ کا احساس

نہیں ہو رہا ہے۔'' کولن کہہ کر اندر کی طرف بڑھا اور اس جگہ ہیرس اور جینی کھڑے رہ گئے۔ جینی اپنی کار کی طرف دیکھ رہی تھی اور ہیرس اس کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ سرور سا محسوس کر رہا تھا۔

ہیرس بولا۔ ''اندر آجاؤ جینی... میں تمہیں اتنی آسانی سے واپس جانے نہیں دوں گا اس لیے بے چین ہونا چھوڑ دو۔''

''میں جانتی ہوں کہ یہ کسی چور کی نہیں بلکہ تمہاری اپنی حرکت ہے۔'' جینی نے کہا۔

''جانتی ہو تو اپنے شوہر کو بتا دو۔'' وہ مسکرایا۔ جینی اس کی بات سن کر پیچ و تاب کھانے لگی۔

''یاد رکھو ہیرس میں اب بھی اتنی ہی مضبوط ہوں جتنی اس وقت تھی جب میں نے تمہیں ناکارہ بنا دیا تھا۔'' جینی دانت پیس کر بولی۔

''تم بھی یہ مت بھولنا کہ میں نے وہ محبت میں برداشت کر لیا تھا۔ اور اب دل میں تمہارے لیے صرف نفرت ہے۔ پرانا ہیرس اس دن مر گیا تھا جس دن اُسے نوکری سے فارغ کر کے چلے جانے کا کہا گیا تھا۔'' ہیرس کے لہجے میں ایسی بات تھی کہ جینی ایک لمحے کے لیے کانپ گئی۔

''تم کچھ نہیں کر سکو گے، سمجھے۔''

''تم سمجھ ہی نہیں سکو گی کہ کیسے مکڑی تمہارے گرد جال بُن دے گی۔'' ہیرس بولا۔ جینی نے اس کی طرف کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور غصے سے پاؤں پٹختے ہوئے چلی گئی۔

☆☆☆

دوپہر تک کا وقت ہیرس اور کولن کا باتیں کرتے اور زور زور سے ہنسنے میں گزر گیا۔ جینی دو بار بہانے سے اس کمرے میں گئی تھی جو اُن کو سونے کے لیے دیا تھا۔ جینی کی دانست میں تھا کہ شاید کولن بھی اس کے پیچھے آجائے لیکن کولن تو جیسے اسے بھول ہی گیا تھا۔ جینی کمرے میں ٹہل کر غصے میں تلملاتی ہوئی پھر باہر آجاتی تھی۔

آخر کار جینی نے کولن سے کہہ ہی دیا۔ ''کولن کیا تم میرے ساتھ کمرے میں آسکتے ہو۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' کولن مسکرا کر کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ بیڈروم تک چلا گیا۔ اندر جاتے ہی جینی نے اپنے لہجے کو دھیما رکھتے ہوئے متانت سے کہا۔

''اس شخص نے کیا جادو کر دیا ہے کہ تم مجھے بھول ہی گئے ہو؟ تم اس جگہ جم کر ہی بیٹھ گئے ہو اور جانے کا نام ہی نہیں لے رہے۔''

''بہت دنوں کے بعد کسی کے ساتھ اس طرح ہنسا ہوں، مجھے مزہ آ رہا ہے۔''

''لیکن مجھے اس آدمی سے خوف محسوس ہو رہا ہے۔'' جینی بولی۔

''اس آدمی سے خوف محسوس ہو رہا ہے؟ یہ بات حیرت انگیز بھی ہے اور ناقابلِ یقین بھی۔''

''کیوں ناقابلِ یقین ہے؟ کیا تم کو اس اجنبی پر اتنا ہی بھروسا ہے کہ میری بات تمہیں غلط لگ رہی ہے؟''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ ایک اچھا انسان ہے اور اس کا دل مہمان نوازی سے بھرا ہوا ہے۔''

''تمہارا دل کچھ بھی کہہ رہا ہو، مجھے اس سے غرض نہیں ہے۔ گاڑی کے ٹائروں کا انتظام کرو اور یہاں سے نکلنے کا سوچو۔'' جینی بے چینی سے بولی۔

''وہ بے چارہ ہمارے لیے کوشش تو کر رہا ہے۔''

''بے چارہ...'' جینی کہہ کر اپنے دانت پیسنے لگی۔ وہ کولن کو حقیقت سے آگاہ نہیں کر سکتی تھی ورنہ وہ اسے بتاتی کہ جسے تم بے چارہ کہہ رہے ہو اسی نے ہماری کار کے ٹائر اتارے ہیں۔ اگر وہ یہ سب کولن کو بتا دیتی تو پھر بات ماضی تک پہنچ جاتی۔ جینی اپنے ماضی کو بھول چکی تھی اور وہ نہیں چاہتی تھی کہ کولن کے سامنے اس کا ماضی آئے اور شاطر ہیرس کوئی ایسی بات کہہ دے کہ جس کا سرے سے وجود ہی نہ ہو اور اس کی ازدواجی زندگی نقصان سے دوچار ہو جائے۔

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ بے فکر ہو جاؤ۔ دوپہر کا کھانا تیار ہو رہا ہے۔ تب تک جیک بتا رہا تھا کہ ٹائر بھی آجائیں گے اور ہم فوراً نکل جائیں گے۔'' کولن نے محض جینی کی بحث ختم کرنے کے لیے کہا اور کمرے سے چلا گیا جبکہ جینی اپنے نچلا ہونٹ چبانے لگی۔

☆☆☆

کولن حیرت سے میز پر سجا دوپہر کا کھانا دیکھ رہا تھا۔ دوپہر کے کھانے میں صرف بھنی ہوئی مچھلی تھی۔ اور مچھلی تیار بھی اس انداز میں کی تھی کہ جیسی جینی پسند کرتی تھی۔ کولن کے برابر میں جینی بیٹھی تھی۔ کولن نے آہستہ سے پوچھا۔

''کیا تم نے اپنی پسند کی مچھلی کہہ کر پکوائی ہے؟''

''مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں اپنی پسند بتاتی۔'' جینی نے منہ بنایا۔

''یہ تو تمہاری پسندیدہ ڈش ہے اور ٹھیک اسی انداز میں پکی ہے جیسی تم پسند کرتی ہو۔'' کولن بولا تو جینی نے جواب دینے کے بجائے پلیٹ اٹھالی۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔ مچھلی کی خوشبو ڈائننگ ٹیبل پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی پسندیدہ مچھلی اس کے سامنے تھے۔ وہ چاہتی بھی تو اپنا ہاتھ نہیں روک سکتی تھی۔

اچانک ہیرس نے اپنا گلا صاف کر کے گویا ان میاں بیوی کو یہ آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ بھی اس میز پر موجود ہے۔ کولن فوراً مسکرا کر ہیرس کی طرف متوجہ ہوا تو ہیرس نے کہا۔

''آج کا یہ کھانا آپ کی بیوی کی خاص فرمائش پر تیار کیا گیا ہے۔ اور اسے پکانے سے پہلے آپ کی بیوی نے میرے خانساماں کو خاص طور بتایا تھا کہ مچھلی کیسے تیار کرنی ہے۔ مجھے امید ہے کہ جینی کو کھانے میں کوئی کمی نظر نہیں آئے گی؟'' ہیرس کی اس بات نے کولن کے چہرے کی مسکراہٹ معدوم کردی تھی۔ کچھ ایسا حال جینی کا بھی تھا جسے ہیرس کی بات سن کر غصہ آگیا تھا۔ جبکہ کولن نے ایک نظر جینی کی طرف دیکھا۔ جینی اس بات سے انکار کر چکی تھی کہ یہ مچھلی اس کی پسند سے تیار نہیں ہوئی ہے۔

''یہ جینی کی خاص پسند ہے۔'' کولن نے کہتے ہوئے اپنی پلیٹ میں مچھلی کا ایک ٹکڑا ڈالا اور ایک لقمہ لے کر بولا۔ ''جینی سے میری شادی کو تقریباً چار سال ہو چکے ہیں۔ ان چار سالوں میں، میں یہ ڈش سیکڑوں بار کھا چکا ہوں۔ یہ ڈش بالکل اسی طرح تیار کی ہوئی ہے جیسی یہ پسند کرتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میرا خانساماں کامیاب ہوگیا اور جینی کی ہدایت پر اس نے پورا عمل کیا ہے۔ کھانا شروع کریں۔'' ہیرس نے کہہ کر پلیٹ اٹھالی اور جینی اپنی جگہ کوئلے کی طرح سلگتی ہوئی سوچ رہی تھی کہ وہ اٹھ کر چلی جائے، یا بیٹھی رہی۔ وہ چیخ کر بتانا چاہتی تھی کہ ہیرس جھوٹ بول رہا ہے۔ لیکن وہ کچھ نہیں کہہ سکی کیونکہ ہیرس کچھ زیادہ ہی چالاکی دکھا رہا تھا۔ اگر وہ کچھ کہہ دے گی تو جانے ہیرس کونسی کہانی سنا کر ایک نیا طوفان برپا کردے۔ اس لیے جینی نے چپ رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اس نے پلیٹ اٹھائی اور مچھلی اٹھا کر جیسے ہی لقمہ منہ میں رکھا اسے وہی مزہ آیا جو وہ اس ڈش کو اپنے گھر میں کھاتے ہوئے محسوس کرتی تھی۔ لیکن کولن کے دل میں شکوہ بیٹھ گیا تھا کہ جینی اسے یہاں سے چلنے کے لیے مجبور کرتی ہے اور خود وہ اپنی پسند کی ڈش تیار کروا کر اس سے جھوٹ بھی بول رہی ہے۔ کولن کھاتے کی میز پر بیٹھا سنجیدگی سے کھا رہا تھا اور ہیرس اس چنگاری پر دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔

☆☆☆

کولن نے دیکھا تھا کہ جینی نے خوب مزے سے اپنا پسندیدہ کھانا کھایا تھا۔ جینی کا ہاتھ بے اختیار کھانے پر چل رہا تھا۔ یہ ڈش اس کی کمزوری تھی اس لیے وہ مزے سے کھاتی رہی۔

کھانا کھانے کے بعد جینی بیڈروم میں چلی گئی اور کولن دل میں چنگاری دبائے لان میں بیٹھ گیا۔ اس کے پیچھے ہی ہیرس بھی چلا گیا۔

''خوش قسمتی سے تمہاری کار کے ٹائر آچکے ہیں۔ ابھی کچھ دیر میں بدل دیں گے اور اگر تم اس قصبے کا حسین نظارہ کرنا چاہو تو جیک تمہیں ایسی جگہ لے جاسکتا ہے کہ تم خوش ہوجاؤ گے۔''

''کیا ایسی جگہ ہے یہاں؟'' کولن جو پہلے ہی جینی کی بات سے پریشان تھا، اس کی بات سنتے ہی یکدم بولا۔

''تم نے کبھی ایسی جگہ کا تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔'' ہیرس نے ایک آنکھ دبائی۔

کولن نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تو پھر دیر کس بات کی۔''

ہیرس نے اسی وقت جیک کو بلایا اور بولا۔ ''میرے دوست کولن کو وہاں لے جاؤ کہ واپسی پر اس کا چہرہ خوشی سے کھلا ہوا دکھائی دے۔''

''کیا تم نہیں چلو گے؟'' کولن خوش ہو کر بولا۔

''میرے لیے وہ پرانی اور تمہارے لیے بالکل نئی جگہ ہے۔ اس لیے آج تم اکیلے ہی جاؤ۔'' ہیرس مسکرایا اور کولن چلنے کو تیار ہوگیا۔ اسی وقت جیک نے کار نکالی اور کولن اس کے ساتھ نکل گیا۔ ہیرس مسکرایا۔

☆☆☆

جینی نے ایک جھٹکے سے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے گھڑی میں وقت دیکھا تو وہ ایک گھنٹے سے کمرے میں بند تھی۔ زیادہ کھانے کے خمار نے اسے سستی میں مبتلا کر کے نیند کی آغوش میں پہنچا دیا تھا۔ جینی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا تو اس کی کار اپنے ٹائروں پر کھڑی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ ٹائر لگ چکے ہیں اور کولن کو جانے کی کوئی فکر ہی نہیں ہے۔ وہ کمرے سے باہر نکلی اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی گئی۔ پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ جینی نے متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھا اور پھر

پکارا۔

''کولن... کولن... کہاں ہو کولن...؟''

جینی آوازیں دیتی ہوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس نے لان کی طرف بھی جھانکا لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ واپس آئی اور اس کی نظر ہیرس کے کمرے کی طرف رک گئی۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ہیرس کے کمرے کے پاس جا کر اس نے آہستہ سے دستک دی جب کوئی آواز نہ آئی تو اس نے ہینڈل گھما کر آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ جیسے جیسے دروازہ کھلتا گیا کمرا جینی کی نگاہ کے سامنے آتا گیا اور یکدم وہ چونک گئی۔ عین سامنے کرسی پر ہیرس براجمان اسی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''زہے نصیب... مجھے خوشی ہوئی کہ تم میرے کمرے تک آئیں۔'' اُسے دیکھتے ہی ہیرس مسکرا کر بولا۔

''کولن کہاں ہے؟'' جینی نے سپاٹ اور سرد لہجے میں پوچھا۔

''یہ بات تم اندر آ کر مجھ سے آرام سے بھی پوچھ سکتی ہو۔'' ہیرس نے کہا۔

''مجھے اندر آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کولن کہاں ہے۔'' وہ دروازے میں ہی کھڑی ہو گئی تھی۔

''جینی کیا تم اب بھی مجھ سے نفرت کرتی ہو جبکہ تمہاری شادی ہو چکی ہے اور میں اپنی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے سہارے جی رہا ہوں۔'' ہیرس نے کہا۔

''مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ کہ کولن کہاں ہے۔'' جینی اس سے بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

''لیکن مجھے دلچسپی ہے۔ کیونکہ میں تمہارے لیے دل میں نفرت لیے جی رہا ہوں۔ اب مجھے تم سے انتقام لینے کا موقع ملا ہے تو میں اسے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔ اور میری خوش نصیبی کہ تمہارا شوہر ان میں سے ہے جن کے ساتھ اگر ہنس کے بات کی جائے تو وہ اسی کے ہو جاتے ہیں۔ تمہارے شوہر کو سیر و سیاحت کا شوق ہے اور وہ دوستوں کی محفل سے پوری طرح لطف اندوز ہونا جانتا ہے۔ اسی لیے تو وہ یہاں تک گیا ہے اور مجھے انتقام لینے کا موقع مل گیا۔''

''میں اپنے شوہر کی ان عادات سے اچھی طرح سے واقف ہوں۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔'' جینی نے اس کی طرف آنکھیں نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں یہ بھی جانتی ہوں کہ میری پسند اور ناپسند سے اچھی طرح واقف ہو۔ اسی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے تم نے آج ناشتے اور دوپہر کے کھانے میں وہی پکایا جو مجھے پسند تھا۔ اور تم نے کولن سے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ سب میری فرمائش پر تیار ہوا ہے۔''

''اگر میں نے غلط کہا تھا تو تم اس وقت انکار کر دیتیں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔

''تم اس وقت ہیرس نہیں بلکہ کالے شیطان ہو جس سے میں کسی بھی غلط بات کی اُمید کر سکتی ہوں۔ میرے انکار پر جانے تم کیا ڈراما رچا دیتے کہ میں ایک قدم گیلی جگہ سے اُٹھانے کی کوشش کرتی تو میرا دوسرا قدم گیلی جگہ پر پڑ جاتا۔''

ہیرس مسکرایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ تم یہ تسلیم کرتی ہو کہ میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

''تم کچھ نہیں کر سکتے سوائے اپنی شیطانی چالوں کے۔''

''جب کولن میرے ساتھ وھسکی پی رہا تھا تو اس کی زبان چلنے لگی اور اس نے بتایا کہ وہ اپنی خوبصورت بیوی کا بہت خیال رکھتا ہے۔ اور اس نے خیال رکھنے کی جو وضاحت کی تھی اس سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا تھا۔ مجھے پتا چل گیا کہ تمہارا شوہر شکی مزاج ہے اور تم سے اس لیے خوفزدہ بھی ہے کہ تم کسی بھی مرد سے گھل مل جاتے میں دیر نہیں لگاتی ہو۔'' ہیرس نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

''میں ایسا کرتی ہوں لیکن میرے دل میں صرف میرے شوہر کی جگہ ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔

ہیرس بولا۔ ''جب تم کولن سے جانے کا کہتی ہو اور میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہوں تو اس رکاوٹ کی وجہ سے تمہارے چہرے پر جو پریشانی اور اذیت ابھرتی ہے اس سے مجھے لگتا ہے جیسے سالوں بعد مجھے میرے زخم پر رکھنے کو مرہم مل رہا ہے۔''

''میں نے غلطی کی کہ تمہاری ایک ٹانگ توڑی' مجھے چاہیے تھا کہ میں تمہیں جان سے ہی مار دیتی۔'' اس نے غصے سے دانت پیسے۔

ہیرس نے قہقہہ لگایا۔ ''یہ تکلیف جو تمہارے اندر سے اُٹھی ہے یہ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ تکلیف دیکھ کر مجھے سکون آئے گا۔''

''تم کمینے اور ذلیل ہو۔'' جینی کو اتنا غصہ آگیا کہ وہ اس کی جانب بڑھی اور دروازہ خود بخود بند ہو گیا۔ وہ چلاّنے لگی۔ ''میں چاہوں تو ابھی تمہارا اگلا دبا کر تمہیں جان سے مار دوں۔ لنگڑے ہیرس...''

ہیرس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اپنے پاس رکھی شیونگ کریم کی ٹیوب اُٹھا کر اس کی پچکاری اس کے سر

پر ماردی۔ بہت سی کریم اس کے سر پر لگ گئی اور وہ مزید سیخ پا ہوگئی۔

''یہ کیا کیا تم نے... کتے۔'' جینی اسی وقت پلٹی اور دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکلی اور بھاگتی ہوئی اوپر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ ٹھیک اسی وقت کولن اندر داخل ہورہا تھا۔ اس نے جینی کو ہیرس کے بیڈروم سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا تو اس کے قدم اسی جگہ رک گئے۔ اس کے چہرے پر حیرت کے ساتھ شک سے بھرا غصہ بھی عیاں ہونے لگا۔

ہیرس نے کولن کو جیک کے ساتھ بھیج کر کچھ ہدایت بھی کی تھی۔ ہیرس کو یقین تھا کہ جب کولن، جینی کے پاس نہیں جائے گا تو وہ اسے دیکھنے نیچے ضرور آئے گی۔ جیک منصوبے کے مطابق کولن کو آدھے گھنٹے میں ہی واپس لے آیا تھا۔ جیک نے ایک عمارت کے سامنے کارروک کر دیکھا تھا اور کولن کو بتایا کہ آج یہ عمارت بند ہے۔ کولن نے سنا تو وہ مایوس سا ہوگیا تھا۔

جیک اسے واپس سیدھا گھر نہیں لے کر آیا تھا بلکہ اس گھر سے ملحق جو ہیرس کی ملکیت ویران سی جگہ تھی وہاں لے گیا تھا اور اُسے کچھ ایسے واقعات سنانے لگا جسے سن کر کولن خوش ہورہا تھا۔

اور جب جینی کمرے سے باہر نکلی اور کولن کی تلاش میں ہیرس کے کمرے تک پہنچ گئی تو ہیرس نے اپنے موبائل فون سے کال کی اور فون بند کردیا تھا۔ جیک کچھ وقفے کے بعد کولن کو لے کر گھر کی طرف آگیا۔

کولن جب ہیرس کے گھر میں داخل ہورہا تھا تو ہیرس کی کار موجود نہیں تھی بلکہ وہاں ایک موٹر بائیک کھڑی تھی۔ جیک چلتے ہوئے موبائل فون سے ہیرس کو بتارہا تھا کہ کولن کہاں تک پہنچا ہے۔ اب جیسے ہی کولن گھر میں داخل ہوا اس کے لیے منظر بہت حیران کن تھا کہ جینی تیزی سے ہیرس کے بیڈروم سے نکل کر اوپر اپنے کمرے کی طرف دوڑی تھی۔

کولن کچھ دیر تو اسی جگہ کھڑا تپتا رہا اور پھر تیزی سے اوپر چڑھا اور کمرے کا دروازہ کھول کر اس نے اپنا قدم کمرے میں رکھا ہی تھا کہ اسے باتھ روم میں پانی چلنے کی آواز آئی۔ کولن کی سانس تیز ہوگئی۔ وہ واپس پلٹا اور برق رفتاری سے ہیرس کے کمرے کے پاس جاکر اس نے دروازہ کھولا تو اندر کوئی نہیں تھا البتہ بیڈ کی چادر بے ترتیب تھی۔ کولن کا چہرہ اور بھی سرخ ہوگیا۔ وہ واپس پلٹا تو اس کے عقب میں ہیرس گھر کے اندر داخل ہورہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خریداری کے بڑے لفافے تھے۔ گیراج میں ہیرس کی کار بھی کھڑی ہوگئی تھی۔ کولن اسے دیکھ کر اسی جگہ رک گیا۔

''کیا بات ہے کولن، مجھے ڈھونڈ رہے ہو؟'' ہیرس نے خوشگوار لہجے میں پوچھا اور اس سے پہلے کہ کولن کچھ کہتا ہیرس نے فوراً جیک کو آواز دی۔ جیک آگیا تو اس نے کہا۔ ''کیا کرس آیا تھا؟''

''جب ہم گھر میں داخل ہورہے تھے تو اس کی موٹر بائیک میں نے دیکھی تھی۔'' جیک نے جواب دیا۔

''میں بھی مارکیٹ میں چلا گیا تھا۔ ابھی میں نے اسے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ ایک نمبر کا کمینہ ہے۔ جگہ جگہ منہ مارنے کی اس کی عادت ہے۔ اس نے پھر میری غیر موجودگی کا فائدہ اُٹھایا ہے۔ دیکھو جیک وہ گھر سے کوئی چیز تو نہیں اُٹھا کر لے گیا۔'' جیک فوراً اس جگہ سے چلا گیا۔

''کرس کون ہے؟'' کولن نے یکدم پوچھا۔

''میرا کزن ہے۔ یہاں رہتا تھا میں نے اسے گھر سے نکال دیا۔ تمہارے جاتے ہی میں بھی مارکیٹ کی طرف چلا گیا تھا۔ مجھے کچھ خریداری کرنی تھی۔ میری غیر موجودگی میں وہ گھر آگیا تھا۔ جاتے ہوئے میں گھر کی چابی کہاں رکھتا ہوں اسے پتا ہوتا ہے۔ اب چابی کی جگہ بھی تبدیل کرنی پڑے گی۔'' ہیرس کو تاسف ہورہا تھا۔

''کیا کرتا ہے کرس؟'' کولن کے تن بدن میں آگ لگی ہوئی تھی۔

''عیاش ہے۔ باپ کے پیسے پر عیاشی کرتا ہے۔ کسی بھی لڑکی کو شیشے میں اتارنے کا فن اس سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ جادوگر ہے وہ۔'' ہیرس غصے سے کہتا ہوا اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا اور پھر جیسے ہی اس نے دروازہ کھولا وہ رک گیا اور جیک کو آواز دی۔ جیک اس کے پاس گیا تو اس نے جیک سے کچھ کہا اور جیک کمرے میں چلا گیا اور ہیرس کچھ سوچتے ہوئے کولن کے پاس رک گیا۔

''تم کب آئے کولن؟''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے۔''

''جینی کیا اوپر کمرے میں ہے؟'' ہیرس نے ایسے پوچھا جیسے وہ خود کسی شک میں مبتلا ہوگیا ہو۔ کولن جو پہلے ہی شکی مزاج تھا وہ عجیب مخمصے میں پڑ گیا۔

''میں دیکھتا ہوں۔''

کولن اوپر چلا گیا۔ اس وقت جینی اپنا سر دھو کر باہر

نکل کر تولیے سے بال خشک کر کے آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں برش کر رہی تھی۔ کولن اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹ چباتا رہا۔

''کہاں چلے گئے تھے تم؟ کیا تمہیں جانے کا کوئی خیال نہیں ہے؟'' اسے دیکھتے ہی جینی نے کہا۔

''اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ یہاں دل لگ رہا ہے۔ ایک آدھ دن اور رکتے ہیں۔'' کولن خشک لہجے میں بولا۔

''کیا مطلب؟ مجھے یہاں نہیں رکنا۔ چلنے کی تیاری کرو۔ ہماری کار کے ٹائر لگ چکے ہیں۔''

''تم نے کیسے دیکھا کہ ٹائر لگ چکے ہیں۔ نیچے گئی تھیں کیا؟''

''میں نے اوپر کھڑکی سے دیکھا تھا۔'' جینی نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم اوپر ہی رہی تھیں۔''

''تمہیں دیکھنے کے لیے میں نیچے بھی گئی تھی۔'' جینی نے برش ایک طرف رکھ دیا۔

''پھر نیچے کون ملا تھا؟'' کولن کے لہجے میں طنز چھپا ہوا تھا جسے جینی محسوس نہیں کر سکی تھی۔

''تم نہیں ملے تھے۔''

''جب میں نہیں ملا تو تم فریش ہونے کے لیے اوپر آگئیں؟'' کولن اس کی طرف عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

جینی نے سوچا کہ وہ بتا دے کہ اس کی تلاش میں جب وہ ہیرس کے کمرے میں گئی تو اس نے شیونگ کریم اس کے سر پر ڈال دی اور اسے سر دھونے کے لیے اوپر آنا پڑا۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ کولن کو بتانا فضول ہی نہیں بحث کا باعث بھی ہے۔ کولن غصے میں یہاں کوئی نیا محاذ کھڑا کر سکتا تھا اور اس محاذ میں ہیرس کچھ ایسی چال چل سکتا تھا کہ جینی کے لیے مشکل کھڑی ہو سکتی تھی کیونکہ جینی جانتی تھی کہ ہیرس کی نیت ٹھیک نہیں ہے اور اس کے ارادے اسے کسی بھی نقصان سے دوچار کر سکتے ہیں۔ اس لیے اس نے بہتر سمجھا کہ وہ بات کو سمیٹ دے۔

''ہاں۔''

کولن کے اندر ایک طوفان سا اُٹھا اور اس نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''میں نیچے ہیرس کے پاس ہوں۔''

''واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے؟ تم ہیرس کے ساتھ ہی نتھی ہو گئے ہو۔'' جینی تیز لہجے میں بولی۔ کولن اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کمرے سے باہر چلا گیا اور جینی بند دروازے کو تکتی رہی۔

کولن نیچے پہنچا تو ہیرس کھڑا جیک سے کہہ رہا تھا۔

''خانساماں آئے تو اسے کہنا کہ وہ اب گھر نہ جایا کرے۔ رات کے کھانے میں جینی نے اُبلے چاول اور جھینگے کی فرمائش کی ہے۔ خانساماں کو بلاؤ اور اُسے کہو کہ میں سارا سامان لے آیا ہوں آ کر اس کو پکانے کی تیاری کرے۔''

جیک حکم سنتے ہی چلا گیا۔ کولن نے پوچھا۔ ''جینی نے یہ کب اس کھانے کی فرمائش کی تھی؟''

''جب تم جیک کے ساتھ چلے گئے تھے تو جینی نے مجھ سے فرمائش کی تھی۔ جب میں مارکیٹ یہ سب چیزیں لینے جا رہا تھا تو مجھے لگا تھا کہ کرس کی گاڑی میرے گھر کی طرف جا رہی ہے۔ میں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا اور اس خیال کو اپنے ذہن سے نکال دیا تھا۔'' ہیرس نے بتانے کے بعد پھر کرس کا ذکر کر دیا۔

''کرس آیا اور چلا گیا؟ وہ آیا کیوں تھا؟'' کولن نے پوچھا۔

''میرے غصہ ہونے کے باوجود وہ میرے پاس چلا آتا ہے۔ بڑا ڈھیٹ قسم کا انسان ہے...'' ہیرس کہتے کہتے کسی خیال کے تحت رک گیا اور سوچنے لگا۔ کولن اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''تم کچھ کہنا چاہتے ہو ہیرس؟''

''نن... نہیں... چھوڑو۔''

''مجھے لگتا ہے کہ تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟'' کولن نے کریدا۔

''میرے جانے کے بعد گھر میں صرف جینی تھی اور کرس...'' ہیرس چپ ہو گیا۔ وہ تذبذب کا شکار تھا اور پھر وہ اپنے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ کولن کے دل میں جینی کی طرف سے شک اور بھی بڑھ گیا تھا۔

کولن نے سوچا کہ اگر وہ اس وقت جینی کے پیچھے اوپر جانے کے بجائے بیڈ روم میں چلا جاتا تو وہ شاید کرس کو بیڈ روم میں موجود پاتا۔

کولن باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ اس کی گاڑی کے ساتھ موٹر بائیک نہیں تھی۔ وہ واپس آیا اور ہیرس کے بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ کولن نے پہلے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن پھر اس نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ ہیرس کے ہاتھ میں کچھ تھا جو اس نے دروازہ کھلتے ہی اپنی پشت پر کر لیا۔ کولن نے محسوس کر لیا تھا کہ ہیرس نے اس سے کچھ چھپایا ہے۔

"مجھے دستک دے کر آنا چاہیے تھا، میں معذرت چاہتا ہوں۔" کولن کی متلاشی نگاہیں اس کی پشت پر چھپی چیز کو دیکھنے کے لیے مضطرب تھیں۔

"کوئی بات نہیں۔تم کیسے بھی آسکتے ہو؟"

"میں پوچھنا چاہتا تھا کہ باہر موٹر بائیک کس کی کھڑی تھی۔دراصل میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں موٹر بائیک پر قصبہ گھوموں۔" کولن نے بات چھیڑی۔

"وہ اس کمینے کرس کی تھی۔اگر تم قصبہ گھومنا چاہتے ہو تو میں موٹر بائیک کا انتظام کردیتا ہوں لیکن اس سے بھی ایک اچھی پیشکش ہے میرے پاس۔"

"وہ کیا؟"

"کیوں نہ ہم قریبی جنگل میں شکار کھیلنے کے لیے جائیں۔شکار کھیلنے کے لیے ہمیں ہرن آسانی سے مل جاتے ہیں۔اور پھر وہاں ایک دریا بھی ہے۔جہاں سے ہم مچھلی کا شکار بھی کرسکتے ہیں،شاید تم اس دریا اور مچھلی کے شکار کے بارے میں بھول گئے ہو۔" ہیرس نے کہا تو کولن سوچنے لگا۔

"یہ سارا سامان میری دلچسپی کا ہے۔لیکن جینی جانا چاہتی ہے۔"

"کیا اس نے تم سے کہا ہے کہ وہ جانا چاہتی ہے؟" ہیرس نے پوچھا۔

"ہاں وہ کئی بار کہہ چکی ہے اور اب بھی اس کا یہی تقاضا ہے کہ ہم تمہیں خدا حافظ کہہ کر اپنا سفر شروع کردیں۔"

"شاید وہ تم سے مذاق کررہی ہے کیونکہ اگر وہ جانا چاہتی تو اپنی فرمائش کا کھانا رات کے لیے کیوں تیار کرواتی۔"

کولن سوچنے لگا۔"ہیرس کیا میں تم سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

"ہاں کیوں نہیں۔"

"تم بتارہے ہو کہ کرس بہت ہی کمینہ اور جانے کیا کیا ہے؟ ہمارے جانے کے بعد جینی اس گھر میں اکیلی تھی... کیا تم سمجھتے ہو کہ کرس اپنی اوقات سے باز نہ آیا ہوگا؟"

اس کی بات سن کر ہیرس دل میں مسکرایا۔"کیا تم کو کچھ شک ہوا ہے؟"

کولن سوچنے لگا کہ وہ کیا جواب دے۔

"شاید... میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔"

"مجھے کرس پر بالکل بھی اعتماد نہیں ہے۔اگر میں شادی شدہ ہوتا تو کرس کے خوف سے میں اپنی بیوی کو کمرے میں بند کرکے جاتا۔لیکن ایک دوست ہونے کے ناتے مشورہ دوں گا کہ تم زیادہ سوچنے کے بجائے وقت کا انتظار کرو اور جینی کو اپنے ساتھ شکار پر چلنے کے لیے راضی کرلو۔میں خود یہ سراغ لگانا چاہتا ہوں کہ کرس کیوں آیا تھا۔؟ ہمارے ہمسائے میں اسی کے جیسا اس کا دوست بھی رہتا ہے۔مجھے شک ہے کہ اس نے کرس کو اطلاع دی ہوگی اور اگر تم جینی سے اس بارے میں کوئی بات کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ تمہارا یا میرا شک ہو اور اس بات کا سرے سے کوئی وجود ہی نہ ہو۔اور خواہ مخواہ تم دونوں کی ہنسی خوشی زندگی میں دراڑ آجائے۔"

کولن نے سوچا کہ ہیرس ٹھیک کہہ رہا ہے۔بات کی تہ میں پہنچنے سے پہلے اس کا بات کرنا مناسب نہیں رہے گا،وہ بولا۔"ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں۔"

"تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟"

اس کا سوال سن کر ہیرس گڑبڑا گیا۔"نہیں،کچھ نہیں ہے۔"

"کچھ تو ہے جو مجھ سے چھپایا جارہا ہے۔"

کچھ تذبذب کے بعد ہیرس بولا۔"وہ کتا سیدھا میرے بیڈروم میں آیا تھا... پتا نہیں یہ کس کی ہے اور بیڈ کے نیچے چھوڑ گیا ہے..." ہیرس نے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑی رنگ سامنے کردی۔ جو ہیرس نے کمرے میں دونوں کی غیر موجودگی میں جیک کے ذریعے سے اٹھوائی تھی۔جیک اس کمرے سے ہیرس کی ہدایت پر جینی کی کوئی بھی چیز لینے گیا تھا۔لیکن اسے بیڈ کی تپائی کے ساتھ وہ رنگ پڑی دکھائی دے گئی تھی۔جیک نے وہ رنگ ہی اُٹھالی تھی۔

وہ رنگ کولن نے شادی کی رات جینی کو خود پہنائی تھی۔اپنے ہاتھ سے خریدی اور پہنائی ہوئی رنگ کو کولن کیسے بھول سکتا تھا۔کولن کو دھچکا سا لگا اور دل میں ایک طوفان سا اُٹھا۔کولن نے پوچھا۔

"یہ کہاں سے ملی ہے؟"

"یہاں نیچے گری ہوئی تھی۔" ہیرس نے بتایا۔

کولن کا دل چاہا کہ... وہ ابھی جاکر جینی کو بالوں سے پکڑ کر کھینچتا ہوا یہاں تک لائے اور اس کی رنگ دکھا کر پوچھے کہ یہ اس کمرے میں کیا کررہی ہے۔لیکن اس نے ایک بار پھر جبر کیا۔وہ کچھ وقت لینا چاہتا تھا۔چنانچہ اس نے پوچھا۔"پھر شکار کا کیا ارادہ ہے؟"

"اب تو سہ پہر ہورہی ہے۔کیا خیال ہے صبح ناشتے

کے بعد مچھلی کے شکار کو چلیں؟''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' کولن کہہ کر مسکرایا اور کمرے سے چلا گیا۔ ہیرس نے محسوس کیا تھا کہ کولن کا چہرہ مرجھا سا گیا تھا اور اس کی مسکراہٹ میں بھی وہ بات نہیں تھی۔ ہیرس اپنے مقصد میں کامیاب جا رہا تھا۔

کولن اوپر کمرے میں جانے کے بجائے لان میں بیٹھ گیا۔ اس کی خاموشی کے پیچھے طوفان چھپا ہوا تھا جو مناسب وقت پر تلاطم بپا کر سکتا تھا۔

☆☆☆

جینی کے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ ہیرس نے اس کے گرد کیسا جال بُن دیا ہے۔ کولن کے دل میں ہیرس شک کے ایسے کانٹے بونے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ ان سے کسی بھی وقت دامن چھلنی ہو سکتا تھا۔

جینی اس قصبے سے جلدی جانا چاہتی تھی لیکن کولن جب سے گیا تھا وہ واپس کمرے میں ہی نہیں آیا تھا۔ جینی نے وقت دیکھا چار بج چکے تھے۔ جینی اُکتا کر کولن کے پاس جانے کے لیے اُٹھی اور ابھی اس نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ وہ چونک کر رک گئی۔ سامنے ہیرس کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی جینی کا منہ بن گیا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے روکھے انداز میں پوچھا۔

''ایک گزارش کرنے آیا تھا۔'' ہیرس کا لہجہ بہت دھیما اور ندامت آمیز تھا۔ جینی کو لگا جیسے اس کے سامنے وہ ہیرس کھڑا ہے جب وہ ان کا ملازم ہوا کرتا تھا۔

''کیسی گزارش...؟'' جینی اس کا جائزہ لے رہی تھی۔

''میں نے ابھی کولن سے جھوٹ بول دیا کہ تم نے رات کا کھانا اپنی مرضی کا بنانے کی فرمائش کی ہے۔''

''کیا...؟'' اس کی بات سن کر وہ چونکی۔

''جب سے یہ بات میں نے کولن سے کی ہے وہ بہت افسردہ ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ تم نے اسے جانے کے لیے کہا تھا اور میں نے کھانے کی فرمائش کا بول دیا۔ وہ پریشان ہے کہ تم اسے یہاں سے جانے پر مجبور کر رہی ہو اور اپنی مرضی کے کھانے بھی بنوا رہی ہو۔''

''تم نے ایسا کیوں کیا؟'' جینی کا غصہ دوچند ہو گیا۔

''تم نے جو کچھ ماضی میں میرے ساتھ کیا تھا میں اس کا انتقام لینا چاہتا تھا۔ لیکن اس غلط بیانی کے بعد جب میں نے کولن کے افسردہ چہرے کی طرف دیکھا تو مجھے اس احساس نے بری طرح سے گھیر لیا کہ کولن تم سے بہت محبت کرتا ہے اور میرے جھوٹ کی وجہ سے اس کا دل بجھ سا گیا ہے۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کولن اچھا انسان ہے۔''

آخری جملہ کہتے ہوئے ہیرس کے لہجے میں ندامت اور چہرے پر جیسے کرب سا ابھر آیا تھا۔ جینی کے لیے یہ تغیر حیران کن تھا۔

''یہ تم کہہ رہے ہو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو؟'' ہیرس کا چہرہ اس معصوم بچے کی طرح تھا جو کسی بات سے ڈر گیا ہو۔

جینی متحیّر نگاہوں سے اس کی طرف ایسے دیکھ رہی تھی جیسے ہیرس اس کے سامنے عجوبے کی صورت میں کھڑا ہو۔

''میرے لیے یقین کرنا مشکل ہے کہ تم جو مجھے اذیت دینا چاہتے تھے اور کل رات سے تم نے مجھے اذیت میں مبتلا کر بھی رکھا ہے، اب اپنے کیے پر نادم ہے؟''

''انسان کے دل میں احساس کسی بھی وقت جاگ سکتا ہے۔ تم میری بات کا یقین کرو۔ میں واقعی نادم ہوں۔ تمہارا کولن کے ساتھ خوش رہنا ہی میرے لیے سکون اور اطمینان کا باعث ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں کبھی بھی ایسا نہیں تھا۔ میں نے تب بھی تمہارا نام نہیں لیا تھا جب مسٹر فلپس مجھ سے بار بار پوچھ رہے تھے۔ میری اتنی گھٹیا سوچ نہیں تھی۔ میں تم کو کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ جینی مجھے معاف کر دو۔'' ہیرس نے کہا اور اس کے سامنے گردن جھکا کر اپنے ہاتھ بھی جوڑ دیے۔

جینی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ یہ ہیرس کی نئی چال ہو سکتی ہے اس لیے وہ بولی۔

''کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔ آج اس وقت میں اپنے آپ کو تمہارا وہی نوکر تسلیم کر رہا ہوں جو ماضی میں مسٹر فلپس کی بھینسوں کی رکھوالی کیا کرتا تھا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ اپنے اس نوکر کو معاف کر دو جو تمہارے ایک حکم پر دوڑا چلا آتا تھا۔''

جینی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا لیکن جس انداز میں ہیرس کھڑا تھا اسے لگ رہا تھا کہ ہیرس سچ کہہ رہا ہے۔

''اپنا چہرہ اوپر کرو۔'' جینی نے کہا تو جیسے ہی ہیرس نے اپنا چہرہ اوپر کیا، اس کی بھیگی ہوئی آنکھیں دیکھ کر جینی کو یقین ہو گیا کہ ہیرس ٹھیک کہہ رہا ہے۔

''ٹھیک ہے میں نے معاف کیا۔'' جینی اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

''بہت شکریہ... اب ایک اور درخواست ہے۔''

ہیرس نے اپنی آنکھیں جھکالیں اور اس نے اپنے ہاتھ بھی جینی کے سامنے بدستور جوڑ رکھے تھے۔

''وہ کیا؟'' جینی نے پوچھا۔

''براہِ مہربانی تم آج مت جانا۔ کولن مچھلی کے شکار پر جانا چاہتا ہے۔ کل ہم ناشتے کے بعد مچھلی کا شکار کرنے جائیں گے۔ تم بھی ساتھ چلنا اور دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں تم دونوں کو رخصت کر دوں گا۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' جینی جھلا گئی۔

''کولن کی خواہش بھی ہے اور میں اس کی اداسی بھی دور کرنا چاہتا ہوں۔ براہِ مہربانی ایک آخری بات مان لو اور انکار مت کرو۔ کولن تمہاری وجہ سے مچھلی کا شکار چھوڑ کر چلے جانا چاہتا ہے۔ پلیز کولن کی خوشی کے لیے ایک رات کے لیے رک جاؤ۔'' ہیرس نے اسی انداز میں استدعا کی۔

جینی چپ ہوگئی۔ وہ جانتی تھی کہ کولن کو مچھلی کا شکار کرنا اتنا پسند ہے کہ وہ اس کے لیے پاگل ہو جاتا تھا۔ اس لیے جینی نے اثبات میں سر ہلا ہی دیا۔ ہیرس شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلا گیا اور پابند کر دیا کہ وہ اس گفتگو کا تذکرہ کولن سے نہ کرے۔ وہاں سے جاتے ہوئے ہیرس کے چہرے پر ایک مکارسی مسکراہٹ آگئی۔ وہ ایک اور چال کھیلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

☆☆☆

کولن بظاہر ہنستا مسکراتا دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کا دل بجھ چکا تھا اور وہ جینی سے کچھ متنفر ہو گیا تھا۔ کولن بہت دیر تک لان میں بیٹھا رہا تھا۔ شام کے سائے رفتہ رفتہ پھیل رہے تھے کہ جینی اس کے پاس چلی آئی۔

''کیا بات ہے تم یہاں بیٹھے ہو؟''

''سوچ رہا ہوں کہ واپسی کے لیے نکلیں۔'' کولن کے چہرے پر متانت تھی۔

جینی مسکرائی۔ ''اندر جو میری پسند کا کھانا تیار ہو رہا ہے وہ کون کھائے گا اور پھر کل ہم سب کو مچھلی کے شکار کے لیے بھی تو جانا ہے۔ مچھلی کا شکار کرنا تمہیں کتنا پسند ہے نا۔''

''مجھے مجبور کرتی ہو کہ ہم واپس چلیں اور خود اپنی پسند کے پکوان بھی تیار کرواتی ہو۔ کیا تم میری مدد کرو گی کہ میں اس جینی کا چہرہ دیکھ سکوں جو اصل ہے۔'' کولن اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

جینی اس کی بات سن کر ہنس پڑی۔ ''کیا میں تم سے مذاق بھی نہیں کر سکتی۔ مجھے تو خود یہ قصبہ اچھا لگتا ہے۔ میں تو خود اس جگہ کچھ دن اور رہنا چاہتی ہوں۔''

کولن اس کی بات سن کر دنگ رہ گیا۔ جو اسے بار بار اس جگہ سے جانے کے لیے کہتی رہی اب اچانک اسے قصبہ اچھا لگنے لگا تھا۔ وہ یہاں رہنا چاہتی تھی۔ اتنی جلدی کایا پلٹ گئی تھی۔ کولن کا خون کھول اٹھا۔ لیکن ہیرس بھی سائے کی طرح ان کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ان کی باتیں سن رہا تھا۔ جیسے ہی جینی نے یہ بات کہی وہ فوراً پاس پڑا گٹار اٹھا کر اسے بجاتا ہوا ان کے پاس چلا گیا۔

وہ ایک مشہور گانا اپنی بے ڈھنگی آواز میں گاتے ہوئے گٹار بھی بجا رہا تھا۔ دونوں کے پاس آکر وہ گانے کے ساتھ ہلکا پھلکا ڈانس بھی کرنے لگا۔ اپنی لنگڑی ٹانگ کے ساتھ مضحکہ خیز انداز میں ڈانس کرتے ہوئے وہ ایسا عجیب لگ رہا تھا کہ کولن اور جینی کے چہروں پر بے اختیار ہنسی آگئی۔ ہیرس گاتا جا رہا تھا اور گاتے گاتے اس نے کولن کو بھی ناچنے پر مجبور کر ہی دیا۔ کچھ دیر میں وہاں ماحول ہی بدل گیا تھا۔ وہ تینوں گانے میں شامل ہو گئے تھے۔ پھر وہ تینوں ایک ساتھ جھومنے لگے۔ ہیرس اپنی لنگڑی ٹانگ سے پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ ناچنے میں ان کا بھرپور ساتھ دے۔

پھر تو وہاں ایک محفل سج گئی۔ وہ تینوں باری باری گٹار بجانے لگے اور گانے لگے۔ ان کے قہقہے بھی پھوٹ رہے تھے۔ کولن بہت پرجوش تھا۔ اور ایسا لگتا تھا جیسے اس تفریح نے اس کے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کر دیا ہو۔ وہ سب کچھ بھول گیا ہو۔

رات ہو گئی تھی۔ آسمان پر چاند چمکنے لگا تھا۔ اور تینوں ناچ گانے میں مصروف تھے۔ پھر کولن نے گٹار ایک طرف رکھ دیا اور تالیاں بجانے لگا۔ اسی ہنسی مذاق میں وہ کھانے کی میز تک پہنچ گئے اور ہنستے، باتیں کرتے کھانا کھانے لگے۔ جینی کو بھی اچانک اچھا لگنے لگا تھا۔ اس نے بھی ہیرس کی آنکھوں میں احترام دیکھا تھا جو ملازم کی صورت میں ہیرس کی آنکھوں میں ہوتا تھا۔

ہیرس کے پاس ایک فن تو تھا کہ وہ اپنی دلچسپ باتوں سے دوسروں کو باندھ لیتا تھا۔ کچھ ایسا ہی اس وقت بھی ہوا تھا۔ اس نے اپنی باتوں سے جینی اور کولن کو بار بار ہنسنے پر مجبور کر دیا تھا۔ رات گئے جینی سونے کے لیے کمرے میں چلی گئی اور دونوں وھسکی پینے لگے اور کولن اسی جگہ ڈھیر ہو گیا۔

☆☆☆

صبح ناشتے سے فارغ ہوتے ہی وہ گاڑی میں بیٹھ کر دریا کنارے پہنچ گئے۔ وہ دو گاڑیوں میں آئے تھے۔ ایک میں ہیرس، کولن اور جینی تھے جبکہ دوسری کار میں جیک اور

ایک مددگار تھا۔

وہ جگہ بہت ہی خوبصورت تھی جیسے کسی کہنہ مشق شاعر کی غزل ہو۔ سامنے دریا تھا اور پیچھے درختوں کے جھنڈ تھے۔ اور دریا کے پار دور جانے کونسی دنیا آباد تھی۔

دھوپ خوب چمکدار تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور درختوں سے مختلف پرندوں کے بولنے کی آوازیں جلترنگ بکھیر رہی تھیں۔

کولن اور ہیرس ڈور ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ چرخیاں ان کے ہاتھوں میں تھیں اور جینی ان کے عقب میں ٹہلتی ہوئی ارد گرد کا نظارہ کر رہی تھی۔ کولن اور ہیرس باتوں میں بھی مشغول تھے۔ اچانک کولن کی ڈوری میں ہلچل سی ہوئی اور کولن پُرجوش ہوگیا۔ وہ چرخی گھمانے لگا۔ ہیرس اس سے بھی زیادہ شور مچا رہا تھا۔ ایک اچھی مچھلی اس کی ڈور کے ساتھ لٹکی ہوئی تھی۔ کولن نے نعرہ لگایا اور بے اختیار جینی کو پکارا۔

''دیکھو جینی... میں نے کیسا شکار پکڑا ہے...'' اچانک کولن کی توجہ اپنی مچھلی سے ہٹ گئی اور اس نے اپنے عقب میں متلاشی نگاہوں سے دیکھا۔ جینی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ ان سے کچھ فاصلے پر ان کا مددگار کھڑا تھا۔

''جینی کہاں گئی...؟'' کولن نے متفکر لہجے میں پوچھا۔

''تم اپنی مچھلی کی طرف توجہ دو۔ وہ یہیں کہیں ہوگی۔'' ہیرس نے اس کی توجہ مچھلی کی طرف مبذول کرانا چاہی۔ لیکن کولن کی نگاہیں مسلسل جینی کو تلاش کر رہی تھیں۔ جینی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''جینی... جینی...'' کولن نے بلند آواز سے پکارا۔ کولن کی آواز دور تک گئی لیکن جینی کہیں سے بھی نمودار نہیں ہوئی۔ ہیرس بھی کچھ پریشان ہوگیا۔ اچانک بائیں طرف سے جیک کچھ سوکھی لکڑیاں اُٹھائے نمودار ہوا۔

''جیک... کیا تم نے جینی کو دیکھا ہے؟'' ہیرس نے پوچھا۔

''نہیں، میں تو سوکھی لکڑیاں لینے گیا تھا کہ اگر مچھلی کھانے کا یہیں موڈ ہو تو میں بھون کر دے سکوں۔'' جیک نے کہتے ہوئے لکڑیاں ایک طرف ڈھیر کردیں۔

کولن مچھلی اور کانٹے کو بھول گیا تھا۔ جینی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ اس نے سب کچھ چھوڑا اور جنگل کی طرف بھاگا۔ اس کے پیچھے ہیرس اور جیک بھی چل دیے۔

درختوں کے جھنڈ میں جا کر کولن نے جینی کو بلند آواز سے پکارا لیکن جینی نے جواب میں کوئی آواز نہیں نکالی۔ کولن اور ہیرس کی تشویش بڑھ گئی۔ وہ تینوں درختوں کے بیچوں بیچ بھاگتے ہوئے اسے تلاش کر رہے تھے۔

''جینی کے پاس موبائل فون ہے۔'' ہیرس نے پوچھا۔

کولن نے اپنا موبائل فون نکال کر نمبر ملایا اور کان سے لگا کر دائیں بائیں بھی دیکھنے لگا۔ اچانک جینی کے موبائل کی گھنٹی قریب سے ہی کہیں بجنے لگی۔ تینوں آواز کی سمت بڑھے اور انہوں نے تھوڑی کوشش کے بعد ایک درخت کی شاخ پر پڑا فون تلاش کرلیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے جینی نے اپنا موبائل فون خود اس شاخ پر رکھ دیا ہو۔

کولن نے موبائل فون پکڑ کر ایک بار پھر دور تک دیکھا اور بولا۔ ''جینی کہاں گئی... اور اس کا موبائل فون یہاں کیا کر رہا ہے؟''

وہ تینوں دو گھنٹے تک جینی کو تلاش کرتے رہے لیکن جینی کا کہیں نام و نشان نہیں ملا۔ ہیرس نے مقامی پولیس کو اطلاع کردی۔ کچھ وقت کے بعد پولیس کی گاڑیاں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ ان کے ساتھ ماہر کتے بھی تھے۔ جینی کی تلاش شروع ہوگئی تھی لیکن لگتا تھا کہ جینی کو زمین کھا گئی ہے یا پھر آسمان۔ اس کا کوئی سراغ بھی نہیں مل رہا تھا اور جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا کولن اور ہیرس کی تشویش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

پولیس نے اپنی پوری کوشش کرلی تھی لیکن جینی کو وہ تلاش کرنے میں ناکام رہے۔ ہیرس کے گھر آ کر پولیس ابتدائی رپورٹ لکھ کر چلی گئی۔

پولیس کے جاتے ہی کولن نے تیز لہجے میں کہا۔ ''میں جب بھی کرس کا نام لینے لگتا تھا تم میری بات کاٹ دیتے تھے اور اس کا ذکر تم نے میری زبان پر نہیں آنے دیا۔ مجھے شک ہے کہ یہ اسی کا کیا دھرا ہے۔ اسی نے جینی کو ورغلایا ہے۔''

''دیکھو میں نے خود جان بوجھ کر اس کا نام پولیس کو بتانے سے گریز کیا تھا۔ کیونکہ کرس پر شک ہے۔ کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے کہ یہ اسی کا کیا ہوا ہے۔''

''پولیس تفتیش شک سے ہی شروع ہوتی ہے۔''

''کرس کا باپ بہت بااثر ہے۔ بغیر ثبوت کے اگر ہم اس کا نام لیں گے تو وہ کرس کو دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال لے گا اور اگر یہ سب کیا ہوا کرس کا ہے تو وہ ہوشیار ہوجائے گا۔ پھر جینی تک پہنچنے میں ہمیں مشکل ہوسکتی ہے۔ تم صبر کرو اور مجھے اپنے طور پر کچھ تفتیش کرنے دو۔ اس کے بعد

میں مضبوط انداز میں اس پر ہاتھ ڈالوں گا۔'' ہیرس نے کولن کو مطمئن کر دیا۔

کولن چپ ہو گیا اور اس خاموشی میں کولن کا چہرہ کئی اتار چڑھاؤ کا شکار رہا۔ کولن کو یقین تھا کہ جینی اسے دھوکا دے کر اپنی مرضی سے کرس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ وہ بہت شاطر ہے۔ کرس کے آنے سے قبل وہ اس جگہ سے جانا چاہتی تھی اور جیسے ہی وہ کرس سے ملی اس کے بعد جینی کے تیور ہی بدل گئے اور اسے یہ قصبہ اچھا لگنے لگا بلکہ اس نے یہ اقرار بھی کر لیا کہ وہ اپنی مرضی سے ہی کھانے بنوا رہی ہے۔ شاخ کے اوپر جس طرح سے رکھا ہوا جینی کا موبائل فون اسے ملا تھا اس سے صاف عیاں تھا کہ جینی نے خود جاتے ہوئے اپنا فون وہاں رکھ دیا تھا۔ اگر جینی کی جانے میں مرضی نہ ہوتی اور کوئی اسے زبردستی لے جا رہا ہوتا تو موبائل مزاحمت پر کہیں گر سکتا تھا اس طرح شاخ پر سج نہیں سکتا تھا۔ کولن سوچ رہا تھا۔

کولن کے دل میں جینی کے لیے اب نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ اسے اس بات کا اتنا دکھ نہیں تھا کہ جینی اسے دھوکا دے کر اپنی مرضی سے چلی گئی بلکہ اسے رنج تھا کہ وہ اس کے ہاتھوں بچ کر نکل گئی۔ ورنہ وہ اسے عبرت کا نشان بنا دیتا۔

وہ رات بہت مضطرب تھی۔ کولن ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سو سکا تھا۔ بار بار اس کے دماغ میں وہی منظر گھوم رہے تھے جب وہ ہیرس کے بیڈ روم سے نکلی اور اوپر چلی گئی۔ پھر اس کی وہ رنگ جو اس نے جینی کی انگلی میں خود پہنائی تھی وہ ہیرس کے بیڈ روم میں کیسے آئی؟

آدھی رات کو کولن اُٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ وہ لان میں آ کر ٹہلنے لگا۔ شدید سردی میں اس وقت لان میں ٹہلنا ایسے ہی تھا جیسے کوئی اپنے آپ کو سزا دے رہا ہو۔

کچھ دیر ٹہلنے کے بعد وہ پھر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں بھی اسے چین نہیں آ رہا تھا اور ساری رات اسی طرح بیت گئی۔

☆☆☆

ہیرس اپنے بیڈ روم سے باہر نکلا تو اسے پتا چلا کہ کولن منہ اندھیرے ہی اپنی کار لے کر کہیں چلا گیا ہے۔ ہیرس نے سوچا کہ کولن کہاں گیا ہوگا۔

دوپہر سے پہلے کولن واپس آیا تو وہ اور بھی پریشان تھا۔ اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا، کپڑے گندے اور جوتے مٹی سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ تھکے قدموں سے چلتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔ ہیرس اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''کہاں سے آ رہے ہو کولن؟'' ہیرس نے کچھ توقف کے بعد پوچھا۔

''جینی کی تلاش میں چلا گیا تھا۔ میرے ساتھ پولیس اہلکار بھی تھے۔ ہم نے ایک بار پھر پوری کوشش کی لیکن جینی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔'' کولن نے مرجھائے انداز میں جواب دیا۔

''میں نے کرس کے بارے میں معلومات کی تھی۔ وہ بھی گھر سے غائب ہے۔'' ہیرس نے بتایا تو کولن نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیوں نہ ہم پولیس کو آگاہ کر دیں۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' ہیرس جلدی سے بولا۔

کولن چپ سوچنے لگا۔ اس کی نظروں کے سامنے وہ منظر پھر دوڑنے لگے۔ وہ متانت سے بولا۔

''جینی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے حسن میں کوئی بھی گرفتار ہو سکتا ہے۔ جینی کی ایک عادت مجھے ہمیشہ پریشان رکھتی تھی کہ وہ کسی بھی مرد کے ساتھ بہت جلدی گھل مل جاتی تھی۔ اس کے ساتھ باتیں کرنے لگتی تھی اور بھول جاتی تھی ہے کہ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔ اس لیے مجھے اس پر شک بھی رہتا تھا۔ جب میں اس گھر میں داخل ہو رہا تھا تو وہ تمہارے بیڈ روم سے باہر نکلی تھی۔ مجھے لگا کہ تم اندر ہو۔ جب وہ اوپر گئی تو میں بھی اس کے پیچھے چلا گیا۔ وہ باتھ لے رہی تھی۔ میں نیچے آیا تا کہ تمہیں گریبان سے پکڑ کر باہر نکال کر تمہاری وہ حالت کروں کہ تم عبرت کا نشان بن جاؤ لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب تم باہر سے آ رہے تھے اور پھر تم نے بتایا کہ تمہارا کزن کرس آیا ہوگا... تمہارے بیڈ روم سے جو رنگ ملی تھی وہ جینی کی ہی تھی۔'' کولن کہہ کر چپ ہو گیا اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔

ہیرس کی نگاہیں اس کے جھکے ہوئے سر پر تھیں۔ کچھ توقف کے بعد کولن نے اپنا سر اُٹھا کر ہیرس کی طرف دیکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

''جینی کی بے وفائی کے باوجود میں اسے تلاش کر رہا ہوں، یہ میری سب سے بڑی بے وقوفی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے جینی کو بھول جانا چاہیے۔ ایسی بے وفا عورت کے لیے مجھے اپنی زندگی برباد نہیں کرنی چاہیے۔'' کولن یہ کہہ کر اُٹھا اور پھر بولا۔ ''ہیرس میں بیڈ روم تک جا رہا ہوں اپنا سامان لینے کے لیے... میں ابھی یہ قصبہ چھوڑ رہا ہوں۔''

''کولن کیا تم بددل ہو گئے ہو؟'' ہیرس نے پوچھا۔

''مجھے جینی سے نفرت ہو گئی ہے۔'' کولن کہہ کر اوپر چلا گیا۔

ہیرس اسی جگہ کھڑا تھا۔ جب کولن اپنا سامان لیے نیچے

آیا تو اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ہیرس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''کولن تم جلد بازی کر رہے ہو۔''

''تم جلد بازی کہہ رہے ہو، میں نے جینی کو دل سے نکالنے کے لیے دیر کر دی ہے۔ تمہاری خدمت اور مہمان نوازی کا شکریہ۔'' کولن کہہ کر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا اور پھر رک کر وہ ہیرس سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں... اگر جینی کو پولیس تلاش کر کے یہاں لے آئے تو جینی سے کہہ دینا کہ وہ کولن کے دل سے نکل چکی ہے اس لیے وہ میرے پاس آنے کا خیال بھی دل میں نہ لائے۔''

کولن تیزی سے باہر نکلا اور اپنی کار میں سامان رکھ کر کار اسٹارٹ کی اور اس رفتار سے نکلا کہ جیسے وہ کار کہیں مار ہی دے گا۔ ہیرس متانت بھری نگاہوں اور افسردہ سے چہرے کے ساتھ اس کی کار کو دور جاتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ پھر یکدم اس کا چہرہ مکار مسکراہٹ سے سج گیا۔

☆☆☆

چوبیس گھنٹے گزر گئے تھے۔

رات کے سات بج رہے تھے اور ہیرس کے چہرے پر سفاکی عیاں تھی۔ اس نے اپنی چال سے ایسا جال بچھا دیا تھا کہ کولن کو اپنی بیوی سے نفرت ہو گئی تھی اور وہ اسے اپنے دل سے نکال کر چلا گیا تھا۔

ہیرس نے اپنی لنگڑی ٹانگ کو دیکھا اور دل ہی دل میں بولا۔ ''تم نے میری ٹانگ توڑی تھی میں نے تمہاری زندگی برباد کر دی ہے جینی۔ تم نے مجھے ٹھکرایا تھا، میں تمہیں اس دہلیز تک لے آیا کہ تم بھی پاؤں کی ٹھوکر پر آ گئی ہو۔''

ہیرس یہ سوچ کر مسکرایا۔ اس کی گردن زعم سے اکڑ گئی اور وہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور لنگڑاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ گھر سے ملحق جو ایک احاطہ سا بنا ہوا تھا اور اس احاطے میں تین کمرے بنے ہوئے تھے جو ویران سے دکھائی دیتے تھے، وہاں جا کر اس نے ایک کمرے کا قفل کھولا اور... اندر چلا گیا۔

اندھیرے میں اس نے دیوار کے ساتھ ہاتھ لگا کر بورڈ ٹٹولا اور بٹن دباتے ہی کمرا روشن کر دیا۔ پھر وہ ایک طرف بڑھا اور الماری کا پٹ کھولا تو سامنے نیچے جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں۔ سیڑھیوں سے روشنی آ رہی تھی۔ وہ لنگڑاتا ہوا نیچے اُترتا چلا گیا۔

وہ تہ خانہ ایک کمرے کی طرح تھا۔ ایک طرف بیڈ لگا تھا، دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک میز پر کھانے پینے کا سامان اور تازہ پھل رکھے ہوئے تھے جبکہ کمرے کے ایک طرف کاٹھ کباڑ پڑا تھا، اور سامنے کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے جینی فرش پر بیٹھی تھی۔ ہیرس نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''کیسی ہو جینی؟''

جینی اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے چپ رہی۔ ہیرس نے کرسی اُٹھائی اور اس کے سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے داد دو کہ جیک نے میرے کہنے پر تمہیں جنگل سے ایسے اغوا کر کے اس جگہ پہنچا دیا کہ کسی کو کانوں کان بھی خبر نہیں ہوئی۔'' ہیرس ہنسا اور پھر بولا۔ ''میں نے کولن کے دل میں تمہارے لیے نفرت بھر دی ہے۔ جب تم کولن کو تلاش کرتی اور اسے آوازیں دیتی ہوئی میرے بیڈ روم میں آئی تھیں تو میں نے تمہارے سر پر شیونگ کریم ڈال دی تھی اور تم کمرے سے نکل کر چلی گئی تھیں اسی لیے کولن اندر آ رہا تھا اور اس نے تمہیں میرے بیڈ روم سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ یہ ایک ایسا شک تھا جو شک کا بیج نہیں بلکہ پورا تناور درخت تھا جو میں نے کولن کے دل میں گاڑھ دیا تھا۔'' ہیرس کا لہجہ سفاک ہو گیا تھا اور جینی کو سن کر حیرت ہو رہی تھی۔

ہیرس کچھ خاموشی کے بعد بولا۔ ''کرس ایک فرضی نام، جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے... میں نے اس سے تمہارا ناتا جوڑ کر کولن کا شک حقیقت میں بدل دیا۔ اور کولن تمہارے لیے نفرت اپنے دل میں بھر کر چلا گیا۔''

''تم سفاک کمینے ہو۔'' وہ چیخی۔

''نہیں میں وہ زخم خوردہ ہوں جسے تم نے زخم دیا تھا۔ مجھے اس بات کی سزا دی تھی کہ میں نے تم سے محبت کیوں کی اور مسٹر فلپس نے تمہاری شادی مجھ سے کیوں کرنا چاہی؟ تم نے مجھے زندگی بھر کے لیے اپاہج بنا دیا۔ یہ سارا اسی بات کا انتقام ہے۔'' ہیرس تیز لہجے میں بولا۔

''تم نے میری زندگی برباد کر دی ہے۔'' جینی چیخی۔

''میں بھی تو اپنی برباد زندگی کے ساتھ جی رہا ہوں۔ یہ بربادی تمہارا دیا ہوا تحفہ ہے۔ اس تحفے کو میں نے کچھ اور اضافہ کر کے تمہاری طرف لوٹا دیا ہے۔ ابھی تم ایک مہینہ تک اس تہ خانے میں قید رہو گی تاکہ کولن تمہیں بالکل بھول جائے اور جب کبھی تم اس کے سامنے جاؤ بھی تو وہ تمہیں قبول کرنا تو دور کی بات، تمہاری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کرے۔''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ جینی اتنی کم ہمت ہے کہ وہ چپ کر کے بیٹھی رہے گی۔ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔'' جینی کی آواز میں جوش بھر گیا۔

جینی کہتی ہوئی برق رفتاری سے اُٹھی اور کاٹھ کباڑ کی طرف بڑھی۔ وہاں سے اس نے ایک موٹا ڈنڈا اُٹھا لیا جس پر

اس کی پہلے دن ہی نظر پڑ گئی تھی اور اس نے اس ڈنڈے کو ایک طرف رکھ دیا تھا۔ روز جیک اس کا کھانا سیڑھیوں پر رکھ کر چلا جاتا تھا اس لیے اس پر حملہ کرنے کا اسے موقع ہی نہیں ملا تھا۔
اب ہیرس اس کے سامنے تھا اور اس نے وہ ڈنڈا اُٹھا لیا تھا۔ وہ اس کی طرف بڑھی اور ایک وار کرنا چاہا لیکن ہیرس بجلی کی سی تیزی سے اُٹھا وہ کرسی جس پر وہ بیٹھا تھا اس نے اُٹھائی اور گھما کر جینی کے سر پر دے ماری۔
ایک ہی وار نے جینی کو بے حال کر دیا۔ اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر نیچے گر گیا اور جینی چکرا کر دیوار کے ساتھ لگ گئی۔
ہیرس سفاک انداز میں اس کی طرف بڑھا اور اس کو بالوں سے پکڑ کر پھنکارتی ہوئی آواز میں بولا۔
''اب نہیں جینی... تب اور بات تھی۔ اب میرے دل میں تمہارے لیے کوئی محبت نہیں ہے اس لیے اب تمہیں یہ سب برداشت کرنا پڑے گا۔''
ہیرس نے کہہ کر اس کا سر پوری قوت سے دیوار پر مار دیا۔ جینی کے منہ سے چیخ نکل گئی اور وہ چکرا کر نیچے گر گئی۔ اس کا سر پھٹ چکا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔ ہیرس نے زمین پر پڑا ڈنڈا اُٹھالیا اور ابھی سیدھا ہی ہوا تھا کہ اچانک اس پر کسی نے جست لگائی اور اسے زمین پر لیتا ہوا جا گرا۔
ہیرس پر اچانک حملہ ہوا تھا اس لیے وہ سمجھ نہیں سکا کہ اس پر حملہ کرنے والا کون ہے۔ اس پر جست لگانے والے نے اسے سیدھا کیا اور اس کا گریبان اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ کر اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ تب ہیرس نے دیکھا تو وہ حیرت زدہ رہ گیا کیونکہ اس کے سینے پر کولن سوار تھا۔
''مجھے شک تھا کہ تم میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہے ہو۔ اس لیے میں نے جانے کا ڈراما کیا اور جینی کے لیے اپنی نفرت کا اظہار کر کے چلا گیا۔ میں نے کھانے پینے کا سامان خریدا اور رات کے اندھیرے میں اسی جگہ چھپ کر بیٹھ گیا۔ لیکن مجھے یہ پتا نہیں تھا کہ جینی کہاں قید ہے۔ میں نے جیک کو آتا دیکھا تھا، لیکن میں دوسری طرف چھپا ہوا تھا اس لیے مجھے پتا نہیں چل سکا کہ جیک یہاں کیوں آیا ہے اور کہاں گیا ہے۔ لیکن اب میں نے تمہیں دیکھا تو تمہارے پیچھے آ گیا اور تمہاری باتیں سن لیں۔''
کولن نے کہہ کر ہیرس کے منہ پر گھونسے برسانا شروع کر دیے۔ کولن اس پر اندھادھند گھونسے برسا رہا تھا کہ ہیرس بے حال ہو گیا تھا۔ اس کا چہرہ زخمی ہو گیا تھا اور خون بہنے لگا تھا۔
جب اس نے دیکھا کہ ہیرس نیم بے ہوش ہو چکا ہے تو وہ اُٹھ کر جینی کی طرف بڑھا اور اس کا سر اپنی گود میں رکھ کر بولا۔
''میری پیاری جینی میں آ گیا ہوں۔ میرا دل کہتا تھا کہ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتیں۔ تمہاری خاطر میں یہاں اس انتظار میں رہا کہ کب مجھے تمہارا کوئی سراغ ملے... اور میں تمہیں دوبارہ پالوں....'' کولن کے لہجے میں محبت تھی۔
''کولن مجھے تم سے محبت ہے۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ یہ انسان نہیں شیطان ہے جو شیطانیت کا جال بچھا کر ہماری زندگی کو برباد کرنا چاہتا تھا۔'' جینی نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔
''تم ٹھیک کہہ رہی ہو جینی۔''
اسی اثنا میں ہیرس اُٹھ بیٹھا اور اس نے پاس پڑا ڈنڈا پکڑ لیا۔
کولن، جینی سے کہہ رہا تھا۔ ''اُٹھو ہم ابھی چلتے ہیں۔''
ٹھیک اسی وقت ہیرس کھڑا ہو گیا اور اس نے کولن کی کمر پر ڈنڈے کا وار کر دیا۔ کولن تکلیف سے بلبلا اُٹھا۔ اس نے جینی کو ایک طرف کیا اور ہیرس کی طرف گھوما۔ ہیرس حملہ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ لیکن اس بار کولن نے اسے حملہ کرنے کی مہلت نہیں دی اور اس کے ہاتھ سے ڈنڈا چھین کر اس کے سر پر اس قوت سے مارا کہ ہیرس کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر گیا۔ کولن نے ڈنڈا ایک طرف پھینکا۔ کاٹھ کباڑ سے رسّی تلاش کر کے اس نے ہیرس کے ہاتھ اور پیر باندھ دیے اور نفرت سے بولا۔
''اب تم اسی جگہ پڑے مرکھپ جاؤ گے اور کسی کو تمہاری خبر نہیں ہوگی۔''
کولن نے جینی کو سہارا دیا اور اسے تہ خانے سے باہر لے آیا۔ اس نے تہ خانے کا دروازہ مقفل کر کے چابی اپنی جیب میں ڈالی اور رات کے اندھیرے میں اس جگہ سے نکل کر جینی کو سہارا دیے تیزی سے ایک طرف چل دیا۔ کچھ دیر کے بعد دونوں اندھیرے کا حصہ بن چکے تھے۔ بہت آگے کولن نے کار ایک ویران جگہ پر جھاڑیوں کے پیچھے کھڑی کی تھی۔ کولن نے جینی کو کار میں بٹھایا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہی... کار اس جگہ سے نکال کر لے گیا۔ ہیرس کا قصبہ ان سے دور ہوتا جا رہا تھا، اور اس تہ خانے میں ہیرس فرش پر پڑا تھا۔ اس کے سر سے خون مسلسل بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں رفتہ رفتہ بند ہو رہی تھیں۔ بے یارومددگار پڑا ہیرس سوچ رہا تھا کہ وہ اپنی چالوں سے ان کی بربادی کا نہیں بلکہ اپنی موت کا سامان کر رہا تھا۔

جلد باز

تنویر ریاض

سوچ سمجھ کر اور تدبیر اختیار کرنے والے ہمیشہ اپنے مقصد میں کامیاب رہتے ہیں۔۔۔ وہ درست وقت پر صحیح طریقۂ کار پر گامزن رہتے ہیں... جو لوگ ان دو اہم چیزوں کو مدِّنظر رکھتے ہیں... وہ کامیاب و شاداں رہتے ہیں... اس نے غلط وقت کا تعین کیا اور پھر وہ کر گزرا جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا...

امتحان کی دہلیز پر کھڑی دو دوستوں کی دوستی کی کڑیاں...

سراغ رساں مائیکل گرینڈی نے فون اٹھایا لیکن اس کا دماغ اب بھی ایکسرے میں الجھا ہوا تھا جو اس نے گزشتہ روز ہنری فورڈ اسپتال میں کروایا تھا اور دو مرتبہ ڈاکٹر سائمن کے دفتر میں فون کرنے کے باوجود اس کی رپورٹ نہیں ملی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید یہ فون ڈاکٹر سائمن نے ہی اسے کوئی بُری خبر سنانے کے لیے کیا ہوگا لیکن دوسری جانب اس کا ایک ساتھی بائرن بول رہا تھا۔

''ہمیں ایک لاش ملی ہے۔ کیا نیکو تمہارے سامنے

بیٹھا ہوا ہے؟"

"ہاں، لیکن یہ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"کیونکہ جب تک ہمیں پوری تفصیل معلوم نہ ہو جائے، میں نہیں چاہتا کہ اسے اس بارے میں کچھ پتا چلے۔"

جب بائرن نے بتایا کہ مرنے والی کون تھی تو گرینڈی نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ مزید گفتگو کرنے سے پہلے کمرے سے باہر چلا جائے۔ اس نے بائرن سے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ "میں تمہیں باہر جا کر فون کرتا ہوں۔" پھر اس نے نیکو کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ تم سگریٹ نوشی ترک کر چکے ہو۔" نیکو نے حیرت سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔"

"کیا تمہیں ایکسرے رپورٹ مل گئی؟"

"نہیں۔"

"کھانسی کا کیا حال ہے؟"

"بہت بُرا۔" یہ کہہ کر گرینڈی نے فون کریڈل پر رکھا اور نیکو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں سگریٹ پینے باہر جا رہا ہوں۔"

نیکو نے اسے غور سے دیکھا اور اسے یوں لگا جیسے گرینڈی اس سے کچھ چھپا رہا ہے جبکہ گرینڈی بھی محسوس کر رہا تھا کہ نیکو کو کچھ شبہ ہو گیا ہے۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ اس کی سابقہ یا موجودہ محبوبہ کو کسی نے اسکول کے احاطے میں شدید زخمی کر دیا ہے۔ اس نے کوشش کی کہ نیکو کے دل میں ایسا کوئی شبہ جنم نہ لینے پائے اس لیے اس نے بات بنانے کی کوشش کی اور بولا۔ "مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ تم اور شیری دوبارہ یکجا ہو رہے ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے میں نے تم سے یہ بات کبھی نہیں کی۔"

نیکو نے اس کی طرف غور سے دیکھا اور بولا۔ "تم شیری کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ابھی معاملات طے نہیں ہوئے؟"

"وہ مجھ سے کہتی رہتی ہے کہ فریڈرک سے اس کا تعلق ختم ہو گیا ہے لیکن مجھے اس پر پوری طرح یقین نہیں آیا۔"

گرینڈی نے ایک سرد آہ بھری اور سچ بیان کرتے ہوئے بولا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ تمہیں فریڈرک کے بارے میں مزید پریشان ہونے کی ضرورت ہے۔"

عمارت سے باہر آنے کے بعد گرینڈی نے بائرن کو فون کرنے سے پہلے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور اس میں سے ایک سگریٹ نکال کر منہ میں دبا لیا پھر اسے سلگانے کے بعد ایک گہرا کش لیا۔ فوراً ہی اسے اپنے بائیں پھیپھڑے میں درد محسوس ہونے لگا۔ اسی درد سے پریشان ہو کر وہ ڈاکٹر کے پاس گیا تھا جس نے فوری طور پر اسے سگریٹ چھوڑنے کا مشورہ دیا لیکن اب شاید بہت دیر ہو چکی تھی اور ایکسرے رپورٹ میں کینسر کا شبہ ظاہر ہو سکتا تھا، ایسی صورت میں ایک اور سگریٹ پینے سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ اس نے آدھا سگریٹ زمین پر پھینک کر اسے پیروں سے مسل دیا۔ پھر اس نے اپنا سیل فون نکال کر بائرن کا نمبر ملایا۔ وہ نیکو کی خاطر شیری کا حال جاننا چاہ رہا تھا۔

"اب وہ کیسی ہے؟"

"تم نہیں چاہو گے کہ اس کے پوسٹ مارٹم کی تصویریں نیکو کو دکھاؤ۔" بائرن نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔

"کیا اس کی شکل پہچانی جا رہی ہے؟"

"ہاں، بہرحال وہ ایک انسانی لاش ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔" گرینڈی کے پورے جسم میں کپکپی دوڑ گئی۔

"ڈاکٹر فوجیتا کا خیال ہے کہ اس کی کھوپڑی میں فریکچر ہوا ہے۔" بائرن کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "میں حیران ہوں کہ اس وقت اس کا محبوب کہاں تھا؟"

"تمہارا اشارہ فریڈرک کی جانب ہے؟"

"ہاں، کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ فریڈرک سے قطع تعلق کر کے دوبارہ نیکو سے تعلق استوار کرنے والی تھی۔"

"مجھے یقین ہے کہ اس واقعے کے بعد فریڈرک روپوش ہو گیا ہو گا۔"

"اگر تم فریڈرک پر شک کر رہے ہو تو اسے تلاش کرنا بہت ضروری ہے۔"

ایلیمنٹری اسکول کے باہر کار روک کر اس نے ایک اور سگریٹ سلگائی اور ہمیشہ کی طرح سوچنے لگا کہ اسے سگریٹ نوشی ترک کر دینی چاہیے پھر اس کی نگاہیں اپنے بڑھے ہوئے پیٹ پر گئیں جو اس کے خیال میں دوسری تشویش ناک بات تھی۔ کیا یہی وجہ تھی کہ اس کے دفتر میں بیٹھنے والی سیکریٹری لونا نے اس کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے سگریٹ کا گہرا کش لیا اور سوچنے لگا کہ لونا کو اپنی

جانب مائل کرنے کا کیا طریقہ ہوسکتا ہے۔

وہ اپنی کار سے باہر آگیا۔ گزشتہ چند ہفتوں سے پھیپھڑوں کی تکلیف کے سبب وہ کافی تھکاوٹ محسوس کررہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ وہ برف پر لیٹ کر اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے کی کوشش کرے۔ بہرحال وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل بوتے پر قدم بڑھاتا جائے واردات تک پہنچ گیا۔ اسکول کی عمارت انگریزی کے حرف L کی شکل میں بنی ہوئی تھی جس کے جنوبی اور مغربی اطراف میں کھیل کا میدان تھا جس پر گزشتہ چند روز کی برف باری کے سبب ناہموار سطح بن گئی تھی جس پر قدم رکھنا اس کے لیے مزید تکلیف دہ ہورہا تھا۔

بائرن ایک طویل قامت سیاہ فام شخص تھا۔ وہ اس کے پاس آیا اور برف کی ناہموار سطح کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”کیا تم اس پر یقین کرسکتے ہو؟“

گرینڈی اب بھی پُرامید تھا کہ لڑکی کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ اس نے کہا۔ ”ممکن ہے کہ وہ گر پڑی ہو۔“

بائرن نے یقینی انداز میں کہا۔ ”وہ گری نہیں تھی۔“

گرینڈی نے قرب و جوار کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی شہادت؟“

”ابھی تک تو کوئی گواہ سامنے نہیں آیا لیکن ہم سب سے پوچھ گچھ کریں گے۔“

جس جگہ اسکول کی دونوں عمارتیں مل رہی تھیں، وہاں دو پولیس والے ٹارچیں سنبھالے شیری کی لاش کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ گرینڈی نے لاش کے پاس پہنچ کر پولیس والوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

”میتھیوز! تم کار میں جاکر بیٹھو۔ تمہاری ناک سردی سے نیلی ہوگئی ہے اور اسٹیفن، تم کافی اور ڈونٹ سے دل بہلاؤ۔ یہ میری طرف سے ہے۔“ اس کے ساتھ ہی گرینڈی نے اسے دس ڈالر پکڑا دیے۔

دونوں پولیس والوں کے جانے کے بعد گرینڈی جھکا اور اس نے لاش کے اوپر سے چادر ہٹادی۔ نیکو کی سابقہ یا موجودہ محبوبہ شیری مردہ حالت میں پڑی ہوئی تھی، اس کا کوٹ، سویٹر اور قمیص جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی۔ اس کے سنہرے بال بے ترتیب حالت میں بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر بری طرح ضربات لگائی گئی تھیں اور جگہ جگہ گہرے زخم، اندرونی چوٹیں اور سوجن نظر آرہی تھی۔ اس کے علاوہ بائیں جانب کھوپڑی کا حصہ چٹخا ہوا تھا۔

گرینڈی نے پہلا سوال یہی کیا۔ ”وہ اتنی رات گئے اسکول میں کیا کررہی تھی؟“

بائرن نے خالی خالی نظروں سے مقتولہ کی لاش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ اندازہ نہیں ہے۔“

”کیا تم نے اسکول کے اسٹاف سے بات کی۔“

”میں نے پرنسپل کے لیے پیغام چھوڑا تھا لیکن اس نے ابھی تک میری کال کا جواب نہیں دیا۔“

”اسکول تو بالکل خالی ہے۔“

”ہاں۔“

”یہاں تک کہ کوئی چوکیدار بھی نظر نہیں آرہا۔“

گرینڈی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس کا پیٹ خالی ہو چکا تھا اور اس کی نظریں اسٹیفن کو ڈھونڈ رہی تھیں جو کافی اور ڈونٹ لینے گیا تھا، پھر اس نے لاش کی طرف توجہ مبذول کی اور بولا۔ ”کوئی اور طبعی شہادت؟“

بائرن نے کندھے اچکا دیے اور بولا۔ ”یہاں قدموں کے نشانات ہونا چاہیے تھے مگر جب میں یہاں پہنچا تو اس وقت تک وہ نشانات برف کی نئی تہ کے نیچے دب چکے تھے۔“

گرینڈی نے کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ”اگر پرنسپل تم سے رابطہ کرے تو اسے بتادینا کہ آج اسکول بند رہے گا۔“

شیری کی موت کی خبر سننے کے بعد نیکو کا ردِعمل توقع کے مطابق تھا۔ اسے شدید ذہنی و قلبی جھٹکا لگا تھا۔ وہ بُری طرح لڑکھڑایا اور اگر فوری طور پر میز کا سہارا نہ لیتا تو اسے شدید چوٹ آسکتی تھی۔ وہ اپنی کرسی میں دھنس گیا اور اس کی زبان سے بے اختیار شیری، شیری کے الفاظ نکلنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اس نے اپنی پوری قوت مجتمع کی اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا پھر وہ ٹہلتا ہوا کھڑکی تک گیا اور سڑک کی طرف دیکھنے لگا جہاں کاریں، ٹرک، بسیں اور پیدل چلنے والے اپنی اپنی منزل کی جانب گامزن تھے۔

نیکو چند لمحے باہر کا منظر دیکھتا رہا جیسے اپنے اعصاب کو پُرسکون کرنے کی کوشش کررہا ہو۔ پھر اس نے گرینڈی کی طرف دیکھا اور فیصلہ کرلیا کہ وہ شیری کے مقدمے میں انصاف کے تقاضے پورے ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی اس کے خون کا انتقام لے گا۔

”اس قتل میں فریڈرک کا ہاتھ ہے۔“ اس نے قطعیت سے کہا۔ ”اور یہ بات تم بھی جانتے ہو۔“

گرینڈی نے اس کی توجہ دوسری جانب مبذول

کرانے کے لیے کہا۔ ”تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ اتنی رات گئے اسکول میں کیا کرنے گئی تھی؟“

”کیا وہ اسکول میں تھی؟“

”ہاں۔“

نیکو کے تن بدن میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور وہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”وہ فریڈرک سے ملنے کے لیے اسی طرح کے مواقع تلاش کرتی تھی۔ وہ دونوں اسی لیے رات گئے اسکول گئے ہوں گے۔“

”اوہ، گویا تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ فریڈرک سے ملنے اسکول گئی تھی؟“

”ہاں۔“ اس نے پورے یقین سے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ وہ اسی مقصد سے وہاں گئی ہوگی۔“

”لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تم اور شیری دوبارہ ایک دوسرے کے قریب آرہے تھے اور فریڈرک سے اس نے قطع تعلق کرلیا تھا لہٰذا یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ وہ گزشتہ شب اس سے ملنے اسکول گئی ہوگی۔ ممکن ہے کہ وہ کسی اور وجہ سے وہاں گئی ہو۔“

”نہیں۔“ نیکو کی آنکھوں میں بے اعتباری جھلک رہی تھی۔ ”تم اس کا گزشتہ ریکارڈ دیکھو اور بتاؤ کہ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

گرینڈی کو اعتراف کرنا پڑا۔ واقعی اس معاملے میں شیری کا ریکارڈ قابلِ ستائش نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ”تب تو ہمیں یقیناً فریڈرک پر نگاہ رکھنا ہوگی۔“

نیکو نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ بھی اس کے ساتھ ہی کار میں جارہا ہو اور بولا۔ ”ٹھہرو، میں اپنی گن لے لوں۔“

”میں اور بائرن اس سے ملنے جائیں گے۔“ گرینڈی نے کہا۔ ”تم نہیں۔“

نیکو کو لگا کہ جیسے اس کے ساتھ دھوکا ہوگیا ہو۔ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولا۔ ”کیسی باتیں کررہے ہو مائیک، وہ میری محبوبہ تھی۔“

”میں نے اس سلسلے میں پہلے ہی چیف سے بات کرلی ہے اور اس نے تمہیں اس معاملے سے الگ رکھنے کے لیے کہا ہے۔“

”وہ اسی سے ملنے کے لیے اسکول گئی تھی اور یہ بات سب سے پہلے میں نے ہی تمہیں بتائی ہے۔“

”ممکن ہے کہ ایسا ہی ہوا ہو اور ہم اس اطلاع کے لیے تمہارے شکر گزار ہیں لیکن چیف کا خیال ہے کہ تم اس وقت سوگ کی کیفیت میں ہو۔ اس لیے تمہیں اس معاملے سے الگ رکھا جائے۔“

سنتے ہی نیکو کا پارا چڑھ گیا۔ اس نے غصے میں آکر کمپیوٹر اسکرین پر زوردار مکا مارا، اور وہ زمین پر گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگ دم بخود رہ گئے۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی پھر گرینڈی نے نیکو کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔ ”تمہارے خیال میں اس کے اسکول جانے کی یہی ایک وجہ ہوسکتی ہے؟“

نیکو نے اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ سپلائی روم میں ملا کرتے تھے۔“

گرینڈی نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں کہا۔ ”ہمیں تمہارے نقصان پر افسوس ہے۔“

نیکو کی حالت قدرے بہتر ہو چکی تھی۔ اس نے گرینڈی سے پوچھا۔ ”کیا تم نے ذاتی طور پر جائے وقوعہ کی تصاویر لی ہیں جو کہ تم عام طور پر اپنے فون کے ذریعے لیتے ہو؟“

گرینڈی کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”تمہیں یہ تصویریں نہیں دیکھنا چاہئیں۔“

”میں یہ تصویریں ضرور دیکھوں گا۔“ نیکو نے اصرار کیا۔

”ہرگز نہیں۔“

”مجھے تصویریں دکھاؤ مائیک، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس نے شیری کے ساتھ کیا سلوک کیا۔“

”ہم نہیں جانتے کہ وہ کون تھا یا تھی۔ ہمارے پاس فریڈرک کی وہاں موجودگی کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ وہ جو کوئی بھی تھا، اس کے قدموں کے نشانات برف کی تہ تلے دب گئے ہیں۔“

”تم نے اسے فون کرنے کی کوشش کی؟“ نیکو نے پوچھا۔

”ہاں لیکن کوئی فون نہیں اٹھا رہا۔ ہم اس کے لیے پیغام بھی نہیں چھوڑ سکتے کیونکہ اس کا میل باکس پہلے ہی بھرا ہوا ہے۔“

”کیا تم اس کے اپارٹمنٹ گئے تھے؟“

”ہاں لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھا۔“

”میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں جاسکتا ہے۔ مجھے اس کے تمام ٹھکانوں کا علم ہے اور جانتا ہوں کہ وہ کہاں چھپا ہوا ہوگا۔“ نیکو اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں اسے تلاش

کرلوں گا۔ مائیک تم فکرمت کرو۔''

''تم بھول رہے ہو کہ چیف نے تمہیں سوگ منانے کے لیے کہا ہے۔''

''ہم سب مختلف انداز میں سوگ مناتے ہیں۔'' نیکو نے معنی خیز انداز میں کہا۔

گرینڈی اور بائرن، اسکول پرنسپل گیری اربی سے ملنے نو بجے سے پہلے ہی اسکول پہنچ گئے۔ وہ ایک چھوٹے قد کا سیاہ فام شخص تھا اور اس نے نیلے رنگ کا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ ان کی ملاقات اسکول گیٹ پر ہوئی جہاں پرنسپل ان بچوں کو اسکول بند ہونے کے بارے میں بتا رہا تھا جنہیں یہ اطلاع نہیں مل سکی تھی۔ کچھ اور ٹیچرز بھی وہاں موجود تھیں، ان میں مسز ٹوریس، مسز نی مین، مسز منٹن، مس زاویلا اور مس بارنیٹ شامل تھیں۔ پانچوں ٹیچر افسردہ اور سنجیدہ نظر آرہے تھے۔ خاص طور پر مس تانیا ٹوریس بہت خوف زدہ تھی۔ گرینڈی کو اس میں غیر معمولی دلچسپی محسوس ہوئی اور وہ اس کے چہرے کا جائزہ لیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ چھوٹے قد کی سانولے رنگ والی ہسپانوی لڑکی تھی جسے دیکھ کر گرینڈی کو لونا کی یاد آگئی۔ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی پریشان اور مضطرب نظر آرہی تھی لیکن گرینڈی کی عقابی نظریں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ وہ صورتِ حال کے حوالے سے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ ہے اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مس ٹوریس ضرور اس بارے میں کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔

وہ اس سے علیحدگی میں بات کرنے کے لیے ایک طرف لے جانا چاہ رہا تھا کہ مس ٹوریس کا فون بجنے لگا۔ اور وہ کسی سے ہسپانوی زبان میں گفتگو کرنے لگی۔ چنانچہ گرینڈی نے بھی یہ سوچ کر اپنی توجہ پرنسپل کی جانب مبذول کرلی کہ وہ بعد میں مس ٹوریس سے بات کرلے گا۔

''کیا تم ہمیں مس شیری فاؤنٹین کے کلاس روم تک لے جا سکتے ہو؟'' اس نے پرنسپل سے کہا تو وہ انہیں اپنے ہمراہ اسکول کی عمارت میں لے گیا۔ اندرونی حصے میں رنگ و روغن کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی، کہیں کہیں سے پلاستر اکھڑا ہوا تھا اور ٹرانی کیبنٹ میں شیشے کی جگہ کارڈ بورڈ کا ٹکرا لگا دیا گیا تھا۔ فرش کے ٹائلوں پر کافی عرصے سے پالش نہیں ہوئی تھی اور وہ کافی بدنما نظر آرہے تھے۔ گرینڈی کو اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی کہ اسکول کی مالی حالت کافی پتلی ہے۔

''کیا یہ مس شیری کا پرس ہے؟'' گرینڈی نے میز کی جانب رکھے ہوئے پرس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پرنسپل نے غور سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، یہ اسی کا ہے۔''

گرینڈی نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور پرس کھول کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس میں عام استعمال کی چیزیں مثلاً بٹوا، چیونگ گم، آئی پوڈ اور لوشن کی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس پرس کو دیکھنے کے بعد گرینڈی کو شبہ ہونے لگا کہ مس شیری اپنے سابق محبوب فریڈرک سے ملنے نہیں بلکہ اپنا پرس لینے اسکول آئی ہوگی۔ جب اس نے یہ بات بائرن کو بتائی تو اس نے پوچھا۔ ''اس کے بٹوے میں سے کوئی چیز تو نہیں نکالی گئی؟''

''نہیں۔'' گرینڈی نے بٹوا کھول کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کے تمام کریڈٹ کارڈز اور نقدی موجود ہے۔''

''کتنی رقم ہوگی؟''

گرینڈی نے رقم گننے کے بعد کہا۔ ''تین سو ڈالر اور کچھ ریزگاری۔''

بائرن نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اتنی رقم کے لیے تو میں بھی ضرور واپس آتا۔''

گرینڈی، پرنسپل سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''کیا وہ اکثر اپنا پرس یہاں بھول جایا کرتی تھی؟''

''وہ عام طور پر اسے ایک بڑے بیگ میں اپنے رجسٹر اور کتابوں کے ساتھ رکھا کرتی تھی۔ ممکن ہے اس نے یہی سوچا ہو کہ وہ بیگ میں پرس رکھ چکی ہے۔''

گرینڈی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں اسکول کے احاطے کا بھی جائزہ لینا چاہیے۔ اب وہاں روشنی بہتر ہوگی۔''

احاطے میں آنے کے بعد بھی گرینڈی کو کوئی خاص سراغ نہ مل سکا۔ مسلسل برف باری کی وجہ سے تمام نشانات مٹ چکے تھے اور وہاں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو اس بارے میں کچھ بتا سکتا۔ اسکول کے اندرونی حصے کی طرح بیرونی حصہ بھی بے ترتیب اور ناہموار تھا۔ پرنسپل کا کہنا تھا کہ اسکول کے پاس چوکیدار کو دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس علاقے کے تین اسکولوں کے لیے ایک ہی چوکیدار تھا۔ جس کی وجہ سے احاطے میں سے برف ہٹانے کا کام نہیں ہو سکا تھا۔ گرینڈی کو وہاں سے ایک چاکلیٹ بار کا ریپر، ایک پیپر کپ، ایک چپس کا خالی پیکٹ اور ایک کاغذ کی پلیٹ ملی۔

گرینڈی نے بائرن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ بچوں نے یہ چیزیں سامنے والے اسٹور سے

خریدی ہوں گی۔''

بائرن کا دھیان کسی اور جانب تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے فریڈرک کی بہن کو فون کیا تھا۔''

''اچھا، کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟'' گرینڈی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اس نے مجھے بتایا کہ شیری اور اس کے بھائی کے درمیان تعلقات منقطع ہو چکے تھے۔ اور اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ وہ دونوں گزشتہ شب ملاقات پر رضامند ہو جاتے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ آج صبح کی پرواز سے اپنی سابق بیوی کے پاس کیلی فورنیا جا رہا ہے۔ ان کے درمیان صلح ہو گئی ہے اور یہی وجہ ہے کہ شیری اور اس کے بھائی نے علیٰحدہ ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''گویا اس نے شیری کو چھوڑ دیا؟''

''ہاں۔''

''لیکن نیکو تو کچھ اور کہہ رہا تھا۔''

''اس نے نیکو سے جھوٹ بولا ہوگا۔''

''گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ جب فریڈرک سے ملنے اسکول پہنچی تو اسے وہاں نہ پا کر اسے مایوسی ہوئی اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے کی جانب گر پڑی۔''

''بے چارہ نیکو۔'' بائرن نے کہا۔

وہ ایک بار پھر اردگرد کا جائزہ لینے لگے۔ بالآخر گرینڈی کو ایک ایسی غیر معمولی چیز مل گئی جس کے سہارے وہ آگے بڑھ سکتا تھا۔ وہ بے اختیار بول اٹھا۔ ''یہ دیکھو۔''

انہوں نے قریب جا کر دیکھا۔ وہ ایک سینڈوچ کا لیبل تھا اور اس کے ساتھ آدھی کھائی ہوئی ناشپاتی کا ٹکڑا تھا۔ اس پر ہاریو مارکس کا لوگو بنا ہوا تھا۔ گرینڈی نے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے اور وہ سینڈوچ اٹھا لیا پھر اس نے ناشپاتی کے آدھے ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بچے اس قسم کی چیزیں نہیں کھاتے جب تک ان کے ساتھ زبردستی نہ کی جائے۔''

بائرن نے ہاریو مارکس کے لوگو کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اس جگہ سے واقف ہو؟''

''میں ایسی جگہوں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہوں جہاں میرے لیے اچھی خوراک ملتی ہو۔ بہرحال میں اس جگہ سے واقف ہوں۔''

وہ جگہ وہاں سے بارہ بلاک کے فاصلے پر تھی اور اس کا مالک شہیر نامی ایک شخص تھا۔ گرینڈی نے اسے ناشپاتی کا ٹکڑا اور سینڈوچ دکھایا تو وہ بولا۔ ''ہاں، میں اس آدمی کو جانتا ہوں۔ وہ ہفتے میں دو تین بار آتا ہے اور ہمیشہ انہی چیزوں کا آرڈر دیتا ہے۔''

''اس کا کوئی نام بھی ہوگا۔'' گرینڈی نے کہا۔

شہیر نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''کولبی!''

''پورا نام بتاؤ۔''

''مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا وہ گزشتہ شب یہاں آیا تھا؟'' گرینڈی نے پوچھا۔

اس بار شہیر کو سوچنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس نے فوراً جواب دیا۔ ''وہ ساڑھے چھ بجے کے قریب آیا تھا۔ عموماً اس کے آنے کا یہی وقت ہے۔''

''وہ گاڑی پر آیا تھا۔''

''نہیں۔''

''کیا تم نے کبھی اسے گاڑی پر آتے ہوئے دیکھا ہے؟''

''نہیں، گرمیوں میں وہ بائیک پر آتا ہے۔''

''اس کا حلیہ بتا سکتے ہو؟''

شہیر نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ ''تمہارے جیسی جسامت ہے اور وہ سفید فام ہے۔''

''کیا تم بتا سکتے ہو کہ اسٹور سے نکلنے کے بعد وہ کس جانب گیا تھا؟''

شہیر نے گرینڈی کو اس طرح دیکھا جیسے وہ کوئی انہونی بات کہہ رہا ہو پھر بولا۔ ''میں اس وقت سینڈوچ بنا رہا تھا لیکن اگر تم چاہو تو اس کی ویڈیو دکھا سکتا ہوں۔''

پھر اس نے کسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''لیڈیا، کاؤنٹر پر آ جاؤ، میں تھوڑی دیر کے لیے دفتر جا رہا ہوں۔''

کچھ دیر بعد جب وہی ویڈیو اسکول کے پرنسپل اربی کو دکھائی گئی تو وہ پریشانی کے عالم میں ویڈیو میں موجود اس مشتبہ شخص کو دیکھنے لگا جس نے سرمئی رنگ کا اوورکوٹ پہن رکھا تھا۔ اسے پہچاننے میں پرنسپل کو کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ بولا۔ ''یہ کولبی ہانٹز ہے اور پہلے اسی اسکول میں کل وقتی چوکیدار ہوا کرتا تھا۔ وہ کبھی بھی تانیا ٹوریس کو تنہا نہیں چھوڑتا تھا لیکن اب عدالت نے اسے پابند کر دیا ہے کہ وہ تانیا سے دور رہے۔''

جب بائرن وہاں سے نکل کر دفتر کی سمت روانہ ہوا تا کہ پولیس ریکارڈ سے کولبی کے بارے میں معلومات حاصل کر سکے تو گرینڈی کو تانیا سے بات کرنے کا موقع مل گیا جس سے اسے مفید معلومات حاصل ہوئیں۔

''وہ شیری پر بھی بُری نظر رکھتا تھا۔'' تانیا نے اسے بتایا۔ ''جب اسے نوکری سے نکالا گیا تو میں اور شیری اپنی اپنی کار تک ایک ساتھ ہی جایا کرتے تھے کیونکہ وہ ہمیشہ ہمارے انتظار میں اسکول کے باہر کھڑا ہوتا تھا۔ گرمی کے موسم میں وہ اپنی قمیص اتار دیتا اور جب ہم لوگ لنچ کے لیے پیزا کارنر جاتے تو وہ بائیک پر ہمارا پیچھا کیا کرتا۔''

''کیا تم اس کا حلیہ بتا سکتی ہو؟''

''تم نے پلپلا آلو دیکھا ہے۔ بس وہ ویسا ہی ہے۔ اس کے علاوہ غصے کا بھی تیز ہے۔ میں تو اسے بُرا آدمی ہی کہوں گی۔ اسے بولنے کی بہت عادت ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کافی پینے جائیں اور یہ بڑی زیادتی ہے کہ ہم اسے یہ موقع نہیں دے رہے۔ شاید اس لیے کہ وہ ایک چوکیدار تھا حالانکہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کیا کام کرتا ہے۔ میں نے اس سے پہلے چوکیدار کے ساتھ بھی ڈیٹنگ کی ہے لیکن اس نے کبھی فضول بکواس نہیں کی۔ بہرحال اب میں نے اس سے دور رہنے کا عدالتی حکم حاصل کرلیا ہے۔''

بائرن نے واپس آکر گرینڈی کو مشتبہ شخص کولبی ہائنز کے پولیس ریکارڈ کے بارے میں بتایا۔ ''اسے عدالت نے صرف مس ٹوریس سے دور رہنے کا ہی حکم نہیں دیا بلکہ اس کا ڈرائیونگ لائسنس بھی معطل ہو چکا ہے اور اسے روڈ ایکسیڈنٹ میں ایک شخص کو زخمی کرنے کے جرم میں جیل بھی ہو چکی ہے۔''

''گویا وہ عادی مجرم ہے۔'' گرینڈی نے کہا۔

''ہاں اور خوش قسمتی سے مجھے کچھ لوگوں سے پوچھ گچھ کرنے کا موقع بھی مل گیا۔''

''اوہ تو تم اسی لیے چلے گئے تھے۔ میں تو سمجھا کہ تم ہمارے لیے ناشپاتی اور سینڈوچ لینے گئے ہو۔''

''مجھے ایک گواہ مل گیا۔'' بائرن نے انکشاف کیا۔

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔ اس سے کیا معلومات حاصل ہوئیں؟''

''اس علاقے کا ایک شخص گیون پنڈو سڑک کے آخر میں مکان نمبر ستاسی میں رہتا ہے۔ اس کی تمام عمر اسی علاقے میں گزری ہے اور اس کی کولبی سے بھی بات چیت ہوتی رہتی ہے۔''

''گویا وہ اسے اچھی طرح جانتا ہے۔''

''ہاں، وہ اسے ایک مجمع میں بھی پہچان لے گا۔''

وہ پنڈو کو لے کر پرنسپل کے کمرے میں آئے اور اسے وہ ویڈیو دکھائی جس میں کولبی سینڈوچ خرید رہا تھا۔ پنڈو اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''ہاں یہی ہے، مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں۔''

''تم یقین سے کہہ سکتے ہو؟'' گرینڈی نے پوچھا۔

''سو فیصد۔ میں اس شخص کو جانتا ہوں۔''

''تم نے گزشتہ شب کیا دیکھا جب وہ اسکول آیا تھا؟''

''وہ اسکول کے احاطے میں مس فاؤنٹین کا تعاقب کررہا تھا۔ وہ تقریباً دس گز اندر آیا اور اس کے پیچھے دوڑنا شروع کردیا۔ مجھے کام پر جانا تھا لیکن کار میں سوار ہونے سے پہلے میں یہ اطمینان کرنے کے لیے وہاں رک گیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے یا نہیں۔ میں نے مس فاؤنٹین کو آواز دی تو اس نے کہا کہ وہ خیریت سے ہے لہٰذا میں اسے اس کیڑے کے ساتھ چھوڑ کر چلا گیا جس پر اب مجھے پچھتاوا ہورہا ہے۔'' پھر اس نے کچھ ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ایک مرتبہ میرے کتے کو پتھر بھی مارا تھا۔''

گرینڈی نے پیٹرول کمانڈر لوکیز کو فون کر کے کولبی کو گرفتار کرنے کے لیے کہا اور جب اسے ہومی سائڈ کے سامنے پیش کیا گیا تو اس نے کہا۔ ''میں گزشتہ شب اسکول کے قریب بھی نہیں آیا۔''

''ہمارے پاس ایک گواہ موجود ہے۔'' گرینڈی نے کہا۔

''کیسا گواہ؟'' کولبی نے انجان بنتے ہوئے کہا۔

''اس سے تمہاری ملاقات عدالت میں ہوگی۔'' گرینڈی نے جواب دیا۔ ''اس کے علاوہ ہمیں مقتولہ کے پاس سے تمہارا آدھا سینڈوچ اور ناشپاتی بھی ملی ہے۔ تم نے یہ چیزیں جس اسٹور سے خریدیں، اس کی ویڈیو بھی ہمارے پاس ہے۔ لڑکیوں کے معاملے میں تمہارا ریکارڈ بہت خراب ہے۔ میں نے وہ آدھی ناشپاتی لیبارٹری بھجوادی ہے۔ ڈی این اے رپورٹ آجائے، اس کے بعد تم سزا سے نہیں بچ سکو گے۔''

''کیا تم مجھے گرفتار کرلو گے؟''

''وہ تو میں پہلے ہی کرچکا ہوں۔''

''کس جرم میں؟'' کولبی نے معصومیت سے سوال کیا۔

''قتل، بشرطیکہ یہ ثابت نہ ہوجائے کہ شیری کی موت ایک حادثہ تھی۔ ممکن ہے کہ وہ برف پر پھسل گئی ہو۔ برفیلی سطح

ناقابلِ اعتبار ہوتی ہے اور آدمی دھوکا کھا جاتا ہے۔ میں خود بھی گرتے گرتے بچا ہوں۔ اگر تم ثابت کردو کہ وہ واقعی گر گئی تھی تو یہ ایک مختلف کہانی بن جائے گی۔''

کولبی کے چہرے پر رونق آگئی۔ اسے اپنے بچاؤ کا راستہ نظر آرہا تھا۔ اس نے یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا لیکن وہ یہ بھول گیا کہ برف پر گرنے سے صرف ایک جگہ اندرونی چوٹ آسکتی ہے جبکہ مقتولہ کے جسم اور چہرے پر شدید زخم آئے تھے۔ کولبی غیر ارادی طور پر گرینڈی کے جال میں پھنس گیا۔

''میں اس سے بات کررہا تھا اور بس... پھر وہ اچانک لڑکھڑا کر گر پڑی۔ برف پر پھسلنا بہت خطرناک ہوتا ہے۔''

''تم نے پولیس کو فون نہیں کیا؟'' گرینڈی نے کہا۔

''مجھے عدالت نے اسکول سے دور رہنے کا حکم دے رکھا ہے۔''

''کیا ہم تمہارے ہاتھ دیکھ سکتے ہیں؟'' گرینڈی نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

کولبی کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے بحالت مجبوری اپنے دونوں ہاتھ گرینڈی کے سامنے کردیے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر زخموں اور خراشوں کے نشان تھے جبکہ درمیانی اور چھوٹی انگلی پر ٹیپ لگا ہوا تھا۔

گرینڈی اپنی جگہ سے اٹھا اور انٹرویو روم کا دروازہ کھول کر ایک پولیس آفیسر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔ ''آفیسر لائل! کیا ہم میڈیکل ایگزامنر سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ اس شخص کے ہاتھ کا ایکسرے کرے۔ ہمیں ثبوت کے لیے اس کی ضرورت پڑسکتی ہے۔''

اسی روز بعد میں گرینڈی کو غیر متوقع طور پر ایک اور مشتبہ شخص سے انٹرویو روم میں ملنا پڑ گیا۔ جائے وقوعہ پر لگے ہوئے کیمرے کی ریکارڈنگ دیکھنے کے بعد اس نے مشتبہ شخص سے کچھ سوالات کیے اور اسے شدت سے سگریٹ کی طلب محسوس ہونے لگی کیونکہ سامنے بیٹھا ہوا کوئی اور نہیں بلکہ اس کا ساتھی نیکو تھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ مختلف حیلے بہانوں سے اپنی جان چھڑا لے۔

''میں آج صبح پارک این فلائی کے پاس سے بھی نہیں گزرا۔'' نیکو نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا۔

''اس پارک میں کیمرا لگا ہوا ہے۔''

''وہ میں نہیں تھا۔'' نیکو نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارا خیال ہے کہ کیمرا جھوٹ بول رہا ہے؟''

''ایسا ہی ہے۔ کیونکہ میں وہاں گیا ہی نہیں۔'' نیکو نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''کیا تم سیکارو والا واقعہ بھول گئے؟''

''بالکل نہیں اور اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا شکر گزار رہوں گا۔ اس وقت تم نے میری جان بچائی تھی لیکن تمہیں حقیقت سے آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ اس رات شیری، فریڈرک سے ملنے اسکول نہیں گئی تھی بلکہ وہ اپنا پرس وہاں بھول آئی تھی۔ وہ وہی پرس لینے گئی تھی۔''

''فریڈرک ائرپورٹ کیوں جارہا تھا۔ اگر یہ فرار کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے؟''

''اوہ تو گویا تم یہ جانتے ہو کہ فریڈرک ائرپورٹ جارہا تھا جبکہ ابھی تم نے کہا کہ وہاں موجود نہیں تھے۔''

''مائیک رہنے دو۔ تم مجھے اپنے جال میں نہیں پھنسا سکتے۔''

''لیکن حقائق کچھ اور ہیں۔'' گرینڈی نے کہا۔ ''تمہارا کہنا درست ہے کہ فریڈرک ائرپورٹ جارہا تھا لیکن وہ بھاگ نہیں رہا تھا بلکہ اپنی سابقہ بیوی سے دوبارہ تعلقات استوار کرنے کے لیے کیلی فورنیا جارہا تھا اور اسی لیے اس نے شیری کو چھوڑ دیا تھا۔ ہم نے اس سلسلے میں تمام معلومات حاصل کرلی ہیں۔ اس کی بہن نے بھی یہی بیان دیا ہے اور ہمیں فریڈرک اور اس کی سابقہ بیوی کے درمیان پیغامات کا ریکارڈ بھی مل گیا ہے۔ اس کی سابقہ بیوی سے تصدیق ہونا باقی ہے۔ فریڈرک نے اپنے طور پر شیری سے تعلق ختم کردیا تھا۔''

''وہ فرار کی غرض سے ائرپورٹ جارہا تھا۔'' نیکو نے اصرار کیا۔

''اور تم نے اس کا تعاقب شروع کردیا۔ وہ یقیناً جانے سے پہلے صبح اپنے دفتر گیا ہوگا اور تم جانتے تھے کہ وہ کہاں ملے گا۔ تم نے اس کی کار دیکھی اور ائرپورٹ کے راستے میں اس کا تعاقب شروع کردیا۔ نیکو! تمہیں کب عقل آئے گی اور کب تم اپنے غصے پر قابو پانا سیکھو گے۔ یہ بچپن سے اب تک تمہارا مسئلہ بنا ہوا ہے۔''

''میرا فریڈرک کے قتل سے کوئی تعلق نہیں۔'' نیکو نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ گرینڈی چاہتا تھا کہ جلدی سے یہ معاملہ ختم ہو اور اسے ایک سگریٹ پینے کا موقع مل جائے۔ وہ جھکا اور اس نے ویڈیو ریکارڈنگ چلا دی۔ کیمرے نے برف سے ڈھکی ہوئی پارک این فلائی کی پارکنگ لاٹ کا منظر ریکارڈ کیا ہوا تھا۔ وہاں نیکو اور

فریڈرک کی کاریں نظر آرہی تھیں۔ فریڈرک کی کار آگے اور نیکو کی کار اس کے پیچھے تھی اور وہ دونوں باتیں کررہے تھے۔ فریڈرک کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ نیکو کو کچھ سمجھانے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کا ہاتھ بار بار اوپر نیچے جاتا اور وہ انگلی سے کیلی فورنیا کی جانب اشارہ کررہا تھا لیکن نیکو پر اس کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے فریڈرک کو زور سے دھکا دیا اور وہ لڑکھڑا کر پیچھے جا گرا۔ نیکو نے اس پر بس نہیں کیا بلکہ اپنے دستانے اتار کر فریڈرک کے منہ پر مکے برسانا شروع کردیے۔ فریڈرک کا پاؤں پھسلا اور وہ برف پر جا گرا۔ نیکو نے اس کے پیٹ پر لات ماری۔ فریڈرک درد کی شدت سے دہرا ہوگیا۔ پھر نیکو اپنی کار تک گیا۔ ڈکی سے لوہے کی سلاخ نکالی اور فریڈرک کے سر پر اس وقت تک ضربات لگاتا رہا جب تک وہ بالکل ساکت نہ ہوگیا، پھر اس نے سلاخ کو فضا میں بلند کرکے فریڈرک کے سر پر پوری قوت سے وار کیا۔

''یہ سب دیکھنے کے بعد بھی کچھ کہنے کی گنجائش ہے؟'' گرینڈی نے پوچھا۔

''وہ شیری کو قتل کرکے فرار ہورہا تھا۔ تم نے کچھ نہیں کیا تو مجھے اسے روکنا پڑا۔''

''اس کی وجہ یہ تھی کہ ہم نے شیری کے قتل کے شبہے میں ایک اور شخص کو گرفتار کرلیا تھا جبکہ فریڈرک کا اس واقعے میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔ میری خواہش تھی کہ تم ہماری کارروائی مکمل ہونے کا انتظار کرلیتے۔''

یہ سن کر نیکو اپنی جگہ پر ساکت ہوکر رہ گیا۔ اس نے شکستہ آواز میں کہا۔ ''وہ کون ہے؟''

گرینڈی نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔ ''تمہیں چیف کی ہدایت کے مطابق نارمل لوگوں کی طرح شیری کا سوگ منانا چاہیے تھا۔''

نیکو کو حوالات بھیجنے کے بعد وہ کھلی فضا میں ایک سگریٹ پینے باہر آگیا۔ اسے ایک عجیب طرح کی بے چینی محسوس ہورہی تھی۔ اس کے دماغ میں سیکاریلی والا واقعہ گھوم گیا جب نیکو نے اس کی جان بچائی تھی اور آج اس کی وجہ سے نیکو اپنی بقیہ زندگی جیل میں گزارے گا۔ اس نے سگریٹ سلگائی لیکن بالکل مزہ نہیں آیا اور کھانسی کے ساتھ خون آنے لگا۔ اس نے سوچا کہ جو کچھ اس نے نیکو کے ساتھ کیا، یہ قدرت کی طرف سے اس کا بدلہ ہے۔ اس نے سگریٹ زمین پر پھینک دی اور فیصلہ کرلیا کہ اب وہ کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔

اس نے گھبرا کر ڈاکٹر سائمن کو فون کیا تاکہ اپنی ایکسرے رپورٹ کے بارے میں معلوم کرسکے۔ ڈاکٹر نے اس کی آواز سنتے ہی کہا۔ ''اچھا ہوا کہ تم نے فون کرلیا۔ میں نے تمہارے گھر پیغام چھوڑا تھا لیکن تم نے جواب میں رابطہ ہی نہیں کیا بہرحال تمہارے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔''

''مجھے اندازہ تھا کیونکہ اب کھانسی کے ساتھ خون بھی آرہا ہے۔''

''اس پر مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ تمہارے بائیں پھیپھڑے پر ایک دھبا نظر آرہا ہے۔''

''اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ''کیمو یا ریڈی ایشن۔''

''میرا خیال ہے کہ تمہیں سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''تمہیں کینسر نہیں بلکہ پھیپھڑوں کی سوزش ہے۔''

''یہ کیا ہوتا ہے؟''

''تمہیں نمونیا ہے۔ تم واقعی بیمار ہو۔ میں حیران ہوں کہ تم اس حالت میں کام کیسے کررہے ہو۔ بہر حال پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں کچھ دوائیں تجویز کررہا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہیں کم از کم دو ہفتے مکمل آرام کرنا ہوگا اور اب تمہیں مکمل طور پر سگریٹ نوشی ترک کرنا ہوگی۔''

''اوہ ڈاکٹر، میں نہیں سمجھتا کہ فوری طور پر اس کے لیے تیار ہوں۔''

''سگریٹ نوشی تمہاری موت کا سبب بھی بن سکتی ہے۔''

''مجھے امید ہے کہ پھیپھڑوں کا کینسر ہونے سے پہلے ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوجاؤں گا۔''

ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے بعد اس نے نیکو اور کوبی سے کی جانے والی تفتیش کی رپورٹ تیار کی۔ دونوں پر قتل کا الزام تھا اور ثبوت وشواہد کے ہوتے ہوئے ان کا سزا سے بچنا محال تھا۔ کوبی ہائنز سے اسے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس نے ایک معصوم لڑکی شیری کے ساتھ زیادتی کی کوشش کی اور اسے مار ڈالا جبکہ وہ اپنی پرانی محبت کی طرف واپس آرہی تھی۔ البتہ اپنے ساتھی نیکو کے لیے وہ افسردہ تھا۔ کاش وہ جلد بازی سے کام نہ لیتا تو اسے معلوم ہوسکتا تھا کہ شیری کو فریڈرک نے نہیں بلکہ کوبی نے قتل کیا تھا لیکن وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سرویلنس کیمرے کی ریکارڈنگ اتنی واضح تھی کہ اس کے ہوتے ہوئے استغاثہ کو کسی دوسرے ثبوت یا گواہ کی ضرورت نہ پڑتی۔

وہ گھر جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھا تو دفتر میں موجود سب لوگ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے جیسے وہ کوئی دوسرے سیارے کی مخلوق ہو۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ اس نے اپنے بہترین دوست نیکو کو ساری عمر کے لیے جیل کی سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے کا بندوبست کردیا ہے جبکہ وہ ماضی میں اس کی جان بچا چکا تھا۔ اسے باقی لوگوں کی پروا نہیں تھی لیکن لونا کو سمجھانا بہت ضروری تھا۔ وہ ہمت کرکے اس کے پاس گیا اور بولا۔ ''لونا، کیا تم کسی وقت میرے ساتھ کافی پینے چل سکتی ہو؟''

''تمہارا مطلب ڈیٹ سے ہے؟'' اس نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''یہی سمجھ لو۔''

لونا نے نرم لہجے میں انکار کردیا۔ جس پر اسے بالکل حیرت نہیں ہوئی۔ وہ مایوس ہوکر باہر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھا۔ جہاں ٹیلی ویژن کے رپورٹر اور کیمرا مین اس کا انتظار کررہے تھے۔ وہ واپس آگیا اور اس نے باہر جانے کے لیے عمارت کے عقبی دروازے کا انتخاب کیا۔ کھلی فضا میں آکر اسے سگریٹ کی طلب ہونے لگی۔ اس نے جیب سے پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ منہ میں دبایا اور اسے سلگانے ہی والا تھا کہ اس کے دماغ میں ڈاکٹر سائمن کی آواز گونجنے لگی۔ جو سگریٹ نوشی کے نقصانات گنوا رہا تھا اور ان میں ایک بدبودار سانس بھی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات جم گئی کہ شاید لونا نے اسی لیے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا ہوگا۔

اس نے سگریٹ واپس پیکٹ میں رکھا اور اسے زمین پر پھینک کر پاؤں سے کچل دیا۔ وہ کار پارکنگ کی طرف جانے کے لیے مڑا ہی تھا کہ اس کے عقب میں عمارت کا دروازہ کھلا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ لونا سیڑھیوں پر کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ''مجھے افسوس ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''امید ہے کہ تمہیں دکھ نہیں ہوا ہوگا۔''

''تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو خود بھی اپنے آپ میں کشش محسوس نہیں ہوتی۔''

''مجھے اپنے باپ کی ایک بات یاد آگئی۔ اس کا کہنا ہے کہ ہم اس وقت تک زندگی سے انصاف نہیں کرسکتے جب تک ہر موقع سے فائدہ نہ اٹھائیں۔''

''گویا تم میرے ساتھ کافی پینے کے لیے تیار ہو؟''

''بشرطیکہ تم سگریٹ پینا چھوڑ دو کیونکہ میں بدبودار سانس برداشت نہیں کرسکتی اور یہ کہ ہم کسی ایسی جگہ چلیں جہاں صحت مند غذا ملتی ہو۔''

اس لمحے اسے ڈاکٹر سائمن ایک فرشتہ محسوس ہوا جس نے لونا کو حاصل کرنے کی کتنی آسان ترکیب بتائی تھی۔ اس کی خاطر تو وہ سات جنم تک بھی سگریٹ نوشی ترک کرنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے خوشی سے جھومتے ہوئے کہا۔ ''میں ایسی جگہ جانتا ہوں جہاں ناشپاتی کے سینڈوچ ملتے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ وہ صحت کے لیے بے حد مفید ہیں۔''

لونا مسکراتے ہوئے آگے بڑھی اور اس کا ہاتھ تھام لیا۔

بلا عنوان

سلیم انور

ہر کام کے لیے وقت درکار ہوتا ہے... اس کے پاس محض چند کٹھن اور جان لیوا گھڑیاں تھیں... اس کی ہر حرکت بے حد سست... رقت طلب اور تکلیف دہ تھی... جو کرنا تھا... اسی پل کے پل انجام دینا تھا... بالآخر اس کی محنت رنگ لائی... اور اس نے اپنا ہدف حاصل کر لیا...

کئی محاذوں پر کارنامے اپنے نام رقم کرنے والے فوجی کی جرأت و ہوش مندی...

یہ لگ بھگ تین ہفتے پہلے ایک صبح کی بات ہے جب یہ سب کچھ شروع ہوا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میری آنکھ کھلی تو میرا جسم ٹھنڈے پسینے میں تر تھا۔ مجھے واضح طور پر دکھائی دینے میں کچھ وقت لگا۔ سب سے پہلے وال پیپر کی پرت.... دکھائی دی... پھر پتنگوں کے دھبوں سے اٹا ہوا روشنی کا بلب اور آخر میں وہ عورت!

وہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے بیدار ہوتے ہی وہ

کرسی پر سے اٹھ گئی اور میرے بیڈ کی جانب بڑھنے لگی جو ایک زنگ آلودہ پلنگ اور پچکے ہوئے میٹرس پر مشتمل تھا۔ میرے بیڈ سے لگ بھگ ایک گز کی دوری پر وہ اچانک رک گئی۔

اس کا یہ انداز سلو موشن کے مانند تھا اس لیے مجھے اس کے سراپا کا بھرپور طریقے سے جائزہ لینے کا وقت مل گیا... خاص طور پر اس کے ڈھیلے ڈھالے کاٹن ٹاپ کا جس میں حرکت کرتے ہوئے اس کے سینے کا زیر و بم نمایاں ہو رہا تھا۔

''تم ہیری کارٹر ہو؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساتھ ہی خود کو یہ یقین دلانے کے لیے اپنے بازو میں ایک چٹکی بھری کہ کہیں میں جاگتے میں کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا۔

''وہی ہیری کارٹر جو کوریا کی جنگ کا سابقہ سپاہی ہے اور کینیا اور کانگو میں بھی کرائے کا فوجی رہ چکا ہے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔''

''اس صورت میں کیا تم باتھ روم میں جا کر خود کو صاف ستھرا بنا سکتے ہو؟'' اس عورت نے کہا۔ ''میں اس صاف ستھرے ہیری کارٹر کو دیکھنا چاہتی ہوں جو پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں ہوا کرتا تھا۔ مجھے یہ ہیری کارٹر نہیں چاہیے جو اس وقت میرے سامنے موجود ہے۔ سچ پوچھو تو تمہارے پاس سے بہت بو آ رہی ہے۔''

چند سیکنڈز کے لیے تو میں ساکت پڑا رہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ عورت مجھے یہ حکم دینے والی کون ہوتی ہے کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تب وہ آگے کی جانب جھکی تو اس کے کھلے گریبان کے ہیجان خیز نظارے کی تاب نہ لا سکا اور اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

جب میں شاور لے رہا تھا تو مجھے اس کے کافی بنانے کی آوازیں سنائی دیں۔ میں شیو پہلے ہی بنا چکا تھا۔ اس دوران اس عورت نے میرے لیے پینٹ اور شرٹ کا ایک صاف ستھرا جوڑا بھی ڈھونڈ نکالا تھا جس کے بارے میں مجھے خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ میرے پاس موجود ہے۔

جب میں نے نہانے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد باتھ روم کے آئینے میں اپنا عکس دیکھا تو خود کو پہچان نہ سکا۔ میں باہر نکل آیا۔

''اب بُرے نہیں لگ رہے۔'' وہ مجھے دیکھ کر بولی۔

''زیادہ بُرے نہیں لگ رہے۔ بس پیٹ ذرا نکلا ہوا ہے۔ ... تم اب بھی عمدہ شیپ میں ہیں۔''

میں نے گرما گرم کافی کی چسکیاں لینا شروع کر دیں۔ میرا حلق جھلس رہا تھا لیکن مجھے کافی پینے میں مزہ آ رہا تھا۔ اس دوران اس عورت نے اپنے فینسی پرس میں سے ایک چھوٹی سی نوٹ بک نکالی اور اس کے صفحات کھول کر اس میں سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے گھڑی کی سوئیوں کو دو دہائی پیچھے دھکیل دیا ہو۔

''کوریا۔ 1952ء۔ تم بہت جلد ترقی پا کر سارجنٹ بننے جا رہے تھے کہ پھر تمہیں فوج سے رسوا کن طور پر سبکدوش کر دیا گیا۔ تم پر کسی افسر کے ٹینٹ میں ہینڈ گرینیڈ پھینکنے کا الزام تھا۔''

میں نے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھی۔

''دیکھو، اس وقت میری عمر اٹھارہ برس تھی اور میں نشے میں تھا۔ اس شخص نے پلاٹون کے چار آدمیوں کو قتل کر دیا تھا کیونکہ وہ نامعقول اور احمق تھا۔ یقین کرو کہ اگر میں اسے لڑھکانا چاہتا تو میں اسے دھماکے سے نہ اڑاتا، چاہے میں نشے میں ہوتا یا سنجیدہ۔''

''مجھے تمہاری بات پر یقین ہے۔'' اس عورت نے کہا۔ ''اب آگے بڑھتے ہیں... کینیا 1954ء۔ وہاں تم واقعی ایک ہیرو تھے۔ اس مرحلے میں تم نے ایک عورت کی زندگی بچاتے ہوئے گیارہ ماؤ ماؤ افریقیوں کو قتل کر دیا تھا۔ اخبارات تمہارے اس کارنامے سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ اس بیوہ عورت کے لیے خوش قسمتی کی بات تھی کہ تم اس کے فارم میں اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے وہاں موجود تھے جب ان لوگوں نے اس فارم پر دھاوا بولا تھا۔''

''بکواس۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو اس عورت کے پاس کسی اور مقصد کے لیے گیا تھا اور ہم دونوں عین اس لمحے راز و نیاز میں مگن تھے جب ان حرام زادوں نے حملہ کر دیا تھا۔''

''او کے! لیکن وہ تمہارا سب سے عمدہ ترین وقت تھا۔ اب 1964ء کی بات کرتے ہیں... تم اس وقت کانگو میں کسی کے لیے کرائے کے فوجی کے طور پر کام کر رہے تھے۔ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ شک نہیں کر سکتی کہ تم نے اپنا کام بہ حسن و خوبی سرانجام دیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے باوجود تم ایک بیلجیئم بینک سے دس لاکھ فرانک اڑانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہیں وہ رقم واپس نہیں ملی۔''

''ہاں، انہیں تم واپس تو نہیں ملی۔ لیکن آسٹریلین ڈالر کے مقابلے میں بیلجیئم فرانک کی ویلیو لگ بھگ نصف تھی۔ پھر کئی جگہ رشوت بھی دینا پڑی۔ آخر میں میرے پاس جو نقد رقم بچی وہ لگ بھگ دو لاکھ ڈالر تھی۔ یہ رقم چھ ماہ سے

زیادہ نہیں چلی۔'' میں نے بتایا۔

''اور اس کے بعد تم پر بڑا زوال آ گیا۔ جب انہوں نے تمہیں ویت نام بھیجنے سے انکار کر دیا تو تم ناکارہ ہو گئے اور آوارہ گردی شروع کر دی۔ شہر کے ہر شراب خانے سے تم ٹھکرائے جا چکے ہو۔ کیا تم یہی چاہتے ہو، ہیری؟'' اس عورت نے کہا۔

وہ اب میرے نزدیک آ چکی تھی۔ مجھے اس کے اٹھنے کا بالکل بھی احساس نہیں ہوا تھا کیونکہ میں ماضی کے خیالوں میں کھو کر خود کو اسٹیلے دل کے بدبودار شراب خانے میں اسکاچ پیتے ہوئے محسوس کر رہا تھا اور میرے جسم سے پسینا اسی تیزی سے بہہ رہا تھا جس تیزی کے ساتھ میں وہسکی پی رہا تھا۔

''اور اس کا متبادل کیا ہے؟'' میں نے جاننا چاہا۔

''ابتدا میں پانچ لاکھ ڈالر... ٹیکس فری۔'' اس عورت نے کہا۔ ''اس کے بعد کیا معلوم آگے کیا ہو؟''

''اور اس کے عوض مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

مجھے یوں لگا جیسے جواب دینے میں اس نے لمبا وقت لے لیا ہے لیکن حقیقت میں وہ صرف چند سیکنڈ کا وقفہ تھا۔

''ایک بکتر بند گاڑی کو اڑانا ہے، یہ کام صرف ہیری کارٹر ہی کر سکتا ہے۔ ہمیں ایک پیشہ ور کی خدمات درکار ہیں اور وہ تم ہو سویٹ ہارٹ! صرف اور صرف تم! اس کاروبار میں سب سے بہترین ایکسٹرمینیٹرز میں تمہارا شمار ہوتا ہے۔''

اس نے جو کچھ کہا تھا مجھے یہ سن کر ایک طریقے سے کوئی حیرانی نہیں ہوئی تھی۔ بات کاروبار کی تھی۔ اس جیسی کوئی بھی عورت ایک اکتالیس سالہ آوارہ گرد آدمی کے ساتھ اس قسم کی احمقانہ حرکتیں نہیں کر سکتی جو پہلے ہی شکست خوردہ ہو۔

میں ابھی اس بارے میں غور کر ہی رہا تھا کہ وہ ایش ٹرے اٹھانے کے لیے مجھ پر جھک سی گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری آنکھوں میں زوم لینس لگ گیا ہو۔ نظارہ عمدہ تھا... بے حد عمدہ۔

''تم شامل ہونا چاہتے ہو یا نہیں، ہیری؟''

میں نے اسے جواب دیا کہ میں یقیناً شامل ہونا چاہتا ہوں۔

اسے یہ سن کر تسلی ہوئی تھی گو اس نے اپنی زبان یا تاثرات سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ تب اس نے بتایا کہ ہمیں اس سلسلے میں کسی شخص سے ملنے کے لیے جانا ہوگا۔

ہم بنگلے سے زینے سے اُتر کر نیچے آ گئے جہاں ایک قیمتی کار کھڑی ہوئی تھی۔ ہم کار میں سوار ہو گئے۔ جب میں نے اس عورت سے پوچھا کہ اسے میرے بارے میں اتنا کچھ کیونکر معلوم ہے تو اس نے بتایا کہ اس کا کوئی دوست جنگ کے ریکارڈ کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ اس کا تذکرہ اس نے بس اسی وقت کیا۔ اس کے بعد اس بارے میں کبھی کوئی بات نہیں کی۔

وہ شخص بندرگاہ کے سامنے ایک کلاسک اپارٹمنٹ بلاک میں رہتا تھا۔ اس شخص کی رہائش گاہ سے امارت کا اظہار ہو رہا تھا... اور اس کی شخصیت سے بھی۔ وہ لگ بھگ میرا ہم عمر دکھائی دے رہا تھا اور جسمانی طور پر بالکل فٹ لگ رہا تھا جیسے جمنازیم جانا اس کے معمول میں شامل ہو۔

اس عورت نے اس شخص کو بتایا کہ میں ان کے ساتھ شامل ہونے پر رضامند ہو گیا ہوں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ اپنے کام کی لائن میں تم نے عملی طور پر اس کاروبار میں استعمال ہونے والے ہر قسم کے ہتھیار سے فائر کیا ہوگا۔'' اس شخص نے کہا۔ ''بزوکا کے بارے میں کیا کہو گے؟''

''میرے لیے بزوکا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔'' میں نے اسے بتایا۔ ''لیکن بزوکا ہی کیوں؟''

''ہمارے ساتھ ایک پرابلم ہے۔'' اس شخص نے کہا اور اس اطمینان کے ساتھ سگریٹ سلگانے میں مگن ہو گیا جیسے اس کے پاس دنیا بھر کا فالتو وقت ہو۔ ''ہمارا پرابلم یہ ہے کہ ہمیں بیک وقت تین کام کرنے ہیں۔ ہمیں بکتر بند گاڑی کو روکنا ہے۔ عملے اور کیبن میں موجود فون کو بے حرکت اور ساکت کر دینا ہے اور ساتھ ہی گاڑی کو ازخود کھول دینا ہے تاکہ ہم اس میں موجود تنخواہ کی رقم تک آسانی سے پہنچ جائیں۔ ہمیں خیال آیا کہ ایک بزوکا یہ سب کچھ کر سکتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

''یہ اس کے دائرۂ کار پر منحصر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بزوکا ایک بالکل درست اور ہدف کو سو فیصد نشانہ بنانے والا ہتھیار نہیں ہے۔ یہ ٹارگٹ کو یا اس کے اطراف میں ہٹ کر سکتا ہے۔ کار نشانہ بن سکتی ہے اور ہمیں کچھ ہاتھ نہیں آ سکتا۔ البتہ دو بار نشانہ بنانے پر یہ ممکن ہو سکتا ہے اور دونوں نشانے دو زاویوں سے لینا ہوں گے۔ ایک سامنے سے تاکہ بکتر بند رک جائے۔ دوسرا دھماکا عقبی دروازوں کو اڑانے کے لیے ہوگا۔ میں اس پر کام کر سکتا ہوں۔''

وہ اس وقت خوش دکھائی دینے لگا جب میں نے اسے بتایا کہ ایک بزوکا کا راکٹ سخت فولاد میں دس سینٹی میٹر تک

سرایت کرسکتا ہے۔ اس خوشی میں اس نے میرے لیے ایک جام انڈیل دیا اور اپنا تعارف کرانے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام کارل ہے اور عورت کا نام لوسی ہے۔ مزید چند جام حلق سے نیچے اتارنے کے بعد اس نے اپنے منصوبے کا ابتدائی خاکہ بیان کرنا شروع کردیا۔

جس انداز سے اس نے خاکہ بیان کیا اس سے یہ منصوبہ زیادہ پیچیدہ نہیں لگ رہا تھا۔ بکتر بند گاڑی فوج کی تنخواہ لے کر جاتی تھی۔ یہ تنخواہ لفافوں میں نہایت صفائی سے پیک شدہ اور تمام نقدی بینک نوٹوں کی شکل میں ہوتی تھی۔ یہ تنخواہ ہر دوسری جمعرات کی صبح اس بکتر بند گاڑی میں لے جائی جاتی تھی۔

کارل نے یہ بتانے کے بعد میز کی دراز سے ایک نقشہ نکالا اور اسے ٹیبل پر پھیلا دیا۔

بکتر بند گاڑی کی مسافت 57 کلومیٹر کی ہوتی تھی۔ آخری سولہ کلومیٹر کا سفر اس کھلے علاقے میں ہوتا تھا جس پر آرمی کی سڑک بنی ہوئی تھی جو بیس ہیڈ کوارٹر تک جاتی تھی جہاں تنخواہ پہنچائی ہوتی تھی۔ یہی وہ علاقہ تھا جہاں ہمیں اپنی کارروائی کرنی تھی۔

پھر کارل نے بتایا کہ ہم یہ کارروائی کس طرح کریں گے۔ ابتدا میں تو مجھے اس میں کافی مشکلات دکھائی دیں۔ لیکن کچھ دیر بعد میں نے اندازہ لگایا کہ اس واردات میں ہماری کامیابی کے ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔

پھر اس نے مجھے بزوکا دکھائی۔ یہ دوسری جنگِ عظیم میں کوریا میں استعمال ہونے والی 2.36 انچ شولڈر ٹائپ بزوکا تھی جس کے ساتھ تین ٹانگوں والی ٹیک بھی تھی۔ وہ چھ راکٹ بھی لے آیا اور پوچھنے لگا کہ کیا مجھے مزید راکٹ درکار ہیں۔ میں نے انکار کردیا۔

میں نے اس سے کہا کہ یہ ایک اچھا آئیڈیا ہوگا اگر وہ کوئی ایسی عمدہ اور پُرسکون جگہ تلاش کرلے جہاں میں مٹی کے تودوں پر اپنی نشانہ بازی کی مشق کرسکوں اور بزوکا چلانے کے لیے خود کو تازہ دم محسوس کرسکوں۔

اس نے بتایا کہ وہ اس کا انتظام کرسکتا ہے۔

انہوں نے اسی عمارت کی تیسری منزل پر میرے لیے اپارٹمنٹ تین سو آٹھ میں کمرا بک کردیا۔ مجھے اس سے قبل اس قسم کے اعلیٰ رہائشی کمرے میں رہنے کا آخری اتفاق اس وقت ہوا تھا جب میں نے بیلجیم کے ایک کروڑ پتی کی بیوی سے مختصر عرصے کے لیے تعلقات استوار کیے تھے۔

تین دن بعد انہوں نے مجھے ہاؤس فون پر کہا کہ میں اوپر آکر اپنے ڈرائیور بینی سے ملاقات کرلوں۔ وہ پستہ قامت اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ اپنی خرگوش جیسی کھوجی آنکھوں کی وجہ سے وہ ایک سابقہ چھپے باز لگ رہا تھا۔

بینی مجھے ساحل کی سمت لگ بھگ دو سو کلومیٹر اور پھر اندر کی جانب مزید بیس کلومیٹر میدانی علاقے میں لے گیا جس کے بعد جنگل سے پٹا ہوا علاقہ شروع ہوجاتا تھا۔ یہ راستہ کسی کے استعمال میں نہیں تھا۔ وہاں اتنا سناٹا اور سکون تھا جیسے ہم خلا میں کسی جگہ آگئے ہوں۔

عام طور پر بزوکا کو چلانے کے لیے دو آدمی درکار ہوتے ہیں لیکن ٹرائی پوڈ کی وجہ سے اسے ایک آدمی بھی چلا سکتا ہے۔ بس اسے ٹرائی پوڈ پر سیٹ کرنا ہوتا ہے۔

میں نے بینی کو ٹارگٹ کی جانب متوجہ کیا جو کہ ساٹھ میٹر کی دوری پر مٹی کا ایک ٹیلا تھا۔

میں نے پہلا راکٹ فائر کیا تو وہ ہدف سے پرے جاکر پھٹا اور اس نے زمین پر خودرو جھاڑیوں کا چند مربع میٹر کا حصہ اڑا دیا۔

نشانہ خطا ہونے نے بینی کو قدرے پریشان کردیا۔

میرا دوسرا فائر قدرے بہتر رہا بلکہ کہیں بہتر رہا۔ تیسرا فائر ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔

رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ہم واپس آگئے۔ بینی اوپر کارل کو رپورٹ کرنے چلا گیا جبکہ میں اپنے کمرے میں آگیا اور باتھ روم میں جاکر شاور لینے لگا۔

کچھ دیر بعد مجھے کارل نے فون کیا اور اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ سب کچھ ٹھیک ہوگا اور وہ میری کارکردگی سے مطمئن ہے۔ اوکے! لیکن اس کے باوجود بھی مجھے یہ بات کھٹک رہی تھی کہ کارل بلاوجہ فکرمند ہونے والوں میں سے ہے۔ اسے یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ سب کچھ بالکل ٹھیک ہوجانا چاہیے... اور وہ برجستہ قدم اٹھانے والوں میں سے نہیں ہے۔

میں انتظار کا زیادہ وقت سوئمنگ پول پر گزارتا تھا۔ بعض اوقات لوسی بھی وہاں آجاتی تھی... لیکن بیشتر صبح کے اوقات میں... ہم یا تو تیراکی کرتے رہتے یا پھر دھوپ سینکتے رہتے تھے۔ مجھے ابھی تک لوسی اور کارل کے درمیان تعلقات کی نوعیت کا اندازہ نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ اس قسم کے سوالات پوچھنے کے لیے مناسب وقت نہیں ہے۔ بعد میں کبھی موقع دیکھ کر پوچھ لوں گا، لیکن اس وقت نہیں۔

جس دن ہمیں کارروائی کرنی تھی، وہ مہینے کے دیگر گرم دنوں سے مختلف نہیں تھا۔ صبح ہوتے ہی گرمی میں اضافہ ہونا شروع ہوگیا تھا۔

بینی نے صبح ساڑھے نو بجے کے قریب مجھے آکر بتایا کہ وہ لوگ جانے کے لیے بالکل ریڈی ہو چکے ہیں اور میرا انتظار ہو رہا ہے۔ میں نے ایک جام پیا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔

ہمارا سفر قابلِ ذکر نہیں تھا۔ ایک جگہ گیٹ پر بینی نے اپنا پاس دکھایا تو وہاں متعین سنتری نے ہمیں ہاتھ کے اشارے سے آگے بڑھنے کو کہہ دیا۔ وہ قدرے پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ اندر سے کارل کا آدمی ہوگا۔ آپ کی چھٹی حس اس بارے میں آپ کو آگاہ کر دیتی ہے۔

ہمارے منتخب کردہ مقام پر بینی نے گاڑی سے بزوکا اور راکٹ اتارنے میں میری مدد کی۔ پھر کار آگے موڑ پر ایک چٹان کی آڑ میں چھپانے لے گیا اور واردات کے لیے خود کو سیٹ کرنے میں مصروف ہوگیا۔

مجھے اپنی تیاریاں مکمل کرنے میں پندرہ منٹ لگ گئے۔ اب میں ریڈی ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں لہریں سی اٹھتی محسوس ہونے لگیں جیسے کہ میرے اس قسم کے ایکشن کے موقعوں پر ہمیشہ محسوس ہوا کرتی تھیں۔ مجھے اپنا پرانا دور یاد آگیا۔

پھر مجھے سب سے پہلے موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی جس پر بکتر بند گاڑی کا محافظ سوار تھا۔ وہ لوگ وقت مقررہ پر وہاں پہنچ چکے تھے۔ پھر میں نے موٹر سائیکل سوار محافظ کو بلندی پر تیزی سے اوپر آتے اور اپنی نظروں کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ وہ بکتر بند گاڑی بھی عین اس کے عقب میں تھی اور اسی تیزی سے رواں تھی۔

موٹر سائیکل جہنم میں جائے، میں نے سوچا۔ اس سے نمٹنا بینی کا معاملہ تھا۔

میں نے ایک راکٹ فائر کر دیا اور بکتر بند کے نچلے حصے کو دھوئیں کے بادلوں میں غائب ہوتے دیکھنے لگا۔ جب میں دوسرا راکٹ لوڈ کر رہا تھا تو موٹر سائیکل محافظ نے تیزی سے بریک لگا دیے۔ بینی آڑ سے نکل کر بھاگتے ہوئے موٹر سائیکل سوار محافظ پر فائرنگ کر رہا تھا۔

محافظ نیچے گر پڑا تھا لیکن اسے گولی نہیں لگی تھی۔ وہ صرف ڈھونگ رچا رہا تھا کیونکہ دوسرے لمحے وہ اٹھ کر سڑک کے دوسری جانب چٹانوں کی جانب دوڑ پڑا تھا اور دوڑتے دوڑتے اس نے اپنا پستول بھی نکال لیا تھا۔ میں اس ٹائپ کے سپاہیوں سے بخوبی واقف تھا۔ وہ جھنڈا بلند کرنے کی مسابقت میں جوش سے پاگل ہو جاتے ہیں۔

میرے فائر کیے ہوئے دوسرے راکٹ نے بکتر بند گاڑی کے عقبی حصے کو تقریباً بیس میٹر اوپر ہوا میں اچھال دیا۔ لیکن گاڑی سے کوئی فرد باہر کودتے دکھائی نہیں دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ یا تو وہ بے ہوش ہو چکے تھے یا پھر ملیامیٹ۔

میں نے جان بوجھ کر نشانہ قدرے نیچے اور ذرا پرے لیا تھا۔ اس لیے کہ تنخواہ کی رقم لے جانے والی گاڑی کو نشانہ بنانا ایک الگ بات تھی اور چار یا پانچ انسانوں کی جان لینا جنہیں میں جانتا تک نہیں تھا، ایک الگ بات تھی۔

ملٹری پولیس کے اس محافظ کو روکنا بھی ضروری تھا۔ لیکن یہ اس احمق بینی کے بس کا معاملہ نہیں لگ رہا تھا کیونکہ وہ سڑک پر پڑا چیخ رہا تھا اور اس کے پیٹ میں اعشاریہ تین آٹھ کی گولی لگ چکی تھی۔

میں لوسی اور کارل کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ کار لے کر تباہ شدہ بکتر بند گاڑی کے پاس پہنچ جائیں اور اس میں سے تنخواہ کی رقم کے بکس کار میں منتقل کرنا شروع کر دیں۔ پھر جونہی میری نظر ان کی آتی ہوئی کار پر پڑی تو میں زگ زیگ انداز میں بینی کی طرف دوڑ پڑا۔ میں بہت تیزی سے اور چوکنا طریقے سے دائیں بائیں دوڑ رہا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ وہ ملٹری پولیس کا محافظ اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے طریقے سے بہ خوبی واقف ہے۔

بینی کے پاس پہنچ کر میں نے دوڑتے قدموں سے جھک کر اس کی رائفل اٹھائی اور چٹانوں کی سمت دوڑنے لگا۔

ساتھ ہی میں نے کارل سے چیخ کر کہا کہ وہ بکتر بند میں سے کیش کے بکس نکال کر کار میں رکھنا شروع کر دے جبکہ میں اس محافظ سے نمٹنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کارل نے اس انداز سے اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ اب بھی پاس ہو۔ لیکن یہ لوسی تھی جس نے تباہ شدہ بکتر بند سے رقم کے بکس گھسیٹنا شروع کیے تھے۔ کارل وہیں کھڑا بینی کی چیخ و پکار سن رہا تھا حتیٰ کہ اس ملٹری پولیس محافظ کی چلائی ہوئی گولی اس کے شانے میں لگی اور وہ وہیں گر پڑا۔

میں چٹانوں کے درمیان گھومتا گھماتا بالآخر اس مقام تک جا پہنچا جہاں سے میں اس محافظ کو دیکھ سکتا تھا۔ اسے میری آمد کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔ میں دبے پاؤں اس کے

عقب میں ایک محتاط فاصلے تک پہنچ گیا اور اسے ساکت ہو جانے کا حکم دیا۔

یہ میرے تحکمانہ لہجے اور گرج دار انداز کا اثر تھا کہ وہ میری آواز سنتے ہی جیسے منجمد ہو گیا۔ تب میں نے اس سے کہا کہ وہ سامنے کی چٹان سے چپٹ کر کھڑا ہو جائے اور ہاتھ اوپر اٹھالے۔ اس نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کرلی۔ میں نے رائفل کے بٹ سے اس کی کھوپڑی بجا دی۔ البتہ یہ دھیان رکھا کہ وار مہلک ثابت نہ ہو اور وہ صرف چند دنوں کے لیے سر کے زخم کی بنا پر اسپتال میں پڑا رہے اور جب بولنے کے قابل ہو جائے تو تمام قصہ اپنے افسران کے گوش گزار کردے۔ شاید وہ اس بہادری پر اسے کوئی تمغا عطا کردیں۔

جب میں واپس کار تک پہنچا تو کیش کے تمام بکس کار میں لوڈ کیے جاچکے تھے اور کارل پچھلی نشست پر پڑا کراہ رہا تھا اور گریہ کررہا تھا کہ اس کا کتنا خون ضائع ہو چکا ہے۔ میں نے بزوکا اور راکٹ اٹھایا اور دونوں چیزیں کارل کے پاس کار کے اندر رکھ دیں۔

''بینی کا کیا ہوگا؟'' لوسی نے پوچھا۔

''بینی کو بھول جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے پاس زیادہ سے زیادہ آدھے دن کا وقت ہے۔''

''کار تم چلاؤ گے۔'' لوسی نے کہا۔ ''میں تمہیں بتاؤں گی کہ کس طرف جانا ہے۔ لیکن ہم کسی گیٹ سے باہر نہیں نکلیں گے۔''

ہم خودرو براؤن گھاس اور سمندر کی خشک کھاڑی کے راستے آگے بڑھتے رہے۔ کبھی کچا راستہ بھی آجاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لوسی خاردار باڑھ کے کسی ایسے حصے کی تلاش میں ہے جہاں نالے کی گزرگاہ زیادہ گہری نہ ہو۔

اس مقام پر ہم دونوں کی نظر ایک ساتھ پڑی۔ میں نے کار کی رفتار بڑھادی اور کار نوّے کلومیٹر کی رفتار سے لوہے کے جال کو پھاڑتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔ تاروں کی رگڑ کار کے دروازوں اور شیشوں پر صاف سنائی دی تھی۔

یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت باہر کی سڑک پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ اور نہ ہی اس وقت جب ہم نے کار ایک بغلی سڑک پر اتاردی۔ ہمیں کسی نے خاردار تاروں کے جال کو توڑ کر نکلتے یا فرار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

ہمیں فارم تک پہنچنے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت لگ گیا۔ فارم ویران تھا۔ لوسی نے صحیح کہا تھا کہ فارم سب سے الگ تھلگ اور نظروں سے چھپا ہوا ہے۔ میں کیش کے تمام بکس کار سے اتار کر فارم ہاؤس میں لے گیا اور کار اناج کی کوٹھی میں کھڑی کردی۔

کارل کی حالت غیر ہو رہی تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بے ہوش ہونے والا ہے۔

تب میں لوسی اور کارل کے بارے میں سوچنے لگا۔ پہلی بات تو یہ کہ لوسی اور کارل کے درمیان ایسی کوئی بات نہیں تھی جیسا کہ ابتدا میں میرا خیال تھا۔ دوسرے یہ میرا خیال نہیں تھا کہ کارل باس ہے۔ یقیناً تمام بات چیت اسی نے کی تھی لیکن وہ کسی صورت نہیں لگ رہا تھا کہ اس منصوبے کا ماسٹر مائنڈ وہی ہے۔

اس واردات کی خبر دو گھنٹے بعد کار ریڈیو پر نشر ہوئی۔ بکتر بند گاڑی کے دو محافظ بینی کے ہمراہ اسپتال کے آئی سی یو میں داخل تھے۔ باقی تمام افراد کو دھماکے سے صدمہ پہنچا تھا لیکن وہ زخمی نہیں ہوئے تھے اور انہیں طبی امداد دینے کے بعد اسپتال سے رخصت کردیا گیا تھا۔

خبر کی سب سے دلچسپ ترین بات کہ تنخواہ کی رقم ساٹھ لاکھ ڈالر تھی۔

اس لحاظ سے مجھے اپنے حصے کی رقم پانچ لاکھ ڈالر معمولی لگی۔ خاص طور پر بٹوارے کی فہرست سے بینی کا نام خارج ہونے کی بنا پر۔

لوسی نے یقیناً میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔

''جانتے ہو ہیری، تم نے وہاں پورے ہوش وحواس کے ساتھ اور مستعدی سے تمام کام سرانجام دیے۔ جبکہ بینی نے ہمارا راز فاش کرکے ہمیں ایک بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔ لہٰذا اب بینی کے حصے کی رقم بھی تمہیں ملے گی۔ تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

میں سوچنے لگا کہ زندگی بھی تاش کے کھیل پوکر کے مانند ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے ہاتھ میں بہت بُرے پتے آتے ہیں اور کبھی آپ کے پاس ایسے پتے آجاتے ہیں کہ وہی ہاتھ میں رکھنے پڑتے ہیں اور انہیں بدلنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

یقیناً میں اپنا اور بینی کا حصہ لے کر الگ ہو سکتا تھا جبکہ دوسری جانب میں اس گیم میں شامل رہنا چاہتا تو رہ بھی سکتا تھا۔ اس لیے کہ بٹوارے کی رقم ہر مرتبہ بڑھتی جارہی تھی۔ یہ فیصلہ مجھ ہی کو کرنا تھا۔

''اس کا انحصار چند وضاحتوں پر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''سب سے پہلے مجھے یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بینی کا حصہ کتنا تھا؟''

''جو حصہ تمہارا ہے وہی حصہ بینی کا بھی تھا... پانچ لاکھ ڈالرز۔'' لوسی نے بتایا۔

''یہ تو سیدھا سادہ ریاضی کا معاملہ ہے۔'' میں نے لوسی سے کہا۔ ''مجھے دس لاکھ ڈالر ملیں گے اور کارل اور تمہارے درمیان پورے پچاس لاکھ ڈالر تقسیم ہو جائیں گے۔ مجھے اس کی پروا تو نہیں لیکن کارل کا صحت مند ہونا مشکل دکھائی دے رہا ہے۔ وہ اس وقت تک چیختا چلاتا بند نہیں کرے گا جب تک کہ اسے کسی ڈاکٹر کو نہ دکھا دیا جائے۔ بدترین بات یہ ہے کہ جب ایکشن شروع ہوا تو اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ اس میں وہ جرأت اور دلیری نہیں جو ہونی چاہیے، ہنی۔ یہ بات میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی۔''

لوسی نے مجھ سے ایک سگریٹ مانگی اور سلگانے کے بعد ایک لمبا کش لیتے ہوئے بولی۔ ''ہیری، اس بارے میں تم درست ہو سکتے ہو۔ لیکن ایک ایسے شخص کے لیے جو دو ہفتے قبل ایک آوارہ گرد تھا... یہ سب ایک طویل سفر کے مانند ہے، بے بی۔''

''بات صرف رقم کی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بات میری اور تمہاری ہے۔ ہم دونوں ایک ہیں۔ یہ بات میں اسی وقت جان گیا تھا جب میں نے تمہیں پہلی بار دیکھا تھا۔''

لوسی یہ سن کر مجھے غور سے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔ ''میں اس بارے میں سوچوں گی، ہیری۔ میں اس بارے میں پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کروں گی۔ اب تم سے کل بات ہو گی۔''

☆☆☆

اگلے روز صبح روشن لیکن قدرے گرم تھی۔ میں اناج کوٹھری میں خشک چارے کی پرانی گھاس پر سکون کی نیند سوتا رہا تھا۔

آنکھ کھلنے پر مجھے کافی کی مہک محسوس ہوئی۔ لوسی فرائی پین میں پٹھ کا گوشت اور انڈے تیار کر رہی تھی جیسے ہم کہیں تعطیلات گزارنے کے لیے آئے ہوئے ہوں۔

کارل نے ناشتے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ اس کی رات بہت خراب گزری ہے اور اس کا شانہ بہت تکلیف دے رہا ہے۔ وہ کہیں سے بھی وہ کارل نظر نہیں آ رہا تھا جسے میں نے وہاں کلاسک اپارٹمنٹ میں دیکھا تھا۔ مزید ایک آدھ دن میں اس کی حالت کسی آوارہ گرد کے مانند ہو جائے گی۔ وہ ایک اور ہیری کارٹر بن جائے گا۔ یہ بڑی متاثر کن بات تھی۔

سورج چڑھنے کے بعد درجۂ حرارت مزید بڑھ گیا اور دیواریں جیسے آگ اگلنے لگیں۔ لوسی صحن میں لگے ہوئے پرانے ہینڈ پمپ کے پاس چلی گئی اور چلانے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن پمپ کا ہینڈل سخت ہو رہا تھا اور اس سے چلایا نہیں جا رہا تھا۔ تب میں نے ہینڈل کو چند زوردار جھٹکے دیے تو وہ چلنے لگا اور پائپ سے کنوئیں کے ٹھنڈے پانی کی دھار بہنا شروع ہوگئی۔

''اسے چلاتے رہو، ہیری۔'' لوسی نے اچانک کہا۔

میں خاموشی کے ساتھ اسے بے لباس ہوتے دیکھتا رہا۔ دھوپ میں اس کا سنولایا ہوا چہرہ شہد کی سی رنگت لیے ہوئے تھا۔

تب مجھے اپنی بات کا جواب مل گیا۔ میں سمجھ گیا کہ کارل اب بے مصرف ہے... اور یہ کہ جیسے میں نے مشورہ دیا تھا، معاملہ اب ہم دونوں تک محدود رہ گیا تھا۔

میں، لوسی اور ساٹھ لاکھ ڈالرز!

اس سہ پہر لوسی نے کارل کو بتایا کہ ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں گے لیکن ہمیں احتیاط کرنا ہوگی۔ وہ کوئی بھی ڈاکٹر نہیں ہوسکتا۔ ہمیں حالات کو دیکھتے ہوئے قدم اٹھانا ہوگا۔

کارل ہماری باتوں سے مطمئن ہو گیا۔ اس وقت اسے رقم کی فکر لاحق نہیں تھی۔ وہ بس مرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم حالات سے باخبر رہنے کے لیے مسلسل ریڈیو سنتے رہے۔

تین دن بعد ہم نے فیصلہ کیا کہ اب یہاں سے نکلنا ہمارے لیے محفوظ ہوگا۔ یہاں گزارے ہوئے وہ دن کئی انداز سے میری زندگی کے بہترین اور یادگار دنوں میں شمار کیے جا سکتے تھے۔ ہم نے خشک کھاڑی میں ایک ایسا گہرا گڑھا تلاش کر لیا تھا جس میں پانی جمع تھا۔ ہمارا زیادہ تر وقت وہاں پانی میں یا باتیں کرتے ہوئے گزرتا تھا۔ ہم منصوبے بناتے تھے کہ اس رقم سے کیا کیا کریں گے۔ وہاں شاہ بلوط کا ایک گھنا درخت بھی تھا جس کی چھاؤں میں ہم راز و نیاز کرتے اور ایک جان دو قالب ہوا کرتے تھے۔

پھر ایک روز لوسی نے مجھے اس تیز رفتار کشتی کے بارے میں بتایا۔ وہ کشتی ساحل پر تقریباً سو کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تھی۔ بیس میٹر لمبی اس کشتی میں پیٹرول بھرا ہوا تھا اور کھانے پینے کی اشیا بھی وافر مقدار میں موجود تھیں۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ان کا منصوبہ معاملہ سرد پڑنے کے بعد سمندر کے راستے فرار ہونے کا تھا۔ لوسی کو مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ اس کے ذہن میں کیا تھا۔ ہمیں یہاں سے کارل کو ساتھ لے کر نکلنا تھا لیکن کشتی میں سمندر کے راستے فرار ہونے والے صرف ہم دونوں ہی ہوں گے۔

ہم رات دو بجے کے قریب اس فارم ہاؤس سے روانہ ہوگئے۔ گاڑی میں ڈرائیو کر رہا تھا جبکہ لوسی کارل کے ہمراہ عقبی نشست پر موجود تھی۔ کارل جلد ہی سو گیا۔ ہم مین سڑک کے بجائے عقبی راستوں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ راستوں کی راہنمائی لوسی کر رہی تھی۔ اس کا ذہن کمپیوٹر کے مانند کام کر رہا تھا اور وہ ٹھنڈے دماغ سے کام لے رہی تھی۔

صبح پانچ بجے کے لگ بھگ ہماری گاڑی ساحل کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔

کچھ دیر سفر کرنے کے بعد لوسی نے اچانک مجھے گاڑی روکنے کو کہا۔ میں نے گاڑی روک دی۔ لوسی نے ساحل کی طرف اشارہ کیا۔

وہاں ایک کشتی جیٹی کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ وہاں کشتی، جیٹی اور ایک چھوٹے سے شیڈ کے سوا اور کچھ نہیں تھا... کچھ بھی نہیں اور نہ ہی اطراف میں کچھ دکھائی دے رہا تھا۔

''یہ کشتی یہاں گزشتہ روز لائی گئی ہے۔'' لوسی نے بتایا۔ ''جس شخص نے کشتی یہاں پہنچائی ہے وہی ایک دو روز میں آکر یہ کار یہاں سے لے جائے گا اور اس علاقے کو اچھی طرح چیک کر کے یہ یقین کر لے گا کہ ہماری یہاں آمد کے کوئی آثار تو موجود نہیں رہ گئے۔''

''اور کارل کا کیا ہوگا؟''

اس نے اپنے پرفیکٹ شانے اچکا دیے۔ ''میرے خیال سے یہاں کارل کی زندگی کا اختتام ہوتا ہے۔ اسے جھاڑیوں میں لے جاؤ اور دفن کر دو۔ کار کی ڈکی میں ایک بیلچہ موجود ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ ختم ہو چکا ہے؟'' میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''اسے ختم ہوئے تقریباً ایک گھنٹا ہو چکا ہے۔ صبح اس کی کافی میں کچھ ملا دیا گیا تھا۔ یہی بہترین طریقہ تھا۔ بے چارہ کارل درد اور تکلیف برداشت نہیں کر سکتا تھا۔'' لوسی نے بتایا۔

میں نے وہی کیا جیسا لوسی نے کہا تھا۔

جب میں واپس کار تک پہنچا تو بُری طرح پسینے میں نہایا ہوا تھا۔

"تم بہت عمدہ جارہے ہو، ہیری۔" اس نے آہستگی سے کہا اور میرے قریب آگئی۔ مجھے پیار کرنے کے بعد وہ بولی۔ "اب کار آگے لے جاتے ہیں اور ضرورت کی ہر وہ شے جو ہمیں درکار ہے، کشتی میں پہنچا دیتے ہیں۔"

جب ہم نے کشتی میں لوڈنگ مکمل کرلی تو مجھے احساس ہوا کہ وہ کشتیوں کے بارے میں بہت معلومات رکھتی ہے۔ پھر لوسی نے ایک چابی تلاش کی جس کی مدد سے اس نے کشتی کا چھوٹا سا شیڈ کم گیراج کا دروازہ کھول لیا اور مجھ سے کہا کہ میں کار اندر لے جاؤں۔

ہر چیز کا انتظام اتنا عمدہ طریقے سے کیا گیا تھا کہ مجھے معلوم ہوگیا اگر میری جگہ کارل ہوتا تو یہ سب کچھ ہینڈل نہیں کرسکتا تھا۔ کارل نے صرف ان افراد کی خدمات حاصل کی تھیں جن سے کام لیا جاسکتا تھا... سوائے میرے!

مجھے لوسی نے تلاش کیا تھا۔

یا کوئی اور بھی تھا جو ان سب سے اوپر تھا اور ان کا باس۔ وہ جو ساحل سے دور سمندر میں کہیں لوسی کا انتظار کررہا تھا؟

لیکن ایسا نہیں ہوسکتا تھا۔ ہرگز نہیں۔ خاص طور پر لوسی کے اس التفات پر جو اس نے وہاں فارم ہاؤس میں مجھ پر کی تھی۔

میرا ذہن ان ہی بے ربط خیالوں میں الجھا ہوا تھا جب میں کار سے باہر نکلا۔ عین اسی لمحے مجھے اپنی پشت پر کسی سخت شے کی چبھن کا احساس ہوا۔

اور تب مجھے اپنے تمام سوالوں کا جواب مل گیا۔

میں محتاط انداز میں گھوم گیا۔ لوسی کا چہرہ میرے سامنے تھا۔ اس کے ہاتھ میں آٹومیٹک ریوالور دبا ہوا تھا۔ یہ ریوالور اس نے مضبوطی سے تھاما ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں معمولی سی کپکپاہٹ بھی نہیں تھی جو اس بات کا واضح پیغام تھا کہ وہ اسے استعمال کرنا بھی بہ خوبی جانتی ہے۔

"یہ وہ مقام ہے جہاں ہمارے راستے مختلف ہورہے ہیں، ہیری۔" لوسی نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ "یقین کرو یہ اس طریقے سے پلان نہیں کیا گیا تھا۔ ہر کسی کو اپنا اپنا حصہ ملنا تھا۔ لیکن جیسا کہ تم نے کہا تھا، یہ ریاضی کا ایک سیدھا سادہ کیس بنتا چلا گیا۔"

"اور اس میں اور کوئی شامل نہیں ہے؟" جب میں نے یہ بات پوچھی تو میرا مقصد وقت کا حصول ہرگز نہیں تھا۔ میں حقیقت جاننا چاہتا تھا۔ یہ سوال ہمیشہ سے میرے ذہن میں کلبلاتا رہا تھا۔

"صرف میں ہوں، ہیری۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا رہے گا کیونکہ میں، میں ہی ہوں ہیری... میں اور صرف میں۔" یہ کہہ کر اس نے ٹریگر دبا دیا۔

میں زمین پر گر گیا۔ خشک ریت کے فرش پر میرا خون تیزی سے جذب ہورہا تھا۔ لوسی نے کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے بند کردیا۔

میں نے اندازہ لگایا کہ میرے پاس دس منٹ سے بھی کم کا وقت ہے۔ میرے پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں نے بہ مشکل تمام اٹھ کر کار کا دروازہ کھول دیا۔ میرا ذہن جیسے تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔

وقت... ہر کام کے لیے وقت درکار ہوتا ہے اور میری ہر حرکت بے حد سست، محنت طلب اور تکلیف دہ تھی۔ لیکن مجھے کسی نہ کسی طور اپنا کام پورا کرنا تھا۔

مجھے کشتی کے انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ لوسی اس وقت بہت سی چیزوں کے بارے میں سوچ رہی ہوگی۔ لیکن ان میں سے کسی بات کا تعلق ہیری کارٹر سے نہیں ہوگا۔ ہیری کارٹر ایک آوارہ گرد کرائے کا فوجی تھا جو اس کی زندگی کے ایک وقفے میں کسی من موجی لہر کے مانند بہتا ہوا آیا اور نکل گیا۔

میں نے کسی نہ کسی طرح دروازے کو نصف کھول دیا اور سب کچھ سیٹ کردیا۔ میرے پاس صرف ایک شاٹ باقی بچا تھا۔ بزوکا ایک ٹن اور راکٹ آدھا ٹن وزنی محسوس ہورہے تھے۔

وہ کشتی اب میری نظروں کے سامنے تھی۔ وہ جیٹی سے تقریباً چار سو میٹر کی دوری پر پہنچ چکی تھی۔ یہ ایک اچھا خاصا دور مار نشانہ تھا۔

میں نے بزوکا کا بٹن دبا دیا۔

راکٹ ایک زناٹے کے ساتھ روانہ ہوگیا جیسے کوئی گائیڈڈ میزائل ہو۔

میں نے اسے نشانے کو ہٹ کرتے ہوئے دیکھا۔

ایک لمحے قبل وہ تیز رفتار کشتی پانی کی سطح پر تھی۔ دوسرے لمحے وہاں کچھ نہیں تھا۔ کچھ بھی نہیں ماسوائے خوف زدہ آبی پرندوں کے جو اوپر فضا میں چیخیں مار رہے تھے۔

تب میں خود کو بہتر محسوس کرنے لگا۔ حتیٰ کہ میرے پیٹ کا درد بھی تیزی سے معدوم ہورہا تھا۔

اور پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

غرض بے غرض

بابر نعیم

جعل سازی اور فراڈ ذہین افراد کا پیشہ ہے... وہ بے روزگار تھے... اور برسرِروزگار کی جیبوں سے رقم نکلوانے کا فن بخوبی جانتے تھے... اپنے مفادات کی خاطر سودوں کو منافع بخش رنگ دینے والے رنگ سازوں کی حیلہ سازی...

ان افراد کی انسانیت پسندی جو بیک وقت ظالم اور مظلوم سے ہم آہنگ تھے

جونز اور ایکن، سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو میں بیٹھے ہوئے تھے جو کونی کارسن کی ملکیت تھی۔ ایکن اب بھی کونی کے لیے کام کرتا ہے اور اس کا تنخواہ دار ملازم ہے جبکہ جونز چالیس سال سے زیادہ عرصے تک خدمات انجام دینے کے بعد اب ریٹائر ہو چکا ہے۔ اس نے بطور کنٹریکٹر کارسن کے لیے اکثر و بیشتر ناقابلِ یقین کارنامے انجام دیے اور اب بھی کبھی کبھی ایکن کی مدد کرتا رہتا ہے۔ ایکن نے دس منٹ پہلے اسے کیفے اروما نامی کافی شاپ سے لیا تھا جہاں وہ گزشتہ برس

ریٹائر ہونے کے بعد صبح کا زیادہ حصہ گزارتا ہے۔

''ہم یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' جونز نے پوچھا۔

''مسٹر کارسن نے ایک کام کے سلسلے میں ہمیں بلایا ہے۔''

جونز ناراض ہوتے ہوئے بولا۔ ''میں عام طور پر کام کے سلسلے میں لوگوں سے براہِ راست ملنا پسند نہیں کرتا۔''

''جانتا ہوں۔'' ایکن قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اس کا شمار لوگوں میں نہیں ہوتا۔ وہ مسٹر کارسن کی آنٹی ہے۔ آنٹی آئرین اور کارسن کا کہنا ہے کہ تم اسے جانتے ہو۔'' پھر اس نے بیک مرر میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ابھی تمہاری سمجھ میں ساری بات آجائے گی۔''

ایک اور سیاہ رنگ کی بی ایم ڈبلیو ان کے پاس سے گزری اور موڑ کاٹ کر ایک سرخ اینٹوں والے مکان کے ڈرائیو وے میں داخل ہوگئی۔ ڈرائیور نے باہر نکل کر گرد و نواح کا جائزہ لیا اور پچھلی نشست کا دروازہ کھول دیا۔ کوئی کارسن باہر نکلا۔ اسے دیکھتے ہی دو باتیں ذہن میں آتی تھیں۔ پہلی تو یہ کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے۔ اس کے پاس بہت سی کاریں، مکانات، کپڑے اور دیگر آسائشیں ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ بہت طاقتور ہے بلکہ اس کے ہر انداز سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ جونز اور ایکن نے سڑک پار کی اور اس کے قریب پہنچ گئے۔ کارسن انہیں دیکھ کر مسکرایا اور جونز سے بولا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ آنٹی تم سے دوبارہ ملاقات کی خواہش مند ہیں۔''

آنٹی آئرین اس کے باپ کی سب سے چھوٹی بہن تھی۔ اس کی شادی 1953ء میں جوزف ایرون سے ہوئی۔ اس وقت وہ صرف انیس برس کی تھی۔ جوزف اس سے بارہ سال بڑا تھا۔ وہ ایک مضبوط جسامت والا شخص تھا اور ہمیشہ اپنے سے زیادہ طاقتور لوگوں سے الجھتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ اسے ہر کام میں سب سے زیادہ حصہ دیا جائے پھر وہ اپنے ہی دو ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا جنہوں نے اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا تھا۔

ستر کی دہائی شروع ہو چکی تھی اور کوئی کارسن بفیلو میں اپنے قدم جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ انہی دنوں کارسن نے پہلی بار جونز کو بلایا تاکہ وہ شہر میں اس کی حکمرانی قائم کرنے میں مدد کر سکے۔ جونز جانتا تھا کہ جوزف کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ اپنے دوستوں اور وفاداروں کا اندازہ نہ لگا سکا اور اس نے لوگوں کو خوش کرنے کے بجائے انہیں ناراض کیا۔ اسی لیے جونز اس کے مرنے پر حیران تھا اور نہ ہی افسردہ اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

یہ کہنا مشکل ہے کہ اس کی موت سے آئرین کتنی متاثر ہوئی۔ اس نے جوزف کی بچائی ہوئی دولت اور وہ پیسے جو انشورنس وغیرہ کی مد میں اسے ملے تھے، سمیٹے اور اپنے راستے پر چل دی۔ اس نے اپنی زبان بند رکھی اور کوئی واویلا نہیں مچایا۔ جونز تقریباً دو ہفتے اس کے ساتھ رہا جب کارسن مالی معاملات طے کرنے کے لیے متعلقہ لوگوں سے بات چیت کر رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے ایک بار پھر دو ہفتے آئرین کے ساتھ گزارے تاکہ اسے اپنے معاملات نمٹانے میں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جونز کو وہ عورت پسند آئی تھی۔ وہ دوستانہ انداز میں گفتگو کرتی تھی۔ اسی نے جونز کو مستقبل کے بارے میں سوچنے اور اپنا سرمایہ کسی محفوظ جگہ لگانے پر مجبور کیا۔ اسی کی وجہ سے وہ کتابوں، تھیٹر اور فلموں میں دلچسپی لینے لگا۔ لیکن اب وہ اسے چالیس سال بعد دیکھ رہا تھا۔

''جونز۔'' آئرین نے کہا۔ ''تم اب بھی پہلے جیسے ہی نظر آرہے ہو۔ سوائے اس کے کہ تمہارے بال چھوٹے ہو گئے ہیں۔ چہرہ دبلا اور شاید آنکھوں میں کچھ نرمی آگئی ہے۔''

اس بات پر جونز نے زوردار قہقہہ لگایا۔ آئرین نے ایکن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتے ہو، اس نے مشکل وقت میں میرا ساتھ دیا اور ایک مہینے تک میرے پاس بیٹھ کر مشورے دیے۔''

''اب یہ میرے ساتھ بیٹھتا ہے۔'' ایکن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

آئرین نے جونز کو بتایا۔ ''یہ بہت چھوٹا تھا جب اپنے دادا کے ساتھ یہاں آیا کرتا تھا۔ تم لوگ کافی پیو گے؟''

وہ انہیں لے کر کچن میں آگئی جو بہت خوب صورت اور جدید انداز میں بنایا گیا تھا۔ ایکن نے کپ بورڈز میں سے چار پیالیاں اور فریج میں سے کریم نکالی۔ کارسن اور جونز کے لیے بلیک اور آنٹی کے لیے کریم والی کافی بنائی۔ اسی اثنا میں عقبی دروازہ کھلا اور تقریباً آئرین ہی کی ہم عمر عورت اندر داخل ہوئی۔

''آجاؤ۔'' آئرین اسے دیکھ کر بولی۔ ''یہ ہیلن گریسی ہے۔'' اس نے تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

ہیلن چھوٹے قد اور چھوٹے بالوں والی عورت تھی اور اس کے چہرے پر ایک اطمینان بھری مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ ایکن نے اس کے لیے بھی بلیک کافی بنائی۔ کارسن نے اپنا بھاری ہاتھ میز پر مارتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو، ہم یہاں کس لیے آئے ہیں۔ یہ دونوں شاید تمہاری مدد کر سکیں۔''

جونز کے سوا وہاں بیٹھے ہوئے سب لوگوں نے گردن ہلا دی۔ کارسن نے کہا۔ ''ہمیں پوری بات بتاؤ۔''

''یہ تھوڑی سی پیچیدہ کہانی ہے۔'' آئرین نے کہا۔

آئرین اور ہیلن ہفتے میں دو اور بعض اوقات تین مرتبہ ملاقات کیا کرتی تھیں۔ اس گروپ میں اور بھی عورتیں شامل ہوگئی تھیں جسے انہوں نے کلب کا نام دے رکھا تھا۔ وہ باری باری ایک دوسرے کے گھر جاتیں۔ تاش کھیلتیں اور آپس میں ہنسی مذاق کرتیں۔ بعض اوقات وہ کھانا کھانے باہر چلی جاتیں یا کسی کیسینو میں وقت گزارتی تھیں۔

''ہمارے گروپ میں ہر طرح کی عورتیں ہیں۔'' آئرین نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے قدامت پسند اور لبرل۔'' ہیلن نے وضاحت کی۔ ''لیکن سیاست پر کوئی بات نہیں ہوتی۔''

''ہماری یہی کوشش ہوتی ہے۔'' آئرن نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن بعض اوقات ایسا کرنا پڑتا ہے جیسے مسز باروے۔''

''یہ مسز لوسی باروے کے بارے میں بات کررہی ہے۔''

''میں اسے مسز باروے ہی کہتی ہوں۔'' آئرین نے کہا۔ کیونکہ اس نے اپنا یہی تعارف کروایا تھا۔''

''یہ بھی اس کا ایک انداز ہے۔'' ہیلن نے کہا۔ ''ورنہ وہ اندر سے بہت اچھی ہے۔''

''نہیں۔'' آئرین بولی۔ ''وہ اندر اور باہر سے ایک جیسی ہے۔ بدمزاج اور تنگ ذہن، میری تو خواہش ہے کہ اسے کلب سے نکال دیا جائے۔''

''ضروری نہیں کہ سب لوگ تم سے اس نکتے پر متفق ہوں۔''

''یہ میں اس لیے کہہ رہی ہوں کہ وہ سیاست پر بات کرتی ہے۔ اس کے پسندیدہ موضوعات اوباما کیئر، ٹیکس، مالیاتی خسارہ اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔''

''ہاں، اس طرح وہ ہمارے کلب میں تفریق پیدا کر سکتی ہے۔''

کارسن نے کھنکھارتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں اصل موضوع کی طرف آنا چاہیے۔''

''اوہ، ہاں۔'' آئرین سنبھلتے ہوئے بولی۔ ''لوسی کا شوہر ہیرالڈ باروے گزشتہ مہینے چل بسا اور لوسی کے لیے اچھی خاصی رقم چھوڑ گیا لیکن اس کے حصول میں اتنی پیچیدگیاں تھیں کہ وہ تقریباً پاگل ہوگئی۔''

''وہ خوف زدہ ہے۔'' ہیلن نے کہا۔

''کیونکہ حکومت اس کی تمام دولت چھین لینا چاہتی ہے۔'' آئرین نے کہا۔

''ہماری ساری دولت۔'' ہیلن بولی۔ ''ہیرالڈ نے اسے بتایا تھا کہ لبرل اس ملک کو سوشلسٹ ریاست میں تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔''

''ہونہہ، سوشلسٹ ریاست۔'' آئرین طنزیہ انداز میں بولی۔

''ٹھیک ہے۔'' کارسن نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں مختصراً بتاؤ۔ پھر کیا ہوا؟''

''ہیرالڈ کو مرے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ لوسی کو ایک فون کال موصول ہوئی۔ بولنے والی نے اپنا تعلق ایک ایسے گروپ سے بتایا جو بزرگ شہریوں کے مالی مفادات کا تحفظ کرتی ہے۔ فون کرنے والی نے لوسی کو متنبہ کیا کہ اس کی دولت کا بڑا حصہ انتظامی اخراجات، ڈیتھ فیس اور دیگر کارروائیوں میں صرف ہو جائے گا اور بقیہ رقم پر اسے بھاری ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔''

''اوہ میرے خدا۔'' ہیلن نے اپنے گالوں پر ہاتھ مارتے ہوئے لوسی کی نقل اتاری۔ ''یہ کیسی حکومت ہے جو میری ساری دولت چھین لینا چاہتی ہے۔''

آئرین قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''یہ مذاق کی بات نہیں ہے۔''

''نہیں، بالکل نہیں۔ لیکن تم جانتی ہو کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ لوسی نے انہیں وہ سب کچھ بتا دیا جس سے وہ خوف زدہ تھی۔ فون کرنے والی نے اسے بتایا کہ اس کی ایجنسی لوسی کی دولت کا تحفظ کر سکتی ہے۔ وہ اسے ایسے طریقے بتائیں گے جس سے اس کے ٹیکس کا بوجھ کم ہو جائے اور اس کے لیے معقول ہیلتھ انشورنس کا بندوبست بھی ہو جائے۔''

کارسن نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ ''اب معاملہ کہاں تک پہنچا؟''

''لوسی نے انہیں اپنا ایک اکاؤنٹ نمبر دے دیا اور انہوں نے اس میں سے ساری رقم نکال لی جو تقریباً تین لاکھ ڈالر تھی۔ اب لوسی ہر ایک سے یہی کہہ رہی ہے کہ یہ لوگ اس کی رقم کا تحفظ کررہے ہیں اور انہوں نے اسے ایک محفوظ جگہ پر منتقل کر دیا ہے۔ اب وہ دوسرے اکاؤنٹس، سرمایہ کاری، اسٹاکس، بونڈز اور انشورنس پالیسیوں کے بارے میں بھی پوچھ رہے ہیں۔''

اس سے بھی زیادہ بری بات جس نے آئرین اور ہیلن

کو بھی پریشان کر دیا۔ وہ یہ تھی کہ لوسی نے اس نام نہاد ایجنسی کو اپنے دوستوں اور کلب کے دوسرے ممبروں کے بارے میں بھی بتا دیا۔ اس نے انہیں ان لوگوں کے نام، پتے اور فون نمبر دے دیے اور یہ بھی بتا دیا کہ اس کے اندازے کے مطابق ان میں سے ہر ایک کے پاس کتنی دولت ہوگی اور ان کے بچے کہاں رہتے ہیں۔

''اب ہم سب کو فون کال موصول ہو رہی ہیں۔'' ہیلن نے کہا۔ ''وہ اتنے اعتماد سے بات کرتے ہیں کہ لوگ بہ آسانی ان پر اعتبار کر لیتے ہیں۔''

''بوڑھے لوگ ویسے بھی بہت معصوم ہوتے ہیں۔ وہ فون کال سن کر ہی ان پر یقین کر لیتے ہیں۔''

''ان لوگوں میں قائل کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔'' ایکن نے کہا۔ ''وہ تیز تیز بولتے اور لوگوں کے جواب توجہ سے سنتے ہیں اور پھر اپنے گاہکوں سے کھیلتے ہیں۔''

''بے چاری لوسی!'' ہیلن نے ہمدردی سے کہا۔

''اسے بے چاری مت کہو۔'' آئرین نے جل کر کہا۔ ''اسے تو یہ بھی پروا نہیں کہ اس کی کتنی رقم چلی گئی ہے۔''

جونز کی سمجھ میں ساری بات آ گئی تھی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ ''تم لوگوں کو ٹیلی فون کال وصول ہو رہی ہیں تو اس کی اطلاع پولیس کو دو اور اس عورت لوسی کو اپنے کلب سے نکال دو۔''

آئرین نے اسے سختی سے گھورا۔ کارسن نے بھی اس کی تقلید کی۔ جونز سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''تم لوگ کیا چاہتے ہو، ہم کیا کریں؟''

ہیلن کے پاس اس کا کوئی واضح جواب نہیں تھا۔ لیکن آئرین جانتی تھی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ اس کی خواہش تھی کہ کوئی کارسن اس معاملے کو دیکھے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کا بھتیجا کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اس کے پاس پولیس سے زیادہ ذرائع ہیں۔ وہ چاہتی تھی کہ لوسی کی رقم واپس مل جائے حالانکہ لوسی کو پیسوں کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ وہ فراڈیے کلب کے دوسرے ممبران کو فون کرنا بند کر دیں اور لوسی بھی انہیں ہر ایک کے بارے میں ذاتی معلومات فراہم نہ کرے۔

''اس کے علاوہ میں چاہتی ہوں کہ ہیلن ابھی اور اسی وقت فون کر کے لوسی کو یہاں بلائے اور تم لوگ اس سے براہِ راست بات کرو۔ میں لوسی کو پہلے ہی بتا چکی ہوں کہ ان فون کالز سے پریشان ہو کر میں نے چند سراغ رسانوں سے رابطہ کیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ یہ دونوں اس سے بات کر سکتے ہیں۔'' کارسن نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ایک ضروری کام سے جانا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ جونز اور ایکن بھی اس کے ساتھ دروازے تک گئے۔ ہیلن نے فون اٹھایا اور لوسی کا نمبر ملانے لگی۔ کارسن نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور ایکن کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ''اس پر وہ نمبر درج ہے جس سے ٹیلی فون کالز آ رہی ہیں۔ اس نمبر کا ایریا کوڈ 585 تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ نمبر روچیسٹر کا نہیں ہے لیکن وہ سب لوکل کالز تھیں جو زیادہ تر لی مین ایونیو سے کی گئی تھیں۔

جونز نے کہا۔ ''میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔ ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟''

''آئرین نے جو کہا وہی کرو۔'' کارسن بولا۔ ''اس کاغذ کو سنبھال کر رکھنا۔''

اس کے جانے کے بعد جونز بولا۔ ''یہ ایک دلچسپ کام ہوگا۔''

''ہاں۔'' ایکن نے کہا۔ ''تم تو ریٹائرمنٹ کے بعد ویسے بھی اس طرح کے کام کرتے رہتے ہو جیسے لولے لنگڑے، اپاہج، معذور اور بوڑھے لوگوں کی مدد کرنا۔''

''لیکن یہ دونوں عورتیں معذور یا ضعیف نہیں ہیں۔'' جونز نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ دونوں اندر واپس آئے اور چند لمحوں بعد ہی لوسی نے دروازے پر لگی اطلاعی گھنٹی بجائی۔ ہیلن دروازے پر گئی اور اسے اپنے ساتھ لاتے ہوئے بولی۔ ''یہ دونوں سراغ رساں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

ایکن اسے دیکھ کر تعظیماً کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام ایزرا لوئیس ہے اور یہ میرا ساتھی ٹام ایلیٹ ہے۔''

جونز نے بھی تعظیماً سر ہلایا لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں اٹھا البتہ اپنا فرضی نام سن کر اس کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔

''میرا نام مسز ہارو ہے۔'' لوسی نے اخلاقاً ایکن کا ہاتھ تھامتے ہوئے جونز کی طرف دیکھا پھر آئرین اور ہیلن کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں جانتی کہ انہیں کیا بتاؤں۔''

ہیلن نے جواب دینا چاہا لیکن اس سے پہلے ایکن بول پڑا۔ ''ہم ایسے بزرگ شہریوں سے رابطہ کر رہے ہیں

جنہیں بن مانگی کالز موصول ہو رہی ہیں اور ہم اس سلسلے میں یقین کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا تعلق سی اے پی اے نامی تنظیم سے ہے جو شہریوں کے مالی معاملات میں حکومت کی مداخلت کو کم سے کم کرتی ہے۔''

جونز بڑے غور سے ایکن کی تقریر سُن رہا تھا۔ اس کے لیے اپنا قہقہہ روکنا مشکل ہو گیا۔ ایکن اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''اس سلسلے میں ہم اس ایجنسی کے بارے میں بھی معلومات حاصل کر رہے ہیں جس نے پہلے تم سے اور پھر تمہارے دوستوں سے رابطہ کیا۔''

لوسی بولی۔ ''میں تو صرف......''

ایکن نے اس کی بات کاٹ دی اور بولا۔ ''ہم کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرنا چاہتے... بلکہ صرف یہ تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ وہ صحیح لوگ ہیں اور شہریوں کے تحفظ کے لیے جو قوانین بنائے گئے ہیں، ان کے مطابق کام کر رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، تم اپنا کام جاری رکھو۔'' لوسی نے کہا۔ ''میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔''

''ہمیں پوری بات بتا دو۔'' ایکن نے کہا۔

لوسی نے بتایا کہ شوہر کے انتقال کے ایک ہفتے بعد ہی اسے ایک عورت کی جانب سے ایک کال موصول ہوئی جسے اس کے کیس پر مامور کیا گیا تھا۔

''کیسا کیس؟'' جونز نے پوچھا۔

''وہ جاننا چاہ رہے تھے کہ شوہر کی وفات کے بعد مجھے ملنے والی کوریج میں کوئی رکاوٹ تو نہیں۔ مثلاً میڈیکل، سوشل سیکیورٹی، بینکنگ وغیرہ۔ کیونکہ شوہر کی وفات کے بعد کچھ ایسے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں جن کے لیے بہت دوڑ دھوپ کرنا پڑتی ہے، پھر دفتری کارروائیوں میں اتنی تاخیر ہو جاتی ہے جن کی وجہ سے بینک اکاؤنٹ غیر معینہ عرصے کے لیے منجمد ہو جاتے ہیں پھر وکیلوں کی خدمات حاصل کرنا ہوتی ہیں اور یہ معاملہ مہینوں بلکہ سالوں کے لیے لٹک جاتا ہے۔ میں اس بارے میں تھوڑا بہت جانتی تھی اور میرے شوہر نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا۔''

''کس بارے میں؟'' ایکن نے پوچھا۔

لوسی نے ایک گہری سانس لی اور جونز کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''اس نے مجھے اوباما کیئر کے بارے میں بتایا تھا اور جب میں نے اس عورت سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ بولی کہ میری پریشانی بالکل جائز ہے۔ حکومت میری رقم پر بھاری ٹیکس لگا دے گی اور ایک ڈاکٹر کے ذریعے میرا طبی معائنہ کروایا جائے گا۔ مجھے اس معاملے میں بولنے کی

اجازت نہیں ہوگی اور کارروائی مکمل ہونے تک یہ رقم مجھے نہیں ملے گی۔"

"پھر اس نے تمہیں کیا مشورہ دیا؟" ایکن نے پوچھا۔

لوسی نے ایک بار پھر جونز کی طرف دیکھا اور بولی۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ اس نے میرے سارے خدشات دور کردیے اور اس سے بات کر کے مجھے بہت سکون ملا۔"

"اس نے تمہارے لیے کیا کیا؟" ایکن نے پوچھا۔

"اس نے میری تمام رقم ایک محفوظ جگہ منتقل کردی اور یہ سب قانونی طریقے سے ہوا۔ اس طرح میرے اثاثے حکومت سے محفوظ ہو گئے۔ میں جانتی ہوں کہ آئرین اور ہیلن مجھ سے متفق نہیں ہیں لیکن کلب کے دوسرے لوگ یہ جان کر مطمئن ہیں کہ ان کی مدد کرنے کے لیے کوئی ایجنسی موجود ہے۔"

جونز نے کہا۔ "ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ تم نے اپنے دوستوں کے بارے میں اس عورت کو معلومات فراہم کر کے قانون کی خلاف ورزی تو نہیں کی۔"

"ایسا کوئی قانون نہیں ہے جو ہمیں لوگوں کی مدد کرنے سے روکتا ہو۔" لوسی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"جب تک عدالت تمہیں حکم نہ دے، تم کسی شخص کی ذاتی معلومات دوسرے لوگوں کو فراہم نہیں کرسکتیں۔" جونز نے کہا۔ "دوسری بات یہ کہ تم نے الیکشن میں ووٹ دیا تھا؟"

"ہاں۔" لوسی نے جواب دیا۔

"ایسی صورت میں تمہیں شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں۔" جونز نے کہا۔ "ووٹ دینے کے بعد تم اس نظام کا حصہ بن گئی ہو۔ محض اس بنیاد پر حکومت کی مخالفت کرنا ٹھیک نہیں کہ تمہارا امیدوار الیکشن میں کامیاب نہیں ہوسکا۔" لوسی نے منہ کھولا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ جونز اس کی پریشانی بھانپتے ہوئے بولا۔

"میری آخری بات غور سے سن لو، اب تمہیں کسی بھی اجنبی سے اپنے پڑوسیوں اور دوستوں کے بارے میں بات کرنے کی ضرورت نہیں۔"

☆☆☆

آئرین کے گھر سے نکلنے کے بعد جونز نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ مجھے واپس کافی شاپ جانا چاہیے۔"

ایکن نے جیب سے وہ کاغذ نکالا جو کارسن نے اسے دیا تھا اور بولا۔ "کیوں نا ہم ایک کوشش کر دیکھیں، ممکن ہے اس عورت سے بات کرنے کا موقع مل جائے۔"

جونز نے تائید میں سر ہلا دیا۔ ایکن جانتا تھا کہ لی مین ایونیو کہاں ہے لیکن اس نے اپنے آئی فون کے ذریعے سری سے مدد چاہی تا کہ وہ مطلوبہ جگہ تک پہنچ سکیں۔ یہ ایپل والوں کا سوفٹ ویئر ہے جو صارف کی رہنمائی کرتا ہے۔ سری کی ہدایات کے مطابق وہ لی مین اسٹریٹ پر واقع اس مکان تک پہنچ گئے۔ ایکن نے جیب سے وہ کاغذ نکالا جو کارسن نے اسے دیا تھا اور اس پر لکھے ہوئے مندرجات کا خلاصہ جونز کو بتانے لگا۔

"یہ سیل نمبر ونسنٹ ویئر نامی شخص کے نام پر ہے جس کا پتا بھی روچیسٹر کا ہے لیکن اس فون کے ذریعے کالز یہاں سے ہو رہی ہیں۔" اس نے مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس مکان کے مالک کا نام پال برزینگی ہے اور یہ کرائے پر دیا گیا ہے۔ اس وقت 38 سالہ رچرڈ بلانٹ جو پیشے کے لحاظ سے ڈرائیور ہے۔ وہ اور اس کی 24 سالہ بیوی سوندرا موسلی اس مکان میں رہ رہے ہیں۔"

اس نے بی ایم ڈبلیو کار اس آف وہائٹ مکان کے سامنے روکی اور جونز سے بولا۔ "اب کیا ارادہ ہے؟"

"یہاں تک آئے ہیں تو اس کے مکینوں سے مل کر ہی جائیں گے۔"

ایکن کار سے مکان کے بیرونی دروازے تک پہنچا اور گھنٹی بجادی۔ جونز اس سے کچھ فاصلے پر ایسی جگہ کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ بیرونی اور بغلی دروازوں پر نظر رکھ سکے۔ تیسری مرتبہ گھنٹی بجانے پر ایک عورت آئی۔ وہ دبلی پتلی ہلکے رنگ کی سیاہ فام عورت تھی۔ اس نے بلیو جینز اور سرخ ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی گود میں ایک بچہ تھا جبکہ دو بچے اس کی ٹانگوں سے لپٹے ہوئے تھے۔ وہ عورت اسکرین ڈور کے پیچھے کھڑی سوالیہ نگاہوں سے ایکن کو دیکھتی رہی لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔

ایکن نے کہا۔ "سوندرا موسلی؟"

اس عورت نے لمحہ بھر کے لیے ایکن کو دیکھا پھر اس کی نظریں جونز پر گئیں پھر وہ ایکن سے بولی۔ "تم غلط جگہ آئے ہو۔"

"اچھا۔" ایکن نے حیران ہوتے ہوئے کہا پھر اس نے اپنا سیل فون نکال کر ایک نمبر ڈائل کیا اور عورت کی جیب میں رکھا ہوا فون بجنے لگا۔ اس عورت نے حیرانی کے عالم میں پوچھا۔ "کیا چاہتے ہو؟"

ایکن کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ جونز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ میرے ڈیڈی ہیں اور

تم دیکھ سکتی ہو کہ کتنے بوڑھے ہو چکے ہیں۔ میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں کہ ان کی دولت کس طرح حکومت سے بچائی جاسکتی ہے۔''

سوندرا نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور دروازہ کھول دیا۔ وہ دونوں تیزی سے لیونگ روم میں داخل ہو گئے۔ وہ کمرا بہت صاف ستھرا اور روشن تھا۔ ایک دیوار پر بڑا سا۔۔ ٹی وی آویزاں تھا جبکہ اس کے نیچے باکس میں ڈی وی ڈی، دو ہیڈ فون سیٹ اور دو بڑے اسپیکر رکھے ہوئے تھے۔ ایکن نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''اچھی جگہ ہے۔''

سوندرا نے اپنے دونوں بچوں سے کہا۔ ''تم لوگ... ٹی وی دیکھو جب تک میں ان لوگوں سے بات کرتی ہوں۔'' پھر وہ ایکن اور جونز سے بولی۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ انہیں دوسرے کمرے میں لے گئی اور چھوٹے بچے کو کھلونوں کے پاس بٹھا کر بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ تم پولیس والے نہیں ہو ورنہ وردی میں ہوتے اور باہر دس گاڑیاں کھڑی ہوتیں۔''

ایکن سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''دراصل ہم پولیس سے بھی زیادہ بُرے ہیں۔''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا اور گزر گیا۔ ایکن نے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ ہم کیا بات کرنے آئے ہیں۔ بہتر ہے کہ تم خود ہی سب کچھ بتا دو۔''

''کیا بتا دوں؟'' اس نے کرسی کی پشت سے کمر لگاتے ہوئے کہا۔

ایکن اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''اگر تم نہیں بتاؤ گی تو ہمیں دوسرے طریقے بھی آتے ہیں۔''

سوندرا نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔ ''تم لوگ کون ہو؟''

''بے وقوف لڑکی۔'' ایکن نے کہا۔ ''وقت ضائع کرنے کے بجائے ہمیں سب کچھ بتا دو۔ ایک ایک بات۔''

''میں تمہیں ہر بات نہیں بتا سکتی کیونکہ مجھے خود بھی بہت سی باتیں معلوم نہیں۔''

''اس سے تمہارا کیا مطلب ہے؟'' ایکن نے پوچھا۔

''بے وقوف انسان۔'' وہ ایکن کی نقل اتارتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اکیلی عورت یہ سب کچھ کر سکتی ہوں۔''

جونز نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ''چلو ہم لوسی بارووے سے شروع کرتے ہیں۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جس طرح تم ہم سے بات کر رہی ہو، اگر تم نے اس سے بھی اسی انداز میں گفتگو کی ہوگی تو وہ تم سے کیونکر بات کرنے پر تیار ہو گئی؟''

سوندرا نے کہا۔ ''میں نہیں جانتی کہ تم میرے بارے میں کچھ کہہ رہے ہو یا لوسی کے۔''

''ایکن نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ''مس موسلے! میرے ساتھی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لوسی کبھی بھی کسی سیاہ فام عورت کو اپنا اکاؤنٹ نمبر دینے پر تیار نہ ہوتی۔''

سوندرا نے بتایا کہ اس کے تینوں بچے تین مختلف مردوں سے ہیں۔ اسے پیسوں کی ضرورت ہے۔ وہ مساج تھراپی کا کورس کر رہی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ ایک اچھا پیشہ ہے اور وہ گھر میں رہ کر بھی یہ کام کر سکتی ہے لیکن حال ہی میں جس شخص کے ساتھ رہ رہی تھی، وہ بھی اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

''رچرڈ بلانٹ؟'' ایکن نے پوچھا۔ کارسن نے جو کاغذ اسے دیا، اس پر یہی نام لکھا ہوا تھا۔

سوندرا نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے کبھی راک سنگر رابرٹ بلانٹ کا نام سنا ہے۔ وہ سفید فام شخص جب ملا تو اس نے یہی بتایا کہ وہ رابرٹ بلانٹ کا بیٹا اور بہت امیر کبیر شخص ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہم بہت جلد لندن چلے جائیں گے اور اس کے باپ کے محل میں رہائش اختیار کر لیں گے۔ میں اس کی باتوں میں آ گئی حالانکہ وہ یہاں لانڈری ٹرک چلا رہا تھا۔''

اس نے بتایا کہ بچے کی پیدائش کے بعد رچرڈ بلانٹ اسے چھوڑ کر چلا گیا اور اسے مساج تھراپی اسکول چھوڑنا پڑ گیا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ اس کے پاس فیس دینے کے لیے پیسے نہیں تھے اور دوسرے یہ کہ گھر میں کوئی ایسا فرد نہیں تھا جو اس کی غیر موجودگی میں بچوں کی دیکھ بھال کرتا پھر ایک روز میری ملاقات گیلیر یا مال میں ایک اور شخص سے ہوئی۔ میں بچوں کو گھمانے کے لیے وہاں لے گئی تھی۔ بچے آئس کریم کھا رہے تھے۔ میں ستانے کے لیے ایک بینچ پر بیٹھ گئی۔ تبھی وہ میرے پاس آیا۔ دیکھنے میں خاصا معقول لگ رہا تھا۔ پھر ہم باتیں کرنے لگے۔ اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اور اس کے دوست یہ کام شروع کر رہے ہیں اگر ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں تو مجھے بھی کچھ آمدنی ہو سکتی ہے۔ مجھے اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آئی اور میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔''

ان دونوں آدمیوں نے سوندرا کو ان لوگوں کے نام، پتے، فون نمبر اور دیگر تفصیلات سے آگاہ کر دیا جن کا حال

ی میں انتقال ہوا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے انٹرنیٹ سے مزید معلومات حاصل کیں جن میں بینک اور انشورنس کمپنیوں کے نام شامل تھے۔ بعض اوقات وہ مختلف اکاؤنٹس اور انشورنس پالیسی کی مالیت کی تفصیلات بھی فراہم کرتے تھے لیکن وہ نہیں جانتی کہ انہیں یہ معلومات کس طرح ملتی تھیں۔

سوندرا نے بتایا کہ اس کا کام صرف لوگوں کو فون کرنا، ان سے باتیں کرنا اور انہیں ان خطرات سے آگاہ کرنا تھا جو رقم کو محفوظ رکھنے کے لیے احتیاطی تدابیر اختیار نہ کرنے کی صورت میں ہو سکتے تھے۔

''میرے لیے یہ بہت آسان تھا۔'' اس نے کہا۔ ''میں لوگوں سے باتوں باتوں میں وہ سب اگلوا لیتی تھی جس کا جاننا ہمارے لیے ضروری تھا۔ خاص طور پر وہ جس بات سے خوف زدہ تھے۔ وہ ان کا ڈر تھا۔ میں نے جس سے بھی بات کی، وہ حکومت سے خوف زدہ تھا۔ اسے حکومت کی پالیسیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ سب اپنے پیسے کا تحفظ چاہ رہے تھے۔''

''اور تم نے انہیں قائل کر لیا کہ ان کی مدد کر سکتی ہو۔''

''مجھے انہیں قائل نہیں کرنا تھا بس ان سے باتیں کرنا تھیں، وہ خود ہی مجھے سب کچھ بتا دیتے تھے پھر میں ان سے کہتی کہ ہم کیا مدد کر سکتے ہیں۔''

''تمہیں اس کام کے کتنے پیسے ملتے تھے؟'' ایکن نے پوچھا۔

''وہ مجھے ایک نام اور فون نمبر کے علاوہ پانچ سو ڈالر دیتے تاکہ میں ان لوگوں کو فون کروں۔ عام طور پر مجھے پانچ چھ مرتبہ فون کرنا ہوتا تھا۔''

''ہوں۔'' ایکن نے ہنکارا بھرا۔ ''تو تمہیں صرف پانچ سو ڈالر ملتے ہیں؟''

''جب مکمل معلومات حاصل کر لیتی تو پانچ سو ڈالر مزید ملتے اور پیسے منتقل ہونے کے بعد میرے حصے میں کل رقم کا دس فیصد آتا ہے۔''

''تمہیں ان لوگوں پر بھروسا ہے کہ وہ تمہارا حصہ دیتے رہیں گے۔''

''اس کی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ جب میں کسی کو فون کرتی ہوں تو پتا ہوتا ہے کہ اس سے کتنے پیسے ملیں گے۔ اب بھی پرانے کام کے بیس ہزار ڈالر باقی ہیں۔ اس کے علاوہ لوسی سے جو رقم ملی ہے اس کے بھی تیس ہزار ڈالر ملیں گے۔ اب بھی اس کے پاس بہت پیسا ہے جس کے بارے میں معلومات درکار ہیں۔ اس نے مجھے دوسرے لوگوں کے نام پتے بھی دیے ہیں جنہیں میں نے فون کرنا شروع کر دیے ہیں۔''

سوندرا لمحے بھر کے لیے رکی پھر بولی۔ ''مجھے اپنے حصے کی فکر نہیں ہے کیونکہ میں سب جانتی ہوں اور ان لوگوں کو بھی پتا ہے کہ انہیں میرے ساتھ مل کر کام کرنا ہے۔ اس لیے وہ مجھ سے بے ایمانی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''کیا تم ان لوگوں کے نام بتاؤ گی جنہوں نے تمہیں اس کام میں شامل کیا؟''

''ڈیوس، یہ وہ شخص ہے جو مجھے مال میں ملا تھا اور دوسرا...'' وہ اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کا نام یوشی ہے۔ ڈیوس اسے اسی نام سے بلاتا ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ اس کا امریکی نام ایلوس ہے۔ میں نے سنا ہے کہ وہ بھی اچھا گلوکار ہے۔''

جونز نے کہا۔ ''ہم ان لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''ہم ان تک کس طرح پہنچ پائیں گے؟'' ایکن نے پوچھا۔

سوندرا سوچ میں پڑ گئی اور بولی۔ ''اگر انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے تمہیں ان کے بارے میں بتایا ہے تو میرے لیے مسئلہ ہو جائے گا۔''

ایکن کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد بولا۔ ''میں سمجھتا ہوں لیکن فی الحال تم ہی یہ مسئلہ حل کر سکتی ہو۔ ہمارا ڈیوس اور ایلوس سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''میں تمہیں ان لوگوں کے فون نمبر دیتی ہوں۔'' سوندرا نے بے بسی سے کہا۔ ''اس کے علاوہ انہیں تلاش کرنے کا کوئی طریقہ نہیں۔''

''ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔'' جونز نے کہا۔ ''تم ابھی انہیں فون کر کے کہو کہ کچھ لوگ پوچھ گچھ کے لیے آئے ہیں اور ان کا فوری طور پر یہاں پہنچنا بہت ضروری ہے۔''

''وہ سمجھیں گے کہ تم پولیس والے ہو اور کبھی نہیں آئیں گے۔''

''انہیں کہو کہ کوئی غنڈا تمہیں تنگ کر رہا ہے۔ اس نے کسی طرح تمہارا نمبر حاصل کر لیا ہے اور اب پیسے مانگ رہا ہے۔ اس سے کہنا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ لڑکا اکیلا ہے اور انہیں یہاں آ کر اس کا دماغ ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے۔'' جونز نے اسے سمجھایا۔

سوندرا نے ڈیوس کا نمبر ملایا اور جونز کے اسکرپٹ کے مطابق بولنا شروع کر دیا۔ اس نے ڈیوس کو بتایا کہ ایک شخص اس سے گزشتہ کیس کے بارے میں سوالات کر رہا

ہے۔ وہ لوسی بارووے کی دولت کے بارے میں سب جانتا ہے اور اسے یہ بھی معلوم ہے کہ اس کا ایک بڑا حصہ کہیں اور منتقل ہوگیا ہے۔ اس سے پہلے کہ اسے دیر ہوجائے، وہ اپنا حصہ وصول کرنے آگیا ہے۔ اس نے سوندرا کا نمبر لوسی کو کی گئی ٹیلی فون کال سے حاصل کیا۔ شاید وہ اس کا فون ٹیپ کرتا رہا ہے۔ شاید یہ شخص اندر کا آدمی ہے اور کسی بینک یا انشورنس کمپنی سے تعلق رکھتا ہے۔

''نہیں، اس کا تعلق پولیس سے نہیں ہے کیونکہ اس نے اسے ایک ہزار ڈالر کی پیشکش کی تھی لیکن اس نے کہا کہ وہ پچاس ساٹھ ہزار ڈالرز کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اس کے پاس کاغذات کا ایک بنڈل ہے جن پر نمبر پڑے ہوئے ہیں۔''

''نہیں۔'' سوندرا نے کہا۔ ''وہ کوئی برا آدمی نہیں لگتا بلکہ خاصا اسمارٹ ہے۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی خاص بات ہے جس کی وہ وضاحت نہیں کرسکتی۔ نہیں، وہ کوئی بہت زیادہ جوان نہیں ہے، ہاں سفید فام ہے۔ اس وقت وہ باہر گیا ہے۔ شاید اپنی کار سے کچھ نکالنے کے لیے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سوندرا نے فون پر کہا۔ ''میں نہیں جانتی کہ اس کے پاس کون سی کار ہے۔ گلی میں ایک عمدہ سیاہ کار کھڑی ہے لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

اس نے فون رکھ دیا اور جونز سے بولی۔ ''وہ آدھے گھنٹے تک آجائیں گے۔ یوشی اس وقت نہا رہا ہے۔''

''کیا وہ ایک ساتھ رہتے ہیں؟'' ایکن نے پوچھا۔

''وہ آپس میں بوائے فرینڈز ہیں۔'' سوندرا نے جواب دیا۔

''لعنت ہو ان لوگوں پر۔'' جونز نے غصے سے کہا۔ ''پہلے ہی عذاب کون سے کم تھے۔ اب یہ ہم جنس پرستی بھی شروع ہوگئی۔'' ایکن نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''ہم تباہی کے کنارے پر پہنچ گئے ہیں۔''

سوندرا بھی قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''غیر شادی شدہ ماؤں کو کیوں بھول رہے ہو؟''

جونز نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''تم یہ سب کیوں کررہی ہو۔ میرا مطلب ہے کہ اتنی آسانی سے ہماری مدد کرنے پر کیوں تیار ہوگئیں؟''

''میں بے وقوف نہیں ہوں۔'' سوندرا نے جواب دیا۔ ''میرے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ میں تم سے ڈر گئی تھی اور تم سے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ تم اسمارٹ فون کی مدد سے یہاں تک پہنچ گئے تو باقی باتیں بھی

تربیت

ایک صاحب نے طوطا پال رکھا تھا جو کہ گالیاں بہت دیتا تھا۔ یہ صاحب طوطے کی اس عادت سے بہت نالاں تھے۔ آخر وہ تنگ آکر طوطے کو مولانا کے پاس لے گئے اور کہا کہ اس طوطے کو اچھی عادات سکھادیں۔ مولانا صاحب نے دو ماہ کے لیے طوطا اپنے پاس رکھ لیا اور اس کی ٹریننگ کرنے لگے۔

دو ماہ بعد وہ صاحب مولانا کے پاس گئے اور طوطے کے بارے میں دریافت کیا۔ مولانا صاحب بولے ماشاء اللہ آپ کا طوطا گالیاں بکنا چھوڑ چکا ہے۔ اگر آپ اس کی ایک ٹانگ اٹھائیں گے تو یہ بولے گا۔ ''السلام علیکم۔'' دوسری ٹانگ اٹھائیں گے تو بولے گا۔ ''خدا حافظ۔''

ان صاحب نے پوچھا کہ اگر میں اس کی دونوں ٹانگیں اٹھادوں تو؟''

اس سے پہلے کہ مولانا کچھ کہتے۔ طوطا طیش میں آکر بولا۔ ''تو اٹھا تو سہی، میں تیرا ٹینٹوا دبا دوں گا۔''

معلوم کرلیتے۔ میں نہیں جانتی کہ تم دونوں کون ہو لیکن مجھے امید ہے کہ تم ان لوگوں سے ساری رقم نکلوا لوگے۔''

جونز نے عقبی دروازے سے لان میں جھانکا وہاں چار عدد پلاسٹک کی کرسیاں اور ایک میز رکھی ہوئی تھی۔ بائیں جانب گیراج تھا۔ جونز نے پوچھا۔ ''گیراج میں کیا ہے؟''

''میری کار۔'' سوندرا نے جواب دیا۔ ظاہر ہے کہ وہاں گائے، بھینس تو نہیں ہوسکتیں۔''

جونز کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا۔ ''ہم تمہاری کار وہاں سے نکال کر صحن میں پڑی کرسیاں وہاں رکھ دیں گے اور تمہارے ساتھیوں سے وہیں میٹنگ ہوگی۔ اس بات کا خیال رہے کہ بچے گھر کے اندر ہی رہیں۔ تم ان کے ساتھ رہ سکتی ہو۔''

''نہیں، میں تمہارے ساتھ رہوں گی تاکہ تم لوگوں کی باتیں سن سکوں اور میرے ساتھی یہ نہ سمجھیں کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔''

''مجھے ان لوگوں کے بارے میں بتاؤ۔'' جونز نے کہا۔

''ڈیوس زیادہ ہوشیار ہے۔ اسی نے یہ منصوبہ بنایا۔ لوگوں کے نام حاصل کیے۔ مجھے اور ایلویس کو بتایا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کمپیوٹر کیسے کام کرتا ہے اور رقم کس طرح منتقل ہوتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ انشورنس اور اسٹاک مارکیٹ کے بارے میں بھی سیکھ رہا ہے۔ میرا خیال

ہے کہ اس سلسلے میں اس نے کسی ٹیچر کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں لیکن وہ کون ہے، یہ میں نہیں جانتی۔"
"اور دوسرا آدمی؟" ایکن نے پوچھا۔
"ایلوس۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ لڑنے بھڑنے میں ماہر ہے۔ ممکن ہے کہ تمہاری اس سے لڑائی ہو جائے۔"
"میں نہیں۔" ایکن نے کہا۔ "یہ جونز کا کام ہے۔"
"کیا ان کے پاس گن ہو سکتی ہے؟" جونز نے پوچھا۔
"شاید ایلوس کے پاس ہو۔ ڈیوس کو تو یہ بھی پتا نہیں کہ گن میں سے گولی کہاں سے نکلتی ہے۔"
"تمہارے پاس گن ہے؟" جونز نے پوچھا۔
سونڈرا نے اسے یوں دیکھا جیسے اس نے کوئی احمقانہ بات کہہ دی ہو۔ پھر اس نے ایکن کی جانب نظریں گھمائیں اور بولی۔ "میں اپنی حفاظت کے لیے گن رکھتی ہوں۔ کوئی کسی بھی وقت گھر میں گھس کر مجھے اور بچوں کو پریشان کر سکتا ہے۔"
"تم ہمیں اپنی گن ادھار دے سکتی ہو؟" جونز نے پوچھا۔
اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں اور وہ بولی۔ "تمہارے پاس گن نہیں ہے؟"
جونز کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "ہمیں امید نہیں تھی کہ اس کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔"
اس سے پہلے کہ وہ کوئی حرکت کرتی ایکن تیزی سے اٹھا اور دراز میں سے ایک چھوٹا سا ریوالور نکال لایا۔
سونڈرا نے اپنے ہاتھ کھڑے کر دیے اور بولی۔ "میرا ارادہ تم پر گولی چلانے کا نہیں تھا۔"
جونز نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور بولا۔ "تمہارے پاس کمپیوٹر ہے؟"
"تمہیں اس میں سے کچھ نہیں ملے گا۔"
"ہمیں اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم ہمیں سارے اکاؤنٹ نمبر دے دو۔"

☆☆☆

سونڈرا کی کار ڈرائیو وے میں کھڑی کر دی گئی۔ گیراج میں دو کرسی اور پلاسٹک کی میز رکھی ہوئی تھی۔ ایک پر جونز بیٹھ گیا جبکہ دوسری کرسی ایکن نے سنبھال لی۔ وہ سونڈرا کے لیپ ٹاپ پر کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ جونز نے اس سے پوچھا۔ "ہمیں انتظار کرتے ہوئے کتنی دیر ہو گئی؟"
ایکن نے کمپیوٹر کی گھڑی میں دیکھ کر بتایا۔ "چالیس منٹ؟"
سونڈرا اپنے ہاتھ میں کافی کا کپ لیے آئی جس میں سے گرم گرم بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اس نے وہ کپ جونز کے سامنے میز پر رکھا اور بولی۔ "یہاں کافی اندھیرا ہے۔"
جونز نے چھت پر لگے ہوئے بلب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "اتنی روشنی کافی ہے۔ جب تک وہ لوگ اندھیرے کے عادی ہوں گے تب تک ایکن سب کچھ کنٹرول کر چکا ہوگا۔"
"تمہارا کام پورا ہو گیا؟" سونڈرا نے ایکن سے پوچھا۔
"ہاں۔" ایکن انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔
اسی اثنا میں ایک کار ڈرائیو وے میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ سونڈرا بولی۔ "وہ لوگ آ گئے۔"
ایکن نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور بولا۔ "اوہ میرے خدا، ایلوس تو بہت طاقتور ہے۔"
"میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا۔" سونڈرا نے کہا۔ "لیکن اسے ایلوس کے نام سے مت پکارنا، ورنہ وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے تمہیں اس کا یہ نام بتایا ہے۔"
یہ کہہ کر وہ گیراج سے باہر نکلی اور آنے والوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے سیٹی بجاتے ہوئے بولی۔ "اس طرف آ جاؤ۔ میرے بچے جاگ رہے ہیں، اس لیے ہم نے گیراج میں میٹنگ رکھی ہے۔"
جواب میں ان میں سے کسی ایک نے کچھ کہا لیکن جونز اور ایکن میں سے کوئی بھی اس کی بات نہیں سمجھ سکا۔ پھر گیراج کے دروازے میں ایک بھاری بھرکم شخص نظر آیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اس کے پیچھے ایک نسبتاً چھوٹے قد کا سیاہ فام شخص نمودار ہوا۔ اس نے چوکھٹ پر ہاتھ رکھ کر جھانکا اور اندر داخل ہو گیا۔
ایکن آگے بڑھا اور اس کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "پال کولن۔"
ڈیوس نے ہچکچاتے ہوئے مصافحہ کیا پھر ایکن نے دوسرے آدمی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم یقیناً ایلوس ہو۔"
ایلوس نے بھی ڈیوس کی تقلید کی اور محتاط انداز میں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بالکل خلاف توقع تھا۔ ایلوس ایک جانب جھکا اور دھم سے زمین پر گر گیا۔ اس کا بایاں بازو بھاری جسم کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا جبکہ ایکن نے اس کے دائیں بازو کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا پھر اس نے اسے ایک مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور ایلوس کا دایاں بازو کندھے سے الگ ہو گیا۔
ڈیوس حیرت سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اس لمحے اس نے اپنے آپ کو بالکل مفلوج محسوس کیا پھر اس کے کانوں

میں جونز کی آواز آئی۔ ''ڈیوس! ادھر دیکھو۔''

جیسے ہی وہ مڑا۔ جونز نے سوندرا کا پستول اس کے سینے پر رکھ دیا۔ ایکن نے ایلوس کے جسم کی تلاشی لی تو اس کے پاس سے ایک بڑا ریوالور اور چاقو برآمد ہوا۔ اس نے دونوں چیزیں پلاسٹک کی میز پر رکھیں اور خالی کرسی پر بیٹھ کر کمپیوٹر آن کر دیا پھر اس نے ڈیوس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''شروع ہو جاؤ۔''

☆☆☆

جونز نے آئرین کے کچن میں بیٹھے بیٹھے ایک گہری سانس لی اور کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ ایکن کافی بنا رہا تھا۔ آئرین ایک پلیٹ میں پنیر اور بسکٹ لے کر آئی۔ جونز نے یہاں آنے سے پہلے یہ اطمینان کر لیا تھا کہ اس وقت آئرین کے پاس کوئی اور نہیں ہے کیونکہ وہ دوسری عورتوں کی موجودگی میں کوئی بات نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ ایکن نے ان کے سامنے کافی رکھی اور خود بھی ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ جونز نے اس سے کہا۔ ''انہیں بتاؤ کہ تم نے کیا کارنامہ انجام دیا ہے۔''

ایکن نے مسکراتے ہوئے ایک بسکٹ اٹھایا اور تفصیل سے پورا واقعہ بیان کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح انہوں نے سری کی مدد سے سوندرا کا گھر تلاش کیا۔ اس سے پوری حقیقت اگلوائی۔ اسی سے معلوم ہوا کہ وہ تو محض ایک مہرہ ہے۔ اصلی بازی گر تو کوئی اور ہیں جنہوں نے سوندرا کو استعمال کیا۔ اس کا کام صرف اتنا تھا کہ وہ لوگوں کو فون کر کے انہیں اس نام نہاد ایجنسی کی خدمات حاصل کرنے کی ترغیب دیتی تھی تاکہ وہ حکومت کو بھاری ٹیکس دینے سے بچ سکیں اور ان کی رقم محفوظ ہو سکے۔ پیسے نکلوانے اور انہیں کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کا کام ڈیوس اور ایلوس کرتے تھے۔ سوندرا سے کہا گیا کہ وہ کسی بہانے ان دونوں کو اپنے گھر بلا لے۔ جب وہ آئے تو ہم ان کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ انہیں قابو کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔

''آخر میں ہم نے ان دونوں کو سخت وارننگ دی اور یہاں سے دور بھیج دیا۔'' ایکن نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''تم نے انہیں پولیس کے حوالے کیوں نہیں کیا؟'' آئرین حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''نہیں۔'' ایکن نے کہا۔ ''وہ ابھی بچے ہیں جو غلط راستے پر چل پڑے تھے۔ دوسری بات یہ کہ پولیس کے حوالے کرنے کی صورت میں ان پر مقدمہ چلتا اور اس کا فیصلہ ہونے تک لوگوں کی رقم پھنسی رہتی جبکہ ہم اپنے طور پر ان سے یہ پیسے واپس لینے میں کامیاب ہو گئے۔'' انہوں نے یہ رقم تین مختلف بینک اکاؤنٹس میں رکھی ہوئی تھی اور یہ سب ملا کر تقریباً پانچ لاکھ ڈالر بنتے ہیں۔ ہم نے اس کا کچھ حصہ لوگوں کے اکاؤنٹ میں دوبارہ منتقل کر دیا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ سب لوگوں کو ان کی رقم واپس مل گئی؟''

''اس میں سے کچھ رقم جرمانے کے طور پر کاٹ لی گئی تاکہ آئندہ وہ لوگ محتاط رہیں۔''

آئرین نے بھویں چڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ''مسٹر کارسن نے پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا کہ جرمانہ کی رقم کسی جگہ چھپا کر رکھ دی جائے۔ مثلاً بہاماس یا بیلیز وغیرہ۔''

''گویا جرمانے کے نام پر تم یہ رقم اپنے لیے رکھنا چاہتے ہو۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اب بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ وہ ان لوگوں کو اچھی طرح جانتی تھی جن میں اس کا بھتیجا کارسن بھی شامل تھا۔

''میں نے اس میں سے کچھ نہیں لیا۔'' جونز مسکراتے ہوئے بولا۔

آئرین نے ایکن کی طرف دیکھا تو وہ صفائی پیش کرتے ہوئے بولا۔ ''ہم نے اپنے لیے کچھ نہیں رکھا۔''

آئرین نے اپنی نظریں ایکن پر جماتے ہوئے کہا۔ ''میں پوری کہانی سننے کے لیے بے چین ہوں۔''

''تم نے کہا تھا کہ مسز ہاروے کو پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' ایکن نے کہا۔

''ہاں، لیکن یہ اچھا ہوگا کہ اس کی رقم لٹیروں کے پاس جانے سے محفوظ رہے۔''

''میں نے سوندرا اور اس کے تین بچوں کے لیے ایک چھوٹا سا اکاؤنٹ کھول دیا ہے۔'' ایکن نے کیک کا ٹکڑا منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''انہیں پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔''

جونز اس کی بات سن کر مسکرا دیا اور اس نے آئرین کو اشارہ کیا کہ وہ مزید سوال کرے۔

آئرین نے کہا۔ ''باقی رقم کہاں گئی؟''

ایکن نے اپنا حلق تر کیا اور بولا۔ ''مسز ہاروے نے ایک نیک مقصد کے لیے خطیر رقم عطیہ کی ہے۔'' ایکن نے آہستہ سے کہا۔ ''اسے بہت جلد یونائیٹڈ نیگرو کالج فنڈ سے شکریہ کا خط مل جائے گا۔''

جونز نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس لی جیسے وہ ایک فرض سے سبکدوش ہو گیا ہو۔

آوارہ گرد

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

قسط نمبر: 19

مندر، کلیسا، سینی گاگ، دھرم شالے اور اناتھ آشرم... سب ہی، اپنے اپنے عقیدے کے مطابق بہت نیک نیتی سے بنائے جاتے ہیں لیکن جب بانیوں کے بعد نکیل بگڑے ذہن والوں کے ہاتھ آتی ہے تو سب کچھ بدل جاتا ہے... محترم پوپ پال نے کلیسائے نام نہاد راہبوں کو جیسے گھناؤنے الزامات میں نکالا ہے، ان کا ذکر بھی شرمناک ہے مگر یہ ہو رہا ہے... استحصال کی صورت کوئی بھی ہو، قابلِ نفرت ہے... اسے بھی وقت اور حالات کے دھارے نے ایک فلاحی ادارے کی پناہ میں پہنچا دیا تھا... سکھ رہا مگر کچھ دن، پھر وہ ہونے لگا جو نہیں ہرنا چاہیے تھا... وہ بھی مٹی کا پُتلا نہیں تھا جوان کا شکار ہو جاتا... وہ اپنی چالیں چلتے رہے، یہ اپنی گھات لگا کر ان کو نیچا دکھاتا رہا... یہ کھیل اسی وقت تک رہا جب اس کے بازو توانا نہ ہو گئے اور پھر اس نے سب کچھ ہی الٹ کر رکھ دیا... اپنی راہ میں آنے والوں کو خاک چٹا کر اس نے دکھا دیا کہ طاقت کے گھمنڈ میں راج کا خواب دیکھنے والوں سے برتر... بہت برتر قوت وہ ہے جو بے آسرا نظر آنے والوں کو نمرود کے دماغ کا مچھر بنا دیتی ہے... پل پل رنگ بدلتی، نئے رنگ کی سنسنی خیز اور رنگا رنگ داستان جس میں سطر سطر دلچسپی ہے...

تحیر... سنسنی اور ایکشن میں ابھرتا ڈوبتا دلچسپ سلسلہ

وہ عارفہ تھی۔ خوب بج دھج کر آئی تھی وہ۔ میک اپ کی چک دمک، میچنگ جیولری، بیش قیمت ساڑی، بالوں کو نفاست سے گھونسلا ٹائپ کا جوڑا بنا کر اُسے سلیقے سے ایک سیاہ مہین جالی میں لپیٹ رکھا تھا۔ ڈھلتی عمر کی ''یلغارتی'' نشانیوں کو اِن لوازمات سے کسی قدر شکست دینے کی اپنی سی سعی ضرور کر رکھی تھی اُس نے۔

اسے اچانک سیٹھ نوید احمد سانچے والا کے شاہانہ آفس روم میں داخل ہوتے اور مع اس کی ''تیاریوں'' کے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ سارا ''ساماں'' اس نو دولتیے سیٹھ کو لبھانے کے لیے ہی کیا گیا تھا، نیز یہ کسی رمزیہ جشنِ کامیابی کو منانے کا اشارہ بھی تو ہو سکتا تھا؟

مگر بُرا ہو اس گھڑی کا جو ان دونوں کے لیے منحوس ثابت ہوئی تھی کہ تقدیر کے لکھے نے ان دونوں شیطانوں کے رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے مجھے وہاں پہنچا دیا تھا۔

لہٰذا میری وہاں موجودگی، عارفہ کے سان گمان سے بھی بالاتر تھی...... مجھ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے چمکتے گورے چہرے کا رنگ یوں ایک دم بجھ کر رہ گیا جیسے کسی اسٹوڈیو کی تیز فلش لائٹ ایک دم تاریک پڑ جائے۔

''تت... بت... تم...'' اس کے ساکت لبوں سے پھنسے پھنسے الفاظ برآمد ہوئے تھے۔ پھر وہ میرے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر سیٹھ نوید کو پھیلی ہوئی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ جیسے میں وہاں اُسی کی دعوت پر آیا تھا، جبکہ خود سیٹھ کی حالت اس وقت کاٹو تو بدن میں لہو نہیں جیسی ہو رہی تھی۔ وہ کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور رومال سے بار بار اپنی عرق آلودہ پیشانی کو پونچھنے لگا۔

میں بھی اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ہک دک سی کھڑی عارفہ کے سراپا... پر ایک استہزائیہ سی نظر ڈالتے ہوئے میں بولا۔

''ہاں میں، شہزاد احمد خان شہزی۔ آپ نے مجھے پہچان تو لیا ہو گا محترمہ!''

وہ بت بنی کھڑی تھی۔ اُس کے منہ کو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ اپنی منظورِ نظر کی یہ ہیئت کذائی سیٹھ نوید کو ایک آنکھ نہ بھائی اور اس نے پہلی بار اس نازک سچویشن کو ہینڈل کرنے کے لیے خود کو تیار کرنے کی کوشش چاہی۔ لیکن جب وہ ساکت کھڑی عارفہ سے مخاطب ہوا تو لہجہ اس کا بھی بوکھلایا ہوا تھا، اور اس بوکھلاہٹ میں، وہ مجھ سے اپنے خلوت کی ''آپ سے تو کا عنواں ہو گئے'' بھی نہ چھپا رہ سکا۔

''تت... تم بیٹھو پلیز۔''

عارفہ نے ایک گہری سانس لی۔ گویا اس نے بھانپ لیا تھا کہ اب خود کو سنبھالنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ آگے بڑھی اور سیٹھ نوید کے سیدھے ہاتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اگرچہ میرے ساتھ والی کرسی بھی خالی تھی۔ میں سیٹھ نوید کے سامنے والی کرسی پر تھا۔ سیٹھ نوید نے انٹرکام پر کسی کو پانی لانے کو کہا تھا۔

میری ایکسرے جیسی نظریں ان دونوں کے چہروں کا جائزہ لینے میں محو تھیں جہاں مجھے ایک مجرمانہ سی بدحواسی کا شائبہ صاف محسوس ہوا تھا۔ وجہ اس کی صاف تھی کہ میں بلاکم و کاست اس بات کا اظہار کر چکا تھا کہ سرمد بابا کو غائب یا اغوا کروانے میں ان دونوں کا ہاتھ تھا، اور یہ میرے پُراعتماد لہجے اور اچانک یہاں آمد نے سیٹھ نوید پر اچھی طرح باور کرا دیا تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ عین اسی وقت اس کی توقع کے برخلاف عارفہ بھی کچھ ایسے انداز میں یہاں آن وارد ہوئی تھی کہ یقین کی حد تک کیے گئے شبہے میں کوئی گنجائش باقی... نہ رہی تھی؟

جس بیوہ خاتون کا باپ جیسا سسر غائب کر دیا گیا تھا، وہ بجائے تشویش زدہ ہونے کے یوں بج دھج کر یہاں آ پہنچی تھی۔ یہی نہیں، یہ ہی سنوری عارفہ، اُس عارفہ سے یکسر مختلف تھی جس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے فون کر کے سرمد بابا کی گمشدگی کے بارے میں روتے بلکتے ہوئے آگاہ کیا تھا۔ اس وقت اس کی جیسے غم کے مارے جان نکلی جا رہی تھی اور اب میں اسے یہاں، ایک بالکل الگ روپ میں دیکھ رہا تھا، جو ایک خوش باش حسینہ جیسی نظر آ رہی تھی، جیسے اس کے لیے کوئی غم کوئی سانحہ ہوا ہی نہ ہو۔ اس بات نے بھی مجھے شک میں مبتلا کیا تھا، اور ساتھ ہی مجھے اس حرافہ کے ادا کارانہ جوہر کا بھی معترف ہونا پڑا تھا۔

''میں ابھی ذرا دیر پہلے آپ ہی کو فون کرنے والا تھا، اچھا ہوا کہ آپ خود ہی تشریف لے آئیں میڈم!''

سیٹھ نوید نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے کہا۔ اب اس کا لہجہ محتاط ہو گیا تھا اور عارفہ سے تنہائیوں کی بے تکلفانہ گفتگو کو فوراً ہی ادب و آداب کا روپ دینے کی کوشش کرنے لگا۔

میں عارفہ کو مسلسل گھورتے ہوئے دانستہ زہریلے طنز سے بولا۔ ''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ یہاں، سیٹھ صاحب کو سرمد بابا کی گمشدگی کی خبر دینے آئی ہیں یا کسی تقریب میں جانے کا ارادہ کیے ہوئے ہیں؟''

میرے طنز پر اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ یقینی طور پر اس

کوئی پولیس والا نہیں تھا، نہ ہی سول انتظامیہ میں کسی بڑی قانونی پوسٹ پر فائز تھا۔ ہاں ایک سیکریٹ "پاور ایجنٹ" ضرور تھا۔ جو بہ ظاہر کھلے بندوں کسی بھی جگہ مداخلت نہیں کرتا، مگر پاور سیکریٹ سروس کا جو کاز اور ایم تھا، یعنی اپنے تئیں جو "تیسری آنکھ" دیکھ رہی ہے، اُسے پرکھتے ہوئے اپنی صوابدید پر ایک لائحہ عمل تیار کر کے خفیہ کارروائی کرنا، اس پر میں ضرور عمل پیرا ہو سکتا تھا اور اب میں ان دونوں کے متعلق کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا مگر مجھ سے ایک غلطی ہو گئی تھی کہ میں نے اپنا خصوصی اختیارات والا کارڈ شو کر دیا تھا۔

"تم رینجرز میں کس پوسٹ پر کام کرتے ہو؟"

اچانک سیٹھ نوید نے میری جانب دیکھ کر وہ سوال کر ڈالا جس کا میرا تیزی سے سوچتا ہوا ذہن کوئی جواز تلاش کرنے میں محو تھا، لہٰذا مسکرا کر بولا۔

"بعض چھوٹے موٹے راستوں کی عمومی رکاوٹیں دور کرنے کے لیے میرے پاس ایسے بے شمار جعلی کارڈ موجود رہتے ہیں، جن میں انکم ٹیکس آفیسرز سے لے کر خود کو کسی بڑے اخبار کا صحافی ظاہر کرنے میں کوئی عار محسوس نہ ہو، ایسے کئی کارڈ ہر وقت میری جیب میں رہتے ہیں۔"

"تو یہ جعلی کام بھی تم کرتے ہو۔" سیٹھ نوید نے میری طرف گھورنے کے انداز میں دیکھتے ہوئے ایک تلخ سی مسکراہٹ سے کہا، صاف عیاں تھا وہ میری کسی کمزوری کو پکڑ کر اُسے رائی کا پہاڑ بنانے کی کوشش میں تھا۔ میں نے بھی اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدگی سے جواب دیا۔

"آپ نے اپنی آنکھوں سے میرے پاس ایسا کوئی کارڈ دیکھا ہے؟ نہیں ناں! یہ میں نے جاہل اور کم پڑھے لکھے لوگوں میں استعمال کرنے کے لیے رکھے ہوئے ہیں، جیسے تمہارا وہ سیکیورٹی آفیسر۔ جسے صرف وردی پہننا اور گن اُٹھانا آتی ہے۔ کسی کارڈ کی باریکی یا اس کی تحریر پڑھنا نہیں۔ اب اس فضول بحث کو چھوڑو اور تم دونوں مجھے بتاؤ کہ سرمد بابا کو تم لوگوں نے اغوا کر کے کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"کیا بکواس کر رہے ہو تم مسٹر!" میری دوٹوک بات پر وہ ایک دم جھٹکے سے اُکھڑ گیا اور اپنی کرسی سے بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ میرا رینجرز سے کوئی تعلق نہیں ہے، وہ ایک دم اپنی اکڑ میں آ گیا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے اس کی پتلون ضرور گیلی ہونے کے قریب ہو گئی تھی۔ اس کی دیکھا دیکھی عارفہ نے بھی گویا خربوزے کی طرح رنگ پکڑا

کا حلق خشک ہو رہا تھا اور وہ اُسے تر کرنے کی سعی میں اپنے ہونٹ آہستگی سے بھینچتے ہوئے بولی تو اس کی آواز میں واضح طور پر لڑکھڑاہٹ تھی۔

"نن... نہیں... آں... ہاں، میں تمہیں مطلع کرنے کے بعد سیٹھ صاحب سے مدد لینے آئی تھی۔"

"مدد لینے یا کسی خفیہ منصوبے کی کامیابی کا جشن منانے؟" میرا لہجہ ہنوز زہر میں بجھے تیر کی طرح تند ہو رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب یہی ہے محترمہ کہ آپ کو سرمد بابا کی گمشدگی کی اطلاع کے لیے یہاں آنے کے بجائے فوراً متعلقہ تھانے... کا رُخ کرنا چاہیے تھا۔"

"مم... میں نے جمال سے کہہ دیا تھا کہ فوراً تھانے میں رپورٹ درج کروا دے۔"

"اچھا!" میں نے مصنوعی حیرت کا اظہار کیا۔ "مگر آپ نے تو اُسے سرے سے ہی اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ اس اہم واقعے کی رپورٹ پولیس کو نہ دے، کیونکہ بہ قول آپ کے، پولیس بلاوجہ سب کو پریشان کرے گی، تھوڑا اور انتظار کر لیتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے سیل فون کی بیٹری... ڈاؤن ہو گئی ہو، اور وہ کسی اور طرف نکل گئے ہوں۔" میں نے مِن وعَن اس کے وہی الفاظ دہرا دیے جو اس نے جمال کو کہے تھے۔

"جبکہ مجھے فون کرتے وقت تو آپ کی فکر و تشویش سے حالت ہی غیر ہو رہی تھی اور آپ کو خدشہ تھا کہ بابا جی کو اغوا نہ کر لیا گیا ہو؟ آپ کے اس دوغلے پن نے مجھے ایک تلخ سے شبہے میں مبتلا کر دیا ہے میڈم عارفہ جی!" میں نے آخر میں دانستہ نوید... کا خلوت والا انداز اپنایا تھا۔

اُسے نہیں پتا تھا کہ میں انکل جمال سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ یہی سبب تھا کہ میری بات پر اس کا چہرہ یکدم زرد پڑ گیا۔ وہ اس میدان کی کچی کھلاڑی تھی اور بہت سی ایسی توجہ طلب باتوں اور باریکیوں پر توجہ نہ دے پائی تھی۔ مگر کائیاں بھی تھی، جلدی سے بات بناتے ہوئے بولی۔

"نن... نہیں، میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں اس وقت بہت پریشان تھی اور بدحواس بھی اسی لیے جمال سے میں نے ایسا کہا تھا۔ مجھے تو کچھ سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ مجھے کرنا کیا چاہیے؟"

وہ بھونڈے انداز میں بات بنا تو گئی تھی لیکن میرا شبہ یقین میں بدل چکا تھا کہ یہ ان دونوں کی ملی بھگت ہے۔ میں

اور بپھرے ہوئے لہجے میں مجھ سے بولی۔

''تمہاری یہ جرأت کیسے ہوئی، ہم پر اتنا بڑا الزام عائد کرنے کی، ہاں؟'' پھر وہ اپنے ''منظورِ نواز'' کی طرف دیکھتے ہوئے میرے بارے میں بولی۔

''میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں کہ یہ کس قماش کا آدمی ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں بتاؤں گی بعد میں تفصیل سے۔ یہ واقعی دو نمبر کا آدمی ہے۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس کے بارے میں سب پتا ہے، یہ تو بابا جی نے اسے اتنا سر پہ چڑھا رکھا تھا، ورنہ تو یہ مجھے شروع ہی سے سخت ناپسند تھا، پتا نہیں بابا جی نے اس کرمنل کو کیوں گھر میں گھسا رکھا تھا۔'' عارفہ کو بھی میرے بارے میں زہر اُگلنے کا موقع مل گیا۔

''اچھا!'' میں نے ایک طویل ہُنکارا بھرتے ہوئے کہا اور اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دونوں میری طرف گھورنے لگے۔ میں پلٹا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا عارفہ کی کرسی کے قریب آیا اور پھر اس کے میک اَپ زدہ چہرے پر قدرے جھک کر بولا۔

''میڈم عارفہ! آج تو آپ نے اپنی رہی سہی اوقات بھی دکھا کر اس پر مہر ثبت کر ڈالی ہے کہ آپ ایک انتہائی درجے کی کم ظرف، مفاد پرست اور محسن کش عورت ہو، آپ مجھے کیا جانیں گی؟ جانتا تو میں آپ کو ہوں اچھی طرح کہ پہلے کس طرح آپ نے اپنے نیک اور شریف سسر کا سارا کچھ اپنے شوہر کے نام کروایا اور پھر انہیں گھر سے بے دخل کروا کے لاوارثوں کی طرح ایک خیراتی ادارے میں پھنکوا دیا، پھر جب آپ کے زن مرید شوہر محمود کا ایک حادثے میں اچانک انتقال ہوا تو آپ کو اپنے سسر کی کمی کا احساس ہوا اور آپ اُس سادہ لوح دُکھی آدمی کو بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ لے آئیں، کیونکہ اُس وقت آپ خود بھی جگر کی ایک خطرناک بیماری کی لپیٹ میں آچکی تھیں، آپ کو سرمد بابا جیسے ایک ذمے دار آدمی ہی کی ضرورت پیش آئی۔ آپ جانتی تھیں کہ ریاکاری اور پُرفریب دنیا میں ایک وہی ایسے آدمی ہیں، جو سب کچھ بھلا کر اس نازک وقت میں بالکل صدقِ نیت سے آپ کی مدد کریں گے۔ اور ایسا انہوں نے کیا بھی، مگر اُن کے اس حسنِ سلوک کے باوصف آپ کے دل میں اُن کے لیے کالک کم نہ ہوئی، یہاں تک کہ آپ نے تو ایک معصوم اور دُکھیاری لڑکی کے ساتھ بھی احسان فروشی کرنے کی انتہا کر دی، جس نے آپ کی خاطر خود کو ایک کڑے امتحان میں ڈال دیا، کیا لگتی تھی وہ آپ کی؟ مگر وہ انسانی ہمدردی کی خاطر اور سرمد بابا کے احسانوں کا بدلہ چکانے کی کوشش کرتے ہوئے میرے ہی ایما پر آپ کی دادرسی اور تیمارداری کے لیے اپنے دل پہ پہاڑ جیسا پتھر رکھ کر آپ کے ساتھ سات سمندر پار چلی گئی۔ جانتی ہیں ناں آپ اچھی طرح کہ میرا اور عابدہ کا ایک دوسرے سے کیا رشتہ ہے؟ اتنا کہنا کافی سمجھیں آپ کہ محبت کرتا ہوں میں اُس سے۔ آپ نے اُس معصوم کے ساتھ کیا کیا! جب دیکھا اب وہ آپ کے کام کی نہیں رہی تو اُس بے قصور کو امریکی خفیہ اداروں کو اس کے خلاف شبہے میں ڈال کر اور اپنی گردن بچاتے... ہوئے اُس معصوم کو وہیں پھنسا کے آپ خود آرام سے پاکستان لوٹ آئیں، کیا سمجھ لیا تھا آپ نے عابدہ کو، ہاں؟ ایک ٹشو پیپر ہے وہ۔ لاوارث تھی وہ؟ جسے آپ نے جب چاہا استعمال کیا اور کہیں بھی پھینک دیا؟ کیا سمجھتی تھیں آپ خود کو کہ آپ اُس غریب سادہ لوح کو پھنسا کے اور اپنی گردن بچا کے آرام سے یہاں لوٹ آئیں گی اور بس۔ کہانی ختم؟ ہاہ۔ بڑی خوش فہمی تھی آپ کو۔ آپ یہ کیوں بھول گئیں کہ آپ کو میرے سامنے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ اور یہ کہ جب تک عابدہ امریکا میں پھنسی رہے گی، میں آپ کی زندگی اجیرن کیے رکھوں گا۔ میڈم عارفہ جی! اتنی آسانی سے آپ کو نہیں چھوڑوں گا۔ بس یہ دعا کریں کہ عابدہ کا بال بھی بیکا نہ ہو۔ ورنہ آپ جان جائیے کہ اگر خدانخواستہ ایسا کچھ ہوا تو بہت برا ہو جائے گا۔''

یہ کہتے کہتے میرا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ جوشِ غیظ اور ایک کرب ناک دُکھ تلے میرے جسم کا رُواں رُواں مرتعش ہو رہا تھا۔ آنکھوں میں جیسے چنگاریاں بھر آئی تھیں، اور عارفہ کے لیے میرا یہ روپ شاید نیا ہی تھا۔ تاہم اُس نے میرے جلتے سُلگتے لہجے سے اُمڈتی شوریدہ سری اور عزائم کا اچھی طرح اندازہ ضرور کر لیا تھا۔ یہی سبب تھا کہ اس کے چہرے اور آنکھوں سے ایکا ایکی ایک خوف سا مترشح ہونے لگا تھا۔

میں سیدھا ہو کے دوبارہ سیٹھ نوید کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ''میں تم دونوں کی فیوچر پلاننگ سے خوب اچھی طرح واقف ہو چکا ہوں۔ اس لیے تم دونوں کے لیے بہتر یہی ہے کہ یہ معاملہ رازداری سے اور اِدھر ہی نمٹا دو تو اچھا رہے گا۔ ورنہ قانون میں بھی جانتا ہوں۔ سارے شواہد تم دونوں کے خلاف جاتے ہیں، اور یہی نہیں، بلکہ میں یہ بھی... جانتا ہوں کہ سرمد بابا کو کیوں اور کس مقصد کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔ وہ بھی اُڑیسہ کمپنی کے شیئرز تمہارے یا عارفہ کے حوالے

....نہیں کریں گے۔ انہوں نے مجھے اپنا بیٹا کہا ہے اور میں وہ حق نبھانا جانتا ہوں، پیچھے میں بھی نہیں ہٹوں گا۔ کیونکہ تمہیں یاد ہوگا اچھی طرح سے کہ جب تم اُس روز وڑائچ صاحب سے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز حاصل کرنے کے لیے جس طرح دباؤ ڈال رہے تھے اور ڈھکی چھپی دھمکیوں سے بھی کام لے رہے تھے، میں سمجھ گیا تھا کہ دال میں ضرور کالا ہوگا آگے چل کر۔ کیا کہتے ہو اب؟''

سیٹھ نوید اور عارفہ نے اپنے تئیں جس کھیل کو آسان سمجھا تھا، وہ اب ان کے گلے کی ہڈی ثابت ہونے لگا تھا، ایسے چھچھوندر کی طرح، جو نہ نگلنے کا، نہ اُگلنے کا تھا۔ ان دونوں کے لیے بھی بلاشبہ یہ نازک صورتِ حال تھی۔

عارفہ اب میرے چہرے سے اپنی نگاہیں ہٹا کر اس کا چہرہ تکنے لگی تھی۔ مجھے اس کی آنکھوں سے بے بسی سی جھلکتی صاف محسوس ہو رہی تھی۔ جبکہ خود سیٹھ نوید کا چہرہ کسی اور ہی سانچے میں ڈھلتا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔

اس نے ایک بٹن دبایا۔ ایک ہلکی سی بپ کی آواز کمرے میں گونجی، میں کچھ سمجھ نہ سکا مگر جب دروازے کے اوپر لگے ایک سرخ بلب کو جلتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ باہر والوں کے لیے ایک کاشن تھا کہ اندر اہم میٹنگ شروع ہو چکی تھی، لہٰذا ڈسٹرب نہ کیا جائے۔ اس کے بعد مجھ سے بولا۔

''شہزی! بیٹھو ذرا، میں تفصیل سے ساری بات بتانا چاہتا ہوں''۔

بلی شاید تھیلے سے برآمد ہونے لگی تھی۔ میں نے اپنی کرسی سنبھال لی...... وہ کھنکھار کے بولنا شروع ہوا۔

''دیکھو شہزی! میں اُس روز وڑائچ صاحب سے ملاقات کے دوران ہی تمہاری اُن کی نظروں میں حیثیت جان چکا تھا، جب میں اُن سے رازداری اور تنہائی میں بات کرنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے مجھے تمہاری موجودگی میں ہی بات شروع کرنے کا کہہ ڈالا تھا، اس لیے تم بھی جانتے ہو کہ یہ اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کا معاملہ کیا ہے اور کتنا نازک ہے۔''

وہ اتنا کہنے کے بعد ذرا رکا اور پھر گویا ہوا۔

''میں نے اُسی روز وڑائچ صاحب کو خبردار کر دیا تھا کہ جو اس کمپنی کے شیئرز ہولڈر ہیں وہ بہت خطرناک لوگ ہیں، ان سے دشمنی مہنگی پڑے گی، مگر وہ نہ مانے۔ آپ کے سامنے کی تو بات ہے شہزاد صاحب!'' وہ مکاری سی میری طرف دیکھ کر بولا۔

میں جانتا تھا کہ وہ کچھ ایسا ہی جواب دے گا، یوں بھی مجھے ایسی کوئی خوش فہمی نہ تھی کہ وہ میرے سامنے سچ ہی اُگلتا۔ اگرچہ اس حد تک بات اس کی کچھ حقیقت بھی تھی، تاہم یہ ممکن تھا کہ ''کام'' آسان کرنے کے لیے انہوں نے اس کا ٹاسک اسے ہی دے رکھا ہو اور درپردہ سپورٹ انہی کی ہو۔ اسی لیے میں نے بھی کیچلی بدلی اور دوسرا وار کرنے تک محتاط پالیسی بدلتے ہوئے کہا۔

''ہاں! مجھے یہ بات معلوم ہے۔ مگر تم بھی تو ان کے ساتھی ہو سکتے ہو؟'' میں نے اُسے بلف کرنا چاہا، مقصد اُسے یہی باور کرانا تھا کہ میں اس کی باتوں میں آرہا ہوں۔

''ہاں! میں ان کا ساتھی ہوں لیکن کاروبار کی حد تک۔ اسی لیے اُن کو اچھی طرح جانتا بھی ہوں کہ وہ اپنے مفادات کے آگے انسانی جان کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔'' اُس نے عیارانہ لہجے میں اعتراف کیا تو میں بولا۔

''تو تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ وڑائچ صاحب کو انہی لوگوں نے ہی اغوا کیا ہوگا؟''

''اور بھلا کون ہو سکتے ہیں؟ مگر تم سمجھو تب ناں۔ تم تو اُلٹا ہم پر ہی شک کیے بیٹھے ہو۔''

''لیکن میرے شک کی وجہ بھی ٹھوس ہے، آخر کو یہ لوگ تمہارے ہی جانے پہچانے ہیں'' میں نے ابھی لولودش کا نام لینا دانستہ مناسب نہیں سمجھا تھا۔ وہ اس پر بدک سکتا تھا۔

''بے شک میرے جانے پہچانے ہیں مگر وہ کرمنل لوگ بھی ہیں۔''

''ٹھیک ہے، مجھے تمہاری بات سے اتفاق کرنا پڑے گا۔'' میں نے چالاکی سے مصالحانہ رویہ اپناتے ہوئے کہا۔ ''تم ان سے بات کرو کہ وہ وڑائچ صاحب کو چھوڑ دیں، میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ میری بات رد نہیں کریں گے، یوں بھی اب ان کی عمر اللہ اللہ کرنے کی ہے، اس قسم کے ثقیل کاروبار کرنے کی نہیں، جبکہ یہ معاملہ بھی خطرناک ہے۔''

''یہ تم نے بڑی عقل مندی کی بات کی شہزاد صاحب!'' سیٹھ نوید یکدم خوش ہو کر بولا۔ ''لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ تم ہم سے اپنا تعاون برقرار رکھو۔''

''میں یہی کر سکتا ہوں، جو میں نے کہا، تم کب اُن لوگوں سے بات کرو گے؟'' میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا، تو جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

''آپ نے میری تعاون والی بات پر غور کیا؟''

''کیا مطلب؟''

''آپ ابھی پولیس تک یہ بات نہیں پہنچنے دیں گے۔''

''لیکن گمشدگی کی تو پولیس میں رپورٹ اب تک درج ہو چکی ہوگی؟''

''بے شک، وہ الگ معاملہ ہے، رپورٹ تو درج ہونا ہی چاہیے۔ لیکن تم پولیس کو ہماری راہ پر نہیں لگاؤ گے، مطلب کہ انہیں یہ بتانے کی غلطی کبھی نہ کرنا کہ اغوا کنندگان سے میرا کوئی تعلق بھی ہے۔ اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا، بات معاہدے کی ہو رہی ہے ہمارے بیچ، تو اسے یہیں تک محدود رکھنے میں ہم سب کا فائدہ ہے، آگے تمہاری مرضی ہے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں تمہاری بات۔'' میں نے بے تلے لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تو پھر تم کب مجھے اس ڈیل سے آگاہ کرو گے؟''

''ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آیا وڑائچ صاحب کو یرغمال بنانے والے وہی لوگ ہیں یا کوئی اور۔ میں اُن سے رابطہ کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر مجھے ایسا کوئی اشارہ ملا تو تم سے رابطہ ہو جائے گا میرا۔'' یہ کہتے ہوئے اُس رذیل شخص نے مصافحے کے لیے میری جانب اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

ہاں! میں اُسے رذیل ہی کہوں گا، جو اب مجھے بے وقوف سمجھ کر ڈاج دینے کی کوشش کر رہا تھا، میں بہ ظاہر اس کی چالاکی میں آتے ہوئے ایک پُرامیدی مسکراہٹ اپنے چہرے پہ سجا کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس سے مصافحہ کر کے نکل آیا۔

مجھے پورا یقین تھا کہ سیٹھ نوید انہی لوگوں کا ٹاؤٹ تھا، اور انہی کے کاز پر کام کر رہا تھا اور سرمد بابا کے اغوا میں بھی اسی کا ہاتھ تھا لیکن مجھے ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ آیا اس میں عارفہ کا مفاد کہاں فٹ ہوتا تھا؟ کیا وہ واقعی شیئرز فروخت کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھی یا اس جہاز راں کمپنی کی حصے داری کو جاری رکھنا چاہتی تھی؟

اپنے دوسرے خیال کو میں نے رد کر دیا۔ کیونکہ عارفہ کا اس سلسلے میں کچھ خاص کاروباری مائنڈ نہ تھا، جو سرمد بابا کا تھا، صرف سرمد بابا یہی چاہتے تھے کہ وہ اس شپنگ کمپنی کی حصے داری کو جاری رکھیں، جبکہ عارفہ کو پہلے ہی سیٹھ نوید نے برین واش کر دیا ہوگا کہ وہ اس خطرناک معاملے میں پڑے بغیر بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق ساٹھ فیصد کے شیئرز کی ادائیگی پکڑے اور الگ ہو جائے۔ جبکہ اس سے پہلے کی ان کے درمیان ہونے والی گفتگو کے مطابق عارفہ کا خیال یہی تھا کہ وہ باقی کے پچاس فیصد شیئرز لولووش سے خریدنے کی کوشش کریں گے۔

مگر میں نہیں جانتا تھا کہ سیٹھ نوید کس حد تک عارفہ سے مخلص تھا؟ اور لولووش کا کتنا نمک خوار؟ دیکھا جائے تو عارفہ اور سیٹھ نوید کے بیچ یہ معاملہ صاف تھا۔ یعنی دونوں ہی یہ چاہتے تھے کہ باقی کے شیئرز لولووش کو فروخت کر دیے جائیں، اس سے بہت سارا روپیہ پکڑیں اور نئی زندگی کی راہ لیں۔ یعنی قرائن سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ دونوں مستقبل قریب میں ایک دوسرے کے جیون ساتھی بننے کا ارادہ رکھے ہوئے تھے، اور ان کے بیچ سب سے بڑی اور ''دومنہ'' والی رکاوٹ ...سرمد بابا تھے۔ یعنی وہ نہ شیئرز زبردستی فروخت کرنے پر تیار تھے نہ ہی عارفہ کی سیٹھ نوید جیسے آدمی کے ساتھ شادی کرنے پر رضامند۔

میرے نزدیک جہاں تک شیئرز والی بات تھی، اس پر تو سرمد بابا کا زور اور حکم چل سکتا تھا، لیکن عارفہ کی شادی والا معاملہ اس کا ذاتی فعل تھا... اس میں بلاشبہ قانونی اور شرعی طور پر وہ آزاد و خودمختار بھی تھی۔ یقیناً یہ حقیقت سرمد بابا بھی جانتے ہی ہوں گے، لیکن وہ سیٹھ نوید کو بہرحال اچھا انسان نہیں سمجھتے تھے۔ اور ان کے اس خیال سے میں بھی اتفاق کرتا تھا۔

یہ بات ابھی تک پوری طرح واضح نہیں ہو سکی تھی کہ سرمد بابا کی ''مراجعت'' کے بعد انہوں نے اپنا کتنا کچھ اپنے ہاتھ میں کر رکھا تھا کہ وہ اپنی بیوہ بہو کو برے بھلے کی تمیز بتاتے ہوئے خاندان کے ایک جہاندیدہ بزرگ کی طرح اُسے سیدھے راستے پر چلانے کی کوشش کرتے؟

جبکہ مجھے آثار ایسے ہی نظر آ رہے تھے کہ عارفہ ایک بار پھر سرمد بابا کو ہری جھنڈی دکھا کر دودھ سے مکھی کی طرح نکالنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اور اس ''کارِ خیر'' میں اس کے ساتھ سیٹھ نوید بھی بہ نفسِ نفیس پیش پیش تھا۔

اگرچہ میں سرمد بابا سے بھی ناراض تھا مگر میری وہ ناراضی عارضی تھی۔ عابدہ کے سلسلے میں ان کا اتنا قصور نہ تھا، جتنا اس حرافہ عارفہ کا تھا۔ بلکہ وہ تو عابدہ کے سلسلے میں اب بھی پُرعزم تھے.... میں ایسے نازک موقع پر سرمد بابا کو چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

☆☆☆

سیٹھ نوید کے دفتر سے نکلنے کے بعد میں اپنی کار میں آ بیٹھا۔ میں جانتا تھا کہ میرے کمرے سے نکلتے ہی سیٹھ نوید اپنے گارڈز کو اُس وقت تک مجھ پر کڑی نظریں مرکوز

رکھنے کی ہدایت دے چکا ہوگا، جب تک میں دور دور تک ان کی حدِ نگاہ سے اُوجھل نہ ہو جاؤں۔ میں نے بھی یہی کیا اور کار میں سوار ہو کر کچھ دور نکل گیا۔

سیٹھ نوید کا بنگلا بھی اس کے دفتر سے قریب ہی تھا، میں ایک چکر وہاں کا پہلے ہی لگا چکا تھا۔ یہ ایک نئی رہائشی اسکیم تھی، اگرچہ بیشتر بنگلے کوٹھیاں ایستادہ ہو چکی تھیں، اور کچھ تعمیر کے مرحلے میں تھیں، جس سبب بنگلے اور دفتر کے گردوپیش کچھ زیرِ تعمیر عمارتی ڈھانچے کھڑے تھے اور وہاں سناٹے اور خاموشی کا راج تھا۔

ایسے ہی ایک سنگی ڈھانچے کے پاس کار.... روکی اور اس کا انجن بند کر دیا۔

یہاں سے میں بیک وقت دو جگہوں پہ نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ دفتر اور اس کے بنگلے کی طرف جانے والا وہ راستہ جو آٹھ دس فرلانگ کے بعد بائیں جانب کو گھوم رہا تھا۔

جہاں میں کار سمیت موجود تھا، یہاں جابجا ریتی بجری کا ڈھیر اور دیگر ریختہ پھیلا ہوا تھا اور کچھ ادھ بھرے پلر ایستادہ تھے، اسی لیے مطمئن تھا کہ یہاں سے مجھ پر فوری طور پر کسی کی نگاہ نہیں پڑ سکتی تھی۔ لہٰذا میں اندر اپنی ڈرائیونگ سیٹ پر ہی بیٹھا رہا تھا۔

سہ پہر ہلکی شام میں ڈھلنے لگی تھی، آسمان صاف اور فضا جامد تھی، تاہم موسم کچھ خوشگوار ہی تھا، ڈھلتی ہوئی سنہری دھوپ میں ایک عجیب سی خاموش اُداسی کا عنصر محسوس ہوتا تھا۔

ایک جانب وسیع میدان تھا اور وہاں کچھ لڑکے کرکٹ اور فٹ بال کھیل رہے تھے۔

اچانک میں چونکا۔ عین میرے خیال کے مطابق، ”گوگو انٹر پرائزز“ کے مین گیٹ سے میں نے عارفہ کو اکیلے نمودار ہوتے نہیں دیکھا تھا، اُس کے ہمراہ سیٹھ نوید بھی تھا۔ گاڑیاں دونوں کے پاس تھیں لیکن وہ عارفہ کے ساتھ اُسی کی کار کی جانب بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنی کار کے اگنیشن سوئچ میں لگی چابی گھما دی۔ ہلکی سی غراہٹ سے انجن بیدار ہو گیا۔

ونڈ اسکرین کے پار میری نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ عارفہ کی کار میں سوار ہوتے تک سیٹھ نوید اپنی گردن گھما گھما کر اطراف کا جائزہ بھی لیتا جا رہا تھا۔ وہ عارفہ کی ڈرائیونگ والی سیٹ کے برابر ہی بیٹھا تھا۔ کار آگے بڑھی، مگر میں اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں، آس پاس کا زیرِ تعمیر علاقہ زیادہ تر غیر آباد ہونے کی وجہ سے میدانی ہی نظر آتا تھا۔

جب کار مین روڈ والے راستے کے بجائے دوسرے راستے پر ہولی تو میں نے اپنی کار آگے بڑھا دی۔ مذکورہ راستہ جو بلاشبہ سیٹھ نوید کے بنگلے تک ہی جاتا تھا، اُس پر کار آتے ہی دوڑ پڑی، مجھے اندازہ ہوا کہ عارفہ خاصی ”رف“ ڈرائیونگ کرنے کی عادی تھی۔

مجھے ان کی متوقع منزل کا بہ خوبی اندازہ تھا اسی لیے میں نے براہِ راست ان کے تعاقب کا خطرہ مول لیے بغیر۔ ایک دوسرے نسبتاً کچے راستے پر اپنی کار کا رخ کر دیا۔ سنسان اور قدرے کھلا میدانی علاقہ ہونے کے باعث انہیں تعاقب میں آتی میری کار کا اندازہ ہو سکتا تھا اسی لیے میں نے متبادل راستہ اختیار کیا تھا۔

بہ مشکل دس منٹ لگے تھے، مقررہ جگہ پر پہنچنے میں اور میں نے دیکھا کہ وہاں ان کی کار بھی پہنچ چکی تھی اور اب وہ دونوں نیچے اُتر رہے تھے۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچے، ونڈ اسکرین کے پار ان پر نظریں جمائے ہوئے تھا اور سوچ رہا تھا کہ سیٹھ نوید، عارفہ کو اپنے بنگلے پر کیوں لایا تھا؟ کیا باتی کی کوئی منصوبہ بندی کرنے کے لیے یا کسی اور مقصد کے لیے؟ جبکہ عارفہ کے ہار سنگھار سے کچھ اور بات بھی سمجھ میں آتی تھی۔

”تو کیا یہ نودولتیا سیٹھ۔ اتنے بڑے گھر میں بالکل اکیلا رہتا ہے؟ آخر اس کا حدود اربع کیا ہے؟“ میں سوچنے لگا۔ مجھے ابھی تک اس سے متعلق کچھ زیادہ تفصیل معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ اس سلسلے میں مجھے جمال ہی بتا سکتا تھا، اور اس سے مجھے ابھی تفصیلی بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔

وہ دونوں اندر جا چکے تھے اور میں کار سے نیچے اُتر آیا تھا۔ اطراف میں گھلنے والی شام کی ملگجی سی تاریکی مجھے تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ میں اسی کی آڑ لیتا ہوا محتاط روی سے چلا، بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ نیا رہائشی علاقہ ہونے کی وجہ سے اطراف میں ویرانی کا راج تھا، البتہ روشنی کا خاطر خواہ بندوبست کیا ہوا تھا، اور سیکیورٹی بس اسی حد تک تھی کہ ہر بنگلے کے گیٹ پر کوئی نہ کوئی گن مین یا چوکیدار موجود نظر آتا تھا۔ سیٹھ نوید کے بنگلے پر بھی دو چوکیدار تھے۔ ایک ڈنڈابردار اور دوسرا بندوق بہ دست۔

بنگلے کے اطراف میں بھی تعمیر شدہ اور زیرِ تعمیر گھر تھے، ان میں کچھ ویران تھے، مگر اِکا دُکا مزدور ٹائپ افراد

چار پائی پر بیٹھے بیڑی پیتے دکھائی دیے۔

میں ایک بڑا چکر کاٹ کر بنگلے کے پچھواڑے آیا تو یہاں بھی یہی صورت حال تھی۔ میں نے پُرسوچ انداز میں اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ دفعتاً مجھے ایک جگہ لوڈر کھڑا دکھائی دیا، جس سے پلر کھڑے کیے جاتے تھے اور ریتی بجری کی مکسنگ کی بھی اس کے ساتھ مشین اٹیچ تھی، یہ بنگلے کے قدرے قریب ہی کھڑا تھا، میں چار پائیوں پر بیٹھے افراد کی نگاہ سے بچتا بچاتا اسی طرف بڑھا اور پھر میرا کام آسان ہوتا چلا گیا۔

لوڈر پر چڑھتے ہی، میں نے اس کے ایک لمبے اور آگے کو نکلے ہوئے آہنی راڈ پر جھولتے ہوئے، بنگلے کی ایک دیوار تک ہاتھ بڑھا کر رسائی حاصل کی اور پھر بے آواز دوسری طرف کود گیا۔

گن گن لیتے تک میں چند ثانیے وہیں دبکا رہا پھر آگے قدم بڑھائے، کہیں کسی کتے کے ہلکے سے بھونکنے کی آواز آئی تھی، میں بنگلے کی عقبی راہداری میں اُترا تھا، اور وہاں سے میں نے دائیں جانب پیش قدمی کی اور ایک بالکونی ...ٹاپ کر اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا۔

بنگلے میں خاموشی کا راج تھا اور اندازہ ہوتا تھا کہ سیٹھ نوید کے علاوہ اور کوئی یہاں نہیں رہتا ہوگا۔ کم از کم اس وقت تو نہیں تھا ان دونوں کے علاوہ۔

میں ایک کمرے سے ہوتا ہوا، اندازے سے نشست گاہ کی طرف آیا تو وہاں مجھے، ہنستی ہوئی نسوانی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹکا۔

کمروں کی بیشتر لائیٹس بجھی ہوئی تھیں اور کسی میں ہلکے پاور کے بلب روشن تھے۔ ایک کھڑکی سے میں نے اندر جھانکا اور فوراً ہی لاحول پڑھ کے وہاں سے اپنی نظریں ہٹالیں۔ دونوں اندر ''اٹکھیلیوں'' میں مصروف تھے۔ اور سیٹھ نوید، عارفہ پر ریشہ خطمی ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اب کھڑکی کے پردے کو سرکا کے وہاں آنکھوں کی جگہ اپنے کان لگا دیے۔

''جان! آج کی رات ٹھہر جاؤ نا... کتنا انتظار کیا ہے میں نے تمہارا۔ پلیز۔''

یہ سیٹھ نوید کی آواز تھی۔ دوسری کھنکتی آواز عارفہ کی اُبھری۔

''ارادہ میرا بھی یہی تھا، لیکن آج تمہارے آفس میں اُس لوفر کی اچانک اور غیر متوقع آمد نے مجھے بہت پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے میرا اب یہاں رات گزارنا ممکن نہیں رہا۔''

''اس کی کیوں فکر کرتی ہو جانم! وہ واقعی ایک لوفر ہے، ایک تیسرے درجے کا لوفر۔ اُس سے تو پولیس ہی نمٹ لے گی۔'' سیٹھ نوید نے اسے تسلی دی تو عارفہ کی متوحش سی آواز اُبھری۔

''مگر میں ایسے لوفروں سے ڈرتی ہوں، تم نے دیکھا نہیں کس طرح مجھے دھمکیاں دے رہا تھا، مجھے اُس کی آنکھوں میں ایک جنون کی سی کیفیت مترشح ہوتی نظر آئی تھی۔ خون اُترا ہوا تھا اس کی آنکھوں میں۔ پتا نہیں اُسے کیسے اس بات کا پتا چل گیا کہ میں نے ہی امریکی خفیہ اداروں سے اپنی جان چھڑانے کے لیے عابدہ کو دھوکے سے پھنسوا دیا تھا۔''

''میں کہہ رہا ہوں ناں جان! اس کی فکر نہ کرو تم۔ میں جو موجود ہوں۔ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' سیٹھ نوید بولا۔

''تم، پلیز! یہ بابا جی والا معاملہ نمٹا دو، کہیں ہم دونوں ہی نہ پھنس جائیں، شہزی کو ہم پر سو فیصد شبہ ہو چکا ہے۔''

عارفہ کی اس بات پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔ اور سرمد بابا کے ذکر پر تو میں سرتا پا گوش بر آواز بن چکا تھا۔ پھر میں نے اس تیس مار خاں سیٹھ نوید کی آواز سنی۔

''وہ بہت ہٹیلا بڈھا ہے۔ سہیل بتا رہا تھا کہ مان کے نہیں دے رہا ہے وہ۔ مر جائے گا مگر وہ شیئرز ہمارے ہاتھ میں نہیں دے گا۔ تم سے ایک غلطی ہوگئی جان! اگر تم وہ شیئرز بھی اس بڈھے سے لے کر اپنے نام کروا لیتیں تو بہت آسانی ہوجاتی۔''

''اُس بڈھے نے تمہیں پہچان تو نہیں لیا ہے؟''

''نہیں، میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں کہ خود کو اس کی نظروں میں لاؤں، میں نے اس پر یہی ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اُسے یرغمال بنانے والے لوگ وہی ہیں، جو اس سے اڑیسہ کمپنی کے شیئرز ہر قیمت پر حاصل چاہتے ہیں۔'' سیٹھ نوید نے جواب دیا۔

''چلو، یہ تو تم نے عقل مندی کا کام کیا لیکن اب کیا کیا جائے؟ شہزاد ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ بڑا چلتا پُرزہ ہے۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ اس بڈھے کا سُراغ نہ لگا لے؟ اب کیسے نمٹاؤ گے یہ معاملہ؟'' عارفہ کو فکر کھائے جا رہی تھی۔

''کہا ناں جان! آج سہیل آخری کوشش کرے گا اُس بڈھے کو منانے کی۔ مگر سوال وہی پیدا ہوتا ہے، وہ مر جائے گا، مگر ہماری بات نہیں مانے گا، مجھ سے ایک غلطی

ہوگئی، مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا۔ اگر تم ساتھ دو تو؟''

''میں تو تمہارے ساتھ ہی ہوں، بولو، کیا کرنا چاہتے ہو؟''

''اس بڈھے کی کمزوری سے میں واقف ہوں، اگر تم ذرا اپنا دل بڑا کرو تو ایک اور حل بھی ہے میرے دماغ میں۔''

''کیا کرنا چاہتے ہو تم؟''

''ایک اور اغوا۔''

''کس کا؟''

تمہارے دونوں بچوں، پنکی اور دانی کا۔''

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم؟''

''ہاں یہ بکواس ہی ہے۔'' وہ ہنسا۔''یہ محض ایک ڈراما ہوگا۔ دونوں بچوں کو کچھ بھی نہیں ہوگا۔ انہیں اس بڈھے کی نظروں کے سامنے لا کر دوسرے انداز سے دھمکانا ہوگا۔ بچے اس کی کمزوری ہیں اور پھر وہ تو اس کے پوتے ہیں۔ اس طرح وہ مجبور ہوجائے گا ہماری بات ماننے پر۔''

''نن... نہیں، میں اپنے بچوں کی زندگیاں اس طرح داؤ پہ ہرگز نہیں لگانے دوں گی۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا تھا کہ اپنا دل بڑا کرو... ارے بابا! یہ محض ایک ڈراما ہوگا، اس بڈھے کو جھکانے کے لیے۔ بچوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ وہ میرے آدمیوں کے پاس بالکل آرام سے ہوں گے۔''

ایک طویل پُرسوچ وقفہ گزرا۔ عارفہ کو ہامی بھرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ ماں تھی دونوں بچوں کی، لاکھ تسلیاں دینے کے باوجود اس کا دل اس ڈرامے کو تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ اُسے کافی دیر تک خاموش اور سوچتا پا کر عیار سیٹھ نے اُسے محبت سے سمجھانے کی کوشش چاہی۔

''دیکھو جان! کیا تمہیں مجھ پر بھروسا نہیں ہے؟ ہم مستقبل میں ایک دوسرے کا جیون ساتھی بننے کا عہد کر چکے ہیں۔ پھر پنکی اور دانی کو تو میں بھی ایک باپ کا ہی پیار دوں گا، بھلا میں یہ کیسے چاہوں گا کہ انہیں ذرا سی بھی تکلیف ہو۔ وہ دونوں بچے میرے آدمیوں کی حفاظت اور پناہ میں ہوں گے۔ بس! ایک ڈراما کرنا ہے، اور مجھے اس ڈرامے کی کامیابی پر سو فیصد اُمید ہے، اس کے بعد سارے مسئلے سمجھو چٹکی بجاتے ہی حل ہو جائیں گے۔ اب ایک گوٹ ہماری پھنس گئی ہے تو کیا کیا جائے؟ یہی ایک حل ہے۔''

خاموشی کے ایک وقفے کے دوران سیٹھ نوید کی دوبارہ آواز اُبھری۔ وہ مکار اُسے لُبھانے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔''دیکھو ڈارلنگ! آئندہ کی خوشگوار اور مسرتوں بھری زندگی کے لیے انسان کو کچھ خطرات مول لینے ہی پڑتے ہیں اور پھر اس میں کیا خطرہ ہے؟ یہ کون سا سچ مچ ہونے جا رہا ہے؟ اس کے بعد ہماری پُرمسرت اور شادمانیوں سے بھرپور زندگی منتظر ہوگی، جہاں صرف تم اور میں ہوں گے، میں نے تو سوچ بھی لیا ہے کہ شادی کے بعد ہم سوئٹزر لینڈ جائیں گے۔ وہ ایک الگ ہی خوابوں کی دنیا ہے۔ بس! اب یہی ایک حل ہے ان ساری خوشیوں کو پل بھر میں اپنا لینے کا۔''

''تت... تمہیں یقین ہے کہ اس ڈرامے میں تم بغیر کسی نقصان کے کامیاب ہو جاؤ گے؟'' بالآخر عارفہ کی مُرتعش سی آواز اُبھری جس میں نیم رضامندی کی جھلک بدرجہ اُتم موجود تھی۔

''شیور ڈارلنگ! وائے ناٹ۔ منصوبہ بے داغ اور سو فیصد کامیابی کی ضمانت ہے، کیونکہ وہ میرا منصوبہ ہے، اور میرا کوئی بھی منصوبہ آج تک ناکام نہیں ہوا۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''میرے بچے خوف زدہ ہوجائیں گے، کیونکہ وہ کبھی ایسے حالات سے نہیں گزرے۔''

''میں جانتا ہوں، مگر یہ سب بہت قلیل مدت کے لیے ہوگا، اب ہمیشہ کی خوشیاں حاصل کرنے کے لیے ہمیں یہ کڑوا گھونٹ تو پینا ہی ہوگا، تم فکر نہ کرو جان! پنکی اور دانی کو میں اپنے بچے ہی سمجھتا ہوں۔ میں اُن پر ایک ذرا آنچ تک نہ آنے دوں گا۔ اٹس مائی پرومس۔''

اس میں کوئی شک نہ تھا کہ اس کمینے اور عیار شخص نے سرمد بابا کو جھکانے کے لیے بڑا جامع اور بے داغ منصوبہ بنایا تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہ اپنے دونوں پوتوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی خاطر وہ شیئرز تو کیا اپنی جان بھی دُشمن کے قدموں میں رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے۔ کیونکہ ایک باپ سے زیادہ ایک دادا کو اپنے پوتوں سے محبت ہوتی ہے۔ اور سرمد بابا پنکی اور دانی سے ایسی ہی محبت کرتے تھے۔

یوں تو میرا اپنا خیال بھی یہی تھا کہ سرمد بابا کو سرے سے ہی اس خطرناک معاملے میں نہیں پڑنا چاہیے تھا، جو وہ کر رہے تھے وہی کرتے رہتے آرام سے اور اللہ اللہ کرتے، اب ان کی عمر کاروبار کے اتنے بکھیڑے پالنے کی بھی نہ رہی تھی۔ یہ بھی شکر تھا کہ ساٹھ فیصد شیئرز کی قیمت انہیں مل رہی تھی، وہ نہیں جانتے تھے لولوش کو کہ وہ کس قدر خطرناک آدمی ہے، اور اُس کے کتنے روپ ہیں۔ نیز کتنا بڑا ''ڈون'' ہے وہ۔ تاہم بوڑھے آدمی تھے اسی لیے ضد اور انا کے پکے تھے۔

میرا تجزیہ سو فیصد درست ثابت ہوا تھا۔ سرمد بابا کا غیاب سیٹھ نوید اور عارفہ کا مشترکہ منصوبہ تھا۔

''کب تک اس منصوبے پر تمہارا عمل کرنے کا ارادہ ہے؟''

مجھے عارفہ کی آواز سنائی دی۔ میں اب کھڑکی کے پردے سے کان ہٹا کر اپنی آنکھیں چپکا کر دیکھنے لگا۔ اب وہ دونوں تہذیب کے دائرے میں رہتے ہوئے آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ چکے تھے۔

''کل بچے اسکول جائیں گے؟''

''ہاں۔''

''بس! تو کل ہی میں سہیل کو سمجھا دوں گا اور بتا بھی دوں گا کہ دونوں بچوں پر ہلکی سی بھی آنچ نہیں آنی چاہیے۔ انہیں وہ ان کے اسکول سے اغوا کرلے۔'' سیٹھ نوید نے کہا۔

''میں اب چلوں گی۔'' عارفہ اُٹھ کھڑی ہوئی، نوید بھی اس کے ساتھ اُٹھتے ہوئے بولا۔

''اتنی جلدی۔ ابھی تو ہم نے...''

''نہیں، میرا موڈ ذرا آف ہوگیا ہے۔'' عارفہ بولی۔ ''تم جلد از جلد یہ معاملہ نمٹا دو اور بچوں کو ایک دن سے زیادہ میں خود سے دور نہیں رکھ سکتی۔''

سیٹھ نوید نے سچویشن کو سمجھتے ہوئے مکاری سے کہا۔ ''یہ بھی ٹھیک ہے، مجھے تمہارا اطمینان اور سکون زیادہ عزیز ہے، تم گھر جاؤ اور ریلیکس ہونے کی کوشش کرو، میں کل ہی یہ کام نمٹا دوں گا۔ بچوں کے بارے میں اگر تم سے کوئی... پوچھے تو کوئی بھی بہانہ کر دینا۔''

''کیا بہانہ کروں؟ نوکروں اور ملازموں سے کیا کہوں گی بچوں کے بارے میں؟ کچھ تو بتانا پڑے گا ہی انہیں۔ اور پھر گھر آنے کے بعد پنکی اور دانی کے ذہنوں میں بھی یہ خیال ضرور اُبھرے گا کہ آخر اُن کے ساتھ یہ سب ہوا کیا تھا؟''

''تو پھر ایک کام کرنا۔'' سیٹھ نوید کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ''تم ایک پریشان اور خوف زدہ ماں کی ایکٹنگ کرتے ہوئے، انہیں یہی بتانا کہ بچے اغوا کیے جا چکے ہیں اور اغوا کرنے والوں نے یہ دھمکی دی ہے کہ کسی کو اس کی خبر نہ کی جائے اور خاموشی سے تاوان مقررہ جگہ پر پہنچا دیا جائے، دیٹس آل۔''

عارفہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے دل ہی دل میں اس فاحشہ، دغا باز اور مطلب پرست عورت پر ایک لعنت بھیجی کہ ایسے اپنی خوشیوں اور بوالہوسیوں سے بڑھ کر کوئی شے عزیز نہ تھی۔ وہ جس کھیل کو محض ڈراما سمجھ رہی تھی، وہ حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا تھا۔ چلو، یہ بھی اتنے ڈر کی بات نہ تھی، اس عورت نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ محض ڈراما سہی، مگر اس طرح اس کے دونوں معصوم بچوں کے ذہنوں پر کس قدر منفی اثر پڑ سکتا تھا۔ مگر عارفہ کو سیٹھ نوید نے خوش آئند مستقبل کے جو سبز باغ دکھائے تھے، اُس نے اس عورت کو اندھا کر دیا تھا۔ اگرچہ ایک ماں کے دل نے اس کے اندر کچوکا تو لگایا تھا، مگر جلد ہی سیٹھ نوید نے اپنی چکنی چپڑی باتوں سے اُسے رام کر ہی لیا تھا۔

آخر میں ان کے درمیان اڑیسہ کمپنی کے شیئرز سے متعلق بھی گفتگو ہوئی تھی اور عارفہ نے پوچھا تھا کہ اس کی امریکی سوداگر لولوش سے بات ہوئی؟ تو سیٹھ نوید نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے اُس سے یہی کہا کہ وہ پہلے منصوبے پر عمل کرتے ہوئے اس سے باقی کے پچاس شیئرز کی خریداری کے سلسلے میں بات کرے گا، نہ مانا تو اس سے اُلجھنا خطرناک ہوگا، پھر ہمیں ہی باقی کے اپنے پچاس فیصد شیئرز اُسے فروخت کرنا ہوں گے۔ مگر یہ سب تب ہی ممکن ہوگا جب وہ شیئرز ہمارے ہاتھ میں ہوں گے۔ وغیرہ۔

عارفہ اس کی بات سن کر کچھ مطمئن ہوئی کچھ نہیں، تاہم تھوڑی دیر بعد وہ اس سے رُخصت ہو کر چلی گئی۔ سیٹھ نوید وہیں کھڑا چند ثانیے کچھ سوچتا رہا، اس کے بعد اس نے اپنے سیل پر کسی کا نمبر ملایا۔ میں دھڑکتے دل سے اس پر آنکھیں لگائے ہوئے سراپا سماعت بنا، کھڑکی کے پیچھے کھڑا تھا۔

''ہاں سہیل! کیا صورتِ حال ہے؟ منہ کھولا اس بڈھے نے؟ نہیں۔ مائی فٹ! خیر، میں نے اس کا ایک حل ڈھونڈ لیا ہے۔ تم ایسا کرو اسی وقت میرے پاس پہنچو۔ اوکے۔ بائے۔''

اس نے سیل ایک طرف صوفے پر اُچھال دیا اور ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتا ہوا دوسرے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

سہیل نامی اپنے آدمی سے بات کرنے کے بعد مجھے پتا چلا کہ سرمد بابا اس وقت کس کے قبضے .... میں تھے، اور وہ خود بھی ادھر ہی کسی وقت پہنچنے والا تھا۔ ورنہ تو میں نے یہی سوچ رکھا تھا کہ عارفہ کے جاتے ہی میں سیٹھ نوید کو زدوکوب کر کے سرمد بابا کے بارے میں اُگلوانے کی کوشش کروں۔ مگر اب ایک طرح سے براہِ راست خود ہی کام آسان ہو رہا تھا، تو مجھے کسی لمبے چکر میں ہاتھ ڈالنے کی کیا

دلکش کہانیوں و دیگر دلچسپیوں کا حسین مرقع نومبر 2015ء کا دل خوش کن پاکیزہ
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
نگہت سیما اور قیصرہ حیات کے خوبصورت قسط وار ناول
در ثمن بلال کے حسین ناول کی اگلی جاندار قسط
شیریں حیدر نے پردہ اٹھایا کچھ دلدوز حقائق سے اپنی بھرپور تحریر...... زندگی خاک نہ تھی...... میں
نبیلہ ابر راجا کے تجسس سے بھرے ناولٹ متاع دل کی آخری قسط
بشریٰ گوندل ایک بھرپور مکمل ناول کے ہمراہ
ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کے پرروح سفر کی عقیدت بھری داستان
انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتی
ہماری مایہ ناز مصنفہ رفاقت جاوید
سے خوب صورت ملاقات
علاوہ ازیں......
سیما سراج، قانتہ رابعہ، فرحین اظفر،
نزہت جبیں ضیا، نگہت اعظمی و دیگر رائٹرز کی پرحیرت کاوشیں
اس کے ساتھ ساتھ مثبت تفریحی معلومات سے مزین مستقل سلسلے صرف آپ کی خوش ذوقی کی نذر

ضرورت تھی۔

تاہم سہیل کے آنے تک میرے پاس کچھ وقت تھا۔ نوید بھی شاید فریش ہونے کے لیے اپنے کمرے کی طرف چلا گیا تھا۔ بہت سی باتیں میرے علم میں آچکی تھیں، اسی لیے میں کافی مطمئن تھا، ایسے میں عموماً متوقع کامیابی کے جوش میں انسان سے جلد بازی میں غلطی بھی ہو جایا کرتی ہے۔ میں سوچ سمجھ کر اگلا قدم اُٹھانا چاہتا تھا، تاکہ ہاتھ آئی بازی نکل نہ جائے، میری کوشش یہی تھی کہ عارفہ اور سیٹھ نوید کے اگلے پلان پر عمل ہونے سے پہلے ہی میں سرمد بابا کو بازیاب کروالوں۔

تھوڑی دیر گزری تھی کہ ایک تیس پینتیس سالہ شخص وہاں آن پہنچا، سیٹھ نوید اب عام سے لباس میں تھا، دونوں کی گفتگو سے مجھے تسلی ہوگئی کہ نووارد سہیل ہی تھا، نیز ان کی گفتگو کا لب لباب بھی عمومی نوعیت کا تھا اس لیے میں نے وہاں سے نکلنے کا ارادہ کیا اور جس راستے اور جس طریقے سے آیا تھا اسی سے واپس بنگلے سے باہر آگیا اور سیدھا اپنی کار کا رُخ کیا۔

رات ہو چلی تھی۔ میں اپنی کار میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے ہوئے ونڈ اسکرین کے پار بنگلے کے گیٹ پر نظریں جمائے ہوئے خاموش بیٹھا تھا، وہاں مجھے ایک ٹویوٹا جیپ کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

کچھ منٹوں بعد ہی میں نے سہیل کو گیٹ سے نمودار ہوتے دیکھا اور میرے اعصاب تن گئے۔ وہ اپنی جیپ میں سوار ہوا اور ایک طرف روانہ ہوگیا، جیپ حرکت میں آتے ہی میں نے بھی اپنی کار اس کے تعاقب میں لگا دی۔

علاقہ قدرے سنسان ہونے کے باعث تعاقب کا شبہ ہو سکتا تھا اسی لیے میں نے ہیڈ لائٹس گل کر رکھی تھیں، تاہم اتنا بھی اندھیرا نہ تھا کہ مجھے راستہ سجھائی نہ دیتا، جبکہ سہیل کی جیپ کی بیک لائٹس میری راہنمائی کر رہی تھیں۔

مین روڈ پر آتے ہی جیپ نے رفتار پکڑ لی اور میں نے بھی اپنی کار کی بتیاں جلا دیں، اور محتاط روی کے ساتھ اس کے تعاقب میں رواں دواں ایک ایسے علاقے تک جا پہنچا، جو بہ مشکل دو تین کلومیٹر ہی کے فاصلے پر تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ یہ علاقہ سرمد بابا کی رہائش گاہ سے زیادہ دور نہ تھا اور متوسط علاقہ ہی کہلاتا تھا، جو ڈیرا بستی جانے والی سڑک کے کنارے پر تھا۔ ایک مختصر سے چوراہے پر جیپ دائیں جانب کو مڑ گئی، میں نے بھی ذرا فاصلہ رکھ کر اسی طرف اپنی کار موڑ دی۔ علاقے میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک بار پھر اپنی کار لائٹس آف کر دیں اور جیپ کی بیک لائٹس کے سہارے تعاقب جاری رکھا۔

ایک موقع پر میں کھٹک گیا۔ جیپ ایک دوسرے راستے سے دوبارہ کھلی سڑک پر آگئی۔ یہ وہی مین روڈ تھی جس پر کچھ دیر پہلے ہم محوِ سفر تھے۔

"ہوں۔ تو اسے شبہ ہو گیا ہے۔" میرے ذہن... میں اُبھرا اور پھر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی کار کی رفتار ایک دم تیز کر دی۔ اسی وقت جیپ نے بھی رفتار پکڑی، سہیل راہِ فرار اختیار کرنے لگا تھا۔ سڑک پر زیادہ ٹریفک نہ تھا، تاہم میں جیپ کا پیچھا کرتا رہا، آگے ایک موڑ پر جیپ کی رفتار کچھ ہلکی ہوئی، لیکن میں نے اپنی کار کی اسپیڈ کم کرنے کے بجائے مہارت کے ساتھ کنارے میں... اتاری اور تیزی سے موڑ کاٹا، چونکہ میں اپنی کار کو بغیر کسی خطرے کے موڑ کاٹنے کا زاویہ بنا چکا تھا اسی لیے میں چشمِ زدن میں سہیل کے سر پہ جا پہنچا اور کار یکدم اُس کی جیپ کے آگے، راستہ روک کر کھڑی کر دی۔

عقب سے آنے والی چند گاڑیوں نے ہارن پہ ہارن دینا شروع کر دیے، اسی وقت سہیل نے اپنی جیپ ریوس کرنا چاہی تھی جو اس کے پیچھے کھڑی ایک بلیک کرولا سے جا ٹکرائی، اور پھنس گئی۔ مفر کی راہ نہ پاتے ہوئے، اس نے پستول نکالا اور کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا، وہ مجھے گولی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا مگر میں اسے اب کہاں نظر آتا، کار کی ڈرائیونگ سیٹ میں چھوڑ چکا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے کھڑکی سے اپنا سر اور پستول والا ہاتھ نکالے میری خالی کار کو تکے جا رہا تھا اور اُسے پتا بھی نہ چلا کہ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے برابر والی سیٹ کا دروازہ پھرتی سے کھولتے ہی میں نے اس پر اپنا پستول تان لیا اور غراتے ہوئے بولا۔

"حرکت مت کرنا، اور خبردار! پستول پھینک کر ہی کھڑکی سے ہاتھ اندر کرنا۔"

وہ پریشان سا ہوگیا۔ عقب میں رُکنے والی گاڑیوں نے جیسے ہی خطرے کی بو سونگھی، پھر تو جسے جہاں موقع ملا وہ اُدھر ہی مڑ کے آگے یا پیچھے ہولیا۔

میری نظریں سہیل پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کیا تھا، پستول پھینک کر اس نے میری طرف دیکھا، میری نال کا رُخ اس کے چہرے کی طرف تھا۔

"نکلو باہر۔ جلدی۔" میں نے دُرشتی سے دوسرا حکم دیا، اور پستول کی نال کا رُخ اسی کی جانب کیے رکھا۔ وہ باہر اُتر آیا، میں نے ذرا فاصلہ رکھا اور اُسے اپنی کار کی جانب

بڑھنے کا اشارہ کیا، وہ پلٹا اور پلٹتے ہی میرے پستول والے ہاتھ پر جھپٹا۔

اس کے اس اچانک مگر متوقع وار سے میں نے اپنے پستول والے ہاتھ کو جھکائی دے کر بچایا اور خود اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی۔ وار خالی جانے کے باعث وہ میری طرف کافی آگے تک جھک آیا تھا، تبھی میرے دوسرے ہاتھ کا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر پڑا اور وہ اپنے حلق سے اُوغ کی آواز سے پیچھے کو اُلٹ گیا۔

میں نے اپنا پستول پینٹ کی بیلٹ میں اڑسا اور آگے بڑھ کر اُسے گردن سے دبوچ لیا۔ وہ درمیانے قد کاٹھ کا خاصا تنومند آدمی تھا۔ رنگت سانولی تھی اور چہرے سے ہی بدقماش دکھائی دیتا تھا، مگر ٹھوڑی پہ پڑنے والے میرے ایک ہی زوردار گھونسے نے اس کی طبیعت صاف کردی تھی۔

اپنی کار کے پاس گھسیٹنے تک اس کے حلق سے جانے کیا کیا اول فول اُبلتا رہا، مگر میں اُسے اپنی کار تک کھینچ لے آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ پہلے ہی کھلا ہوا تھا جسے میں نے لات کے بند کیا اور اسے دبوچے دوسری طرف کا دروازہ کھول کر اندر ڈرائیونگ سیٹ پر دھکیلا پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

کار اسٹارٹ کی اور غراتے ہوئے خار کھائے لہجے میں کہا۔ ''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے سیٹھ نوید سانچے والا کے کہنے پر منظور وڑائچ صاحب کو کہاں یرغمال بنا رکھا ہے۔ اور یہ بھی کہ تمہارا نام سہیل ہے۔ یہ کار اسی سمت موڑ لو ورنہ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''تم کیا کہہ رہے ہو؟ میں کسی... آہ...'' اس کے جملہ مکمل کرنے سے پہلے ہی میں نے اس کے جبڑے پر ایک گھونسا رسید کردیا، اس کی داڑھ کی طرف کے دانت ہل گئے اور ایک دو ٹوٹ بھی گئے تھے کیونکہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا تھا۔

''میرے ساتھ جمناسٹک مت کرو، سمجھے، ورنہ تمہارے ہر جھوٹ پر میں ایسے ہی تم پر گھونسے برساتا رہوں گا۔'' میں نے وحشیانہ غراہٹ سے کہا اور... اُسے وہیں چلنے کو کہا۔

اس کے چہرے سے اب بے بسی جھلکنے لگی تھی اور اذیت کے آثار رسوا تھے۔ بالآخر اس نے کھڑکی سے باہر خون تھوکا اور کار آگے بڑھا دی۔

تھوڑی دیر بعد کار اسی علاقے میں داخل ہوگئی۔ اب یہاں مجھے ایک شش و پنج نے گھیر لیا کہ کیا ضروری تھا یہ کمبخت مجھے اُسی جگہ لے جاتا، جہاں سرمد بابا کو یرغمال بنا کر رکھا گیا تھا؟ وہ مجھے چالاکی سے پھنسا بھی سکتا تھا، اُس کے ساتھی بھی وہاں موجود ہوسکتے تھے، جن سے مجھے بھڑنا بھی پڑتا۔

''کار اپنے ٹھکانے سے چند قدموں کے فاصلے پر روکنا۔ سمجھے؟'' میں نے تحکمانہ دُرشتی سے کہا اور اس نے ایک گلی پار کرنے کے بعد بائیں جانب کار موڑ کر روک لی۔ پہلے میں نیچے اُترا اور پستول نکال لیا۔ پھر اُسے نیچے اُترنے کا کہا۔

''کون سا ٹھکانا ہے؟'' میں نے اس کے قریب آکر پوچھا۔ وہ میرے گن پوائنٹ پر تھا۔

''وہ سامنے ایک گلی ہے، اس کے اندر۔'' اس نے چاروناچار جواب دیا۔ اس کے منہ سے ابھی تک خون نکل رہا تھا، شاید اس کی داڑھ اندر گہرائی تک ٹوٹ گئی تھی اور خون بند نہیں ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ منہ پر رکھا ہوا تھا۔

''دیکھو، میں آخری بار کہہ رہا ہوں، مجھ سے کسی قسم کا دھوکا تمہیں مہنگا پڑے گا۔ جس کی ایک جھلک تم دیکھ ہی رہے ہو۔'' میں نے فیصلہ کن پیش قدمی کرنے سے پہلے اسے تہدید کرنا ضروری سمجھا۔

''اب بتاؤ مجھے، وہاں تمہارے کتنے آدمی موجود ہیں؟ مجھے یرغمالی بھی وہیں ملنا چاہیے، کلیئر؟''

اس نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ ''میں زخمی ہوں، میرا خون بہہ رہا ہے۔ مم...''

میں نے ہونٹ بھینچ کر ایک اور گھونسا اس کے دوسرے جبڑے پہ رسید کردیا۔ اس کے حلق سے ذبح ہوتے بکرے کی سی آواز نکلی اور وہ وہیں زمین پر گر پڑا۔ اور زور زور سے ہانپنے لگا۔ ''تت... تم قسائی! مم... میں تمہیں۔'' وہ بلبلا کر بھونکنے پر آمادہ ہوا تو میں نے اس کا گریبان پکڑ کر دوبارہ اس کے پیروں پہ کھڑا کردیا، ایک نگاہ اطراف پہ ڈالی، دور پرے کچھ سائے متحرک دکھائی دیے تھے، اردگرد قریب میں کوئی نہیں تھا۔

''دیکھو! نہ تم مجھے جانتے ہو، نہ وہ نودولتیا سیٹھ نوید کھانچے یا سانچے والا، اگر جانتے ہوتے تو مجھ سے ٹکر نہیں لیتے، بلاوجہ میرے ہاتھوں سے خرچ ہونے کے بجائے، تعاون کرو یہی تمہارے لیے بہتر ہے، بغیر کسی جھوٹ، دھوکے اور ڈراما بازی کے، مجھے سچ بتاؤ، اور میری بات مت کاٹو۔ سمجھ گئے؟''

میں نے پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

''وہاں صرف دو ساتھی موجود ہیں، یرغمالی بھی وہیں ہے۔''

"ہوں... چلو اب آگے چلو۔ رومال ہے تمہاری جیب میں؟"

میں نے اس کی تلاشی لی اور رومال نکال کر اس کے حوالے کر دیا، وہ اس نے اپنے منہ پر رکھ لیا۔ اس کی حالت میں نے خاصی خستہ کر دی تھی، وہ اب کسی چون و چرا کے بغیر میرا ہر حکم بجا لانے کے لیے تیار تھا۔ ہم چلتے ہوئے مذکورہ گلی میں داخل ہوئے اور سرے پر ہی وہ مکان تھا جس کی سہیل نے نشاندہی کی تھی۔

مگر یہ دیکھ کر میں چونک گیا کہ دروازے پر تالا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ میں نے خوف ناک نظروں سے سہیل کی طرف دیکھ کر کہا۔

"یہاں تو تالا پڑا ہوا ہے؟" وہ بھی کچھ پریشان سا نظر آنے لگا۔

"مم... مجھے تو نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے وہ دونوں کسی کام سے باہر نکلے ہوں؟"

اس کی بات صحیح لگی۔ میں نے پوچھا۔ "تمہارے پاس اس مکان کی چابی تو ہو گی؟"

دونوں مضروب جبڑوں کی وجہ سے اُسے بولنے میں دقت ہو رہی تھی۔ اس لیے اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ میں نے اس کی بات پر بھروسا نہیں کیا اور اس کی تلاشی لی۔ مجھے اس کی جیب سے چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا ملا، میں نے وہ نکال کر اس کے خون آلود چہرے کی طرف لہرایا۔ "اس میں ہے وہ چابی؟"

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا، مگر میں نے پھر بھی ایک ایک چابی اس تالے پر آزما ڈالی۔

ایک چابی لگ گئی۔ کامیابی کی منزل قریب تھی اس لیے میں نے اس جھوٹ کی سزا کو موخر کر دیا اور دروازہ کھول کو اُسے اندر دھکیلا۔ عقب میں دروازہ بند کیا تو وہ یکدم صحن کے ایک طرف بنی، چھت کی طرف جانے والی سیڑھیوں کی طرف لپکا۔

میں نے پستول نکال کر اس کا رُخ اسی کی جانب کرتے ہوئے ٹریگر دبا دیا، ڈز، کی آواز کے ساتھ ہی اس کی چیخ اُبھری، وہ سرے پر پہنچ کر پیچھے کو اُلٹا اور نیچے لڑھکتا چلا آیا۔ میں نے اُس کی طرف سے نگاہ ہٹا کے اپنی آنکھوں کو تیزی سے گردش دی۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا، سامنے دو ہی کمروں کے دروازے نظر آئے، ایک تو کھلا پڑا تھا دوسرا بند تھا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر دروازے کو لات رسید کر دی، وہ دھڑ سے کھلا۔ ایک پٹ ٹوٹ کر بھی گر پڑا، اندر اندھیرا تھا، میں لائٹ آن کرنے کے لیے ابھی سوئچ ٹٹول ہی رہا تھا کہ ایک کمزور سی لرزتی آواز اُبھری۔

"کک... کون؟"

اس آواز پر میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا۔ یہ سرمد بابا کی آواز تھی۔ اسی دوران میری اُنگلیوں نے سوئچ بورڈ کو چھوا اور لائٹ آن کر دی، سامنے ہی مجھے فرش پر دیوار سے لگے سرمد بابا اس حال میں بیٹھے دکھائی دیے کہ میرے اندر کرب کی لہر سی دوڑ گئی۔ انہیں شاید زیادہ تر اندھیرے میں رکھا گیا تھا، کمرے میں روشنی ہونے سے ان کی بوڑھی آنکھیں چندھیا سی گئی تھیں، یہی وجہ تھی وہ اب اپنی آنکھوں پر ایک ہاتھ کا چھجا سا بنا کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ پہچانتے ہی لرزیدہ آواز میں بولے۔

"شش... شہزی! تم...؟"

وہ رسیوں سے جکڑے ہوئے تھے، اور ان کی ہیئت کذائی دیکھ کر صاف اندازہ ہوتا تھا کہ ان پر تشدد بھی کیا گیا تھا۔ میں فوراً آگے بڑھا اور رسیوں سے .... انہیں آزاد کرنے لگا، مجھے سہیل کے دو ساتھیوں کے لوٹ آنے کا خدشہ تھا، اسی لیے میں جلدی جلدی اپنا کام نمٹانے لگا، بابا بھی خاموش رہے، میں نے انہیں سنبھالا اور صحن میں آ گیا۔ ایک طرف سہیل زخمی حالت میں پڑا کراہ رہا تھا۔

میں دروازے کی طرف بڑھا اور اسی وقت مجھے ایک موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ میں نے سرمد بابا کو اپنے پیچھے کر لیا اور پستول ہاتھ میں لیے باہر جھانکا۔ آنے والے دو تھے، بائیک انہوں نے عین دروازے کے سامنے ہی روکی تھی۔ مجھے یہی سہیل کے ساتھی لگے۔ کیونکہ وہ بھی اسی قبیل کے دِکھتے تھے۔ میرے ہاتھ میں پستول دیکھتے ہی وہ ایک ثانیے کے لیے اپنی جگہ ساکت ہو کر رہ گئے۔ سمجھ تو گئے تھے کہ میں ان کا شکار چھین کر لیے جا رہا تھا اور میرے پیچھے سرمد بابا کی بھی جھلک انہوں نے دیکھ لی تھی۔ سہیل کی طرح یہ بھی مجھے تیسرے درجے کے کھلاڑی لگے تھے، مگر اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بے ضرر تھے۔ میرا تجربہ تھا کہ کبھی کبھی تیسرے درجے کا مجرم بھی ایک بڑی مشکل کھڑی کر سکتا ہے۔ سو میں محتاط ہی تھا اور ابھی انہیں کسی قسم کی تہدید دینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ بائیک پر پیچھے بیٹھے ہوئے شخص نے کوئی "نازیبا" حرکت کرنے کی ٹھانی، مگر میرے پستول کی گولی نے اُسے چیخ مار کے بائیک سے ہی نیچے گرنے پر مجبور کر دیا۔ گولی اس کے دائیں پہلو میں لگی تھی۔ دوسرے پر میری خاطر خواہ دہشت بیٹھی تو اس نے ہلنے کی بھی جرأت نہ

کی مگر یہ میری خام خیالی تھی راستہ صاف جان کر سرمد بابا کو لیے میں نے جیسے ہی دروازے کی چوکھٹ پار کی، اس نے یکدم اپنی بائیک کا ایکسلیٹر گھما دیا۔ بائیک کا اگلا حصہ بلند ہوا اور یہی اس کی وہ چال تھی جس نے مجھے لمحے بھر کو بوکھلا دیا۔ وہ ون وہیلر کا ماہر معلوم ہوتا تھا، بائیک کی زد میں ہم دونوں ہی آ گئے، میں نے سرمد بابا کو سنبھالا اور انہیں ایک طرف دھکا دیا، بائیک کا اگلا وہیل کسی بدمست اُچھلنے والے گھوڑے کی طرح مجھ پر آرہا، مجھے زوردار دھکا لگا اور میں نیچے گر گیا، پستول ہاتھ سے چھوٹا تو بائیک سوار نے دوسری چال یہ چلی کہ بجائے راہِ فرار اختیار کرنے کے، بائیک سے چھلانگ لگا دی۔ بائیک گھوں گھوں کرتی ہوئی اُلٹ پلٹ گئی، اور میں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کے دوران زمین پر گرے پستول کی طرف پیش قدمی کی، مگر اس سے پہلے ہی مدِمقابل نے اپنا پسٹل نکال لیا اور میری طرف اس کا رُخ کر کے گولی چلا دی، میں صاف نشانے پر تھا، اور اتنے قریب سے فائر ہونے والی گولی سے مجھے کوئی معجزہ ہی اب بچا سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے فضا ایک کربناک چیخ سے... گونج اُٹھی۔

☆☆☆

وہ سرمد بابا کی چیخ تھی۔

جانے کب، کیسے اور کس وقت وہ مجھے خطرے میں پا کر اچانک میرے سامنے لڑھکتے چلے آئے تھے اور فائر کی ہوئی گولی انہیں چاٹ گئی تھی، وہ ''دھپ'' کی آواز سے میرے بالکل قریب گرے تھے، اس وقت میں زمین سے اپنا پستول اُٹھانے کے لیے جست لگا چکا تھا، اور وہ میرے ہاتھ میں تھا، دوسرا فائر ہوا، اس بار نشانہ میں ہی تھا، لیکن تب تک میں اپنا پستول ہاتھ میں لیتے ہی بہ سرعت لُڑھکنی لگا چکا تھا اور اسی دوران میں نے مدِمقابل کا نشانہ لے کر گولی داغی، وہ چیخ مار کر گرا، اس کا دوسرا ساتھی جو میری گولی کھا کر زمین بوس تھا، وہ ہنوز بے حس و حرکت تھا۔

علاقے میں بھاگ دوڑ مچ گئی تھی۔ لوگ خوف و ہراس میں تھے۔ جسے جہاں جگہ ملی، دبک کر چھپ گیا۔ میں نے میدان صاف دیکھا اور زخمی سرمد بابا کو اُٹھا کر اپنی کار کی طرف دوڑا، مجھے تو اب ان کے کراہنے کی بھی آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں، جس سے میری تشویش میں اضافہ ہوا جارہا تھا۔ وہ خون سے لتھڑے ہوئے تھے اور میں اُن کے خون سے۔

سرمد بابا کو اس حال میں دیکھ کر میں ہول سا رہا تھا۔ ان ظالموں کی قید میں رہتے ہوئے ان کی حالت پہلے ہی نہایت خستہ ہو رہی تھی، نجانے کس طرح، اور وہ کون سا ایسا جذبہ تھا، جس نے یک دم سرمد بابا کو میری جان بچانے پر اُکسایا اور وہ عین وقت پر میری ڈھال بن گئے۔ ہاں! سمجھ آیا۔ وہ مجھے اپنے مرحوم بیٹے محمود کے روپ میں جو دیکھتے تھے۔ آہ سرمد بابا!

میرا اندر اندر جھیر جھیر ہونے لگا تھا۔ جب دل ڈول رہا ہو تو انسان کے اعصاب بھی جواب دینے لگتے ہیں۔ یہی میری کیفیت ہو رہی تھی۔ میں نے جیسے تیسے سرمد بابا کے بے سدھ وجود کو کار کی پچھلی سیٹ پر لٹایا اور جلدی سے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور قریبی اسپتال کا رُخ کیا۔ اب پرائیویٹ اسپتالوں میں بھی یہ قانون پاس ہو چکا تھا کہ M.L.O. کیس کے چکروں میں پڑے بغیر پہلے مریض کی جان بچائی جائے، یعنی زخمی کو طبی امداد فراہم کی جانی چاہیے۔ یہی کچھ مذکورہ اسپتال کا عملہ کرنے میں مصروف تھا، میں نے انکل جمال کو فون کر کے صرف اسی قدر ہی مطلع کیا کہ وہ فوراً اسپتال پہنچیں، اور عارفہ کو ضرور مطلع کر دیں (عارفہ کو مطلع کرنے کا میں نے مصلحتاً کہا تھا) اس کے بعد میں نے اول خیر سے رابطہ کیا اور اُس سے کہا کہ وہ اسی وقت سرمد بابا کی کوٹھی کے اطراف میں جا کھڑا ہو، اور کسی بھی قسم کی غیر معمولی یا مشکوک نقل و حرکت پر نظر رکھے اور کچھ ایسا محسوس کرے تو مجھے بتا دے۔

اس کے بعد میں نے میجر ریاض باجوہ صاحب سے ان کے پرسنل نمبر پر بات کر کے انہیں ساری بات بتا دی کہ وہ کسی طرح مقامی پولیس انتظامیہ کے افسر سے رابطہ کر کے اُن تینوں مجرموں کے خلاف فوری ایکشن لیں، جنہوں نے سرمد بابا کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ ساتھ ہی میں نے ان کو اس علاقے اور مکان کا پتا بھی بتا دیا۔

ڈاکٹرز، سرمد بابا کی جان بچانے کے لیے کوشاں تھے اور میں E.O.T ایمرجنسی آپریشن تھیٹر کے سامنے والے کوریڈور میں بے چینی سے ٹہل رہا تھا، اور اللہ سے سرمد بابا کی زندگی اور شفایابی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔

آپریشن تھیٹر کے اندر آنے جانے والے ہر فرد سے میں بے چینی کے ساتھ ان کے بارے میں پوچھتا اور ہر بار مجھے یہی جواب ملتا کہ ''دعا کریں'' اور میں دعائیں کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد جمال انکل بھی آ گئے۔ ان کا چہرہ ستا ہوا تھا اور وہ حواس باختہ سے نظر آرہے تھے۔ آتے ہی

مجھ سے لپٹ گئے اور روتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولے۔ ''اب کیسی طبیعت ہے ان کی؟ ہوا کیا تھا آخر؟''

جمال انکل میرے سگے نہیں، سرمد بابا کے بھی ایک پُرانے اور قابلِ اعتماد آدمی تھے۔ میں انہیں ایک طرف کونے میں لے گیا اور انہیں مختصراً الفاظ میں ساری بات بتا دی۔ ان کا چہرہ بھی یہ سب سن کر غصے کے مارے سُرخ ہو گیا۔

''مجھے تو پہلے ہی اس مردود سیٹھ پر شبہ تھا، وڑائچ صاحب کو تو یہ شخص سخت ناپسند تھا، مگر میڈم عارفہ کو کم از کم ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میرا تو دماغ ہی گھوم گیا ہے یہ لرزہ خیز حقیقت جان کر۔ یقین نہیں آتا کہ میڈم بھی ایسی گری ہوئی حرکت کر سکتی ہیں؟''

''ہاں! مجھے بھی یقین کرنا پڑا تھا جب میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا اور سنا تھا۔'' میں نے ہولے سے کہا تو وہ... دانت پیس کر بولے۔

''میڈم نے تو گھر کے بھیدی والا کام کیا ہے، جو اپنی ہی لنکا ڈھاتا ہے۔ مگر اس مردود سیٹھ کو تو ضرور پولیس کے حوالے کرنا چاہیے۔ ہمیں اس کے خلاف فوراً پولیس میں رپورٹ درج کرانا ہوگی، لیکن بات پھر وہی ہو جاتی ہے کہ بجلی اپنے گھر پہ ہی گرے گی اور جب لوگوں کو یہ پتا چلے گا کہ اس ساری سازش کے پیچھے اپنے ہی آدمی کا کام ہے تو...''

''کچھ بھی ہو جمال انکل! اصل مجرموں کو تو کٹہرے میں لانا ہی ہوگا۔ اور پھر سرمد بابا ابھی اندر زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اللہ اپنے پیارے حبیبؐ کے صدقے وڑائچ صاحب کو شفا و زندگی دے دے۔'' جمال انکل آخر میں دعائیہ لہجے میں بولے، پھر مجھ سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ کچھ اُمید تو دلائی ہوگی انہوں نے؟''

میں نے ایک طویل سانس کھینچ کر کہا۔ ''ابھی تک تو کوئی بات نہیں کی ہے انہوں نے۔ دیکھیں، کیا ہوتا ہے۔ آپ دعا کریں۔ ہاں جمال انکل، ایک بات کا خیال رہے۔ عارفہ کسی بھی وقت یہاں پہنچنے والی ہے۔ ابھی اس کے سامنے ایسے بن جانا جیسے مجھے اور آپ کو کچھ پتا ہی نہیں ہے، باقی میں دیکھتا ہوں۔''

وہ بھی ایک جہاندیدہ انسان تھے، میرا اشارہ بھانپ کر انہوں نے دھیرے سے اپنے سر کو اثباتی جنبش دی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی عارفہ بھی ''روتی پیٹتی'' وہاں آپہنچی، اس کے ہمراہ پنکی اور دانی بھی تھے۔ اُن کے چہرے بھی اُترے ہوئے تھے۔ عارفہ کے چہرے پر تصنع کا صاف گماں ہوتا تھا، یہی نہیں، اس کی آنکھوں سے کسی اندرونی بے چینی کا تاثر بھی ملتا تھا اور ایک خوف بھی۔ اور اس کی وجہ صرف میں ہی جانتا تھا۔

''کک... کیا ہوا بابا کو؟ کس نے کیا یہ سب؟ آہ! ہم تو ان کے بغیر دنیا میں اکیلے رہ جائیں گے۔'' اس نے میرے قریب آتے ہی چلتر بازی شروع کر دی۔

میں گمبھیر نظروں سے اس مکار عورت کا چہرہ تکنے لگا، جہاں ریاکاری اور فریب کو معصومیت کی تہ میں اس نے چھپانے کی کوشش کی تھی۔ صرف میں ہی یہ جانتا تھا کہ اس کے گورے چہرے کے پسِ پردہ ایک کالے دل کی کیا سیاہ کاری کارفرما تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اس کے اندر بار بار ایک سوال گردش کر رہا ہوگا۔ ''آخر یہ ہو کیا گیا تھا؟ کہیں، سیٹھ نوید سے جلد بازی میں کوئی غلطی تو نہیں ہو گئی تھی؟ سرمد بابا زندہ بچ گئے تو کیا ہوگا؟ وغیرہ۔

اور مجھے پورا یقین تھا کہ عارفہ نے سرمد بابا کے شدید زخمی ہونے اور ان کی اسپتال میں موجودگی کی اطلاع ملتے ہی یقیناً سیٹھ نوید سے سب سے پہلے رابطہ کر کے یہی دریافت کیا ہوگا کہ ''وہ بڈھا تو تمہارے آدمیوں کے پاس یرغمال تھا۔ اس کا زخمی ہونا تو گیا بھاڑ میں، وہ شہزی کے ساتھ اسپتال کیسے پہنچ گیا؟''

اور مجھے اس بات کا بھی بہ خوبی اندازہ تھا کہ اس کا جواب سیٹھ نوید کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ ہاں، البتہ یہ خبر سنتے ہی وہ خود بری طرح بوکھلاہٹ کا شکار ہو گیا ہوگا۔

اب آئندہ کی سنسنی خیز اور فیصلہ کن گھڑیوں میں دیکھنا یہ تھا کہ آیا پولیس اس مکان اور اس کے تینوں آدمیوں تک پہلے پہنچتی ہے یا سیٹھ نوید کے آدمی، جو یقیناً، اس کے ایما پر وہاں پولیس سے پہلے پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے، وہاں کی تمام نشانیاں مٹاتے ہوئے، اپنے زخمی ساتھیوں کا بارلاد کے وقت سے پہلے رفوچکر ہونے کی کوشش کریں گے؟

یہی وجہ تھی کہ اس مہم کی ابتدا سے ہی میری کوشش تھی کہ اس کے ان تینوں ساتھیوں میں سے سہیل سمیت کوئی جان سے نہ جائے، کوئی ایک آدھ مر چکا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا۔ تاہم مجھے یقین تھا کہ سیٹھ نوید کے آدمیوں کی رسائی سے پہلے پولیس وہاں پہنچ جائے گی، تبھی میں نے میجر باجوہ صاحب سے یہ کام تُرنت کروانے کی چال چلی تھی۔ اس طریقے سے پولیس کا فوراً سے پیشتر حرکت میں آنا یقینی امر تھا۔

میں نے عارفہ کو ایک لمحے کے لیے بڑی خوف ناک نظروں سے گھورا اور پھر اُس سے تسلی و تشفی کا ایک جملہ بھی کہے بغیر پنکی اور دانی کی طرف متوجہ ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''دیکھو بچو! اللہ سب بہتر کرے گا۔ تمہیں معلوم ہے ناں پیارے اللہ میاں بچوں کی دعائیں جلد سُن لیتے ہیں، تو شاباش! رونے اور رنجیدہ ہونے کے بجائے ابھی سے دعا مانگنا شروع کردو کہ وہ ہمارے بابا کو زندگی اور شفا دے۔''

دونوں بچے ذہین اور سمجھدار بھی تھے اور بڑے بھی، میری بات سن کر وہ دونوں خاموشی سے ایک طرف بنی لوہے کی بینچ پر بیٹھ گئے۔

''شش... شہزی! تت... تمہیں بابا جی کہاں سے اور کس حالت میں ملے تھے؟''

معاً عارفہ نے قدرے اٹکتے ہوئے پوچھا تو میں نے اس کے بہ ظاہر مغموم چہرے کو سُلگتی نظروں سے گھورا۔ جواب تو اُسے میں ایسا دینا چاہتا تھا کہ اس کے چودہ طبق روشن ہو جاتے، لیکن ابھی یہ موقع میرے پاس محفوظ تھا، البتہ میں نے اُسے ''شاک'' دینا ضروری سمجھا۔

''میں انہیں وہیں سے لایا ہوں، جہاں اغوا کاروں نے انہیں یرغمال بنا کر رکھا ہوا تھا۔'' حسبِ توقع میری بات پر اس کے چہرے پہ ایک تشویش زدہ سا خوف کا تاثر چمکا اور وہ اٹکتے ہوئے بولی۔

''تت... تمہارا مطلب ہے تم... خ... خود، بابا جی کو۔ تمہیں اغوا کاروں کے ٹھکانے کا کیسے پتا چلا؟'' وہ مجھ سے اپنے مطلب کی کوئی ایسی بات اُگلوانے کوشش میں تھی، جس سے وہ سیٹھ نوید کو آگاہی یہ الفاظ دیگر راہنمائی دے سکے۔ مگر اس کا لُکنت زدہ لہجہ اس کا ساتھ دینے سے قاصر تھا۔

''ہاں! میں خود ان مجرموں کے ٹھکانے تک پہنچا تھا۔''

''یہی تو تمہاری غلطی تھی۔''

اس حرافہ نے میری غلطی پکڑی اور اب پل کے پل اس کے لہجے میں اعتماد اور ایک نیا فتنہ جنم لینے لگا تھا۔

''کاش! تم یہ مہم جوئی نہ کرتے تو آج بابا جی کی یہ حالت.... نہ ہوتی، اگر تم نے اغوا کنندگان کا ٹھکانا دیکھ ہی لیا تھا تو پھر خود تیس مار خاں بننے کی کیا ضرورت تھی؟ تم پولیس کو انفارم کر دیتے۔''

اس کا لہجہ ایک دم بدل گیا اور وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے والی ڈرپوک اور مجرم زدہ عارفہ تو کہیں سے بھی نہیں لگی۔ اس دوران جمال انکل بھی قریب آ گئے تھے، عارفہ کو جیسے ایک گل کھلانے کا موقع مل گیا، اگلے ہی لمحے مجھ پر حیرتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس پر ایکا ایکی ہسٹریائی دورہ پڑ گیا۔ اس نے ڈھیروں ڈھیر آنسو بہاتے ہوئے میرا گریبان پکڑ لیا اور مجھے زور زور سے جھنجوڑتے ہوئے چلّا کر بولی۔

''تت... تمہاری ہی وجہ سے میرے بابا جی اس حالت کو پہنچے ہیں، صرف تمہاری وجہ سے۔ تم بھی اس جرم میں شریک ہو۔ تمہیں اس نازک وقت میں پولیس کی مدد لینی چاہیے تھی۔ اور... اور...''

اسی وقت عملے کے چند لوگ دوڑتے ہوئے ہماری طرف بڑھے اور ڈانٹنے کے انداز میں ہمیں متنبہ کیا کہ یہاں شور نہ مچایا جائے۔

میں نے ان سے معذرت چاہی اور نازک موقع محل دیکھتے ہوئے عارفہ کی اس دھواں دھار اداکاری و صداکاری کو فوراً ''بریک'' لگانے کی غرض سے پہلے تو ایک جھٹکے سے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھڑوایا، اور پھر قہربار لہجے میں ایک ایک لفظ گویا چبا کر بولا۔

''محترمہ اپنی زبان اور اپنے اس ڈرامے کو لگام دیں۔ ورنہ ہوگا یہ کہ جو راز بعد میں باہم بیٹھ کر کھلے گا وہ یوں سرِ عام اور سرِ بازار کھل جائے گا۔ بات ہے رُسوائی کی۔ لیکن کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔ اگر تم یہی چاہتی ہو تو یہی سہی، سنو پھر۔

پولیس اس سلسلے میں میری مدد کم کرتی اور مخبری زیادہ، مجھے اس کا اچھی طرح تجربہ ہے، اور اگر میں بروقت حرکت میں نہ آتا تو کل صبح آپ کے یہ دونوں بچے ڈرامائی انداز میں اغوا ہو کر اُنہی کے پاس پہنچا دیے جاتے جنھوں نے سرمد بابا کو یرغمال بنا رکھا تھا اور اغوا کار، جو ابھی تک بابا جی کا اڑیہ کمپنی کے شیئرز کے سلسلے میں منہ کھلوانے میں بری طرح ناکام ہو چکے تھے، پنکی اور دانی کو ان کی جذباتی کمزوری بنا کر اپنا دیرینہ مقصد حاصل کر لیتے۔ اس سے آگے کی کہانی بھی سننا چاہتی ہیں آپ؟''

اتنا کہہ کر میں رکا۔ ادھر عارفہ کے اندر کا خوف اور تشویش آمیز پریشانی، جو اس نے مگرمچھ کے آنسوؤں اور رونی شکل بنا کر چھپانے کی سعی کی تھی، میری بات سننے کے بعد جیسے پوری طرح ہویدا ہونے لگی۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کے مصنوعی ہسٹریائی دورے کی بھی کیفیات یوں اُڑن چھو ہو گئی، جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہاتھوں کے طوطے اُڑنا شاید اسی کو کہتے ہیں، جس کی واضح تفسیر میں اس وقت اپنے سامنے

کھڑی عارفہ کی مکروہ صورت سے مترشح ہوتے دیکھ رہا تھا۔

وہ یوں آنکھیں پھیلائے مجھے تکنے لگی جیسے کسی اور دنیا کا باسی ہوں یا کوئی ایسی خلائی مخلوق جو زمین میں بسنے والی مخلوق سے زیادہ ذہین ہو اور مافوق الفطرت بھی۔

''چلیں، اس ڈرامے کا کلائمکس بھی بتائے دیتا ہوں جس کی پروڈیوسر تم اور ڈائریکٹر سیٹھ نوید سانچے تھا، یعنی یہ تم دونوں کی مشترکہ پیشکش تھی۔ اَب باقی کی کسر سرمد بابا ان مجرموں کو پہچان کر پوری کر دیں گے، جنھوں نے انہیں اغوا کرنے کا بھیانک جرم کیا تھا اور وہ یقینی طور پر تمہارے منظورِ نواز سیٹھ نوید کے ہی آدمی تھے۔ اور کچھ؟''

''تت... تم... آخر ہو کیا شے؟'' عارفہ کے حلق سے جیسے بے اختیار پھسلا تھا، جو اس کی تسلیم شدہ شکست کا نہ صرف ثبوت تھا بلکہ اس کے ''کچے پن'' کو بھی ظاہر کرتا تھا کہ اس کی عقل صرف عام گھریلو عورتوں کی طرح سازشیں کرنے تک محدود تھی، یہ خطرناک چکر اس کے بس میں کہاں تھے۔

عارفہ کے چہرے کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا۔ ہوائیاں اُڑتے چہرے اور سوکھے پڑتے حلق سے بہ مشکل یہ ٹوٹے اور بے ربط سے جملے اس سے ادا ہو پائے تھے۔

مجھے اس کی ہیئت کذائی سے لطف اندوز ہونے کا کوئی شوق نہ تھا۔ میں تو اس کا چیختا چلاتا منہ بند کرنا چاہتا تھا، اور یہ حقیقت بھی کہ وہ اب سیٹھ نوید جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت انسان کے پیچھے نہ لگے جو اسے تباہ کرنے اور اپنا دامن بچانے میں ذرا دیر نہیں لگائے گا۔ بہ صورتِ دیگر انہوں نے کسی کی قبر پر اپنے سہانے سپنوں کا جو تاج محل سجانے کا منصوبہ بنا رکھا ہے وہ آشکار تو ہو ہی چکا ہے اسی لیے اب زیادہ پاؤں نہ پھیلائے۔ ورنہ ہمیشہ کے لیے وہ سلاخوں کے پیچھے ہوگی۔

مجھے سرمد بابا سے ابتدا ہی سے ایک ذہنی اور قلبی قُربت ہو گئی تھی۔ میں ان کا خاندان، ان کا گھر بچانا چاہتا تھا۔ اور میں نے یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ موقع ملنے پر میں عارفہ کو بھی سمجھانے اور اُسے راہِ راست پر لانے کی کوشش کروں گا۔

میرے منہ سے یہ حقیقت جمال انکل نے بھی سُن لی تھی، اور کوئی بعید نہ تھا کہ قریب بیٹھے عارفہ کے دونوں بچوں، پنکی اور دانی نے بھی سن لی ہو۔ البتہ جمال انکل اب [illegible] تکلیف دہ حیرت بھری نظروں سے تکے جا رہے تھے۔

اسی وقت آپریشن تھیٹر کا دروازہ کھلا اور ہم سب ہی دھڑکتے دل کے ساتھ اس طرف متوجہ ہوئے۔ ایک ڈاکٹر گہرے سبز لباس میں برآمد ہوا تھا، جس کے چہرے پہ ابھی تک ماسک لگا ہوا تھا۔ میں بلا تاخیر اس کی طرف بڑھا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب! کیسے ہیں وہ؟''

ڈاکٹر نے اپنے منہ سے کپڑے کا ماسک ہٹایا اور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ کر بولے۔ ''تم کیا لگتے ہو ان کے؟''

''میں ان کا کچھ لگتا تو نہیں ہوں لیکن، منہ بولا بیٹا ضرور ہوں ان کا۔'' میں نے جواب دیا اور بے چینی سے دوبارہ پوچھا۔ ''بتایئے ناں ڈاکٹر صاحب! وہ خیریت سے تو ہیں ناں؟'' میں بے چین اور دھڑکتی نظروں سے ڈاکٹر کا چہرہ تکنے لگا، وہ کچھ تھکے تھکے سے نظر آرہے تھے۔ پھر میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے۔

''آئم سوری! اللہ کو یہی منظور تھا۔''

وہ ہولے سے میرا کاندھا تھپتھپا کر آگے بڑھ گئے۔

میرے اندر ایک چھناکا ہوا، مجھے ایسا لگا جیسے میرا کوئی اپنا ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا ہو۔ دُکھ کی ایک کرب ناک لہر تھی، جو میرے وجود میں کسی خنجر کی طرح اُترتی چلی گئی۔ سرمد بابا بچھڑ گئے؟ ہمیشہ کے لیے۔ وہ بوڑھا شخص جو اطفال گھر کے ایک گوشے میں، برآمدے کے باہر، سب سے الگ تھلگ، چپ سا بیٹھا رہتا تھا، وہ بوڑھا، جس نے مجھے زندگی جینے کا ڈھنگ سکھایا تھا، جس کی زندہ دل باتیں سن کر میرے اندر کی مایوسیاں چھٹنے لگتی تھیں۔ وہ شفقت کرنے والا بابا آج یوں اچانک مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ کیا اس طرح بھی لوگ پل بھر میں ہمیشہ کے لیے ساتھ چھوڑ جاتے ہیں؟ کیا رشتہ تھا میرا ان سے؟ کیا لگتا تھا میں ان کا؟ کیوں مجھے ان کے اس طرح بچھڑنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی اپنا سگا بچھڑ گیا ہو۔

آج پتا چلا کہ بعض لوگ کیسے دوسرے کو اپنا بنا لیتے ہیں کہ وہ اپنوں سے بھی زیادہ پیارے ہو جاتے ہیں۔ ہاں! یہ محض خونی رشتے کی کہانی تو نہیں ہے۔ یہ تو محبت، خلوص اور ہمدردی کے رشتوں سے بنی ہوئی ایک ایسے تعلق کی زنجیر تھی جس نے مجھے سرمد بابا سے اور انہیں مجھ سے اب تک ایسے ہی جوڑے رکھا تھا جیسے ہم ایک دوسرے کے لیے اپنوں سے بھی بڑھ کر ہوں۔ آہ! مجھے اطفال گھر کا وہ معصوم سا بوڑھا کیسے بھول سکتا تھا، جو برآمدے میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا، خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورتا رہتا تھا۔

میں اس وقت بچہ تھا۔ ہم دونوں کی پتا نہیں کون سی قدر مشترک تھی، جس نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا تھا۔ بڑی عجیب دوستی ہو گئی تھی، ایک بچے اور ایک بوڑھے کی، اس قدر عجیب کہ پھر دونوں ایک دوسرے کو اپنے اندر کے دکھوں سے آگاہ کر کے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا کرتے۔ سرمد بابا بھی اندر سے اتنے ہی دُکھی تھے جتنا کہ میں تھا۔

''شہزی بھیا! دادو فوت ہو گئے؟''

معاً ہی میں جھیر جھیر خیالات سے چونکا تھا۔ پنکی میرے قریب آ کے غم زدہ لہجے میں بولی۔ دانی بھی اُترے ہوئے چہرے کے ساتھ میرے قریب آ چکا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب نے یہی بتایا ہے ناں شہزی بھیا کہ اب دادو ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے ہیں؟''

ان معصوموں کی باتوں نے مجھے اندر سے کاٹ کر رکھ دیا۔ میری آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ میں نے آہستگی سے ان دونوں کے سروں پہ ہاتھ رکھا اور دھیرے سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولا۔

''ہاں، اللہ کو جو منظور تھا۔ اب تم اپنے دادو جانی کے لیے اللہ سے دعا کرنا، وہ انہیں جنت میں جگہ دے۔''

جمال انکل بھی بالکل بچوں کی طرح رو پڑے تھے۔ ایسے ہی وقت میں میری نگاہ قریب کھڑی عارفہ کے چہرے پر پڑی۔ اس کے چہرے پر پریشانی، تشویش اور دُکھ کے مصنوعی تاثرات، جو تھوڑی دیر پہلے تک مجھے نظر آ رہے تھے، وہ پل کے پل مفقود ہو چکے تھے۔ وہاں اب ایک سکون سا دکھائی دیتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ایسا کیوں تھا۔

☆☆☆

سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا، ہمیشہ کے لیے منوں مٹی تلے دفن ہو گئے اور مجھے ایک چپ سی کھا گئی۔ ایک کسک تھی جو میرے دل میں بیٹھ گئی تھی۔ سرمد بابا کی موت کا ذمے دار میں خود کو سمجھنے لگا تھا۔ میں نے کئی بار خود کو یہ تسلی دینے کی ناکام کوشش کی تھی کہ میں سرمد بابا کو نہ صرف اس طرح بچانا چاہتا تھا بلکہ کچھ تلخ حقائق کو بھی بے نقاب کرنے کا ارادہ رکھتا تھا جو آئندہ کے لیے سودمند ثابت ہو سکتے تھے۔ پولیس کے چکروں میں پڑ جاتا تو نہ صرف حقائق مسخ کر دیے جاتے بلکہ سرمد بابا کی بازیابی کا معاملہ بھی کسی خطرناک انجام سے دوچار کر دیا جاتا۔

اب اتنا ضرور تھا کہ کم از کم حقائق مسخ نہیں ہو سکتے تھے۔ مقتول مجرم سہیل سمیت پولیس نے گرفتار کر لیے تھے۔

اگرچہ وہ زخمی حالت میں تھے تاہم ان کا علاج معالجہ کیا جا رہا تھا۔

عابدہ کی طرف سے میری فکر و تشویش ایک لمحے کے لیے بھی کم نہیں ہوئی تھی، لیکن سرمد بابا اور اس مزدود سیٹھ نوید والے معاملے نے مجھے اُلجھا دیا تھا، دیکھا جاتا تو سرمد بابا کی بازیابی سے عابدہ کا مسئلہ بھی ایک طرح سے نتھی تھا۔ جبکہ امریکی نژاد مسلم خاتون لیڈی رپورٹر آنسہ خالدہ کو سرمد بابا کی موت کی اطلاع کرنا ضروری تھا، یوں بھی میں نے اس سے رابطہ کر کے عابدہ کے بارے میں خیریت وغیرہ دریافت کرنا تھی۔ اب ایک یہی میری ہمدرد خاتون تھی، جو وہاں میری اور عابدہ کی دادرسی کر رہی تھی۔ میں تو یہی سمجھتا تھا کہ اللہ نے اس نیک دل اور ہمدرد خاتون کو ہمارے لیے فرشتہ بنا کے بھیجا تھا، ورنہ عابدہ کا امریکا میں اللہ کے سوا اور کون تھا جو وہاں اس کی دادرسی کرتا۔

پاکستانی معیاری وقت کے مطابق یہاں رات تھی اور وہاں امریکا میں اس وقت صبح تھی۔ میں آنسہ خالدہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

تھوڑی دیر میں میرا اس سے ٹیلی فونک رابطہ ہو گیا۔ صاحب سلامت کے مختصر وقفے کے دوران ہی خالدہ نے خاصی عجلت میں مجھ سے کہا۔

''مسٹر شہزاد! میں نے تمہیں ایک میل کی ہے اسے چیک کرو، پھر تم سے بات ہوتی ہے بلکہ ایک گھنٹے بعد ہم اب اسکائپ پر ملتے ہیں، تم تب تک میرا وہ برقی پیغام پڑھ لو جو ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میں تمہیں بھیج چکی ہوں۔''

''ڈیل... لیکن مجھے عابدہ کے بارے میں تو بتا دو پلیز۔ وہ کیسی ہے؟ کہاں؟'' میں بے چینی سے بولا۔

''سب کچھ پہلے جیسا ہی ہے۔ میں آگے کی بہتری کے لیے کوشش کر رہی ہوں۔'' دوسری طرف سے اس کی آواز اُبھری۔ ''بس مجھے ایک گھنٹا دے دو۔ پھر اسکائپ پر تفصیلی گفتگو کرتے ہیں۔ او کے؟''

''ٹھیک ہے، لیکن... مجھے تمہیں ایک اہم خبر سے آگاہ کرنا تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''پلیز، ذرا جلدی۔'' وہ خاصی عجلت میں لگتی تھی اور میں نے اسے سرمد بابا کے متعلق بتا دیا۔

''او مائی گاڈ! یہ کیسے ہوا؟'' وہ چونکی۔ میں نے اشارتاً اُسے بتا دیا۔

''اب کیس میں تبدیلی لانا پڑے گی اور اس لائر سے بھی مجھے ملنا پڑے گا، جسے مسٹر منظور وڑائچ نے ہائر کیا ہوا

تھا۔ خیر تم فوری طور پر ایک کام کرو۔ مجھے کسی بھی طرح مسٹر منظور کا ڈیتھ سرٹیفکیٹ بھیج دو۔ اوکے بائے۔ گھنٹے بعد اسکائپ پر ملتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں نے اسی وقت اپنا میل چیک کیا۔ وہاں میرے لیے آنسہ خالدہ کی طرف سے صرف چند لفظی پیغام تھا۔

''اس نام کی میل اوپن کرو۔ sweet lady@''

مجھے اس مختصر ترین برقی پیغام پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ رینجرز کی خصوصی کمانڈو ٹریننگ کے دوران اور متعدد ''اسپائی'' آئی کیو ٹیسٹ سے گزرنے کے بعد اس طرح کے اشارے میری سمجھ سے بالاتر نہیں تھے۔

یقیناً آنسہ خالدہ مجھ سے کچھ اہم نوعیت کی معلومات شیئرز کرنا چاہ رہی ہوگی۔ اور اُسے خدشہ ہوگا کہ کہیں اس کی میل امریکی خفیہ ادارے ٹریس کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس لیے اس نے اپنی ہی ایک سویٹ لیڈی کے نام سے میل آئی ڈی بھی بنا رکھی تھی۔

میں نے فوراً اس نام کی میل کلک کر کے اوپن کی تو سب سے پہلے ایک نیم عریاں عورت کی ڈانس کرتی تصویر دکھائی دی، اور ایک فحش ویب کیم سائٹ کا چمکتا دمکتا اشتہار ''بلنک'' کرنے لگا۔

عموماً ایسے جنک میل وہ ہوتے تھے جن میں کمپیوٹر وائرس کا خطرہ ہوتا تھا۔ اور یہ عام طور پر جانے انجانے لوگوں کو آتے ہی رہتے تھے۔ اور پڑھے یا کلک کیے بغیر انہیں ڈیلیٹ کر دیا جاتا تھا، لیکن میں نے اسے اوپن والے آپشن میں جا کے کلک کر دیا تو جیسے ایکا ایکی سب کچھ غائب ہو گیا۔ اور اب وہاں۔ کچھ تصاویر اور ایک پیغام مجھے نظر آیا۔ جو آنسہ خالدہ کی ہی طرف سے تھا۔ میں دھڑکتے دل کے ساتھ پڑھنے لگا۔ خالدہ نے لکھا تھا۔

''مسٹر شہزاد! میں اب تمہیں اسی میل ایڈریس سے پیغام وغیرہ بھیجوں گی، کیونکہ نائن الیون کی خفیہ اور غیر جانبدار تحقیقات پر یہاں کے کچھ ادارے میری کالیں اور ای میل تک ٹریس کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اور بالخصوص عابدہ کے سلسلے میں جو کچھ بھی میں کر رہی ہوں، اس پر بھی میری ریکی ہو رہی ہے۔

میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہوتا، تاہم جتنا بھی ہوتا ہے میں تم سے رابطہ کرنے اور عابدہ سے متعلق بتانے کی کوشش کرتی ہوں۔ مسٹر شہزاد! میں تمہیں نہیں جانتی، تم کون ہو، کیا ہو، کیا کرتے ہو؟ لیکن تمہارے دشمنوں کا اندازہ کر کے مجھے لگتا ہے کہ تم بھی کوئی معمولی حیثیت کے آدمی نہیں ہو۔

نائن الیون کے واقعے کے بعد یہاں زیادہ تر مقامی سطح پر مسلم کمیونٹی کے لوگوں کی گرفتاریاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ یہ سانحہ انتہا پسندی کا نام دے کر مسلمانوں کے سر تھوپنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اصل حقائق پر پردہ ڈالا جا رہا ہے۔ اور اس مذموم کوششوں میں جے بی سی پوری طرح خفیہ طور پر انوالو ہے، جس کا ٹاسک باسکل ہولارڈ نامی ایک امریکی نژاد یہودی کو دیا گیا ہے، جس کی تفاصیل گزشتہ میل میں تمہیں بھیج چکی ہوں تصاویر سمیت۔

باتیں بہت سی ہیں، موقع ملا تو مل بیٹھ کر تفصیل سے اس پر بات ہوگی، یہ باتیں تمہاری راہنمائی کے لیے تھیں۔ اب میں اصل بات کی طرف آتی ہوں۔

یہاں ہمارا موضوع عابدہ ہے۔ مجھے انتہائی افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے کہ عابدہ کو پھنسانے میں تمہاری ہی ایک ریلیٹو عارفہ کا دخل ہے۔ سی آئی اے کے ایک ونگ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے اسپیشل ایجنٹ باسکل ہولارڈ نے ہی عارفہ کو اشاروں کنایوں میں ڈرا دھمکا کر عابدہ کے خلاف بیان دینے پر اُکسایا تھا، اور عارفہ نے اپنی گردن بچانے کی خاطر ... تمہاری گرل فرینڈ کو پھنسا دیا۔

یاد رہے ٹائیگر ٹیگ درحقیقت باسکل ہولارڈ ہی کی اپنی بعض جدید خطوط پر بنائی ہوئی ذاتی فورس ہے جسے وہ امریکی خفیہ ادارے میں ضم کر کے مشترکہ مفادات میں استعمال کرتا رہتا ہے۔ یہاں مسلم کمیونٹی میں یہی ونگ زیادہ فعال ہے، جس کی وجہ سے یہاں اس کی کافی دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔

باسکل ہولارڈ بڑے اثر و رسوخ کا مالک ہے، جس کی پشت پر انہی لوگوں کا ہاتھ ہے جو امریکا مشنری پر اثر انداز رہتے ہیں، یعنی یہودی لابی، جو وہاں بہ ظاہر سوداگروں کی ایک انجمن جے بی سی (جیوش بزنس کمیونٹی) کا لبادہ اُوڑھے ہوئے ہے۔ باسکل ہولارڈ درون خانہ ان کا نمائندہ ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بتا چکی ہوں کہ باسکل ہولارڈ فطرتاً مجرم ذہنیت کا آدمی ہے، اور محکمانہ اختیارات سے ہٹ کر بھی اس کے بعض ذاتی تعلقات ہیں جو بڑے خطرناک نوعیت کے ہیں۔ ان میں ایک لولووش کا نام سرِفہرست ہے، جو اب اس کا داماد بھی بن چکا ہے۔ لولووش کے بارے میں بھی تمہیں بتا چکی ہوں۔

مجھے لگتا ہے تمہارے عابدہ والے معاملے میں، میں

خود بھی یہاں خطرناک لوگوں کی نظروں میں آنے لگی ہوں، لیکن مجھے اس کی پروا نہیں۔ میں یہاں مقیم مسلم کمیونٹی کی پروٹیکشن کے سلسلے میں ہر دم اور بلا خوف فعال رہتی ہوں۔ اور صرف اللہ سے ڈرتی ہوں۔

اب آخری اور اہم بات سن لو۔ ابھی تھوڑے دن پہلے اپنی جان پہ کھیل کر باسکل ہولارڈ اور اس کے داماد لولوش کی باہم خفیہ گفتگو میرے علم میں آئی ہے۔ سی آئی اے نے پاکستان میں تمہیں ٹارگٹ کرنے یا اغوا کرنے کے لیے ایک خفیہ آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

سی آئی اے کے دو ٹاپ ایجنٹ، جو یقینی طور پر ٹائیگر ٹیگ سے ہی تعلق رکھتے ہیں، عنقریب ان دونوں کو پاکستان تمہاری تلاش اور اغوا کے لیے بھیجا جارہا ہے۔ خدا کے لیے اسے معمولی بات مت سمجھنا۔ کیونکہ پوری سی آئی اے ایک طرف اور ان کا یہ ایک ونگ (ٹائیگر ٹیگ) ایک طرف ہے۔ اتنا اشارہ کافی ہے۔ بات ختم کرتی ہوں، فوراً اسکائپ پر ملو۔ میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتی ہوں۔"

آنسہ خالدہ کا یہ برقی پیغام پڑھنے کے بعد میں کئی ثانیوں تک سناٹے کی سی کیفیات میں رہا۔ مجھے اس کا کوئی خوف نہ تھا کہ ٹائیگر ٹیگ کے دو ٹاپ ایجنٹ مجھے خفیہ طور پر امریکا لے جانے کے لیے اغوا کرنے کی نیت سے کسی بھی وقت وارد ہونے والے تھے۔ امریکا تو میں خود بھی جانا چاہتا تھا، یہ میرا ایک جوش ہی تھا، مگر معاملہ شاید اتنا ہی نہ تھا، جیسا کہ خالدہ نے ذکر کیا تھا۔ وہ امریکی مجھے عالمی سطح پر ایک بڑا دہشت گرد قرار دینا چاہتے تھے یا معاملہ اس سے بھی آگے کا تھا، یہ واضح ہونا ابھی باقی تھا۔

میل پڑھنے کے بعد میں نے فوراً اپنی اسکائپ آئی ڈی اوپن کی۔ تو چونک پڑا، وہاں خالدہ پہلے سے آن لائن تھی۔ میں نے اُسے جیسے ہی "hi" کا میسج کیا اس کی ویڈیو کالنگ آگئی۔ میں اپنا ویب کیم سیٹ کرچکا تھا۔ اب ہیڈ فون کان پر چڑھا لیا، اس میں مائیک بھی نصب تھا۔

میں نے اس کی ویڈیو کالنگ کا جواب دیا اور اگلے ہی لمحے اس کی تصویر آگئی۔ ابتدا میں تصویر ذرا الجھی کرتی رہی اس کے بعد صحیح ہوگئی۔ وہ ایک ملائم اور چمکدار سی جلد والی ہلکی سانولی رنگت کی خاتون تھی اور خاصی اسمارٹ اور پرکشش لگ رہی تھی، اس کی آنکھوں میں تیز سی چمک تھی اور چہرہ قدرے بیضوی تھا، بال بوائے کٹ تھے، اس کی شخصیت میں مجھے خاصا رعب داب محسوس ہوا تھا، وہ مجھے دیکھ کر بڑے دل نشیں انداز میں مسکرائی اور "ہیلو" کہتے ہوئے اپنا ہاتھ بھی ہلا دیا۔ میں نے بھی یہی کچھ کیا۔

"ہم! خاصے ہینڈسم اور اسمارٹ ہو۔ تم تو صورت سے ہی بالی وڈ کی اسپائی فلموں کے ہیرو نظر آرہے ہو۔" اُس نے کہا۔ اس کی آواز میں بیک وقت مٹھاس اور رعب کا تاثر ملتا تھا۔ میں ہولے سے مسکرادیا اور مقصد کی بات کی طرف آنے کی غرض سے بولا۔

"شکریہ! آپ کیسی ہیں؟ میں نے آپ کا ای میل پڑھ لیا، اور ممنون بھی ہوں آپ کا، لیکن مجھے زیادہ فکر عابدہ کی طرف سے ہورہی ہے۔"

میری بات سن کر وہ ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگی۔ میں بغور اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ بولی۔ "مسٹر شہزاد! عابدہ کے معاملے سے میں ایک لمحے کے لیے بھی... غافل نہیں ہوئی ہوں۔ یہ میرا ٹاسک بھی ہے کہ اُس معصوم کو باسکل ہولارڈ جیسے خبیث انسان کے پنجوں سے آزادی دلواؤں ... بلکہ اس کا مکروہ چہرہ بھی بے نقاب کرنے کی کوشش کروں ... لیکن میں تمہیں کسی خوش فہمی میں نہیں رکھنا چاہتی۔ عابدہ کا معاملہ خاصا گمبھیر ہے۔ لیکن تم فکر نہ کرو، میں اس کی پروٹیکشن میں ہوں۔ مگر میرے لیے اصل پریشانی اور تشویش کی بات ٹائیگر ٹیگ کے وہ دو ایجنٹ ہیں جنہیں تمہیں اغوا کرنے کا ٹاسک دیا جانے والا ہے، اب بار بار تمہارے سامنے اس بات کا اظہار کرنا مجھے آک ورڈ ہی محسوس ہوتا ہے کہ یہ اور ایسی بہت سی خفیہ انفارمیشن میں نے کیسے حاصل کی ہیں۔ اس سے پہلے امریکی ملکی اور سفارتی سطح پر حکومت پاکستان سے تمہاری حوالگی کے سلسلے میں بات کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اور مجھے یقین بھی تھا کہ تمہارا ملک تمہیں امریکا کا مجرم سمجھتے ہوئے .... پلیٹ میں سجا کر ان کے حوالے کردیتا۔ مجھے اس کڑوی حقیقت کا بھی اندازہ ہے کہ امریکا کا اگر ایک کتا بھی پاکستان میں کسی مجرمانہ کارروائی میں ملوث پایا جائے تو اُسے کوئی سزا دینے کے بجائے، نہلا دھلا کر باعزت طریقے سے، سات سلامیاں دے کر جہاز میں سوار کروا کے امریکا روانہ کردیں گے۔

تمہیں شاید میری بات بُری لگی ہو، مگر حقیقت یہی ہے، اس میں میری کسی بدنیتی کا دخل نہیں ہے، جب میں اپنے مسلم بھائیوں اور بہنوں سے محبت کرتی ہوں تو مجھے بھلا مسلم ممالک سے کیوں نہ محبت ہوگی؟ بس کچھ تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی نہیں کرنی چاہیے، ان میں بہتری لانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ بحث طویل ہوجائے گی۔ میرا تم سے رابطہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں بالخصوص فوری خطرات

سے آگاہ کروں۔ جیسے ہی وہ دو ایجنٹ فائنل ہوں گے میں تمہیں ان کی تصاویر اور آمد سے مطلع کر دوں گی۔ اس کے بعد تم کو... کیا کرنا ہے ان کے ساتھ یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔"

میں نے کہا۔ "مس خالدہ! میں آپ کے عزم کو سلام پیش کرتا ہوں۔ میں آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے مجھے بروقت ایک اہم خطرے سے آگاہ کیا، میں اب اس بڑھتے ہوئے خطرے کو پوری سنجیدگی سے مدِ نگاہ رکھوں گا اور آپ کی آئندہ اور وقتاً فوقتاً انفارمیشن کی راہنمائی میں بھی قدم اُٹھانے کی پوری کوشش کرتا رہوں گا، لیکن اس وقت میری ساری توجہ عابدہ پر مرکوز ہے، آپ اس سلسلے میں اپنی کاوشوں کو آگے بڑھاتی رہیں تو مجھے تسلی کے ساتھ خوشی بھی ہو گی۔"

"آف کورس! میں یہی تو کر رہی ہوں، تم تسلی رکھو۔" وہ مسکرائی۔ پھر معنی خیز لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے تم اپنی گرل فرینڈ سے بہت محبت کرتے ہو، اور خود سے زیادہ تمہیں اس کی فکر ہو رہی ہے۔"

"جی ہاں مس خالدہ! آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔"

"او کے! تم سے بات کر کے، تمہیں دیکھ کے خوشی ہوئی، میری باتوں کو دھیان میں رکھنا۔ اب میں اجازت چاہوں گی۔ فی امان اللہ۔" اس نے رُخصت ہوتے وقت پہلی بار اسلامی انداز میں مجھے خدا حافظ کہا اور میں نے بھی اسی انداز میں اسے سلام کیا تھا۔

اسکرین تاریک ہوتے ہی میں سوچوں میں گم ہو گیا۔ شکیلہ اور اول خیر کچھ فاصلے پر بیٹھے تھے، گفتگو ختم ہوتے ہی دونوں میری طرف آ گئے تھے۔ شکیلہ نے تو بہت کچھ سمجھ لیا تھا، جبکہ اول خیر اُسے بار بار ٹہوکے مار رہا تھا کہ کیا گفتگو ہو رہی ہے۔

جب بات واضح ہوئی تو اول خیر کے چہرے پر بھی شکیلہ کی طرح کے پریشان کن تشویش کے آثار نمودار ہوتے چلے گئے۔ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔

"او خیر کا کا! اے تے لمبی پسوڑی پے رہی ہے۔ وہ امریکی اب کیا تیرے بھی سر ہو رہے ہیں؟ ٹھیک ہے پھر آلینے دو ان خبیثوں کو۔ نمٹ لیں گے ان سے بھی۔"

"اول خیر! مجھے خود سے زیادہ عابدہ کی فکر ستا رہی ہے۔ میں تو ان حالات کو فیس کر ہی لوں گا، مگر وہ بے چاری ایک بڑے عالمی کٹھن چکر میں پھنس گئی ہے۔ اور میں ادھر بے بسی سے اپنے ہاتھ مل رہا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے کاکے! پر ہم عابدہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا گو رہتے ہیں، اور پھر وہاں اپنی مسلم بہنا آنسہ خالدہ بھی کوشش کر رہی ہے، پر یہ جو سی آئی اے اپنے جو دو ایجنٹ تیرے چکر میں بھیج رہے ہیں، وہ...؟"

"آلینے دو انہیں بھی، یہ میرا کام آسان کرنے آ رہے ہیں اول خیر!" میں نے اس کی بات کاٹ کر عجیب سے لہجے میں کہا۔

"کک... کیا مطلب کاکے؟" اول خیر شاید کچھ کچھ سمجھتے ہوئے تشویش زدہ آواز میں بولا۔

"ہاں میرے یار! میں خود بھی ان کا بے چینی سے منتظر ہوں۔ آلینے دو انہیں۔ یہ میرا کام آسان کرنے ہی آ رہے ہیں۔"

"شہزی! کہیں تمہارا یہ مطلب تو نہیں کہ تم خود بھی یہی چاہ رہے ہو کہ وہ تمہیں واقعی اغوا کر کے امریکا پہنچا دیں؟" شکیلہ میرا اشارہ پوری طرح بھانپ چکی تھی۔

"ہاں شکیلہ! تم ٹھیک سمجھی ہو، لیکن وہ مجھے نہیں بلکہ اپنی موت کو ساتھ لے کر جائیں گے۔"

"او... خیر کا کے! یہ کیا کہہ رہا ہے تو۔ ایسا نہیں کرنے دیں گے ہم تجھے۔" اول خیر پریشانی سے بولا۔ "یہ کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے، اور نہ ہی ملتان سے ساہیوال تک کا معاملہ ہے یہ سات سمندر پار اور امریکا جیسے سُپر پاور ملک کا معاملہ ہے۔ نجانے کیسے کیسے خطرناک لوگ ہوں گے وہاں۔ نہ نہ۔ کاکے۔ ناں! سوچ سمجھ کے بولا کر ذرا۔"

"یہ صحیح ہے شہزی! خدا کے لیے اس معاملے کو اتنا معمولی مت سمجھو کہ..." شکیلہ بولی۔

"میں صرف اللہ کی طاقت کو سُپر پاور تسلیم کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ابھی اس موضوع کو چھوڑ دو۔ جب وقت آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ میں اس وقت ہر قیمت پر وزیر جان کو ٹارگٹ کرنا چاہتا ہوں۔"

"تو چلا چل کاکے! میں ساتھ ہوں تیرے۔ ڈھونڈ نکالتے ہیں اسے بھی۔" اول خیر یک دم بولا۔

"ہوں۔ اس کے فلاحی ادارے والے دفتر کا پہلے رُخ کریں گے، پھر اس کی ساہیوال والی رہائش گاہ کا۔" میں خود کلامیہ انداز میں بولا۔ اور اول خیر نے اپنے سر کو اثباتی... جنبش دی تھی۔

☆☆☆

ماں جی آج کل زہرہ بھابی کے بہ صد اصرار پر ان کے ہاں "بیگم ولا" میں مقیم تھیں اور وہ دونوں ساس بہو،

ایک دوسرے سے بھائی لئیق شاہ کے بارے میں ہی باتیں کرتی رہتی تھیں، ماں جی کو جب سے یہ پتا چلا تھا کہ زہرہ بانو ان کی بہو تھیں، انہیں زہرہ بانو سے ایک خاص قسم کی اُنسیت ہوگئی تھی۔

زہرہ بانو نے جتنا عرصہ بھی لئیق شاہ کی ''سنگت'' میں گزارا تھا وہ سب ماں جی سے شیئر کرتی تھی۔

میں نے بھی یہی سوچ کر ماں جی کو زہرہ بانو کے ساتھ جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا کہ اس طرح ماں جی کا بھی کچھ موڈ چینج ہوجائے گا۔

میجر ریاض باجوہ کی مداخلت کے باعث تینوں مجرموں کو اسپیشل انوسٹی گیشن ڈپارٹمنٹ کے سپرد کردیا گیا تھا اور ان کے ناقابلِ ضمانت وارنٹ گرفتاری بھی جاری کیے جا چکے تھے۔ عدالت کی طرف سے پولیس کو دی گئی ریمانڈ کی مدت کے دوران ہی تینوں نے اقبالِ جرم قبول لیا تھا۔ ان کے بیانات کی روشنی میں پولیس نے سیٹھ نوید سانچے والے کو گرفتار کرلیا تھا۔ اس نے اپنے لیے ایک قابل اور شہر کے بڑے وکیل کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ وہ اپنے جرم سے انکاری تھا، مگر اس کے خلاف کیس بہت مضبوط اور شواہد و ثبوت ناقابلِ تردید تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپنے ساتھ عارفہ کو بھی پھنسانے کی کوشش کرے گا۔ مگر ابھی تک ایسی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آرہی تھی، نظر یہی آتا تھا کہ عارفہ اور اس کا گٹھ جوڑ بہت مضبوط بنیادوں پر استوار تھا۔

سرمد بابا کے آنجہانی ہونے اور سیٹھ نوید کی گرفتاری کے بعد آڈیہ کمپنی کے اشتہار کی کیا اہمیت و وقعت رہ گئی تھی، اس کا مجھے علم نہیں تھا۔

میں نے ریاض باجوہ کے ساتھ ایک چھوٹی سی میٹنگ میں انہیں عابدہ کے حالات اور آنسہ خالدہ سے ہونے والی گفتگو اور روابط وغیرہ سے اچھی طرح ''اَپ ڈیٹ'' کردیا تھا۔

سی آئی اے کے کمانڈو ونگ ''ٹائیگر ٹیگ'' کے اُن دو ایجنٹوں کی پاکستان میں متوقع اور خفیہ آمد کے سلسلے میں بھی میجر ریاض باجوہ نے گہری تشویش کا اظہار کیا تھا، تاہم میری طرح وہ بھی ان سے آڑے ہاتھوں نمٹنے کے لیے پوری طرح پُرعزم تھے۔ ان دو متوقع ایجنٹوں کو ٹریس کرنے کے لیے انہوں نے اپنی خفیہ فورس ''پاور'' کو متحرک کردیا تھا، ساتھ ہی مجھے بھی محتاط رہنے کی ہدایت کردی تھی۔

اس سلسلے میں میجر ریاض کا کہنا تھا کہ۔ ان دونوں سی آئی اے کے ایجنٹوں سے خفیہ ذریعے سے ہی نمٹنا ہوگا، کیونکہ انہیں اس بات کا خدشہ تھا کہ ان ایجنٹوں کے اپنے مشن میں ناکامی اور ظاہر ہونے کے بعد سیاسی حکومتی قیادت انہیں ''باعزت'' طور پر اور کوئی الزام ... عائد کیے بغیر واپس امریکا روانہ کردے گی۔

میں بھی یہی چاہتا تھا کہ یہ دونوں ایجنٹ یہاں آکر اپنی موت آپ ہی مرجائیں، تاکہ پھر کسی غیر ملکی ایجنٹ کو وطنِ عزیز میں اس طرح کی ''مہم جوئی'' کی جرأت نہ ہو سکے۔

مجھے چند روز بعد جمال انکل نے فون کرکے بتایا کہ سرمد بابا مرحوم کے وکیل ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت ضروری تھا۔

میں اس وقت اول خیر کے ساتھ وزیر جان کو قابو کرنے کی مہم پر روانہ ہونے والا تھا۔

میں ایک اُلجھن کا شکار ہوگیا تھا، آخر ایسی کیا بات تھی کہ سرمد بابا کے وکیل کو میری ضرورت پیش آگئی تھی؟ مجھے یہاں کسی اور ہی معاملے کی ابتدا ہوتی محسوس ہونے لگی تو اس پر سے پردہ ہٹانے کے لیے میں جمال انکل کو فون کرکے دفتر جا پہنچا، اول خیر میرے ساتھ تھا۔

مجھے اس بات پر کچھ حیرت بھی ہوئی تھی کہ وکیل صاحب سے آخر میری ملاقات سرمد بابا کے دفتر میں ہی کیوں کروائی جارہی تھی؟ اگر انہوں نے مجھ سے ایسی کوئی اہم یا خفیہ نوعیت کی بات کرنا تھی تو وہ مجھے اپنے دفتر میں بھی بلا سکتے تھے؟ بعد میں پتا چلا کہ اس کی ایک اہم وجہ تھی، وہ عارفہ اور اس کے دونوں بچوں، پنکی اور دانی کو بھی اس میٹنگ میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

بہرحال میں اول خیر کے ہمراہ دفتر پہنچا۔ وہاں ایک الگ اور بند کمرے میں اس ملاقات کا انتظام کیا گیا تھا۔ اول خیر کو اس ''چھرکنی'' میٹنگ میں شرکت کرنے سے روکا گیا، اور روکنے والی تھی عارفہ۔ مگر میں اڑ گیا اور اس میٹنگ میں مشروط شرکت کی ضد کرڈالی، کیونکہ مجھے اب تک اندازہ ہو ہی گیا تھا کہ میٹنگ کے شرکا میں میری اہمیت مسئلہ تھی، ناچار عارفہ کو ہی جھکنا پڑا۔ اول خیر شامل کیا گیا اور میٹنگ کے آغاز میں ہی مجھے پتا چلا کہ یہ میٹنگ درحقیقت سرمد بابا مرحوم کی وصیت سنانے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی۔ جس کا اظہار ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے ابتدا میں کردیا تھا، اور مجھے حیرت ہوئی تھی کہ بھلا سرمد بابا کی خاندانی وصیت سے میرا کیا تعلق ہوسکتا تھا؟

میں نے کن انکھیوں سے عارفہ کی طرف بھی دیکھا تھا،

اس کے چہرے پہ ناگواری اور نفرت کے ملے جُلے تاثرات سمیت ایک عجیب سی بے چینی بھی کروٹیں لے رہی تھی۔

صاف لگتا تھا کہ اُسے میری شمولیت ایک آنکھ نہیں بھائی تھی اور اب مجھے ایک کڑوی گولی کی طرح نگلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ جس قدر مجھ سے پیچھا چھڑانے کی تگ و دو میں رہتی، میں کسی نہ کسی بہانے پھر اس کے سامنے آن کھڑا ہوتا اور یہ حقیقت ہی تھی کہ جب تک عابدہ کا معاملہ بہ خیر و خوبی طے نہیں پا جاتا، میں اس کا پیچھا یوں اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

''میرا خیال ہے مجھے اب اصل بات کا آغاز کر دینا چاہیے۔''

چند ضروری ابتدائی کلمات اور سرمد بابا کی رحلت سے متعلق متاسفانہ اظہار کے بعد ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے کہا۔ پھر اپنے ہمراہ لائے گرے کلر کے بریف کیس کو کھولنے لگے۔ پھر اندر سے ایک فائل نکالنے کے دوران بولے۔

''سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا کی وصیت کے سلسلے میں عارفہ اور شہزاد احمد خان عرف شہزی کو آگاہ کرنا، میرے ذمے ایک قانونی فریضہ تھا جسے آج میں پورا کر رہا ہوں۔'' وہ خاموش ہوئے۔ فائل ان کے سامنے کھل چکی تھی۔ ایک نظر اس پر ڈالنے کے بعد انہوں نے باری باری میری اور عارفہ کی طرف دیکھا، پھر ہولے سے کھنکھار کر دوبارہ گمبھیر لہجے میں گویا ہوئے۔

''سیٹھ منظور وڑائچ صاحب، اگرچہ بہت پہلے اپنی وصیت تیار کروا چکے تھے، مگر بعد میں نجانے کیا ہوا کہ انہوں نے خود ہی اپنی وصیت کو کالعدم قرار دے کر ختم کر دیا تھا، پھر ایک طویل عرصے تک انہوں نے مجھ سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا۔ اگرچہ میں ان کا عائلی وکیل رہ چکا تھا۔'' وہ اتنا کہہ کر رُکے اور ایک نگاہ اپنے دائیں جانب کی چیئر پہ براجمان عارفہ پر ڈالی پھر آگے بولے۔

''پھر کچھ ہی عرصہ پہلے اچانک انہوں نے مجھ سے دوبارہ رابطہ کیا، مگر افسوس کہ اُس وقت وہ سیٹھ منظور وڑائچ نہیں بلکہ سرمد بابا تھے، آپ شاید میرا اشارہ سمجھ گئے ہوں، یعنی اُن کا سب کچھ ان کے بیٹے محمود کے نام ہو چکا تھا، یا کیا جا چکا تھا۔''

میں نے محسوس کیا کہ ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے دانستہ اس جملے کو وضاحت کے ساتھ ادا کیا تھا، اور ایک بار پھر عارفہ پر نگاہ ڈالی تھی، جس کے چہرے پہ اب پریشانی اور بے چینی سمیت اب خجالت کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔

وکیل صاحب اپنی بات جاری رکھتے ہوئے محتاط لہجے میں مزید بولے۔ ''میرا ان کی ذاتیات سے تو کوئی تعلق نہ تھا، لیکن بہر حال میں ان کا تنخواہ دار وکیل تو تھا اور میرا یہ فرض تھا کہ میں انہیں نیک اور اچھے مشورے بھی دیتا رہوں، انہوں نے مجھے بتایا کہ ان کے بیٹے محمود کا ایک جانکاہ حادثے میں انتقال ہو چکا ہے اور جو کچھ ان کے بیٹے کے نام تھا وہ لامحالہ اس کی بیوہ عارفہ کے نام منتقل ہو چکا ہے۔ وہ قانون نہیں جانتے تھے، مگر میں نے انہیں قانون کی ایک شق سے آگاہ کرتے ہوئے بتایا کہ چونکہ آپ کے مرحوم بیٹے محمود نے براہِ راست آپ سے ہی آپ کا سب کچھ اپنے نام کروایا تھا، چاہے وہ جس طریقے سے بھی کروایا ہو۔ لیکن اب ان کے انتقال کے بعد قانون کی رو سے یہ دوبارہ آپ کا ہو جائے گا، مگر آفرین ہے ان پر انہوں نے ایسا نہیں کیا اور اپنا سب کچھ اپنی بیوہ بہو مس عارفہ محمود کے نام ہی رہنے دیا۔''

اسی وقت میں نے دیکھا کہ عارفہ کے چہرے پہ، جہاں تھوڑی دیر قبل پریشانی اور بے چینی کے آثار تھے، وہ یکدم ایک مسرت آمیز طمانیت میں بدل گئے۔

''ہاں! انہوں نے صرف اس قدر ضرور کیا کہ پاور آف اٹارنی اپنے پاس رکھی تھی، اور بعض معاملات میں وہ مجاز بھی تھے کہ اپنا دیا ہوا، وہ کس کے حوالے کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔ لیکن اب ان کا پیسا، بینک بیلنس، پراپرٹیز اور کاروبار، سب کچھ ان کی بیوہ بہو عارفہ کے نام ہو چکا ہے۔ ماسوائے اڑیسہ کمپنی کے وہ پچاس فیصد شیئرز کے۔''

''کک... کیا مطلب؟ وہ کس کے نام ہیں پھر؟''

عارفہ ایک دم چلا اُٹھی۔ وہ شیئرز خالصتاً میرے مرحوم شوہر محمود ہی کی ملکیت تھے۔ ان سے سیٹھ منظور وڑائچ کا کوئی تعلق تھا، نہ ہی ان کا حق تھا ان پر۔''

''مجھے اپنی بات مکمل کر لینے دیں عارفہ صاحبہ! وصیت سن لینے کے بعد آپ کے تمام اعتراضات اور تحفظات سننے کے لیے میں ابھی ادھر ہی موجود رہوں گا، اسی لیے میں نے میٹنگ کے لیے آپ ہی کے دفتر کا انتخاب کیا ہے۔'' ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے گہری متانت سے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

عارفہ کا چہرہ مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ اتنا کچھ حاصل ہونے کے باوجود اس حریص عورت کے حواسوں پر لالچ و طمع اس قدر سوار تھا کہ شیئرز سے محرومی کا سن کر وہ باؤلی ہو گئی تھی۔

سلیم ہیرانی نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''ایسا فوراً ہی نہیں ہوا تھا، بے شک وہ شیئرز سیٹھ منظور وڑائچ کے بیٹے محمود ہی کی ملکیت میں شمار ہوتے تھے، لیکن چونکہ قانون کی رو سے سب کچھ منظور وڑائچ ہی کے توسط سے ان کے بیٹے کے نام تھا، اسی لیے قانون کی رو سے وہ بھی ان میں ردوبدل کرنے کے مجاز تھے۔ بلکہ وہ تو اپنا سب کچھ اپنے ہی نام دوبارہ کرنے کا بھی قانونی حق رکھتے تھے مگر جانے کیا بات تھی کہ بعد میں انہوں نے وہ سب کچھ اپنے دونوں پوتے پوتی، نعیمہ عرف پنکی اور خرم دانش عرف دانی کے نام کردیا جبکہ اس کی پاور آف اٹارنی ان کی ماں عارفہ کو سونپ دی، اور یہ شرط رکھی کہ اگر عارفہ سیٹھ نوید احمد کے نکاح میں جاتی ہے تو یہ پاور بھی اس کے پاس نہیں رہے گی۔ ہاں البتہ کسی اور نیک شریف آدمی کے نکاح میں اپنی مرضی سے جائے تو یہ پاور اسی کے پاس محفوظ رہے گی اور یہ سب میری وفات کے بعد ناقابلِ تنسیخ سمجھا جائے۔ تاہم کاروبار میں پچیس فیصد حصہ غیر مشروط طور پر میری بہو عارفہ اپنا بھی حق رکھے گی۔

اب رہی بات اڑیسہ کمپنی کے شیئرز کی جو انہوں نے خالصتاً اپنے نام کروا رکھے تھے۔ اگرچہ یہ بھی پہلے ان کے بیٹے محمود کے ہی نام تھے تاہم بعد میں منظور صاحب مرحوم نے اپنی وصیت میں اس سلسلے میں بھی ردوبدل کروائی تھی۔

اب رہی بات یہ کہ اڑیسہ کمپنی کے وہ پچاس فیصد شیئرز اب کس کی ملکیت کہلائیں گے تو اس سلسلے میں وصیت کا آخری باب پڑھ کے بتائے دیتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ کاپیاں آپ دونوں کو دے دوں گا۔'' یہ کہہ کر انہوں نے بہ آواز بلند وصیت کا آخری باب پڑھا۔

''زندگی اور موت کا مالک صرف اللہ ہے۔ یہ کب اور کیسے آنی ہوتی ہے، یہ کوئی نہیں جانتا، تاہم کچھ تحفظات کے پیشِ نظر میں اپنے مرنے کے بعد، خواہ وہ ناگہانی ہو، میں اڑیسہ کمپنی کے پچاس فیصد شیئرز کی مکمل پاور آف اٹارنی اپنے منہ بولے بیٹے شہزاد احمد خان عرف شہزی کے سپرد کرتا ہوں۔ وہ اسے جیسے چاہے استعمال کرنے کا قانونی مجاز ہوگا۔ اور اس سے حاصل کردہ منافع کا نصف مختار بھی ہوگا، چاہے اب وہ اسے فروخت کرے یا اس سے کاروبار کو آگے بڑھائے۔ باقی پچاس فیصد میرے دونوں پوتے پوتی کے نام ہوگا۔

بہ قلم خود سیٹھ منظور وڑائچ المعروف سرمد بابا۔''

''مائی فٹ!'' عارفہ ایک بار پھر ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ ''میں نہیں مانتی اس لغو وصیت کو... یہ... یہ اسی کی سازش ہے۔'' اس نے میری جانب اشارہ کیا۔ ''میں اس وصیت کو کورٹ میں چیلنج کروں گی۔''

''شیور! آپ اس کا حق رکھتی ہیں۔ تو پھر آپ مجھے بتا دیجیے گا کہ کب آپ اس نیک کام کا ارادہ رکھتی ہیں؟'' ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے بپھری ہوئی عارفہ کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا اور آگے بولے۔

''تاکہ میں مزید کچھ کاغذات تیار کرلوں۔ کیونکہ سرمد بابا نے اپنی وصیت میں یہ شق بھی رکھی ہے۔ اس صورت میں، انہوں نے کچھ ثبوت کے ساتھ جو باتیں مجھ سے پرسنلی شیئر کی ہیں وہ مجھے مجبوراً کورٹ میں طشت ازبام کرنا پڑ جائیں گی، اور پھر آپ کو بعد میں ہر قسم کے حالات کے لیے خود کو تیار کرنا ہوگا۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی بعید نہیں آپ کو سزا بھی ہوسکتی ہے۔''

ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی کی اس بات پر عارفہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا مگر وہ بُری طرح تلملا بھی رہی تھی۔

میرے چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ عود کر آئی تھی۔ میں تو سب جانتا تھا کہ سرمد بابا کن حالات سے گزر رہے تھے، ایسے میں انہوں نے جو کیا تھا بالکل ٹھیک ہی کیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ انہوں نے اپنے آخری ایام میں میری طرح اپنی بہو عارفہ اور سیٹھ نوید کے خفیہ گٹھ جوڑ سے آگاہی حاصل کرلی ہو اور ان کا دل خراب ہوگیا ہو۔ تاہم انہوں نے بعد میں سوچا ہو کہ عارفہ ایک اکیلی عورت ہے، زیادہ عمر بھی نہیں ہوئی، اگر دوسری شادی کرتی بھی ہے تو پتا نہیں سوتیلے باپ کا ان کے ان کے پوتے پوتی کے ساتھ کیسا سلوک ہو؟ کہیں وہ عارفہ کو بے وقوف بنا کر اس کا سارا کچھ ہڑپ ہی نہ کرلے۔

سرمد بابا، صرف باپ ہی نہیں بلکہ دادا بھی تھے، اور ایسے حالات میں ایسے بوڑھوں کی دور اندیشی سے انکار ممکن نہیں۔

میٹنگ کے بعد بھی متعلقہ نوعیت کی گفتگو ہوتی رہی۔ اس کے بعد ایڈووکیٹ سلیم ہیرانی نے مجھ سے اپنے دفتر آنے کا وقت مانگا، میں نے انہیں یہ بات بعد میں فون پر بتانے کا کہا، وہ میرا اشارہ سمجھ گئے، اس کے بعد عارفہ سے بھی یہی بات پوچھی، اُس نے فوراً اگلے دن ہی پہنچنے کا کہہ دیا، مگر اب اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا، وصیت کو عدالت میں چیلنج کرنے کا جو تھوڑی دیر پہلے تک اس کے اندر جوش تھا وہ ہیرانی صاحب کی تنبیہ کے بعد ماند پڑ چکا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ جانے لگی تو پنکی اور دانی میری طرف بڑھے، اور میرا ایک ہاتھ چھو کر پنکی نے بڑی رسانیت

سے کہا۔

”بھائی جان! آپ آئیے ناں ہمارے گھر؟ آپ نے تو آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

اس کی دیکھا دیکھی دانی بھی بولا۔ ”ہاں بھائی جان! دادو جان کے بعد ہم خود کو بالکل اکیلے ہی سمجھنے لگے ہیں، آپ سے کچھ سہارا ہو جاتا ہے۔ کیا آپ اب کبھی بھی ہمارے گھر نہیں آئیں گے؟“

مجھے ان دونوں پر بے اختیار پیار آگیا۔ یہ سرمد بابا کی ان کے ساتھ محبت اور میرا ان سے بے لوث برتاؤ تھا کہ یہ دونوں مجھے بھی اپنے ہی گھر کا ایک فرد سمجھتے تھے۔ میں نے ان دونوں کو اپنے ساتھ لگا لیا اور بڑی محبت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔

”تم سے کس نے یہ کہہ دیا کہ میں اب تمہارے گھر نہیں آیا کروں گا؟ تمہارے دادو جان نے مجھے اپنا منہ بولا بیٹا کہہ کر تم سے میرا جو رشتہ ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا ہے وہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ اور پھر اب اس وصیت کے بعد تو بالکل بھی نہیں۔ میں ضرور آیا کروں گا۔“ اس کے بعد میں نے ذرا جھک کر ان دونوں کی پیشانیوں کو چوما۔

دونوں کے چہروں پہ میں نے طمانیت اور خوشی کے آثار محسوس کیے تھے۔ جس کا اظہار ان دونوں نے بڑی گرم جوشی کے ساتھ میرا ہاتھ پکڑ کے دبا کر کیا تھا۔ میں بھی ہولے سے مسکرا دیا تھا اور ترچھی نظروں سے قریب کھڑی عارفہ کی طرف دیکھا تھا، اس کا چہرہ بھرپور نفرت کی عکاسی کر رہا تھا۔ میں اس کی وجہ جانتا تھا۔

”او خیر کا کے! یہ اپنے سرمد بابا تو تم کو بھی جاتے جاتے سیٹھ بنا گئے۔ کروڑوں کی مالیت کے شیئرز میں سے نصف حصہ تمہارے نام کر گئے!“

کار میں روانہ ہوتے وقت اول خیر نے بڑی عجیب کہہ دی۔ مجھے اس کی بات بری لگی۔ مگر میں جانتا تھا کہ ایسا اس نے روا روی اور مذاق میں کہا تھا، ورنہ وہ مجھے یہ خوبی... جانتا تھا کہ میں ایسی کسی شے کو لینا ہی پسند نہیں کرتا، جو میری نہ ہو۔ لہٰذا بولا۔

”سرمد بابا ایک طرح سے مجھے ایک بڑی ذمے داری سونپ گئے ہیں۔ ان شیئرز پر میں اپنا حق نہیں سمجھتا۔ ان کی وصیت اپنی جگہ نیک نیتی پر مبنی ہے، اور ایک طرح سے انہوں نے مجھے منہ بولا بیٹا ہونے کا حق ادا کیا ہے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں ان کے ساتھ کس قدر مخلص تھا، وہ اس کا بارہا میرے سامنے اظہار بھی کر چکے تھے کہ اگر ان کا بیٹا محمود بھی زندہ ہوتا تو وہ تب بھی اس سے زیادہ مجھ پر بھروسا کرتے۔ اللہ انہیں جنت بخشے عجیب فقیر منش انسان تھے وہ۔“

”آمین!“ اول خیر زیرِ لب بولا۔ ”لیکن کاکے وہ نیک نیتی ہی کے ساتھ تمہیں ان پچاس فیصد شیئرز کے منافع کا مختار و مالک بنا گئے ہیں اور تم اس کا حق بھی رکھتے ہو۔ جبکہ تم یہ بھی سمجھ رہے ہو کہ وہ ایک طرح سے تمہیں ایک بڑی ذمے داری بھی سونپ گئے ہیں۔ سرمد بابا تمہیں اپنی خوشی سے دے گئے ہیں۔ تمہیں انکار نہیں کرنا چاہیے۔“

”یہ تو کیا کہہ رہا ہے اول خیر؟ میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو مذاق کر رہا ہے میرے ساتھ؟“ مجھے اس کی بات پر حیرت ہوئی تھی۔

”نہیں کاکے! میں تیرے ساتھ کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ سمجھا رہا ہوں تجھے۔ یہ ایک جنگ ہے، اور اس میں جو مالِ غنیمت حاصل ہوتا ہے، اسے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے۔ اور پھر یہ تو اس دنیا سے رُخصت ہونے والے ایک ایسے شخص کا اپنی خوشی سے دیا ہوا وہ تحفہ ہے جس کا اس نے تجھے حقدار سمجھا ہے۔ تو بتا مجھے، تو نے اور عابدہ بہن نے سرمد بابا کی خاطر کیا نہیں کیا؟ اور اب تک کر رہا ہے بلکہ وہ تیرا اپنے خاندان سے جو رشتہ جوڑ چکے ہیں، وہ ایک طے شدہ امر ہے کہ تو ان کے بعد بھی ان کے خاندان کی دیکھ بھال میں شامل رہے گا، سرمد بابا نے تجھے ایسے ہی نہیں زبانی کلامی اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ بلکہ وہ تجھے ایسا سمجھتے بھی تھے، اور تو نے ایسا کر کے بھی دکھایا۔ کاکے! تیری جنگ بہت پھیل چکی ہے۔ جب تک یہ زندگی ساتھ دے گی اول خیر کو تو بغیر کسی غرض کے اپنے ساتھ پائے گا، لیکن کاکے! پیسوں کی تجھے ضرورت رہے گی۔ اس رضا کارانہ نوکری میں بے شک تجھے تھوڑا بہت جو مل رہا ہے، وہ بھی ٹھیک ہے۔ لیکن جس حساب سے تیرے ملکی و غیر ملکی دُشمنوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وقت کی اس اہم ضرورت سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ لولوش جیسے عالمی مجرم اور باسکل ہولارڈ جیسے خبیث سی آئی اے افسر سے نمٹنے کا تو میرے ذہن میں ایک آسان اور شاندار منصوبہ بھی آچکا ہے۔ مگر تو میری بات کب مانتا ہے؟“

وہ اتنا کہہ کر ذرا رُکا تو میں نے اپنی سوچتی نظریں اس کے چہرے پہ جما دیں۔ منصوبے والی.... بات نے مجھے چونکا دیا تھا۔

وہ میری بے چینی اور نیم رضامندی بھانپ کر مسکرا کے بولا۔ ”گھر پہنچ کر میں تجھے بتاتا ہوں کہ ہم نے کیا

کرنا ہے۔"

☆☆☆

لولوش اور باسکل ہولارڈ جیسے طاقت ور دشمن سے نمٹنے اور عابدہ کو ان کے چنگل سے چھڑانے کا جو منصوبہ اول خیر نے مجھے بتایا تھا، وہ اگرچہ بادی النظر میں بالکل سادہ سا ہی محسوس ہوتا تھا لیکن شاندار اور مؤثر بھی معلوم ہوتا تھا، رہی بات خطرات کی تو وہ اپنی جگہ موجود تھے۔ ان سے نمٹنا تو ہمارا کب کا شیوہ بن چکا تھا۔

اڑیسہ کمپنی کے وہ شیئرز اب مکمل طور پر میرے تصرف میں تھے، جس میں لولوش کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ منصوبہ یہ تھا کہ میں اب خود اس سلسلے میں لولوش سے ایک کاروباری ڈیلنگ کرتا اور یوں میری اور اس کی ملاقات متوقع ہوتی۔ یہی وہ وقت ہوتا جس سے میں فائدہ اُٹھاتے ہوئے لولوش پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کی پوزیشن میں آجاتا اور اس طرح اس کی بیوی انجیلا، جو باسکل ہولارڈ کی لاڈلی اکلوتی بیٹی تھی، اسے اغوا کر کے باسکل ہولارڈ کے چنگل سے عابدہ کو چھڑوانے کی کوشش کرتا۔

باسکل ہولارڈ یقیناً اپنی بیٹی اور چہیتے داماد لولوش کی رہائی کی خاطر عابدہ کو ہمارے حوالے کرنے پر مجبور ہوسکتا تھا۔ کام مشکل تھا مگر منصوبہ بے داغ تھا۔ اور یہی چیز میری ہمت اور جوش کو مہمیز کر رہی تھی۔

"اول خیر! تیرا منصوبہ تو زبردست ہے لیکن لولوش سے اس سلسلے میں بات کیسے اور کہاں ہو؟"

"سیٹھ نوید کا لنک مجھے لولوش سے لگتا ہے، وہی ہماری اس سے بات کرواسکتا ہے۔" اول خیر بولا۔

"مگر وہ تو پولیس کے حوالے ہے؟"

"وہ وہاں زیادہ عرصہ نہیں رہے گا، بہت جلد ضمانت پر چھوٹ جائے گا۔"

"مگر وہ سرمد بابا کا مجرم اور قاتل ہے۔ اُسے تو میں ہر قیمت پر سزا دلوا کر رہوں گا۔"

"وہ کہیں بھاگا نہیں جارہا، اس سے بھی نمٹ لیں گے، عارفہ کے ذریعے اس سے بات ہوسکتی ہے، وہ ضرور اس سے ملاقات کرنے جاتی ہوگی بلکہ مجھے یقین ہے اس نے اب تک لاک اَپ میں ہی اس سے ملاقات کر کے اسے تازہ صورتِ حال کے بارے میں بتا بھی دیا ہوگا کہ اب اڑیسہ کمپنی کے شیئرز تمہاری ملکیت میں ہیں۔"

"میرے ذہن میں ایک اور خیال بھی آتا ہے۔"

"کیسا خیال؟"

"عارفہ بھی تو "تھرڈ پرسن" کا رول ادا کر کے ہماری بات لولوش سے کرواسکتی ہے؟"

"ہاں! یہ بھی ممکن ہے۔" اول خیر نے میرے خیال کی تائید کی۔ تاہم لمحہ بھر کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "ابھی فوراً اس سلسلے میں عارفہ سے رابطہ نہ کیا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا۔ فی الحال انتظار کا کھیل کھیلتے ہیں۔ ممکن ہے عارفہ یا سیٹھ نوید خود ہی ہم سے رابطہ کرنے پر مجبور ہوجائیں، کیونکہ اب اس وصیت کے بعد سے عارفہ کی بھی نیندیں حرام ہوچکی ہوں گی۔ وہ بہت جلد تم سے رابطہ کرے گی۔"

"میرا خیال ہے تب تک وزیر جان کا قضیہ نمٹا دیا جائے۔" میں نے کہا۔ "میں اس پر اب باقاعدہ ہاتھ ڈالنا چاہتا ہوں، پاور والوں کی طرف سے مجھے ریڈ سگنل کا انتظار تھا جو مجھے مل چکا ہے، میری کل ہی میجر صاحب سے اس سلسلے میں بات ہوئی تھی، انہوں نے کیپٹن جنجوعہ صاحب سے بھی حتمی مشورہ کیا تھا۔"

"بس تو ٹھیک ہے آج رات ہی نکلتے ہیں اس مہم پر۔ اب وزیر جان کا معاملہ ختم ہوجانا چاہیے۔" اول خیر بولا۔

"ہاں اول خیر۔ جب سے مجھے اس خبیث نے بتایا ہے اور میں نے ریکارڈ روم میں اپنے باپ سے متعلق جو کچھ پڑھا ہے کہ میرا اجری سپاہی باپ زندہ ہے، مجھے بے چینی سی لگی ہوئی ہے۔ وزیر جان میرے باپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے؟ اب اس کا منہ کھلوانا ضروری ہوگیا ہے۔ میں اب تک اسے اسی وجہ سے چھوڑتا آیا تھا کہ مجھے اس سے متعلق حقیقت کا کچھ علم نہ تھا، لیکن اب ماں جی کی زبانی مجھے حقیقت کا علم ہوچکا ہے، یہ دھوکے باز شخص نہ صرف ملک دشمن ہے بلکہ میری ماں کا مجرم بھی، بہت ظلم ڈھایا اس نے میری مجبور ماں پر۔" میرے اندر کا ابال خون بن کر آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔

شکیلہ نے ہمیں اس مہم پر حتمی اور فیصلہ کن طور پر مائل پایا تو مشورہ دیتے ہوئے بولی۔ "اس خطرناک مہم پر صرف تم دونوں کا جانا کافی نہ ہوگا، تمہیں پاور کے ایجنٹوں کو شامل کرنا چاہیے۔"

"وزیر جان صرف میرا شکار ہے شکیلہ!" میں نے اس کی طرف گھوم کر کہا۔ "میں خود اُسے ٹھکانے لگاؤں گا تب ہی میرے اندر کی آتشِ انتقام ٹھنڈی ہوگی۔"

شکیلہ نے مزید کچھ کہنا چاہا مگر اول خیر نے اُسے اشارے سے خاموش کرادیا۔

☆☆☆

میں اور اول خیر اس مہم پر ساہیوال کی طرف روانہ ہونے کا پروگرام بنا ہی رہے تھے کہ اچانک مجھے زہرہ بانو کی کال موصول ہوئی۔ فون اٹینڈ کرتے ہی میں نے سب سے پہلے ماں جی کی خیریت دریافت کی۔

''وہ بالکل ٹھیک ہیں اور میرے پاس خوش بھی، تم بتاؤ، کہاں ہو اس وقت؟'' وہ بولیں۔

''میں اپنی رہائش گاہ پر۔'' میں نے مختصراً جواب دیا۔ اور اسی وقت میرے سیل پر کسی اور کال کی بپ کی آواز اُبھرنے لگی۔

''شہزی! ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی مجھے کسی کی کال موصول ہوئی تھی، وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔''

''کون تھا وہ؟'' میں نے فوراً پوچھا۔

''پتا نہیں، لیکن اپنا نام بتانے سے گریزاں تھا، پوچھ رہا تھا کہ شہزاد احمد خان سے بات ہو سکتی ہے۔''

''پھر، آپ نے کیا جواب دیا اُسے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہی کہ وہ یہاں نہیں ہوتے۔'' وہ جواباً بولیں۔

''آپ نے یہاں کا تو نہیں بتایا اُسے؟'' کسی خیال کے تحت میں نے کہا۔

''نہیں، لیکن وہ تمہارا نمبر مانگ رہا تھا کہ ایک تو اس کے پاس وقت بہت کم ہے، تم سے کوئی اہم بات کرنی ہے، دوسرے وہ تم سے ملاقات بھی کرنا چاہتا ہے۔''

''حیرت ہے۔ اس کے پاس وقت بھی کم ہے اور وہ مجھ سے ملاقات کا بھی متمنی ہے؟'' میں نے اُلجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ میری پیشانی پہ سلوٹیں نمودار ہو گئی تھیں۔ ''آپ نے نمبر دیا اسے میرا؟''

''ہاں! دینا ہی پڑا، اس نے بات ہی ایسی کہی تھی۔'' زہرہ نے کہا۔

''کیا بات کہی تھی اس نے؟'' میں نے استفسار کیا۔ اس دوران دوسری کال کی بپ مسلسل بج رہی تھی، اور میں نے زہرہ بانو کا جواب سنے بغیر ہی کہہ دیا۔

''میرا خیال ہے میرے سیل پر جس کال کی بپ بج رہی ہے، وہ اسی کی کال نہ ہو۔ میں اٹینڈ کر کے آپ سے پھر بات کرتا ہوں۔ آپ صرف مجھے یہ بتا دیں کہ اس کی کال آپ کے سیل فون پر آئی تھی یا لینڈ لائن پر؟''

''لینڈ لائن پر۔'' انہوں نے جواب دیا اور پھر میں نے رابطہ منقطع کر کے دوسری کال ریسیو کی۔

''ہیلو، شش... شہزاد خان؟'' دوسری جانب سے استفسار یہ کہا گیا۔ بولنے والا مجھے خاصا عجلت میں اور کچھ اعصاب زدہ بھی لگا۔

''ہاں! بات کر رہا ہوں، مگر تم کون ہو؟'' میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

''شہزادا! میرے پاس وقت کم ہے اور میں زیادہ دیر تم سے رابطے میں نہیں رہ سکتا۔ بس یوں سمجھ لو کہ میں اس وقت اپنی جان پہ کھیلا ہوا ہوں۔ میں ثریا کا ساتھی ہوں۔ ثبوت کے لیے یہ کافی ہے کہ جب تم وزیر جان کی قید میں تھے تو میرا ایک ساتھی تمہارا گمنام ہمدرد بن کے تمہیں اور تمہاری ماں کو اس کی قید سے چھڑانے کے لیے اپنی زندگی ہار بیٹھا تھا، لیکن اس کی قربانی ضائع نہیں گئی تھی۔ کافی ہے اتنا؟ آگے بات کروں؟''

اس نے کہا تو میرے وجود میں خون کی گردش یک لخت تیز ہو گئی۔ ''میں جان گیا ہوں، صرف ایک بات، کیا ابھی تھوڑی دیر پہلے تم نے ہی... بیگم ولا...؟''

''ہاں! میں نے ہی وہاں فون کیا تھا۔'' اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔ ''کیونکہ ثریا نے جو ہمیں نمبر دے رکھا تھا تمہارا، وہ بیگم ولا کا ہی تھا۔''

''بولو جلدی کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے فوراً کہا۔

''میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ملے بغیر بات نہیں بن سکتی؟'' میں نے کسی خیال کے تحت کہا۔

''نہیں۔'' وہ جلدی سے بولا۔ ''بات صرف ملاقات ہی کی نہیں ہے، ہمیں عملی طور پر کچھ کرنا بھی ہوگا۔ بس اتنا سمجھ لو، اسپیکٹرم کی لوکل کمانڈ کو نیست و نابود کرنے کا تمہیں ایک سنہری موقع ملنے والا ہے۔ اب صرف ملنے کی بات کرو۔''

''میں تیار ہوں۔ کہاں ملنا ہے؟''

''آج رات شارپلی 9 بجے لاہور ائرپورٹ کے قریب واقع ایک ہوٹل کے کمرا نمبر 19 میں۔ ڈن؟'' اس نے آخر میں استفسار یہ کہا اور میرے اثباتی جواب کے بعد اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میرے چہرے پہ گمبھیرتا سی چھا گئی۔ اول خیر اور شکیلہ میرے قریب ہی موجود تھے۔

''خیریت کا کے؟ کون تھا۔ کیا کہہ رہا تھا؟'' اول خیر قدرے بے چینی سے مستفسر ہوا۔ ۔ میں نے ایک گہری ہنکاری خارج کی اور اسے ساری بات بتا دی۔

''تو کیا تو نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا ہے شہزی؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''یہ کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اور حقیقت یہی ہے جو ثریا کے حوالے سے میری

معلومات میں موجود ہے، وہ اس نے مرنے سے پہلے مجھے دی تھیں۔ جس کے مطابق ثریا حالات سے مجبور ہو کر نادانستگی میں وزیر جان کے ٹولے میں شامل ہو گئی تھی۔ مگر جیسے ہی اُسے اور چند دیگر لوگوں کو معلوم ہوا کہ وزیر جان درحقیقت ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہے تو وہ اس سے متنفر ہونے لگے۔ پھر ثریا اور اس کے ہم خیال لوگوں پر مشتمل ٹولے نے اندر ہی رہتے ہوئے اس کی بیخ کنی کرنے کی ٹھانی۔

اسی دوران حادثاتی طور پر ثریا کا مجھ سے ٹکراؤ ہو گیا اور اس نے مجھے ساری حقیقت بتا دی، اور مجھ سے بھی اس سلسلے میں مدد چاہی، اسی نے بعد میں اپنے گنے چنے ساتھیوں کو میرے بارے میں بھی آگاہ کر دیا تھا مگر بدقسمتی سے ثریا اور اس کے کچھ ساتھی اس خفیہ ''مہم جوئی'' میں مارے گئے۔ اب پتا نہیں باقی ماندہ کتنے بچے تھے۔ لیکن وہ اب بھی کسی ایسے موقع کے منتظر تھے کہ اسپیکٹرم کو بڑی زک پہنچائیں، ہوسکتا ہے وہ موقع انہیں اب ملا ہو۔ اسی لیے میں اسے ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ اور میں لاہور ضرور جاؤں گا۔'' میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

حفظِ ماتقدم کے تحت ہم نے یہ احتیاط رکھی تھی کہ میں اس گمنام ہمدرد سے بہ ظاہر اکیلا ہی ملاقات کروں گا، جبکہ اول خیر مجھ پر نگاہ رکھے گا اور ''فالو'' کرتا رہے گا۔

مختصر مگر ضروری تیاری کے بعد میں اور اول خیر لاہور روانگی کے لیے تیار تھے۔ اس دوران زہرہ بانو کا فون آگیا۔ وہ بھی دریافت کرنا چاہ رہی تھیں کہ کال کرنے والا کون تھا اور کیا چاہتا تھا؟ وغیرہ۔

میں نے انہیں سب بتا دیا، انہیں میرے اس اقدام پر تشویش ہوئی تھی، تاہم میں نے ان کی تشفی کر دی تھی۔

''ماں جی! تم سے کوئی اہم بات کرنا چاہ رہی تھیں۔''

''کون سی بات؟ دینا انہیں فون، میں ابھی کر لیتا ہوں۔'' میں نے قدرے چونک کر کہا تو زہرہ بانو عجیب سے لہجے میں بولیں۔

''وہ فون پہ نہیں، تم سے روبرو بات کرنا چاہتی ہیں۔ تم آسکتے ہو تو آجاؤ۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔''

میں اُلجھ سا گیا اور سوچنے لگا، پتا نہیں ماں جی ایسی کیا بات مجھ سے کرنا چاہتی تھیں جو فون پہ نہیں ہوسکتی تھی۔ جبکہ ابھی چند دن پہلے تو وہ میرے پاس ہی تھیں، پھر اب اچانک بیگم ولا پہنچ کر ایسی کیا بات مجھ سے کرنا یاد آگئی تھی؟ اور وہ بھی ایسی بات جو فون پر نہیں ہوسکتی تھی۔

''کیا آپ کو علم ہے ماں جی مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی ہیں؟'' میں نے زہرہ بانو سے پوچھا۔

''مجھے نہیں پتا، ویسے میں نے بھی پوچھنے کی کوشش کی تھی ماں جی سے۔ بڑا عجیب جواب دیا تھا ماں جی نے کہ وہ ہم دونوں کے سامنے ہی وہ بات کرنا چاہتی ہیں۔ پلیز آجاؤ ناں شہزی! مجھے تو خواہ مخواہ کا تجسس ہو رہا ہے۔'' وہ بڑے دُلار سے بولیں۔

''کہیں وہ پریشان تو نہیں ہیں؟''

''بالکل نہیں، بھلا میرے پاس انہیں کیا پریشانی ہو گی۔ شہزی! وہ بے حد خوش ہیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے، میں آتا ہوں ابھی۔'' میں نے کہہ کر بات ختم کی۔

میں نے اول خیر کو ساتھ لیا اور کار میں روانہ ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم بیگم ولا پہنچ چکے تھے۔

مجھے آج یہاں معمول سے زیادہ سخت سیکیورٹی کا احساس ہوا، میں اس کی وجہ جانتا تھا۔ میں ان کے لیے اجنبی تو نہیں تھا مگر کچھ نئے لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے، انہی میں مجھے کمیل دادا دکھائی دے گیا۔ میں اس کی یہاں موجودگی کی وجہ جان گیا۔ اُسے زہرہ بانو نے ہی باہر گیٹ پر ہمیں لینے کے لیے بھیجا تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پہ مجھے دیکھتے ہی ایک کھنڈی ہوئی سنجیدگی کے تاثرات اُمڈ آئے تھے۔ پھر وہ جیسے طوعاً و کرہاً ہی ہماری کار کی جانب بڑھا تھا۔ لیکن اول خیر پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے کے تاثرات یکدم بگڑ سے گئے۔

میں کار سے نیچے اُتر آیا اور ساتھ ہی اول خیر کو بھی اُترنے کا اشارہ کر دیا تھا۔

''اسے کیوں لائے ہو اپنے ساتھ۔'' وہ ایک نفرت انگیز سی نگاہ اول خیر پر ڈالنے کے بعد مجھ سے قدرے دُرشت لہجے میں بولا تو میں نے بھی اسی طرح تند انداز میں کہا۔

''یہ میرا ساتھی ہے اور میں اسے ہمیشہ اپنے ساتھ ہی رکھتا ہوں سمجھے۔'' پھر میں نے متذبذب کھڑے اول خیر، سے کہا۔ ''اول خیر! آؤ میرے ساتھ۔''

میرا جارحانہ انداز دیکھ کر وہ فوراً ایک طرف کو ہو گیا۔ جب سے اُسے اس حقیقت کا علم ہوا تھا کہ لئیق شاہ کے حوالے سے میرا زہرہ بانو کے ساتھ کیسا رشتہ قائم ہو چکا ہے۔ وہ اب میرے آڑے آنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ تاہم روش اس کی اب تک میرے ساتھ وہی پرانی تھی، یعنی

رقیبوں والی۔

گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کبیل دادا نے مجھے سنانے کی غرض سے اپنے کسی ساتھی سے بہ آواز بلند کہا۔ ''اسے مہمان گاہ میں بٹھاؤ۔'' اشارہ اول خیر کی طرف تھا۔ کبیل دادا کے حکم پر وہ آدمی فوراً اول خیر کی طرف بڑھا تھا۔ میں نے اس کا راستہ روک دیا اور کبیل دادا کی طرف گھوم گیا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بھاری آواز میں کہا۔ ''اول خیر میرے ساتھ ہی اندر جائے گا۔''

''اسے تو یہاں دروازے کے پاس بھی آنے کی اجازت نہیں تھی، مگر خیر۔ لیکن یہ مہمان گاہ میں رکے گا۔ جب تک تم اندر سے واپس نہیں آجاتے۔'' کبیل دادا نے بھی گمبھیر لہجے میں کہا۔

اس کی اڑی بازی پر مجھے غصہ تو بہت آیا، مگر میں اب اس کے معاملے میں ضبط سے ہی کام لینے کی کوشش کرتا تھا، اس لیے کہ میرے دل کے کسی گوشے میں اس کے لیے احترام بھی تھا، اور اس کی اپنے ساتھ رقابت کو بے بنیاد اور فضول ہی سمجھتا تھا۔ لہٰذا خود کو ذرا پُرسکون رکھتے ہوئے بولا۔

''دیکھو کبیل! بے شک اس کا تعلق اب یہاں سے نہیں رہا ہے، لیکن یہ اب میرا آدمی ہے اور اسی حیثیت سے یہ یہاں آیا ہے۔''

''میں اسے اندر نہیں جانے دوں گا۔ بس!'' کبیل دادا نے سرد وسپاٹ لہجے میں کہا۔

وہاں موجود جو پرانے ساتھی تھے، وہ میری اور کبیل دادا کی پرانی چپقلش سے اچھی طرح واقف تھے اس لیے وہ سر جھکائے خاموش کھڑے تھے لیکن کچھ نئے لوگ، میری اور اول خیر کی طرف گھور گھور کر دیکھنے لگے، ان کے خیال میں شاید یہ معاملہ دشمن داری کا تھا۔ ایک دو نے جارحانہ انداز میں ہماری جانب قدم بھی بڑھایا تھا مگر کبیل دادا نے انہیں غصے اور جھنجلاہٹ کے مارے چلا کر وہیں رُکنے کا کہہ ڈالا۔ پھر کسی پرانے آدمی نے اس نئے والے آدمی کے کان میں کچھ کھسر پھسر کی تو وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

''او خیر!'' کہتے ہوئے اول خیر نے کبیل دادا کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''تو چلا جا کاکے! ماں جی سے مل آ۔ میں اِدھر ہی کھڑا ہو جاتا ہوں۔ خیر ہے۔''

''ہرگز نہیں، تم بھی میرے ساتھ اندر چلو گے۔'' میں نے گرم سے لہجے میں کہا اور کبیل دادا کی اکڑ پر اسی وقت زہرہ بانو کا سیل نمبر ملایا، اور ان سے کہا کہ میں اول خیر کے بغیر اندر نہیں آؤں گا۔ مزید یہ کہ ماں جی بھی اول خیر کو میرا وفادار ساتھی، دوست، غمخوار اور بھائی کی حیثیت سے جاننے لگی ہیں۔

میں نے دانستہ ماں جی کا تذکرہ کیا تھا، تاکہ زہرہ بانو کو انکار کی گنجائش نہ رہے۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ یہاں اول خیر کے سلسلے میں کیسا نازک معاملہ تھا۔

دوسری طرف پل بھر کو خاموشی چھا گئی پھر زہرہ بانو نے مجھ سے کہا کہ کبیل دادا کو فون دو، میں نے فون کبیل دادا کی طرف بڑھا دیا۔

کبیل دادا نے بہ دستور کڑوی کسیلی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے فون میرے ہاتھ سے لیا، تھوڑی دیر دوسری طرف کی گفتگو سنتا رہا، پھر مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

''ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! جیسا آپ کا حکم۔''

اس نے سیل فون دوبارہ میری جانب بڑھا دیا اور اول خیر کو بھی میرے ساتھ آگے جانے کی اجازت مل گئی۔

وہاں پہنچتے ہی میں نے سب سے پہلے ماں جی کے کمرے میں حاضری دی۔ ماں کے قریب آتے ہی مجھے ہمیشہ ایک روحانی سکون ملتا تھا۔ ذہن ودل پہ طاری ایک بوجھ کی سی کیفیات گویا پل کے پل عنقا ہونے لگتیں اور میں خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتا تھا کہ میرے لیے دعائیں مانگنے والی میری ماں زندہ تھی۔

زہرہ بانو بھی وہیں موجود تھیں اور میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ میں سلام کر کے ماں جی کے بالکل قریب بیڈ پر بیٹھ گیا تھا۔ ماں جی میرے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرنے لگیں، اول خیر نے بھی ماں جی کو سلام کر کے اپنا سر احترام سے ان کے سامنے جھکا دیا، ماں جی نے اس کے سر پہ بھی پیار سے اپنا ہاتھ پھیرا اور جیتے رہنے کی دعا دی۔ پھر اس نے قریبی کرسی پر تمکنت کے ساتھ براجمان زہرہ بانو کو بھی سلام کیا۔ پھر اول خیر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں اس کے دوست پہلے سے موجود تھے، وہ وہاں مصروف ہو گیا۔

مجھے حیرت ہوئی تھی' ماں جی کو دیکھ کر وہ یہاں ایسے ہی خوش اور مطمئن نظر آرہی تھی جیسے یہ اس کے بیٹے کا گھر ہو۔

''ماں! لگتا ہے، تیری نوں تیری بہت خدمت کرتی ہے، اسی لیے یہاں بہت خوش نظر آرہی ہو۔'' کہتے ہوئے میں نے زہرہ بانو کی طرف دیکھا تھا۔

''ہاں پتر! کیوں نہیں، یہ میری بہت خدمت کرتی ہے۔'' ماں جی نے نرم اور میٹھے لہجے میں کہا۔ ''میں تو اسے

اب بھی اپنی نوں ہی سمجھتی ہوں۔ جب سے اس نے مجھے یہ بتایا ہے کہ میرا لئیق بھی یہاں، اس گھر میں رہ چکا ہے۔ مجھے تو اس کے درودیواروں سے اس کی خوشبو آنے لگی ہے۔ شہزی پتر! مجھے اب بھی ایسا ہی لگتا ہے جیسے میرا لئیق ادھر ہی کہیں موجود ہے۔ ابھی ماں جی کہہ کر مجھ سے آن لپٹے گا۔''

ماں یہ کہتے کہتے روہانسی ہونے لگیں۔ ماں کو بڑے بیٹے کی دائمی جدائی کے دکھ میں اس قدر رنجور اور افسردہ دیکھ کر میرا دل کٹنے لگا۔ مجھے ہولے سے ایک سسکی کی بھی آواز سنائی دی، یہ زہرہ بانو تھیں، وہ بھی اپنے مرحوم شوہر کی یاد تازہ ہونے پر آب دیدہ سی ہو گئی تھیں۔ میں بھی بڑے بھائی کی یاد میں غم زدہ سا خاموش اپنا سر جھکائے بیٹھا رہا۔

''شہزی پتر! لئیق کی صورت میں ابھی تک نہیں بھولی ہوں، آج بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے گھومتا رہتا ہے، میلے کا وہ دن، جب وہ میری اُنگلی پکڑے بہت خوش نظر آرہا تھا، جانے کون سی پھر وہ منحوس گھڑی آگئی کہ وہ مجھ سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گیا۔ پر اب مجھے زہرہ بیٹی نے پتر لئیق کی تصویر دکھائی تو میں حیران ہی رہ گئی۔ وہ تو بالکل تیرا ہم شکل تھا۔ لیکن پتر! پتا نہیں کیا بات ہے، مجھے پھر بھی تسلی نہیں ہوتی۔ مجھے تو لئیق کی وہی صورت یاد رہ گئی، جب وہ گیارہ --- بارہ سال کا ایک معصوم سا بچہ تھا۔'' ماں جی نے اس بار غم کی رقت کو پیتے ہوئے کہا۔

لیکن ماں جی کی اس بات کو سن کر جانے کیوں ایسا لگا، جیسے کسی نے میرے دل کو مٹھی میں پکڑ کے دبوچ لیا ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے ماں جی کو اپنے بڑے بیٹے لئیق شاہ سے ہی زیادہ پیار تھا۔ اور جو بیٹا زندہ اور اس کی آنکھوں کے سامنے تھا، جو خود بھی ماں باپ اور بھائی کی جدائی کا زہر پیے ہوئے تھا، اس کے درد کا کسی کو بھی اندازہ نہ تھا۔ بس صرف ایک پل کے لیے ہی میرے اندر یہ احساس جاگا تھا، جسے میں نے فوراً ہی لغو جان کر اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اور ساتھ ہی خود کو بھی کوسا کہ میں نے ماں جیسی ہستی کے بارے میں ایسا خیال سوچا بھی کیوں، شیطان کا ورغلانا اسی کو --- تو کہتے ہیں کہ وہ اچانک ہی وار کرتا ہے۔ وہ ہماری رگوں میں خون کی طرح دوڑتا ہے۔ مگر ایمان کی طرح ہمارے دل و دماغ پر قابض نہیں ہو سکتا۔ اور مجھے اسی دل و دماغ نے ایسا شیطانی اور لغو خیال فوراً جھٹکنے پر مائل کیا تھا۔

''شہزی پتر!'' ماں جی نے اچانک مجھے پکارا تو میں خیالات سے چونکا، بے اختیار ماں کی طرف دیکھا اور بے تابانہ بولا۔

''ہاں ماں! بول، تو مجھ سے کوئی خاص بات کہنا چاہتی تھی؟'' بالآخر میں نے ماں کو یاد دلایا تو انہوں نے ایک نگاہ پاس ہی کرسی پر بیٹھی زہرہ بانو کی طرف دیکھا، پھر اُسے بڑی محبت سے پکارا۔

''زہرہ! ادھر آنا ذرا۔''

زہرہ بانو اپنی کرسی سے اُٹھ کر ماں جی کے بیڈ کے بالکل قریب آکر کھڑی ہو گئیں۔

''ادھر بیٹھ، میرے قریب۔'' ماں نے ہولے سے کہا۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

اب میں ماں کے سیدھے ہاتھ کی طرف تھا اور زہرہ بانو ماں کے بائیں جانب۔ ماں جی نے پہلے اپنا بایاں ہاتھ زہرہ بانو کے نرم و نازک ہاتھ پر رکھا اور سیدھے ہاتھ سے میرا ہاتھ تھاما۔ مجھے ان کے ہاتھ میں واضح طور پر ہلکی لرزش سی محسوس ہوئی تھی، نہیں جان سکا تھا میں کہ یہ ارتعاش ماں جی کی کسی اندرونی جذباتی کیفیت کا رہین منت تھا یا ان کی عمر کا تقاضا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ماں جی اب کیا کہنے والی تھیں۔ اور یہ بھی نہیں کہ وہ اپنے ایک ایسے بیٹے کو کس جاں کش اور مہیب آزمائش میں ڈالنے والی تھیں، جو پہلے ہی حیاتِ درماندہ کے سُلگتے صحرا میں راندۂ درگاہ تھا۔

پھر جیسے وہ ہم دونوں کو ہی مخاطب کرتے ہوئے بولیں۔ ''مجھ بدنصیب نے دنیا میں بہت دُکھ دیکھے ہیں۔ اپنی خوشیاں بھی مجھ سے ناراض سکھیوں کی طرح رُوٹھ گئیں۔ مگر میں نے کبھی اپنے سوہنے رب سے کوئی گلہ، کوئی شکوہ نہیں کیا اور اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کے قبول کیا۔ اس آس و اُمید پر کہ کبھی تو مجھے اس کا صلہ ملے گا۔ مجھے --- تم دونوں سے بڑی اُمید ہے کہ تم دونوں کو میرے اس فیصلے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ ورنہ۔ شاید ایک دُکھیاری ماں کا دل ٹوٹ جائے گا، میں بےسکون ہی رہوں گی۔ اور اگر ایسا ہوا تم دونوں خوش رہو گے تو یقیناً لئیق شاہ کی روح کو بھی تسکین ملتی رہے گی اور گھر کی عزت بھی گھر میں ہی رہے گی۔ کیونکہ وہ زہرہ سے بہت محبت کرتا تھا۔ بھلا اسے کیسے دُکھی اور تنہا دیکھ سکتا ہے وہ۔ لہٰذا میری دلی خواہش ہے کہ تم دونوں شادی کر لو۔''

یہ کہہ کر ماں جی نے زہرہ بانو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

خونی رشتوں کی خود غرضی اور پرائے بن جانے والے اپنوں کی بے غرض محبت میں پرورش پانے والے نوجوان کی سنسنی خیز سرگزشت کے مزید واقعات آئندہ ماہ

مونگ پھلی کی گواہی

جمال دستی

اپنے آپ کو سب سے زیادہ عقل مند ماننے والا ممکن ہے اس سے زیادہ بے وقوف سمجھ لیا جائے جتنا وہ دراصل حقیقت میں ہوتا ہے... ایسے ہی ایک عقل مند کا کارنامہ... جو بے ساختہ ایک معمولی حرکت مگر غیر معمولی انداز میں کر بیٹھا...

مونگ پھلی کے دانے شکم کی آگ بجھانے کے ساتھ مجرم کا سراغ بھی دیتے ہیں...

مسز ڈوروتھی اس وقت ایک پُراسرار ناول پڑھ رہی تھی جب اسے نہایت بے رحمی سے قتل کیا گیا۔

لاش دریافت ہونے کے ایک گھنٹے کے اندر پولیس افسران کو وہی معمول کے فقرے سننے کو مل رہے تھے۔ ”ہر کوئی ڈوروتھی سے پیار کرتا تھا۔ اسے قتل کرنے کا کسی کے پاس کوئی جواز نہیں ہوسکتا۔“

ڈوروتھی ایک بیوہ تھی جس کی عمر پچاس برس سے اوپر تھی۔ لیکن اس کے دوست اور سہیلیوں کا یہی کہنا تھا کہ دیکھنے میں اتنی عمر رسیدہ بالکل بھی نہیں لگتی تھی۔

ڈوروتھی اس ٹائپ کے لوگوں میں سے نہیں تھی جو اس

عمر میں خود کو ریٹائر سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ ہیکنیک میں فریڈرک فشر فیملی کے پاس گزشتہ تیس برس سے زیادہ عرصے سے کام کر رہی تھی۔ اس بیشتر عرصے میں وہ فریڈرک فشر کی پرائیویٹ سیکریٹری رہی تھی۔ لیکن چند ماہ قبل فریڈرک فشر کے مرنے کے بعد وہ مسز فشر کی سوشل سیکریٹری کے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔

یہ مئی کی پہلی تاریخ تھی۔ مسز فشر پریشان ہو رہی تھی۔ ڈوروتھی کا معمول تھا کہ وہ صبح ٹھیک نو بجے ان کے گھر پہنچ جاتی تھی، مسز فشر کے ساتھ صبح کی کافی پیتی تھی اور ڈکٹیشن لیا کرتی تھی۔ اس وقت بھی کافی کی ٹرے میں دو بھرے ہوئے کپ معمول کے مطابق مسز فشر کے سامنے رکھے ہوئے تھے لیکن ڈوروتھی ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اور نہ ہی اس نے کوئی فون کیا تھا۔

جب صبح کے پونے دس بج گئے تو مسز فشر کو فکر لاحق ہو گئی۔ اس نے پریشان ہو کر اپنی بیٹی کو بلایا اور بولی۔ ''ڈوروتھی کو فون کرو اور معلوم کرو کہ اسے آنے میں دیر کیوں ہو رہی ہے۔''

فون کا جواب کسی مردانہ آواز نے دیا۔

''کیا ڈوروتھی موجود ہے؟'' مسز فشر کی بیٹی نے پوچھا۔

دوسری جانب کچھ دیر کے لیے خاموشی چھائی رہی۔ پھر کوئی جواب دیے بغیر فون رکھ دیا گیا۔

کئی گھنٹے گزر گئے۔ آخرکار مایوسی اور تشویش کے عالم میں مسز فشر کی بیٹی نے اپنی ایک سہیلی کو فون کیا جو ڈوروتھی کے پڑوس میں رہتی تھی اور اسے کہا کہ وہ ڈوروتھی کے گھر جا کر اس کی خیر خبر معلوم کرے کہ اس کے ساتھ کوئی واقعہ تو پیش نہیں آ گیا۔

واقعہ پیش آ چکا تھا۔ ڈوروتھی کو کسی نے قتل کر دیا تھا۔ ڈوروتھی کی لاش لیونگ روم کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا جو پھٹا ہوا تھا۔ اس کے سر پر کسی بھاری ڈنڈے سے وار کیا گیا تھا۔ فرش پر خون کی لکیر تھی جو اوپری منزل کے زینے تک چلی گئی تھی۔

اوپری منزل کے بیڈ روم کے فرش پر ایک مرڈر مسٹری ناول پڑا ہوا تھا۔ ''یہاں ایک عجیب سی شے بھی موجود ہے۔'' ایک پولیس افسر نے بیڈ روم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''نمکین مونگ پھلی کے دانے۔ یہ دیکھو۔''

''بات بہ آسانی سمجھ میں آتی ہے۔'' دوسرے افسر نے کہا۔ ''وہ بستر پہ لیٹی مسٹری ناول پڑھ رہی تھی اور ساتھ ساتھ نمکین مونگ پھلی بھی کھا رہی تھی جب قاتل کمرے میں داخل ہوا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ پوری طرح بیدار تھی۔ ممکن ہے اس نے قاتل کو گھر میں داخل ہوتے ہوئے سن لیا ہو۔''

لیکن ڈوروتھی کا کوئی دشمن نہیں تھا جو اسے قتل کرنا چاہتا ہو۔

پھر ایک اور حقیقت بھی سامنے آئی۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ کے مطابق ڈوروتھی کا قتل نصف شب کے لگ بھگ کسی وقت ہوا تھا۔ اس کے باوجود یکم مئی کی صبح دس بجے جب مسز فشر کی بیٹی نے ڈوروتھی کے گھر فون کیا تھا تو جواب میں ایک مردانہ آواز سنائی دی تھی۔

وہ کون ہو سکتا تھا؟

ڈسٹرکٹ اٹارنی والٹر وائن نے اپنی تفتیش کا آغاز یہ معلوم کرنے سے کیا کہ ڈوروتھی کو کون قتل کرنا چاہتا ہو گا؟

اس کا جواب یہی ملا کہ کوئی بھی نہیں۔۔۔!

تو کیا قتل کا سبب رقم ہو سکتی ہے؟ ڈوروتھی کو ورثے میں دس لاکھ ڈالرز ملے تھے۔ یہ عام ڈکیتی کی واردات بھی ہو سکتی ہے لیکن ڈوروتھی اپنے پرس میں کبھی زیادہ رقم ساتھ نہیں رکھتی تھی۔ اور یہ پرس اس کی لاش کے پاس خالی پڑا پایا گیا تھا۔

البتہ ڈی کروٹ نامی ایک شخص نے جو ڈوروتھی کے معمول کے کام سرانجام دیتا تھا، اور کئی برسوں سے اس کے پاس تھا، ایک انوکھی داستان بیان کی۔ اس نے بتایا کہ ڈوروتھی گزشتہ چند ہفتوں سے نروس اور اَپ سیٹ تھی۔ ایسا کیا واقعہ ڈوروتھی کے ساتھ پیش آیا تھا، اس بارے میں اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ڈوروتھی نے ایک ریوالور بھی خرید لیا تھا اور اسے اپنے پاس کمرے میں رکھتی تھی۔

ڈوروتھی کی ایک پڑوسن نے ہینڈی مین ڈی کروٹ کی اس بات کی تصدیق کر دی۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ ڈوروتھی کو چند ہفتوں سے کسی قسم کی پریشانی لاحق تھی۔ اور اپنے قتل سے ایک ہفتہ قبل اس نے اپنے گھر کے تمام تالے تبدیل کر دیے تھے۔ پڑوسن نے یہ بھی بتایا کہ دریافت کرنے پر ڈوروتھی نے کسی قسم کی وضاحت سے انکار کر دیا تھا۔

قاتل مکان میں لیونگ روم کی ایک کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوا تھا۔ پھر اپنے فرار ہونے کے راستے کے لیے اس نے کچن کے دروازے کا تالا کھول دیا تھا۔

دستیاب شواہد کی روشنی میں پولیس کو تین چیزوں تک محدود ہونا پڑا۔

پہلی بات: وہ شخص کون تھا جس نے پہلی مئی کی صبح ڈوروتھی کے گھر پر فون کا جواب دیا تھا اور پھر فون بند کر دیا تھا؟

دوسری بات: وہ شخص کون تھا جو بار بار ڈوروتھی کو تنگ کررہا تھا؟

تیسری بات: نمکین مونگ پھلی کے دانے فرش پر کیوں بکھرے ہوئے تھے؟

پولیس کو اس پُراسرار شخص کا سراغ لگانے میں زیادہ وقت نہیں لگا جو ڈوروتھی کو تنگ کیا کرتا تھا۔ درحقیقت انہوں نے تین ایسے افراد ڈھونڈ نکالے۔

پہلا شخص ایک انشورنس سیلز مین تھا جو ہیکنسیک کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر تھا۔ ایسے درجنوں گواہ موجود تھے جو یہ شہادت دینے کے لیے تیار تھے کہ یہی وہ شخص ہے جو ڈوروتھی کو تنگ کیا کرتا تھا۔

اس شخص کی داستان سیدھی سادی تھی کہ وہ اپنے کام کے تقاضوں کے مطابق ڈوروتھی سے ملنے جاتا تھا اور اس سے ہٹ کر اسے کبھی تنگ نہیں کرتا تھا۔ ڈوروتھی اس سرمایہ کاری میں دلچسپی رکھتی تھی جس میں ہر سال لگی بندھی رقم ملتی رہتی ہے اور وہ اسی سلسلے میں اس کے پاس ملنے کے لیے جاتا رہتا تھا۔

مسز فشر کی بیٹی نے اس شخص کی آواز سنی لیکن اس بات کی تصدیق نہ کرسکی کہ یہ وہی آواز ہے جو اس نے یکم مئی کی صبح ڈوروتھی کے گھر فون کرنے پر جواب میں سنی تھی۔

ڈوروتھی کے پڑوسیوں نے اسے اس شخص کی حیثیت سے شناخت کرلیا جسے انہوں نے لاش دریافت ہونے والی صبح دس بجے کے لگ بھگ ڈوروتھی کے خوب صورت وائٹ ہاؤس سے پرے جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

دوسرا تنگ کرنے والا فرد ایک لڑکا تھا جو پولیس کے ریکارڈ کے مطابق چوری چھپے تاک جھانک کرنے کا عادی تھا اور اس رات اسے ڈوروتھی کے مکان کے اطراف میں منڈلاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔

تیسرا تنگ کرنے والا فرد ایک سابقہ سپاہی تھا جو ایک دوست کی تلاش میں لفٹ لیتا ہوا اس شہر میں وارد ہوا تھا۔ اس کا دوست کسی ملازمت تلاش کرنے میں اس کی مدد کرسکتا تھا۔ اس کی داستان کی تصدیق بھی کرلی گئی۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بتایا گیا کہ جب ڈوروتھی کا قتل ہوا تو اس وقت وہ نمکین مونگ پھلی کھا رہی تھی۔ لیکن مونگ پھلی کا پیکٹ بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا اور مونگ پھلیاں فرش پر بکھری ہوئی تھیں۔

کیا اس وقت ڈوروتھی نے اپنے ہاتھ میں منہ بھر مقدار میں مونگ پھلیوں کے دانے بھرے ہوئے تھے جب قاتل نے اسے چونکا دیا تھا؟

''خواتین اس بے ڈھنگے طریقے سے مونگ پھلیاں کبھی نہیں کھاتیں۔'' سراغ رساں اور یچیو نے کہا۔ اس بارے میں اس کا اپنا ایک الگ نقطۂ نظر تھا۔

''قاتل مکان میں داخل ہوا، سیڑھیوں کے راستے اوپر پہنچا اور ڈوروتھی پر حملہ کر دیا۔ پھر وہ ایک لمحے کے لیے کھڑا سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اتنے میں اس کی نگاہ مونگ پھلی کے پیکٹ پر پڑی تو اس نے بے ساختہ اپنی مٹھی میں دانے بھر لیے۔ پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ اس دوران بہت سے دانے اس کے ہاتھ سے فرش پر گر کر بکھر گئے۔ باقی اس نے اپنی جیب میں بھر لیے ہوں گے۔''

اب پولیس کو اس مشتبہ مجرم کو تلاش کرنا تھا جو نمکین مونگ پھلی کا رسیا رہا ہو۔

تینوں مشتبہ افراد کے لباس پولیس پہلے ہی اپنی تحویل میں لے چکی تھی۔ ان کی تلاشی لی گئی۔ کسی میں بھی مونگ پھلی کے دانوں کی موجودگی کے آثار نہیں ملے۔

ڈوروتھی کے ساتھ جن کے بھی تعلقات رہے تھے ان تمام افراد کے بارے میں اس پہلو سے خصوصی تحقیقات کی گئیں کہ ان میں کون نمکین مونگ پھلی کا رسیا ہے۔

ان تحقیقات کا بھی کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔

آخر کار سراغ رساں اور یچیو اس چھوٹے سے مکان تک پہنچ گیا جو ڈوروتھی کے وائٹ ہاؤس سے زیادہ دور واقع نہیں تھا۔ جہاں اس کا قتل ہوا تھا، یہ ایک بے کیف چھوٹی سی جگہ تھی جو کسی کنوارے کی رہائش گاہ ہو سکتی تھی۔

سراغ رساں اور یچیو اور اس کا اسسٹنٹ اس مکان سے کپڑوں کے کئی جوڑے لے کر نکلے۔ ان کا رخ کسی لانڈری یا ڈرائی کلینرز کی جانب نہیں تھا۔ وہ ان کپڑوں کو پولیس لیبارٹری لے جا رہے تھے۔

''ان میں مونگ پھلی کے ذرات تلاش کرو۔'' سراغ رساں نے لیبارٹری کے انچارج سے کہا۔ ''اور خون کے دھبے بھی۔''

جواب ''ہاں'' میں ملا۔

پھر سراغ رساں نے ہینڈی مین ڈی کروٹ کو پوچھ گچھ کے لیے طلب کر لیا۔ وہ اس وقت ایک مقامی پول روم میں موجود تھا۔ اسے ہیڈ کوارٹر لے آیا گیا۔

سراغ رساں اور یچیو نے براہِ راست اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ ''تم نے ہمیں بتایا تھا کہ ڈوروتھی کسی تنگ کرنے والے سے خوف زدہ تھی۔ تم گزشتہ پندرہ برس سے ڈوروتھی سے واقف تھے اور اس کے اچھے دوستوں میں شمار ہوتے تھے۔ تو پھر تم نے اس سے کبھی یہ کیوں نہیں پوچھا کہ وہ کس سے خوف زدہ تھی؟''

بوکھلاہٹ کے عالم میں ڈی کروٹ کی زبان لڑکھڑانے لگی اور وہ ہکلانے لگا۔ سراغ رساں اور یچیو کا لہجہ سخت گیر ہو گیا۔ ''تم نے کیوں نہیں پوچھا؟ اس لیے کہ اسے تنگ کرنے والے تم خود تھے۔ تم اس کے پیسے چوری کیا کرتے تھے اور اسے اس بات کا علم تھا اسی لیے اس نے اپنے گھر کے تمام تالے تبدیل کر دیے تھے اور اسی لیے اس نے ریوالور بھی خرید لیا تھا۔ شاید تم بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتے اگر تم نے مٹھی بھر نمکین مونگ پھلی کے دانے نہ اٹھائے ہوتے...''

آخر آرتھر ڈی کروٹ کو اعترافِ جرم کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

''میں شراب نوشی کرتا ہوں۔ مجھے شراب کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کی پاکٹ بک میں مجھے کچھ رقم مل جائے گی۔ میں کھڑکی کے راستے گھر میں داخل ہوا تو اس کے بعد یہ خیال آنے پر میں خوف زدہ ہو گیا کہ اس کے پاس ریوالور بھی ہے۔ میں دبے پاؤں سیڑھیوں سے اوپر پہنچا تو وہ اپنے بیڈ پر لیٹی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔ میں نے اس پر ڈنڈے سے وار کر دیا۔ پھر میں اس کی لاش کو نیچے لیونگ روم میں لے آیا۔ میں نے اسے فرش پر لٹا دیا۔ میں نے اس کی نوٹ بک تلاش کر لی اور اس میں موجود ڈھائی سو ڈالر کے لگ بھگ رقم نکال لی۔''

یہ کہہ کر اس نے قدرے توقف کیا۔ پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''میں نے اس کا منہ دھلانے کی کوشش کی۔ وہ ہمیشہ میری ایک اچھی دوست رہی ہے۔ کوئی بھی اسے قتل کرنے کے بارے میں سوچ نہیں سکتا تھا۔''

پولیس نے بقیہ تینوں مشتبہ افراد کو رہا کر دیا۔

فون پر وہ پُراسرار مردانہ آواز کس کی تھی؟

پولیس کو اس بارے میں یقین تھا کہ وہ آرتھر ڈی کروٹ ہی تھا جو موقع واردات پر اس امید کے ساتھ واپس پہنچا تھا کہ شاید مزید کچھ رقم مل جائے۔

وہ شاید پھانسی کی سزا سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا اگر اس نے نمکین مونگ پھلی کے دانے مٹھی میں نہ بھرے ہوتے۔

مونگ پھلی کے دانوں کے ثبوت نے اسے تختۂ دار تک پہنچا دیا۔

ریئی سترہ برس کی خوب صورت اور صحت مند لڑکی تھی۔ قد درمیانہ اور نقوش معصومانہ تھے۔ اسے دیکھ کر لگتا تھا کہ اسے زمانے کی ہوا نہیں لگی ہے۔ اس نے حال ہی میں ہائی اسکول کا آخری امتحان دیا تھا اور چند ہفتوں بعد اس کا رزلٹ آنے والا تھا تب تک وہ گھر میں تھی اور بور ہو رہی تھی۔ اس کی کوئی دوست نہیں تھی اس کا کوئی بوائے فرینڈ نہیں تھا۔ اسے ٹی وی دیکھنا، خود ہی شطرنج کھیلنا اور اپنی سائیکل پر قصبے کی سنسان سڑکوں پر پھرنا اچھا لگتا تھا۔ فری ٹاؤن ایک چھوٹا قصبہ تھا۔

خاندانی

مریم کے خان

ہر خاندان کی کوئی ایک خوبی ہوتی ہے... جو آگے بڑھتے بڑھتے پہچان کا ذریعہ بن جاتی ہے... اس کا خاندان مختصر مگر اپنی ایک خاص پہچان رکھتا تھا... بہادری و دلیری اس کی صفات تھیں... ماضی کی غلطیاں کچھ اس طرح پیچھا کرتی ہیں کہ حال ہی نہیں مستقبل میں بھی اس کا تاوان دینا پڑجاتا ہے... ایک چھوٹے سے قصبے میں زندگی گزارنے والے دوستی اور دشمنی رکھنے والوں کی جیتی جاگتی کہانی..

قتل و غارت گری کے ماحول میں ہلچل مچا دینے والی دشمنی...

دلدلی جنگلات اور جھیلوں سے گھرا ہوا تھا۔ فری ٹاؤن کے پاس سے ریلوے لائن گزرتی تھی اور یہاں زندگی کی تمام سہولیات دستیاب تھیں۔ رینی کی ماں جولیا ایک ہائی وے ریستوران شراکت میں چلاتی تھی۔ وہ صبح دس سے شام سات بجے تک وہاں ہوتی اور اس دوران میں رینی گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ مگر اسے اکیلے رہتے ہوئے کبھی ڈر نہیں لگا تھا۔ اس صبح ناشتے کے بعد وہ برآمدے میں لکڑی کی میز پر بساط بچھائے خود سے شطرنج کھیل رہی تھی۔ جولیا اندر سے تیار ہو کر باہر آئی اور جھک کر اس کا گال چوما۔

''اپنا خیال رکھنا... اگر کہیں جانا ہو تو زیادہ دور مت جانا۔''

''انکل ٹام کے ہاں؟''

جولیا اس سوال کے جواب میں ہچکچائی۔ ''او کے، وہ اچھا آدمی ہے اور تم سے محبت کرتا ہے مگر تم اس کے بارے میں جانتی ہو۔''

رینی اجازت ملنے پر خوش ہو گئی۔ ''تھینک یو مام۔''

جولیا اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا مکان بہت شاندار تھا اور چاروں طرف سے خوب صورت باغ میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے پاس لگژری کار تھی۔ جولیا چاہتی تھی کہ رینی کسی اچھی یونیورسٹی یا ادارے میں داخلہ لے اور اپنا کیریئر بنائے۔ مگر رینی چاہتی تھی کہ ایک سال وہ آزاد رہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ اس سے زیادہ عمر کی لڑکیاں اب تک اسکول میں پڑھ رہی تھیں۔ اگر اس نے کم عمری میں ہائی اسکول پاس کر لیا تھا تو اس کا حق بنتا تھا کہ وہ ایک سال اپنی مرضی سے گزارے۔ جولیا کا کہنا تھا کہ ایک بار تعلیمی سلسلہ منقطع ہو جائے تو دوبارہ پڑھنا آسان نہیں ہوتا ہے اس لیے وہ نتیجہ آتے ہی آگے داخلے کی کوشش شروع کر دے۔ دونوں ماں بیٹی میں کھینچا تانی جاری تھی اور ابھی تک اس بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ جولیا کے جانے کے بعد رینی نے اپنی سائیکل اٹھائی اور داخلی دروازہ لاک کر کے روانہ ہو گئی۔

ان کا گھر قصبے میں تھا جبکہ ٹام قصبے سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹے سے دلدلی جنگل میں بنے کیبن میں رہتا تھا۔ رینی وہاں پہنچی تو ٹام صرف نیکر اور بنیان میں برآمدے میں بیٹھا ہوا بیئر سے شغل کر رہا تھا۔ وہ طویل قامت مگر دبلا آدمی تھا۔ عمر پینتالیس کے آس پاس تھی اور اس کے لمبے اور ہلکے بال کنگھی سے بے نیاز تھے۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہو گیا۔ ''ہے رینی کیسی ہو تم؟''

''فائن۔'' رینی نے تجسس سے جالی والے دروازے کے دوسری طرف دیکھا۔ ٹام نے اسے ٹوکا۔

''اے وہاں تمہارے مطلب کی کوئی چیز نہیں ہے۔''

''ہو سکتا ہے۔'' رینی نے شرارت سے کہا۔ ''لیکن میں جانتی ہوں وہاں کیا ہے۔''

''اگر تم جانتی ہو تب بھی تمہارا اس سے دور رہنا ضروری ہے۔'' ٹام نے کہا اور اپنی آئس باسکٹ سے ایک کولڈ ڈرنک ٹن نکال کر اسے تھما دیا۔ رینی ریلنگ پر ٹک گئی۔

''کیوں؟''

''کیونکہ یہ بات جولیا کو پسند نہیں ہے۔''

''اور تم کو؟''

''ظاہر ہے مجھے بھی پسند نہیں ہے۔''

''تب تم اور بریڈ...''

''رینی۔'' ٹام کا لہجہ تیز ہو گیا۔ ''تم ہم سے سوال نہیں کر سکتیں۔''

رینی دانتوں سے اپنے گلابی ہونٹ کاٹنے لگی پھر اس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''سوری انکل ٹام۔''

ٹام اس کا سگا چچا تھا اس کے باپ جارجی کے مرنے کے بعد اس نے رینی اور جولیا کا بہت خیال رکھا۔ شروع میں وہ ہر روز ہی ان کے ہاں آتا اور گھنٹوں رینی کے ساتھ کھیلتا تھا۔ جولیا کو ریستوران بزنس میں اس نے مدد کی تھی۔ پھر رینی بڑی ہو گئی اور انکل ٹام کا آنا کم ہو گیا۔ ایک وقت آیا کہ اس نے آنا بالکل ترک کر دیا کیونکہ جولیا کو اس کا آنا پسند نہیں تھا۔ حالانکہ ایک زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ شاید ٹام، جولیا سے شادی کر لے مگر وہ شادی والا آدمی ہی نہیں تھا۔ وہ اپنی ایک الگ دنیا میں مگن تھا، اسے دوسروں کی پروا نہیں تھی۔ اس دنیا میں اگر وہ کسی سے محبت کرتا تھا تو رینی تھی۔ اس نے کولڈ ڈرنک ٹن کھولا اور بولی۔ ''میں بہت بور ہوتی ہوں، کرنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔''

ٹام نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''آج کل تو لڑکیوں کے پاس وقت نہیں ہوتا۔ انٹرنیٹ اور لڑکے۔''

''مجھے کسی چیز کا شوق نہیں ہے۔''

''یہ زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔''

''میں کمانا چاہتی ہوں۔''

ٹام نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''تمہیں رقم کی ضرورت ہے؟''

''نہیں، میں کام کرنا چاہتی ہوں ایسا کام جس سے کچھ کماؤں بھی، جو میری ذاتی کمائی ہو۔''

ٹام سوچ میں پڑ گیا۔ ''تم صرف ہائی اسکول پاس ہو اور فری ٹاؤن میں جاب کے مواقع کم ہیں۔ تمہیں معمولی سی جاب ملے گی۔''

''میں معمولی جاب نہیں کرنا چاہتی۔''

''پھر۔''

''میں ایسی جاب کرنا چاہتی ہوں جس میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کما سکوں۔''

ٹام نے اسے پُرخیال نظروں سے دیکھا۔ ''ایسی جاب تمہیں کہاں ملے گی؟''

''ایک جگہ مل سکتی ہے۔'' رینی نے ٹن خالی کر کے میز پر رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ ''بائے انکل ٹام۔''

''بائے رینی۔'' ٹام نے ہاتھ ہلایا۔ رینی نے اپنی سائیکل سنبھالی اور روانہ ہو گئی۔ اس کا رخ قصبے کی دوسری طرف تھا۔ یہ جگہ ہائی وے سے کچھ ہی فاصلے پر تھی اور اس کا نام ہائی وے گرلز تھا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ نائٹ کلب تھا اور اس وقت یہاں اُلّو بول رہے تھے۔ ایک لڑکا بار کی میز صاف کر رہا تھا اور ایک کونے میں ٹی وی چل رہا تھا۔ جس پر بیس بال میچ آ رہا تھا۔ لڑکے نے رینی کو غور سے دیکھا اور بولا۔

''بے بی تم غلط وقت پر آئی ہو، اس وقت تمہیں یہاں کوئی گاہک نہیں ملے گا۔''

''میں یہاں کام نہیں کرتی ہوں، مجھے بریڈ سے ملنا ہے۔''

اس بار لڑکے نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ ''اچھا تو تم باس سے ملنا چاہتی ہو مگر وہ اس وقت کسی سے نہیں ملتا۔''

''مجھ سے ملے گا اُسے کہو کہ اس کی بھتیجی رینی آئی ہے۔''

یہ سنتے ہی لڑکا سنجیدہ ہو گیا اور اس نے کاؤنٹر کے نیچے ہاتھ ڈال کر کہا۔ ''باس کوئی رینی آئی ہے۔ خود کو تمہاری بھتیجی بتاتی ہے۔''

''بھیج دو۔'' کچھ دیر بعد بریڈ کی دھیمی آواز آئی۔

لڑکے نے کونے میں دیوار کے ہم رنگ دروازے کی طرف اشارہ کیا مگر رینی پہلے ہی اس طرف بڑھ چکی تھی۔ اندر بریڈ اور ڈوئن موجود تھے۔ ڈوئن بریڈ کا دستِ راست اور اس کا ذاتی محافظ بھی تھا۔ ساڑھے چھ فٹ قامت اور دو سو پاؤنڈز وزنی ڈوئن ہمہ وقت مسلح رہتا تھا مگر وہ خالی ہاتھوں بھی کم خطرناک نہیں تھا۔ بریڈ تقریباً پچاس برس کا صورت سے سوبر اور وجیہہ نظر آنے والا شخص تھا۔ اس نے دو رنگ والا کوٹ پہن رکھا تھا اور اس کے سامنے میز پر ایک لمبی نال والا ریوالور رکھا ہوا تھا۔ اس نے سرد نظروں سے رینی کو دیکھا۔ ''تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

رینی اب کسی قدر نروس تھی، اس نے دونوں ہاتھ اسکرٹ کی جیبوں میں ڈال کر کہا۔ ''مجھے کام چاہیے۔''

''کام؟'' بریڈ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''ہاں کام جس میں اچھی آمدنی ہو اور کام بے شک مشکل ہو مگر زیادہ طویل نہ ہو۔''

بریڈ جو اَب تک کرسی پر پھیل کر بیٹھا تھا سیدھا ہو گیا اور ذرا آگے جھک کر بولا۔ ''تم جانتی ہو رینی لڑکیاں یہاں کیا کام کرتی ہیں؟''

''میں اس کام کی بات نہیں کر رہی۔'' رینی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''میں اس کام کی بات کر رہی ہوں جو ہمارا فیملی بزنس ہے۔''

''مگر تم...؟''

''میں بھی اس فیملی کا ایک حصہ ہوں۔''

''تمہارا اس کام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ہے۔'' رینی زور دے کر بولی۔ ''میں اس فیملی کا حصہ ہوں۔''

بریڈ کا چہرہ ستّ گیا۔ ''مگر اب یہ فیملی ختم ہو رہی ہے اور بزنس بھی ختم ہو رہا ہے۔''

''میں...'' رینی نے کہنا چاہا مگر بریڈ کھڑا ہو گیا۔ اس نے رینی کا بازو پکڑا اور اسے دروازے تک لایا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔

''رینی یہ بہت خطرناک کام ہے۔''

''میں جانتی ہوں مگر میں کرنا چاہتی ہوں۔ دیکھو مجھے انڈر ایج ہونے کا فائدہ ہے اور دوسرے کوئی مجھ پر شک نہیں کرے گا۔ میں آرام سے کوریئر کا کام کر سکتی ہوں۔''

بریڈ نے دروازہ کھولا۔ ''تم جا سکتی ہو۔''

''مجھے معلوم ہے تم آج کل مشکل میں ہو کیونکہ تمہارے دو کوریئر پکڑے جا چکے ہیں۔''

''کیا تم بھی ان میں شامل ہونا چاہتی ہو۔''

''مجھے کوئی نہیں پکڑ سکے گا۔'' رینی نے اعتماد سے کہا مگر بریڈ دروازہ بند کر چکا تھا۔ جب وہ باہر جا رہی تھی تو صفائی کرنے والے لڑکے نے اسے نظرانداز کر دیا۔ رینی نے اپنی سائیکل سنبھالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس طویل سفر نے اس کی بھوک جگا دی تھی۔

☆☆☆

بریڈ واپس اپنی کرسی پر بیٹھا تو ڈوئن نے کہا۔ ''لڑکی ہوشیار ہے۔''

''ہاں۔'' بریڈ کا لہجہ خشک تھا۔ ''مگر وہ اس کام کے لیے نہیں ہے۔''

''عارضی طور پر استعمال کرنے میں کیا حرج ہے۔'' ڈوئن بولا۔ ''تم جانتے ہو سپلائی رکی ہوئی ہے۔ اگر یہ اسی طرح بند رہی تو ہمارے سارے گاہک کوپر کی طرف چلے جائیں گے۔''

بریڈ کے چہرے پر تشویش پھیل گئی۔ ''کوپر بہت زیادہ ہاتھ پاؤں پھیلا چکا ہے۔ درحقیقت وہ ہمیں یہاں بزنس سے آؤٹ کر چکا ہے۔''

''اوپر والے بھی اس کے ساتھ ہو چکے ہیں۔''

''وہ اس کے ساتھ ہوتے ہیں جو انہیں ڈالرز دیتا ہے۔'' بریڈ نے تلخ لہجے میں کہا۔

''ہماری سپلائی بھی کم ہوتی جا رہی ہے اور ہمارے پاس اسٹاک جمع ہو گیا ہے۔''

''اگر اس میں سے کچھ نکل جائے تو خاصی رقم ہاتھ آئے گی۔'' بریڈ نے پُرخیال انداز میں کہا۔

''اسی لیے کہہ رہا ہوں لڑکی کی پیشکش پر غور کرو۔''

اس بار بریڈ نے کچھ کہنے سے گریز کیا، وہ سوچ میں پڑ گیا تھا۔

☆☆☆

جولیا ناشتے کے بعد میز صاف کر رہی تھی اور رینی ٹی وی کے آگے بیٹھی اپنا پسندیدہ گیم شو دیکھ رہی تھی۔ جولیا تیار ہوتے اوپر گئی تو فون کی بیل بجی۔ رینی کچھ دیر انتظار کرتی رہی کہ جولیا اوپر سے اٹھائے مگر بیل مسلسل بجتی رہی تو اس نے مجبوراً اٹھ کر ریسیور اٹھایا۔ ''جولیا۔'' دوسری طرف سے بریڈ کی آواز آئی۔

''میں رینی ہوں۔''

''گڈ، میں تم سے ہی بات کرنا چاہ رہا تھا۔'' بریڈ نے کہا۔ ''تم آسکتی ہو میرے پاس۔''

''آسکتی ہوں، لیکن کب؟'' رینی نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ وہ بریڈ کے انداز سے سمجھ گئی تھی۔

''آج گیارہ بجے تک لیکن...'' بریڈ کہتے ہوئے ہچکچایا۔ ''جولیا کو اس کا علم نہ ہو۔''

''تم بے فکر رہو انکل بریڈ۔'' رینی نے کہا اور ریسیور رکھ کر دوبارہ ٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد اوپر سے جولیا اتری۔

''کس کا فون تھا؟ میں شاور لے رہی تھی۔''

''پتا نہیں۔'' رینی نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ ''میں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔''

''شاید بونارڈ کال کر رہا ہوگا۔'' جولیا نے اپنے پارٹنر کا نام لیا۔ وہ جانے کے لیے تیار تھی۔ اس نے رینی کو حسبِ معمول کچھ ہدایات دیں اور روانہ ہو گئی۔ اس کے جاتے ہی رینی نے کمرے میں آ کر وارڈ روب کھولا اور ایک لباس منتخب کر کے پہننے لگی۔ یہ جینز اور اس کے ساتھ ٹی شرٹ تھی۔ ساتھ میں اس نے بڑے سائز کا لیدر شولڈر بیگ لیا تھا۔ اس قسم کے بیگز عام طور سے اسکول کی لڑکیاں استعمال کرتی ہیں، ان میں اسکول کی چیزوں کے ساتھ اور بھی بہت کچھ آ جاتا ہے اور یہ دیکھنے میں بھی اسٹائلش لگتے ہیں۔ سر پر اس نے ہیٹ لے لیا اور باہر آ گئی۔ ساڑھے دس بجے وہ روانہ ہوئی اور سست روی سے سائیکل چلاتی ہوئی پونے گیارہ بجے بریڈ کے نائٹ کلب پہنچ گئی مگر اس بار اس نے سامنے سے جانے کے بجائے عقبی دروازے کا رخ کیا اور وہاں سے بریڈ کے کمرے میں پہنچ گئی۔ وہ چونکا۔

''تم کس طرف سے آئی ہو؟''

''پیچھے سے۔'' رینی نے جواب دیا۔ ''میں نے سامنے سے آنا مناسب نہیں سمجھا۔''

ڈوئن موجود تھا، اس نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا نا لڑکی ہوشیار ہے۔''

بریڈ کا چہرہ سپاٹ رہا۔ اس نے کہا۔ ''تم جانتی ہو اس کام میں کتنے خطرات ہیں۔''

رینی نے سر ہلایا۔ ''میں جانتی ہوں پولیس...''

''صرف پولیس نہیں، ہمارے حریف اب زیادہ بڑا خطرہ بن گئے ہیں۔ انہوں نے ہی میرے دو کوریئر پکڑوائے ہیں۔''

''مجھ پر کوئی شک نہیں کرے گا۔'' رینی نے کہا۔

بریڈ ہچکچا رہا تھا۔ رینی کا باپ جارجی اس کا فرسٹ کزن تھا اور دونوں میں دوستی بھی تھی۔ انہوں نے بزنس کا اسٹارٹ ساتھ ہی کیا تھا۔ برسوں کے ساتھ کے بعد جارجی ایک گن فائٹ میں مارا گیا تب سے بریڈ اکیلا کام دیکھ رہا تھا۔ بالآخر بریڈ اٹھا اور اس نے اپنی تجوری سے ایک پیکٹ نکالا جو خاکی لفافے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس نے وہ رینی کو تھمایا تو اس کا وزن اندازاً نصف کلوگرام تھا۔ بریڈ نے کہا۔ ''یہ نکسن بار میں میلان نامی شخص کو پہنچانا ہے۔''

''میں اسے کیسے پہچانوں گی؟'' رینی نے پیکٹ اپنے بیگ میں رکھ لیا۔

''تم وہاں جا کر میلان کا نام لو گی تو تمہیں اس تک پہنچا دیا جائے گا۔''

''جواب میں مجھے کیا لانا ہے؟''

''وہ رقم دے گا۔ رقم لفافے میں ہوگی اور لفافہ بند ہو گا۔ تم لفافہ میرے پاس لاؤ گی۔''

رینی کمرے سے نکلی تو بریڈ نے ڈوئن کی طرف دیکھا اور وہ سر ہلاتا ہوا رینی کے پیچھے روانہ ہو گیا۔ رینی نے اپنی سائیکل سنبھالی اور نکسن بار کی طرف روانہ ہو گئی۔ نکسن بار ہائی وے سے ذرا دور فری ٹاؤن جانے والی ایک لنک روڈ پر تھا۔ رینی اسی لنک روڈ سے وہاں پہنچی۔ دن کے وقت بھی وہاں خاصی رونق تھی کیونکہ وہاں گیم رومز بھی تھے اور عقبی کمرے پوکر کے لیے مخصوص تھے۔ مگر وہاں سارے ہی مرد تھے۔ عورت یا لڑکی کوئی نہیں تھی۔ اس لیے جب رینی اندر آئی تو سب کی نظریں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ وہ ذرا گھبرائی پھر سنبھل کر بار اٹینڈ کے پاس آئی اور آہستہ سے کہا۔ ''مجھے میلان سے ملنا ہے۔''

اس نے منہ سے ایک لفظ نکالے بغیر اسٹور روم کی طرف اشارہ کیا۔ رینی اسٹور روم میں آئی جہاں تین افراد تھے۔ اس نے ان سے میلان کا پوچھا تو ایک آدمی نے سوالیہ نظروں سے رینی کو دیکھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم میلان ہو؟''

''لڑکی کام کی بات کرو۔'' صورت سے ہی سخت اور جرائم پیشہ نظر آنے والے شخص نے کہا اور اسٹک سمیت میز پر جھک گیا۔

''مجھے بریڈ نے بھیجا ہے۔''

اس نے کوئی ردِ عمل دیے بغیر بال کو اسٹک ماری۔

''صرف بھیجا ہے؟''

''نہیں اس نے کچھ بھیجا بھی ہے۔''

میلان نے اپنے دو ساتھیوں کی طرف دیکھا تو وہ خاموشی سے وہاں سے چلے گئے ان کے جانے کے بعد رینی نے اپنے بیگ سے پیکٹ نکالا اور میلان سے کہا۔ ''تمہیں اس کے بدلے کچھ دینا ہے۔''

میلان نے وہیں ایک الماری کو کھولا اور اس میں سے لفافہ نکال کر رینی کی طرف اچھال دیا۔ اس نے لفافہ پکڑا اور اسے بیگ میں رکھ کر بریڈ کا دیا پیکٹ اسنوکر ٹیبل پر رکھ کر وہاں سے نکل آئی۔ اس کا دل قدرے تیز دھڑک رہا تھا مگر وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ بریڈ کے سامنے تھی، اس نے بیگ سے لفافہ نکال کر بریڈ کے حوالے کیا۔ اس نے اسے کھولا اور اندر موجود رقم میں سے چند نوٹ نکال کر رینی کی طرف بڑھائے۔ یہ پانچ سو ڈالرز تھے۔ اس نے وہ خاموشی سے اپنی جیب میں رکھ لیے۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی اور پھر رک کر بولی۔ ''تم نے ڈوئن کو میرے پیچھے کیوں بھیجا؟''

''تمہاری حفاظت کے لیے۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، الٹا اس کی وجہ سے میں مشکوک ہو جاؤں گی۔ آئندہ اسے مت بھیجنا۔''

رینی گھر جاتے ہوئے بہت خوش تھی۔ آج اس نے اپنی زندگی کی پہلی کمائی کی تھی۔ وہ بھی پورے پانچ سو ڈالرز کی۔ اس کی ماں سارے دن کی محنت کے بعد شاید اتنی رقم کماتی تھی جو اس نے ایک گھنٹے میں کما لی تھی۔ وہ فری ٹاؤن کی طرف جانے والی سڑک پر مڑی تھی کہ اچانک اس کی سائیکل کا اگلا پہیا ہلنے لگا۔ اس نے سائیکل روک کر اس کا معائنہ کیا۔ نٹ اور اسکرو اپنی جگہ فٹ تھا، اس کا مطلب تھا کہ پہیے کے بال بیرنگ اپنی جگہ سے ہل گئے تھے۔ وہ سائیکل لے کر پیدل چلنے لگی۔ اگر کوئی جان پہچان والا نظر آتا تو وہ اس لفٹ لے سکتی تھی مگر اس وقت سڑک سنسان تھی۔ پھر عقب سے بائیک کے انجن کی آواز ابھری تو اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ کوئی رائیڈر تھا۔ اس نے ہیلمٹ پہن رکھا تھا مگر چہرہ کھلا تھا اور رینی نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تروتازہ چہرے والا نوجوان تھا۔ اس نے نزدیک آکر بائیک روکی۔

''کیا ہوا ہے؟''

''اس کا پہیا ہل رہا ہے۔'' رینی نے اگلے پہیے کی طرف اشارہ کیا۔

''میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔''

''لفٹ دے کر؟'' رینی نے اس کی بات پر طنز کیا۔

''نہیں ذرا آگے میری ورکشاپ ہے۔ سائیکل لے کر وہاں آ جاؤ، میں اسے دیکھتا ہوں۔''

نوجوان کی ورکشاپ اسی سڑک پر تھی مگر سامنے ایک چھوٹا سا جنگل تھا اس لیے سڑک سے نظر نہیں آتی تھی۔ رینی گھوم کر اندر پہنچی تو نوجوان ایک گاڑی کے بونٹ سے ٹکا ہوا بیئر پی رہا تھا۔ ہیلمٹ اتار کر وہ زیادہ اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے رینی کو بیئر کی پیشکش کی مگر اس نے انکار کر دیا۔ ''میں نہیں پیتی۔''

نوجوان کو ذرا حیرت ہوئی پھر اس نے ہاتھ آگے کیا۔

''میں مارش ہوں۔''

''رینی۔'' اس نے ہاتھ ملایا۔

''اوکے رینی اب تمہاری سائیکل کو دیکھتے ہیں۔'' مارش نے اپنا ٹول بکس نزدیک کیا اور سائیکل کا پہیا کھولنے لگا۔ اسے کھول کر اس نے اندر سے بال بیرنگ کا جائزہ لیا۔ ''اس

کے کچھ بال بیرنگ گھس گئے ہیں۔ یہ سائز مشکل سے ملے گا مگر میرے پاس ایک تیار بال بیرنگ ہے، کہو تو وہ لگا دوں؟"
"لگا دو۔"
"کچھ وقت لگے گا۔" مارش کہتا ہوا اندر گیا اور اپنے سامان کو کھنگالنے لگا۔ رینی وہیں ایک بکس پر ٹک گئی۔ ورکشاپ میں دو گاڑیاں اور ایک ڈھانچا موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ وہاں مرمت کا مکمل سامان تھا اور ریکس پر تمام چیزیں بہت ترتیب سے رکھی تھیں مگر نہ جانے کیوں رینی کو لگا کہ یہاں زیادہ کام نہیں ہوتا تھا۔ مارش بال بیرنگ تلاش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک ڈبا لایا اور پہیے کا فکس بال بیرنگ کھولنے لگا۔ یہ خاصی مشکل سے نکلا اس کے بعد وہ اس کے سائز کا تیار بال بیرنگ پہیے میں فکس کرنے لگا۔ ایک بھاری ہتھوڑے کی چند ضربوں نے اسے یوں پہیے میں فکس کر دیا جیسے وہ اسی کا ایک حصہ ہو۔ اس نے سامان واپس رکھا اور کپڑے سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے بولا۔ "لو تمہاری سائیکل تیار ہے۔ اگر پھر مسئلہ کرے تو میرے پاس لے آنا۔"
"شکریہ مارش۔" رینی نے کہتے ہوئے جیب سے رقم نکالی۔ "کتنے ہوئے؟"
"اوہ اس کی ضرورت نہیں ہے۔" مارش نے جلدی سے کہا۔
"سوری میں مفت میں نہ کوئی چیز لیتی ہوں اور نہ کام کراتی ہوں۔" رینی نے پچاس ڈالرز کا ایک نوٹ اس کے ٹول بکس پر رکھا اور سائیکل لے کر وہاں سے نکل آئی۔ وہ گھر پہنچی تو وہاں برآمدے میں ٹام موجود تھا۔ رینی نے چہک کر کہا۔ "ہائے انکل ٹام، خیریت آج تم یہاں؟"
ٹام معقول حلیے میں تھا اور اس نے پینٹ شرٹ کے ساتھ کوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ اپنے الجھے رہنے والے بال اس نے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھے تھے۔ رینی کی خوشگواری کا اس پر خاص اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"تم کہاں سے آرہی ہو؟"
رینی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔ "کیا یہ سوال مناسب ہے؟"
"بالکل، میں تمہارا چچا ہوں اور پوچھ سکتا ہوں۔"
رینی بھی سنجیدہ ہو گئی۔ "میں بریڈ کے پاس سے آرہی ہوں۔"
"اس نے تمہیں کام دیا؟"
"اس نے انکار کیا تھا مگر میں نے اصرار کر کے..."
"میں نے جتنا پوچھا ہے اتنا جواب دو۔" ٹام نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔
"او کے، اس نے مجھے ایک کام دیا تھا۔"
"اور تم نے کیا؟"
"ہاں، مجھے ایک پیکٹ نکسن بار پہنچانا تھا، وہ میں نے پہنچا دیا۔"
"کتیا کا بچہ۔" ٹام نے زیرلب کہا۔
"انکل ٹام یہ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔"
"میرا معاملہ ہے۔" ٹام غرایا۔ "تم میری بھتیجی ہو اور ابھی کم سن ہو۔"
رینی نے محسوس کیا کہ ٹام بہت غصے میں تھا۔ وہ لڑنے بھڑنے والا آدمی نہیں تھا مگر جب اسے غصہ آتا تو وہ کسی کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اگر وہ بریڈ سے لڑتا تو نقصان اسے ہی ہوتا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ "پلیز انکل ٹام، تم کسی سے کچھ نہیں کہو گے۔"
"کیا تمہاری ماں کو علم ہے کہ تم کیا کر رہی ہو؟"
"ہرگز نہیں۔"
"تب تم دوبارہ بریڈ کے نائٹ کلب نہیں جاؤ گی۔ میں نہیں چاہتا کہ تم کوئی خطرناک اور گندہ کام کرو۔"
"اگر یہ کام خطرناک اور گندہ ہے تو تم اور بریڈ کیوں کرتے ہو؟"
رینی کے اس سوال پر ٹام دھیما ہو گیا، اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ "جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو ہمیں سمجھانے والا کوئی نہیں تھا اور اب ہم اس دلدل میں گلے تک اتر چکے ہیں۔"
"دیکھو اس کام میں رقم ہے۔" رینی نے اسے جیب سے رقم نکال کر دکھائی۔ "صرف ایک گھنٹے کے کام کا معاوضہ ہے۔"
ٹام نے گہری سانس لی۔ "رینی تم بچی ہو اور نادان ہو، کیا تم جانتی ہو جس کام کا معاوضہ فی گھنٹا پانچ سو ڈالرز ہے اس میں خطرہ اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اگر پولیس تمہیں اس پیکٹ سمیت پکڑ لیتی تو تم کم عمری کے باوجود جیل جانے سے نہیں بچ سکتی تھیں۔ ایک بار تم پر جیل کا ٹھپا لگ گیا تو تمہارا کیریئر شروع ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ تمہیں کسی اچھے تعلیمی ادارے میں داخلہ نہیں ملے گا۔ تم نے دیکھا جن لوگوں سے تم نے ڈیل کی وہ صورت سے خطرناک نظر آتے ہیں۔ میں جانتا ہوں یہ سو پچاس ڈالرز کے لیے قتل کر دینے والے لوگ ہیں۔ رینی تم کس کام میں ہاتھ ڈال رہی ہو۔ مجھے تو بریڈ پر حیرت ہے، اس نے تمہیں کام کیسے دیا۔ میں ابھی جا کر اس سے پوچھتا ہوں۔"
"تم اس سے نہیں پوچھو گے۔" رینی نے التجا کی۔

''پلیز...''

ٹام نے اسے پُرخیال نظروں سے دیکھا۔''اگرچہ اصل قصور وار وہی ہے لیکن میں ایک شرط پر اس سے نہیں پوچھوں گا۔''

ریئی سمجھ گئی کہ اس کی شرط کیا ہوگی۔ اس نے بجھے انداز میں سر ہلایا۔''اوکے اب میں کام نہیں کروں گی۔''

''اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔'' ٹام نے کہا اور رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد ریئی تھکے انداز میں کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔ اس نے زیرِلب کہا۔

''اب بوریت سہو اور خود سے چیس کھیلو۔''

اگلے دن جولیا کے جانے کے بعد فون کی گھنٹی بجی۔ ریئی نے کال ریسیو کی دوسری طرف بریڈ تھا، اس نے کہا۔ ''کام ہے۔''

''سوری اب میں کام نہیں کروں گی۔''

بریڈ چند لمحے کے لیے خاموش رہا پھر اس نے کہا۔

''گڈ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہے۔''

☆☆☆

جان کوپر صورت شکل اور انداز سے ہالی ووڈ فلم اسٹار نظر آتا تھا لیکن فلموں یا شوبزنس سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ اس کا تعلق منشیات کے بزنس سے تھا۔ وہ آرکنساس سے یہاں آیا تھا۔ اس نے یہاں اپنا بزنس سیٹ کیا اور بہت ہوشیاری سے اسے پھیلانے لگا۔ اسے اصل کامیابی اس وقت حاصل ہوئی جب اس نے یہاں بدعنوان پولیس والوں کی حمایت حاصل کرلی۔ اس کے بعد سے اس نے بریڈ کو دبانا شروع کردیا۔ حال ہی میں اس کے دو اہم ترین کوریئر پولیس نے گرفتار کرلیے اور اس کے باقی کوریئر کام سے گریز کررہے تھے اس لیے بریڈ کی طرف سے سپلائی رکی ہوئی تھی اور اس کی جگہ کوپر اپنا مال مارکیٹ میں ڈال رہا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو لوگ بریڈ کا نام بھی بھول جائیں گے۔

اس وقت وہ اپنے خوب صورت لیک ولا میں ایک لڑکی کے ساتھ تھا۔ لڑکی گزشتہ شام اس کے ساتھ آئی تھی اور تعلقات کے تمام مراحل طے ہونے کے باوجود کوپر اس کے نام سے بھی بے خبر تھا۔ اسے نام سے غرض بھی نہیں تھی کیونکہ لڑکی بے پناہ حسین تھی اور اسے ہیروئن کے ایک انجکشن کے بدلے مل گئی تھی۔

کوپر نہار منہ خالص وسکی پیتے ہوئے ٹیرس پر کھڑا سامنے سبز پانی والی جھیل دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جھیل بلکہ اس دلدلی علاقے میں تقریباً ہر جگہ مگرمچھ موجود ہیں۔ جھیل کے پاس جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا کیونکہ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس کے سبز پانی تلے کوئی مگرمچھ گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ لڑکی آڑی ترچھی بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور اسے بالکل ہوش نہیں تھا۔ اچانک کوپر کے موبائل نے بیل دی۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا، کال کرنے والا اس کا دستِ راست اینڈی تھا، اس نے کال ریسیو کی۔''کیا بات ہے؟''

''باس بریڈ کی طرف سے نکسن بار میں سپلائی ہوئی ہے۔''

''تبھی میں سوچ رہا تھا کہ اس کی طرف سے دوبارہ رابطہ نہیں کیا گیا۔'' کوپر کا چہرہ سخت ہوگیا۔ ''سپلائی کیسے ہوئی ہے؟''

''کوئی لڑکی دے کر گئی تھی۔'' اینڈی نے کہا۔

''میں نے کہا تھا باس کہ کوریئر توڑنا اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔ ہمیں راست اقدام کرنا ہوگا۔''

''لگتا ہے اس کا وقت آگیا ہے۔ تم تیار ہوکر میرے پاس آجاؤ۔''

موبائل رکھ کر کوپر نیچے آیا اور اس نے اسٹڈی میں کتابوں کی ایک الماری سرکائی تو اس کے پیچھے اس کا خفیہ اسلحہ خانہ سامنے آگیا۔ اس میں ہر طرح کا ہتھیار تھا۔ ہتھیار دیکھتے ہوئے کوپر سفاک انداز میں مسکرانے لگا۔

☆☆☆

ریئی سائیکل چلاتی ہوئی جارہی تھی کہ اس کی نظر سڑک سے ذرا دور مارش کی ورکشاپ کی طرف گئی اور اس نے سائیکل اس طرف موڑ دی۔ مارش اپنی موٹر سائیکل کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ مسکرایا۔''ہیلو کیا سائیکل میں مسئلہ ہوا ہے۔''

ریئی ہچکچائی۔''نہیں، میں یہاں سے گزر رہی تھی۔''

مارش ہاتھ صاف کرتا ہوا اس کی طرف آیا۔''تمہاری عمر پوچھ سکتا ہوں؟''

''سترہ سال دو مہینے اور دس دن۔'' ریئی نے بتایا۔

''میں نے ہائی اسکول کا امتحان دیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے تم ذہین لڑکی ہو۔'' مارش نے تعریفی انداز میں کہا۔''مگر تم نے ابھی تک الکوحل کا استعمال شروع نہیں کیا؟''

''مجھے پسند نہیں ہے۔''

''صرف الکوحل؟'' مارش نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔

''کیا مطلب؟''

''کہیں تمہیں لڑکے بھی تو ناپسند نہیں ہیں؟''

رینی کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''ایسا نہیں ہے لیکن میرا کوئی بوائے فرینڈ بھی نہیں ہے۔''

''آج رات اگر تم فارغ ہو تو ڈنر...''

''مام کی طرف سے مجھے رات کو باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔''

''اوکے پھر لنچ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

رینی نے سوچا اور سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد وہ مارش کی بائیک پر بیٹھی اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ مارش نے اس کے لیے ایک چھوٹے ہیلمٹ کا بندوبست کرلیا تھا۔ برک ڈائن کا شمار اس علاقے کے چند اچھے ریستوران میں ہوتا تھا۔ وہ اندر آئے تو جولیا اسے دیکھ کر چونکی۔ یہ اسی کا ریستوران تھا۔ وہ تیزی سے رینی کی طرف آئی۔ ''تم یہاں؟''

''مام ہم لنچ کے لیے آئے ہیں۔''

''یہ کون ہے؟'' جولیا نے پوچھا۔

''مام یہ مارش ہے اور مارش یہ جولیا ہے میری مام اور اس ریستوران کی مالک۔''

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔'' مارش نے جولیا کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''میں اکثر یہاں کھانے آتا ہوں۔''

جولیا نے بادلِ ناخواستہ اس سے ہاتھ ملایا اور رینی کو ایک طرف لے گئی۔ ''تم اسے کیسے جانتی ہو؟''

رینی نے بتایا کہ وہ اسے کیسے جانتی ہے۔ ''مام مارش اچھا لڑکا ہے۔ اس نے میری مدد کی تھی۔''

''ہر مدد کرنے والا اچھا نہیں ہوتا ہے۔'' جولیا واپس کاؤنٹر کی طرف چلی گئی۔ رینی اور مارش ایک میز پر آئے۔

''تم نے بتایا نہیں تھا کہ یہ ریستوران تمہاری مام کا ہے۔''

''یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔'' رینی نے سرسری سے انداز میں کہا۔ انہوں نے لنچ کیا اور پھر مارش اسے واپس ورکشاپ لے آیا۔ رینی کی سائیکل وہیں تھی۔ رینی گھوم پھر کر اس کی ورکشاپ دیکھنے لگی۔ ''تمہارے پاس زیادہ کام نہیں ہے۔''

''درحقیقت سرے سے کام ہی نہیں ہے۔ میں نے حال ہی میں یہ ورکشاپ کھولی ہے۔''

''تم فری ٹاؤن کے رہنے والے نہیں ہو۔''

''درست ہے، مجھے کسی نے بتایا تھا کہ فری ٹاؤن میں ایک اچھے آٹو مکینک کی ضرورت ہے تو میں نے سوچا یہاں قسمت آزمائی کی جائے۔''

''تمہیں جس نے بتایا ہے بالکل غلط بتایا ہے۔ اس علاقے میں کم سے کم نصف درجن اچھی آٹو ورکشاپس ہیں اور ان کے گاہک بندھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی نئے کے پاس بہت مشکل سے جاتا ہے۔''

''قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔ بڑے شہروں اور قصبوں میں جگہیں بہت مہنگی ہیں، یہاں تقریباً مفت میں جگہ مل گئی ہے۔ کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ لگتا ہے تم یہاں کے بارے میں سب جانتی ہو؟''

''تقریباً میں یہیں پیدا ہو کر پلی بڑھی ہوں اور میرا واحد شوق گھومنا ہے۔''

''کیا تم مجھے فری ٹاؤن دکھاؤ گی؟''

''کیوں نہیں۔'' رینی مان گئی اور وہ مارش کی بائیک پر نکلے۔ مختلف سڑکوں اور گلیوں سے گزرتے ہوئے رینی اسے علاقے کے بارے میں بتا رہی تھی۔ پھر وہ ٹام کے کیبن والے جنگل کے پاس سے گزرے۔ وہ ذرا آگے گئے ہوں گے کہ ایک سیاہ لینڈ کروزر ان کے پاس سے گزری۔ رینی نے مڑ کر دیکھا تو وہ اس راستے پر گھوم رہی تھی جو ٹام کے کیبن کی طرف جا رہا تھا۔ رینی مضطرب ہوگئی۔ اس نے مارش سے کہا۔ ''بائیک موڑو۔''

''کیوں کیا کچھ رہ گیا ہے؟''

''پلیز۔'' اس نے کہا تو مارش نے بائیک واپس موڑی اور وہ کچے راستے تک آئے۔ یہاں سے کیبن دکھائی دے رہا تھا مگر سیاہ لینڈ کروزر نظر نہیں آرہی تھی۔ رینی بائیک سے اترتے ہوئے بولی۔ ''تم یہیں رکو میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ کچے راستے کے بجائے جھاڑیوں اور درختوں کے درمیان سے گزرتی کیبن تک آئی۔ اس نے دیکھا کہ ٹام کی کار غائب تھی اور سیاہ لینڈ کروزر ذرا فاصلے پر رکی ہوئی تھی۔ کیبن کے سامنے ایک ہینڈسم آدمی آس پاس دیکھ رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں خودکار رائفل تھی۔ اتنے میں دوسرا اندر سے برآمد ہوا یہ گرانڈیل شخص گنجا تھا اور اس کے پاس بڑے سائز کی شاٹ گن تھی۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ہینڈسم آدمی نے آہستہ سے کچھ کہا تو گرانڈیل شخص واپس اندر چلا گیا اور وہ چند منٹ بعد دوبارہ نمودار ہوا پھر دونوں سیاہ لینڈ کروزر میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوگئے۔ ان کے جاتے ہی رینی کیبن کی طرف بڑھی۔ اسے معلوم تھا کہ ٹام وہاں نہیں تھا۔ جیسے ہی اس نے کیبن کا دروازہ کھولا اندر سے ایل پی جی کی تیز بو آئی۔ رینی کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور وہ تیزی سے بھاگی۔ اچانک خوفناک دھماکا ہوا اور رینی کو لگا کہ وہ اڑ کر دلدلی زمین پر آگی

جھاڑیوں پر آگری تھی۔ چند لمحے کے لیے اس کے حواس مختل ہو گئے تھے پھر اس نے پلٹ کر دیکھا تو کیبن کا بیشتر حصہ دھماکے میں اُڑ گیا تھا اور اس کے کھنڈر سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

"رینی۔" اسے مارش کی آواز سنائی دی۔ "تم کہاں ہو؟"

"میں یہاں ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی اور اپنا جائزہ لیا۔ گرنے سے چند خراشیں آئی تھیں اور کچھ چوٹیں لگی تھیں مگر مجموعی طور پر وہ ٹھیک تھی۔ مارش اس کے پاس آیا اور اس کا جائزہ لیا۔ پھر اس نے کیبن کی طرف دیکھا۔

"یہاں کیا ہوا ہے؟"

"ایل پی جی کا دھماکا۔" رینی نے کہا۔ "شاید اندر گیس لیک ہو گئی تھی۔"

"سیاہ لینڈ کروزر... دھماکے کے فوراً بعد سڑک سے گزری تھی۔"

"میں نہیں جانتی مجھے یہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ میں کیبن کے پاس گئی تھی کہ دھماکا ہوا اس سے پہلے مجھے ایل پی جی کی بو آئی تھی۔"

مارش اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ "تم یہاں کیوں آئیں؟"

"یہ جگہ میرے انکل ٹام کی ہے۔" رینی نے کہا۔ "وہ کسی سے نہیں ملتے ہیں اور سیاہ لینڈ کروزر اس طرف آئی تو مجھے تجسس ہوا تھا۔"

مارش نے پھر کیبن کی طرف دیکھا۔ "تمہارا کیا خیال ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے؟"

"میں نے انہیں کچھ کرتے نہیں دیکھا۔" رینی نے جھوٹ کہا۔

"اندر دیکھتے ہیں شاید کسی کو مدد کی ضرورت ہو۔" مارش کیبن کی طرف بڑھا تھا کہ رینی نے اسے روک لیا۔

"یہاں کوئی نہیں ہے اور تم آگ دیکھ رہے ہو اس نے کچھ چھوڑا ہوگا اس سے پہلے کوئی یہاں آئے ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہیے۔"

"لیکن..." مارش نے کہنا چاہا مگر رینی اسے کھینچتے ہوئے باہر تک لائی۔ اس کے پیچھے آنے سے پہلے مارش نے اپنی بائیک جھاڑیوں میں چھپا دی تھی اور لینڈ کروزر والے وہاں سے گزرتے ہوئے اسے دیکھ نہیں سکے تھے۔ مارش نے بائیک نکالی اور وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اس کی ورکشاپ پر پہنچ کر رینی نے سائیکل لی اور گھر کی طرف چل پڑی۔ وہ جلد از جلد ٹام سے رابطہ کرنا چاہتی تھی۔ گھر میں آتے ہی اس نے ٹام کے موبائل پر کال کی۔ اس زمانے میں موبائل ابتدائی دور میں تھے اور نوجوانوں کے لیے ان میں دلچسپی کی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے رینی کے پاس موبائل نہیں تھا۔ ٹام نے کال ریسیو کی۔ رینی نے مضطرب انداز میں کہا۔

"انکل ٹام تمہارے کیبن کو دھماکے سے اُڑا دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے میں وہیں ہوں۔"

"لیکن تم یہ نہیں جانتے ہو کہ وہاں ایک سیاہ لینڈ کروزر آئی تھی۔ اس میں دو افراد موجود تھے۔ ان میں سے ایک دو بار تمہارے کیبن میں گیا اور جب وہ دوسری بار گیا تو اس کے آنے کے دو منٹ بعد ہی دھماکا ہو گیا۔ میں کیبن میں جانے والی تھی مگر ایل پی جی کی بو سے خبردار ہو گئی اور بچ گئی ورنہ شاید میری لاش وہاں جلی پڑی ہوتی۔"

"تم وہاں کیوں گئی تھیں؟"

"میں وہاں سے گزر رہی تھی جب میں نے سیاہ لینڈ کروزر کو تمہارے کیبن کی طرف جاتے دیکھا۔ میں ان کے پیچھے گئی تھی۔"

"ان دونوں آدمیوں کا حلیہ۔"

رینی نے تفصیل سے حلیہ بتایا اور پھر لینڈ کروزر کا نمبر بھی بتایا۔ ٹام نے کہا۔ "ٹھیک ہے اب تم گھر میں رہو گی اور بلاضرورت باہر نہیں آؤ گی۔"

"یہ لوگ کون ہیں؟"

"ہمارے دشمن اور ہم میں تم بھی شامل ہو اس لیے اب تم باہر نہیں نکلو گی۔"

☆☆☆

فائر بریگیڈ والے اپنا کام کر چکے تھے اور اب پولیس والے اپنا کام کر رہے تھے۔ ٹام ایک طرف کھڑا تھا۔ اتنے میں وہاں بریڈ کی گاڑی رکی اور اس میں سے بریڈ کے ساتھ ڈوئن بھی اترا تھا، وہ دونوں اس کے پاس آئے۔ "کیا ہوا ہے؟" بریڈ نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"کوپر کا کمینہ پن۔" ٹام نے جواب دیا۔ "وہ اور اینڈی یہاں آئے تھے آگ اینڈی نے لگائی۔"

"کیسے؟"

"اس نے گرین ہاؤس کو گرم رکھنے والے ایل پی جی سلینڈر سے دھماکا کیا۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟"

"رینی نے بتایا، اس نے ان دونوں کو یہاں آتے دیکھا تھا اور وہ ان کے پیچھے آئی تھی۔"

بریڈ نے سر ہلایا۔ ''پولیس کو گرین ہاؤس سے کچھ ملا؟''

''نہیں سب جل کر راکھ ہو گیا ہے۔'' ٹام نے کہا۔

''پولیس والوں کو بچہ مت سمجھو۔''

''ہاں وہ بچے نہیں ہیں مگر ان کے پاس میرے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہوگا۔'' ٹام نے کہا۔ ''اسے چھوڑو تم کوپر کا کوئی علاج کرو۔ ورنہ ہم زیادہ دن زمین کے اوپر نہیں رہیں گے۔''

''ٹام ٹھیک کہہ رہا ہے باس۔'' ڈوئن بولا۔ ''وہ کھل کر سامنے آ گیا ہے۔''

''کوپر۔'' بریڈ نے دانت پیسے اور پھر ٹام کی طرف دیکھا۔ ''تم میرے ساتھ چلو۔ تم خطرے میں ہو اور اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔''

''میں کسی موٹیل چلا جاؤں گا۔''

''نہیں تم میرے نائٹ کلب میں ہی محفوظ ہو۔''

ٹام نے سر ہلایا۔ ''میں وہاں آ جاؤں گا۔''

بریڈ اور ڈوئن کے جانے کے بعد ایک پولیس افسر ٹام کی طرف آیا، اس نے کسی پودے کی جل جانے والی شاخ اٹھا رکھی تھی مگر اس کی ساخت برقرار تھی۔ اس نے ٹام سے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''پودینہ۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تم چاہو تو اس کا لیب ٹیسٹ کرا لو۔''

پولیس افسر چند لمحے اسے گھورتا رہا اور پھر جلی شاخ مسل کر نیچے پھینک دی۔ ٹام نے یہاں کوکین کے پودے لگا رکھے تھے اور خود کوکین تیار کرتا تھا۔ ان پودوں کے لیے اس نے گرین ہاؤس بنایا ہوا تھا کیونکہ یہ سرد آب و ہوا برداشت نہیں کرتے ہیں۔ اس کی بنائی کوکین بریڈ فروخت کرتا تھا۔ ٹام کا کام زیادہ بڑا نہیں تھا مگر اس کا گزارا ہو جاتا تھا اور پھر اسے اپنے لیے بھی کوکین مل جاتی تھی مگر اب سب تباہ ہو گیا تھا۔ دوبارہ سے سیٹ اپ لگانے پر اچھا خاصا خرچ آتا اور ابھی اس کے پاس اتنی رقم نہیں تھی۔ مگر اسے پروا بھی نہیں تھی وہ ہر حال میں مست رہنے والا آدمی تھا۔ پولیس والوں سے جان چھڑا کر وہ جولیا کے گھر پہنچا۔ اب اسے رینی کی فکر تھی اگر کوپر اور اینڈی جان جاتے کہ وہ ان کے جرم کی عینی گواہ ہے تو وہ خطرے میں پڑ سکتی تھی۔ رینی لاؤنج میں ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی۔ ٹام نے پوچھا۔ ''تمہیں یقین ہے کہ کوپر اور اینڈی نے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔''

''اگر انہوں نے دیکھا ہوتا تو میں زندہ نہ ہوتی، وہ بہت زیادہ مسلح تھے۔'' رینی نے سنجیدگی سے کہا۔ ''انکل ٹام مجھے تمہاری فکر ہے، وہ تمہارے لیے آئے تھے اور جب تم نہیں ملے تو انہوں نے تمہارا گھر اور کام تباہ کر دیا۔''

''مجھے اپنی نہیں، تمہاری فکر ہے۔''

رینی نے نہا دھو کر اپنے زخموں پر دوا لگا لی تھی اور دوسرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اسے امید تھی کہ ماں کو اس کے زخموں کی خبر نہیں ہوگی اور اگر ہوئی بھی تو وہ سائیکل سے گرنے کا بہانہ کر سکتی تھی۔ اس نے ٹام سے پوچھا۔ ''اب تم کہاں رہو گے؟''

''میرا خیال ہے موٹیل چلا جاؤں مگر بریڈ مجھے نائٹ کلب بلوا رہا ہے۔''

''وہ ٹھیک کر رہا ہے، تم خطرے میں ہو۔''

☆☆☆

اینڈی مایوس تھا، اس نے کوپر سے کہا۔ ''یہ تو کچھ نہیں ہوا ہم نے صرف ایک ٹھکانا تباہ کر دیا۔ وہ بھی معمولی سا۔''

''اور بھی بہت کچھ ہوگا، تم فکر مت کرو۔'' کوپر نے کہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی، اس نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا اور زیر لب کہا۔ ''ڈپٹی شیرف۔''

ڈپٹی شیرف جانسن اس کا وظیفہ خوار تھا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ ''کہو جانسن۔''

''میرے پاس ایک اطلاع ہے۔'' جانسن بولا۔ ''رینی نامی لڑکی جو ٹام کی بھتیجی ہے، اس نے تمہیں اور اینڈی کو کیبن کے پاس دیکھا تھا۔''

کوپر چونکا۔ ''تمہیں کیسے پتا چلا؟''

''میں نے ٹام اور بریڈ کو اس بارے میں بات کرتے سنا تھا۔''

کوپر نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تمہارا شکریہ جانسن۔''

کال کاٹ کر وہ اینڈی کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تمہاری شکایت کے ازالے کا وقت آ گیا ہے۔ اپنے آدمیوں کو بلا لو۔ آج ہم بڑا شکار کریں گے۔''

☆☆☆

رینی کا گھر سے نکلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے نہیں کہ اسے ٹام نے منع کیا تھا بلکہ اس لیے کہ ٹی وی پر اس کے پسندیدہ سوپ کی لگاتار تین اقساط دکھائی جا رہی تھیں۔ وہ پاپ کارن کا بڑا سا پیالہ لیے ٹی وی کے آگے بیٹھی تھی کہ کال بیل بجی۔ رینی جھنجلا گئی۔ وہ اس وقت ٹی وی کے آگے سے اٹھنا نہیں چاہتی تھی اگر فون کی گھنٹی بجتی تو وہ نظر انداز کر دیتی لیکن کال بیل بجانے والے کو تو دیکھنا ہی تھا۔ بادل ناخواستہ اٹھ کر اس نے دروازے کے اوپر لگے شیشے سے باہر دیکھا تو اسے مارش نظر آیا۔ وہ اپنی ساری کوفت بھول گئی اور اس نے جلدی

سے دروازہ کھولا تھا کہ اسے سامنے سڑک پر موجود سیاہ لینڈ کروزر سے کوپر اینڈ پارٹی اترتی دکھائی دی۔ رینی کا منہ کھلا رہ گیا اور پھر اس نے دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ مارش حیران ہوا۔ ''کوئی مسئلہ ہے؟''

''کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' عقب سے کوپر نے کہا۔ مارش تیزی سے مڑا اور پھر اپنے سامنے کئی طرح کی گنز دیکھ کر اس نے بھی دونوں ہاتھ اوپر کر لیے۔ کوپر مسکرا رہا تھا۔ اس نے کہا۔

''گڈ کڈز۔''

''کیا چاہتے ہو تم؟'' رینی بولی۔

کوپر نے ہاتھ دراز کر کے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''تم دونوں ہمارے ساتھ چلو گے۔''

چند لمحے بعد وہ دونوں سیاہ لینڈ کروزر میں دو مسلح افراد کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے۔ گاڑی میں کل پانچ افراد تھے اور وہ محاورے کے مطابق دانتوں تک مسلح تھے۔

☆☆☆

ٹام، بریڈ کے دفتر میں آرام کرسی پر دراز تھا اور اس کے ہاتھ میں ڈرائی جن کی بوتل تھی۔ بریڈ نے اسے پُر ملامت نظروں سے دیکھا۔ ''تم اسی طرح نیٹ پیتے رہے تو جلد قبر میں ہو گے۔''

''جلد یا بدیر۔'' ٹام نے بے پروائی سے کہا۔ ''جانا تو وہیں ہے۔''

ڈوئن ایک طرف خاموش بیٹھا ہوا تھا۔ بریڈ فکرمند ٹہل رہا تھا اور اس کی فکرمندی کا تعلق کوپر کے آج کے قدم سے تھا۔ اس نے ٹہلتے ہوئے ڈوئن کی طرف دیکھا۔ ''ہمیں تیار ہو جانا چاہیے۔ کوپر کھل کر حرکت میں آگیا ہے۔''

''میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا باس۔'' ڈوئن خوش ہو گیا۔

''اپنے آدمیوں کو بلا لو۔'' بریڈ نے دراز کھول کر اس میں موجود جدید ترین پستول اور اس کے اضافی میگزین نکال کر اپنے کوٹ میں رکھ لیے۔ ڈوئن کال کرنے لگا۔ ٹام نے ان دونوں کو دیکھا۔

''یہاں کیا ہونے والا ہے؟''

''امکان ہے کہ کوپر اپنے آدمیوں سمیت یہاں آئے گا۔''

''کس لیے؟''

''فیصلے کے لیے کہ اس علاقے میں کون بزنس کر سکتا ہے۔'' بریڈ نے کہا اور ایک اضافی پستول ٹام کی طرف اچھال دیا۔ جسے اس نے بہ مشکل کیچ کیا۔ ٹام نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''میں کیا کروں؟''

''اپنا دفاع۔''

ڈوئن کال کر کے فارغ ہوا تھا کہ اس کی نظر سی سی ٹی وی کے مانیٹر پر گئی۔ اس پر بیک وقت چار کیمروں کی ویڈیو آرہی تھی اور باہر والے کیمرے نے ایک سیاہ لینڈ کروزر کو رکتے دکھایا۔ ڈوئن مضطرب لہجے میں بولا۔ ''باس وہ آگئے ہیں۔''

بریڈ نے دیکھا اور پھر چونکا جب اس نے سیاہ لینڈ کروزر سے رینی کو اترتے دیکھا۔ اس کا بازو اینڈی نے تھام رکھا تھا۔ کوپر کیمرے کے بالکل سامنے آیا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے سیلیوٹ کیا تھا۔ ٹام کے حلق سے کراہ نکلی۔

''رینی۔''

''تیار ہو جاؤ۔'' بریڈ نے کہا تو ڈوئن نے ایک کونے میں رکھی شاٹ گن اٹھائی اور وہ دونوں تیزی سے باہر آئے۔ بریڈ نے ڈوئن سے کہا۔ ''رینی کے آس پاس موجود افراد کا پہلے صفایا کرنا ہے۔''

بار میں کام کرنے والا لڑکا پہلے ہی شاٹ گن سنبھال چکا تھا۔ اس نے بھی مانیٹر پر آنے والوں کو دیکھ لیا تھا۔ ان تینوں نے الگ الگ جگہوں پر پوزیشن لے لی۔ بار کا سوئنگ ڈور دھماکے سے کھلا اور سب سے پہلے رینی اور اس کے پیچھے ایک نوجوان اندر آیا۔ ان دونوں نے ہاتھ اوپر کیے ہوئے تھے۔ بریڈ نوجوان پر گولی چلانے جا رہا تھا مگر اس کے ہاتھ اوپر دیکھ کر رک گیا اور اس نے عقب میں آنے والے کو نشانہ بنایا۔ گولی اس کے سر پر لگی اور وہ الٹ کر پیچھے گیا تھا۔ گولی چلتے ہی مارش نے رینی کو آگے دھکا دیا اور خود اسے اپنے جسم سے کور کرتا ہوا فرش پر گرا اور نہایت پھرتی سے اسے سمیٹتا ہوا میزوں کے نیچے آگیا۔ فوراً ہی باہر سے خودکار اور نیم خودکار ہتھیاروں سے بے پناہ فائرنگ شروع ہو گئی۔ بریڈ ایک ستون کے پیچھے تھا اس لیے محفوظ رہا مگر بار والا لڑکا کاؤنٹر کے پیچھے تھا اور ایک برسٹ نے کاؤنٹر سے گزر کر اسے چھلنی کر دیا۔ بریڈ نے اسے اوندھے منہ گرتے دیکھا۔

مارش اور رینی اب دیوار کی آڑ میں تھے اور اندر آئے بغیر کوئی انہیں نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ ڈوئن واش روم کی طرف جانے والی راہداری میں تھا۔ اس نے اشارے سے بریڈ کو بتایا کہ وہ کھڑکی سے جوابی کارروائی کرنے جا رہا ہے، بریڈ ان لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے۔ بریڈ نے سر ہلایا اور جیسے ہی باہر سے فائرنگ رکی اس نے ستون کی آڑ سے

پستول نکال کر باہر کی طرف لگاتار فائر کیے اور اس وقت تک ٹریگر دباتا رہا جب تک میگزین ختم نہیں ہو گیا۔ اس دوران میں ڈوئن ایک کھڑکی تک پہنچا اور اس نے اپنی شاٹ گن سے لگاتار باہر کئی فائر کیے۔ ایک چیخ سنائی دی اور فوراً ہی باہر سے کھڑکی والی سمت فائرنگ ہونے لگی۔ ڈوئن تیزی سے واپس راہداری میں گیا تھا مگر عین اس وقت جب وہ راہداری میں داخل ہو رہا تھا اسے جھٹکا لگا اور بریڈ نے اس کے سفید کوٹ پر بائیں شانے سے سرخی پھوٹتے دیکھی۔ اسے گولی لگی تھی۔ اس دوران میں بریڈ اپنے پستول میں نیا میگزین ڈال چکا تھا۔ باہر سے کوپر کی آواز آئی۔

''بریڈ، آج فیصلے کا دن ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' بریڈ چلّایا۔ ''لیکن کیا تم اندر آنے کی ہمت کرو گے؟''

''جلد تم دیکھ لو گے۔''

بریڈ کی چھٹی حس نے خبردار کیا اور اس نے دیوار سے ٹکے ڈوئن کو واش روم کی طرف جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے سر ہلایا اور ٹیک لگائے ہوئے واش روم کی طرف بڑھا۔ اس دوران میں مارش رینی کو اپنی آڑ میں لیے فرش پر رینگتا ہوا بریڈ کی طرف آرہا تھا۔ ڈوئن واش روم کی طرف غائب ہو گیا تھا اور فوراً ہی وہاں سے شاٹ گن اور خودکار رائفل کے ملے جلے فائرز کی آواز آئی۔ ڈوئن لڑکھڑاتا ہوا راہداری میں آگرا اور بریڈ نے چلّا کر ان دونوں سے کہا۔ ''بھاگو۔''

رینی اور مارش اٹھ کر اس کی طرف بھاگے۔ بار کا دروازہ پھر دھماکے سے کھلا اور اینڈی نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں شاٹ گن تھی اور وہ رینی و مارش کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ دونوں تیز بھاگ رہے تھے مگر کھلی جگہ تھے۔ بریڈ کا دل دھڑکا تھا مگر اس نے نہایت سرعت سے ہاتھ بلند کیا اور اینڈی کی پیشانی کا نشانہ لے کر فائر کیا۔ اس بار بھی اس کا نشانہ درست بیٹھا اور گولی کے جھٹکے سے اینڈی کا سر مڑ گیا اور شاٹ گن کا زاویہ تیسرے فائر کے دوران مڑ گیا۔ گولی بریڈ کی طرف آئی اور اسے لگا کہ اس کے بائیں پہلو میں انگارے سے بھر گئے ہوں۔ رینی کی وجہ سے وہ ستون کی آڑ سے نکل آیا تھا۔ گولی صرف چھوتی گئی تھی مگر اس نے پہلو کا دو انچ کا ٹکڑا ادھیڑ دیا تھا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔ رینی اور مارش اس کے پاس سے گزر کر راہداری میں پہنچ گئے۔ وہ وہاں محفوظ تھے۔ اینڈی کے گرتے ہی دروازے پر کوپر نمودار ہوا اس کے ہاتھ میں مشین گن تھی۔ اسے دیکھتے ہی زخمی بریڈ تیزی سے حرکت میں آیا۔ برسٹ اس جگہ لگا جہاں وہ ایک لمحے پہلے تھا۔ وہ رینی اور مارش کے ساتھ اپنے دفتر میں گھسا اور دروازہ بند کر کے لاک کر دیا۔ کوپر نے باہر سے برسٹ مارا مگر بہ ظاہر لکڑی کا نظر آنے والا دروازہ درمیان میں پانچ ملی میٹر کی فولادی شیٹ کی وجہ سے بلٹ پروف تھا۔

رینی نے بریڈ کا زخم دیکھا تو تیزی سے اس کے پاس آئی۔ پھر اس نے اپنا کوٹ اتار کر اس کی گدی سی بنائی اور بریڈ کے زخم پر رکھ دی۔ وہ کراہا تھا۔ ''لعنت ہو... یہ تمہیں کیسے لے آیا؟''

''گھر سے۔'' رینی نے جواب دیا۔

''یہ کون ہے؟'' اس نے تجسس سے کمرے کا جائزہ لیتے مارش کی طرف اشارہ کیا۔

''میرا دوست، اتفاق سے اسی وقت مجھ سے ملنے آیا تھا۔'' رینی نے کہا اور ٹام کا پوچھا۔ ''انکل ٹام کہاں ہے؟''
تب پہلی بار بریڈ کو احساس ہوا کہ ٹام کمرے میں نہیں تھا۔ ''میرے خدا یہ کہاں گیا؟''

رینی چونکی۔ ''کیا وہ یہیں تھا؟''

''میں اسے یہیں چھوڑ کر گیا تھا۔'' بریڈ کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور اس نے ٹام کی رکھی ڈرائی جن کی بوتل اٹھائی اور منہ سے لگا کر ایسے ہی پینے لگا۔ تکلیف کم کرنے کا اس کے نزدیک یہی ایک طریقہ تھا۔ ''تم دونوں کو یہاں سے جانا ہو گا۔''

''ہم یہاں محفوظ ہیں۔'' رینی نے کہا۔

''تم کوپر کو نہیں جانتے۔ یہ بلٹ پروف دروازہ ہمیں محفوظ نہیں رکھ سکتا۔''

☆☆☆

کوپر غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ صرف چند افراد ایسی مزاحمت کریں گے کہ اس کے تین ساتھی مارے جائیں گے۔ اسے سب سے زیادہ غصہ اینڈی کے مارے جانے کا تھا۔ اب اس کے ساتھ صرف ایک آدمی بچا تھا۔ بریڈ لڑکی اور لڑکے سمیت اپنے دفتر میں محصور ہو گیا تھا اور اس کا دروازہ بلٹ پروف تھا۔ اس کے آدمی نے تمام تارکاٹ دیے تھے اور تمام سیکیورٹی کیمرے تباہ کر دیے تھے۔ کوپر یہاں آگ لگا کر بھی جا سکتا تھا مگر اس طرح بریڈ کے بچ جانے کا امکان تھا اس لیے وہ یقینی طور پر اسے ختم کر کے جانا چاہتا تھا۔ وہ لینڈ کروزر تک آیا اور اس کے عقبی خفیہ خانے سے ایک بریف کیس نکال کر کھولا تو اس میں ایک عدد ڈائنامائٹ بنڈل تھا۔ اس نے اسے نکالا اور اندر آیا۔ اس نے ڈائنامائٹ بنڈل دروازے کے ہینڈل سے باندھا۔ اس

کے فلیتے کو لائیٹر سے آگ دکھا کر وہ تیزی سے واپس آیا۔ ایک منٹ سے پہلے خوفناک دھماکا ہوا اور جب کوپر مشین گن سامنے کیے راہداری میں آیا تو دروازہ مع چوکھٹ کے غائب تھا۔ ڈائنا مائٹ نے فرش اور دیواروں کو بھی نقصان پہنچایا تھا۔ کوپر نے احتیاطاً اندر ایک برسٹ مارا۔

☆☆☆

بریڈ نے مارش سے پوچھا۔ ”تم پستول چلانا جانتے ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں، میں نے آج تک آتشیں اسلحے کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

اسی لمحے باہر سے ایسی سنسناتی آواز آئی جیسے کوئی پھلجھڑی سی جل رہی ہو۔ بریڈ کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ ”ڈائنا مائٹ۔“ اس نے کہا اور کھڑے ہو کر میز الٹ دی۔ ”اس کے پیچھے آجاؤ۔“

مارش اور رینی بھاگے تھے... جیسے ہی وہ میز کے عقب میں گرے ایک خوفناک دھماکا ہوا اور کمرے میں دھواں اور گرد و غبار بھر گیا۔ انہوں نے منہ دبا کر سانس روک لی تھی تاکہ کھانسی نہ آئے۔ انہیں بریڈ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چند لمحے بعد مشین گن کا برسٹ آیا اور میز کے اوپری حصے سے گزرتا ہوا دیوار پر لگا۔ مارش نے ایک بار پھر رینی کو اپنے جسم کی ڈھال میں چھپا لیا۔ کوپر اندر آیا اور اس نے زمین پر پڑے شدید زخمی بریڈ کو دیکھا۔ البتہ اسے لڑکی اور لڑکا نظر نہیں آئے۔ مگر اسے ان کی زیادہ فکر بھی نہیں تھی۔ اسے اصل خطرہ بریڈ سے ہی تھا۔ بریڈ کے چہرے اور سینے پر گہرے زخم نظر آرہے تھے جن سے تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کا مہمان نظر آرہا تھا۔ دھماکے کے وقت وہ دروازے سے زیادہ دور نہیں تھا اور کھڑا ہوا تھا اس لیے براہِ راست نشانہ بنا تھا۔ کوپر نے پوچھا۔ ”وہ دونوں کہاں ہیں؟“

”تم... جہنم میں جاؤ۔“ بریڈ نے بہ مشکل کہا۔

”وہاں تم جانے والے ہو۔“ کوپر نے اطمینان سے کہا۔ اس نے اب گری ہوئی میز دیکھ لی تھی۔ بریڈ کی طرف سے اسے اطمینان ہو گیا تھا، وہ آگے بڑھا اور اس نے ان دونوں کو دیکھ لیا۔ ”اوہ تو تم دونوں یہاں ہو، کھڑے ہو جاؤ۔“

کوپر نے حکم دیا تو مارش اور رینی کھڑے ہو گئے۔

کوپر نے بریڈ سے کہا۔ ”اب میں تمہارے سامنے ان دونوں کو قتل کروں گا اور اس کے بعد اس جگہ کو آگ لگا کر چلا جاؤں گا۔ آج کے بعد یہ علاقہ میرا ہوگا، صرف میرا۔“

کوپر نے مشین گن کا رخ مارش اور رینی کی طرف کیا تھا کہ عقب سے ٹام کی آواز آئی۔ ”یہ علاقہ کبھی تمہارا نہیں ہوگا۔“

کوپر ایک لمحے کو ساکت رہ گیا۔ وہ تیزی سے گھوما اس نے برسٹ مارا مگر ٹام اس سے پہلے گولی چلا چکا تھا جو اس کی گردن کے آر پار ہو گئی۔ کوپر نیچے گرا اور غرغراتی آواز نکالتے ہوئے اپنے گلے سے پھوٹنے والے خون کو روکنے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی لمحے شاٹ گن کا دھماکا ہوا اور ٹام نے اپنے سینے میں ہونے والے سوراخ کو حیرت سے دیکھا پھر وہ پیچھے مڑا جہاں کوپر کا آخری آدمی کھڑا تھا۔ ٹام نے گولی چلائی جو آدمی کو لگی اس نے چلا کر گالی دی اور لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا گرا۔ ٹام بھی دھڑام سے نیچے گرا۔ وہ بریڈ کی طرف دیکھ رہا تھا اور بریڈ اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ سے ہنسا اور اس نے دم توڑ دیا۔ رینی تیزی سے ٹام کے پاس آئی۔ وہ رو رہی تھی، اس نے ٹام کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا مگر ٹام دنیا سے گزر چکا تھا۔ اس کی موت کا احساس کر کے رینی بلند آواز سے رونے لگی۔ آج اس کا رہا سہا خاندان بھی ختم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

رینی اور مارش گھر کے آگے لان میں لگے جھولے پر بیٹھے تھے۔ آج چوتھا دن تھا اور تمام معاملات نمٹ چکے تھے۔ میڈیا کے مطابق منشیات فروشوں کی آپس کی لڑائی نے اس علاقے کی نئی نسل کو منشیات کی لہر سے عارضی طور پر بچا لیا تھا۔ جب تک یہاں نئے منشیات فروش گروہ نہ آجاتے تب تک فری ٹاؤن کے باسی اپنے بچوں کی طرف سے بے فکر رہ سکتے تھے۔ مارش نے پوچھا۔ ”اب تم کیا کرو گی؟“

”میں جلد ورجینیا یونیورسٹی چلی جاؤں گی۔ ماما نے میرے داخلے کا بندوبست کر دیا ہے۔“

مارش گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ”اب تم پانچ سال بعد واپس آؤ گی۔“

رینی نے سر ہلایا۔ ”اور ان پانچ سالوں میں، میں تمہیں مس کروں گی۔“

”میں تو ابھی سے تمہیں مس کر رہا ہوں۔“

”تم کیا کرو گے؟“

”میں سوچ رہا ہوں کہ ہیوی بائیک مکینک کا کورس کر لوں۔ اس کی زیادہ مانگ ہے اور آمدنی بھی زیادہ ہے۔“ مارش نے کہا۔ ”ممکن ہے میں بھی چارلوٹس ولا آجاؤں۔“

”سچ میں...“ رینی مسکرانے لگی۔

یکسانیت

ایم افضل انجم

مدہوشی کی کیفیت سے بچنا چاہیے کیونکہ مدہوشی ہو تو اچھی چیز سو گنا اچھی لگنے لگتی ہیں... اس پر بھی ایسی کیفیت طاری تھی... جس میں سرور تھا... فرحت انگیزی تھی اور تنہائی و افسردگی سے فرار کا غیر یقینی جواز تھا...

زندگی کے لگے بندھے معمول اور یکسانیت سے گھبرا جانے والوں کا نیا تجربہ

فون کی گھنٹی تیسری مرتبہ بجی تھی۔

''ہیلو...'' عظمیٰ نے دھیمے لہجے میں ماؤتھ پیس میں کہا۔ دوسری طرف سے چند لمحوں کے توقف کے بعد آواز سنائی دی۔

''محترمہ پلیز فون بند نہ کیجیے گا... مجھے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع تو دیجیے۔''

''دیکھیں مسٹر، آپ اپنا اور میرا دونوں کا وقت ضائع کررہے ہیں۔'' عظمیٰ کے لہجے میں جھنجلاہٹ تھی۔

"اگر آپ مہربانی فرما کر مجھے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع دے دیں تو شاید آپ میرے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لیں۔ میں ہرگز آپ کو تنگ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔" دوسری طرف سے لجاجت آمیز لہجے میں درخواست کی گئی تھی۔

جواباً عظمیٰ خاموش رہی تھی۔

"آپ مجھے بالکل بے ضرر پائیں گی۔ میں ایک پریشان اور اداس انسان ہوں۔ اور اس وقت مجھے کسی بھی انسان سے گفتگو کرنے کی اشد ضرورت ہے... آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا؟" اجنبی کے لہجے میں بے چارگی تھی۔

"آپ اداس اور بے ضرر ہیں تو میری بلا سے... دوبارہ اس قسم کی فضول باتوں کے لیے فون نہ کیجیے گا۔" عظمیٰ نے اپنے لہجے کی ناگواری دباتے ہوئے کہا اور ریسیور کریڈل کر دیا۔

"ہوں..." اس نے نفی میں سر جھٹکتے ہوئے ہنکارا بھرا اور واپس کچن کی طرف چلی گئی۔

عظمیٰ جوان اور بھرپور عورت تھی۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی۔ دونوں بیٹے تھے۔ ایک کی عمر آٹھ برس اور دوسرے کی بارہ برس تھی۔ دونوں شہر کے ایک بہترین اسکول میں تعلیم لے رہے تھے۔ شوہر سرکاری محکمے میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ شہر کے صاف ستھرے علاقے میں ان کی رہائش تھی۔ زندگی کی تقریباً تمام ضروریات احسن طریقے سے پوری ہو رہی تھیں۔

یہ مختصر فیملی ایک پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ عظمیٰ اور اس کا شوہر صفدر بیگ دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ اپنے بچوں کے ساتھ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹتے تھے۔ کبھی پکنک پر جاتے... کبھی کسی عزیز کی دعوت پر چلے جاتے اور کبھی کسی عزیز کو اپنے گھر مدعو کر لیتے یعنی لگی بندھی اور سادہ سی زندگی گزار رہے تھے۔ عید تہوار پر یا اور کسی خاص موقع پر ان کے معمولات میں کچھ تبدیلی بھی ہوتی تھی لیکن مجموعی طور پر زندگی تقریباً یکسانیت کا شکار تھی اور یکسانیت کی یہ کیفیت کبھی کبھی دونوں کو کھلتی بھی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور انہیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی مگر بارہ سالوں کی باہمی رفاقت کے بعد دونوں کے جذبات میں وہ پہلی سی تندی نہ رہی تھی بلکہ کبھی کبھی دونوں کے بیچ ایک سرد مہری سی محسوس ہوتی تھی جسے دونوں ہی خود پر مسلط نہیں ہونے دیتے تھے لیکن محسوسات کی کیفیت ارادے کی گرفت سے باہر ہوتی ہے۔ یکسانیت کے نتیجے میں اکتاہٹ یا بے کیفی پیدا ہونا ایک فطری بات ہے۔ بہرحال دونوں کے پاس اس یکسانیت کا علاج نہ تھا۔ کھانا تیار کرنے کے بعد عظمیٰ کچن سے باہر نکلی تو دوپہر ہو چکی تھی اور بچے اسکول سے آنے ہی والے تھے۔ بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کی سہولت اسکول کی طرف سے تھی۔ اسکول وین بچوں کو گھر تک پہنچا جاتی تھی۔

فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بج رہی تھی۔ عظمیٰ نے وال کلاک پر نظر ڈالی اور طویل سانس لیتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔

دوسری طرف توقع کے مطابق صفدر بیگ تھا۔ وہ روزانہ اسی وقت فون کرتا تھا۔ دونوں کے درمیان چند منٹ لگی بندھی گفتگو ہوئی۔ صفدر بیگ نے آج دیر سے گھر آنے کی اطلاع بھی دی تھی۔ وجہ آفس میں کام کی زیادتی تھی اور پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ عظمیٰ نے ریسیور کریڈل پر رکھا ہی تھا کہ دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی۔

عظمیٰ نے لپک کر دروازہ کھولا تو توقع کے مطابق بچے اسکول سے آ گئے تھے۔ دونوں بچوں کو یونیفارم وغیرہ کے متعلق ہدایات دیتی ہوئی عظمیٰ کچن کی طرف بڑھ ہی رہی تھی کہ فون کی گھنٹی ایک مرتبہ پھر بجنے لگی۔ اس نے ناگواری سے فون کی جانب دیکھا اور پھر پلٹ کر فون ریسیو کیا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔

"ہیلو..." عظمیٰ نے سخت لہجے میں کہا۔

"دیکھیں محترمہ مجھے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دیں۔ میں آپ سے قطعی کوئی غیر شائستہ اور غیر معقول گفتگو نہیں کروں گا۔" دوسری طرف سے وہی اجنبی آواز سنائی دی۔ لہجہ دھیما اور شائستہ تھا۔ عظمیٰ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

"دیکھیے محترم میں اس وقت خاصی مصروف ہوں اور آپ سے کسی قسم کی گفتگو نہیں کر سکتی۔"

"تو پھر میں کچھ دیر بعد فون کر لوں گا۔ جب تک آپ فارغ ہو جائیں گی۔"

"مگر آپ فون کریں گے ہی کیوں؟ آپ کوئی اور گھر کیوں نہیں دیکھ لیتے۔" عظمیٰ کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی سخت ہو گیا۔

"پلیز آپ کچھ نرمی سے سوچیں، میں صرف فون پر باتیں کرنا چاہتا ہوں... اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔"

"بہرحال اس وقت میں مصروف ہوں..." عظمیٰ نے فون پٹخ دیا۔

"عجیب آدمی ہے، مجھ سے باتیں کرنے کے لیے نہ جانے کیوں مرا جا رہا ہے؟ پتا نہیں کیا بے تابی ہے۔ لہجے اور انداز گفتگو سے تو معقول ہی لگتا ہے لیکن یہ کوئی معقول حرکت ہے کہ کسی اجنبی عورت سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔" عظمیٰ یہ سب

سوچتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ اسے بچوں کے لیے کھانا ڈائننگ ٹیبل پر لگانا تھا۔

☆☆☆

صفدر بیگ خاصی تاخیر سے گھر لوٹا تھا۔ بچے سو گئے تھے۔ البتہ عظمٰی اس کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔ اس نے معمول کے مطابق کھانا لگایا اور صفدر بیگ کے ساتھ خود بھی کھانے کے لیے بیٹھ گئی۔ کھانے کے دوران دونوں کے درمیان گفتگو بھی ہوتی رہی۔

اس قسم کی گفتگو ان کے درمیان روزانہ ہی ہوتی تھی۔ کھانے کے بعد صفدر بیگ بیڈروم کی طرف چلا گیا جبکہ عظمٰی نے کچن کا رخ کیا۔ وہ اپنے اور صفدر بیگ کے لیے کافی بنانے لگی۔ کچھ دیر بعد وہ کافی سمیت بیڈروم میں آگئی۔ طویل خاموشی کے دوران میں کافی پی گئی، اس کے بعد صفدر بیگ نے ٹی وی آن کر لیا اور اسپورٹس چینل پر میچ دیکھنے میں مشغول ہو گیا جبکہ عظمٰی نے کسی خواتین میگزین کی ورق گردانی شروع کر دی۔ مقررہ وقت پر دونوں نے اپنے مشاغل ترک کر دیے اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ دونوں کے منہ مخالف سمتوں میں تھے۔

عظمٰی آنکھیں موند کر پہلو کے بل دراز تھی۔ اس کے ذہن میں دن میں موصول ہونے والی فون کال کا خیال چکرا رہا تھا لیکن اس نے فون سے متعلق صفدر سے کوئی بات نہیں کی۔ اس کے خیال میں یہ عام سی بات تھی۔ اکثر اس قسم کی رانگ کالز آجاتی ہیں۔

لیکن تھوڑی دیر بعد ہی اس کے ذہن میں فون کرنے والے کا خیال آگیا۔ اس اجنبی کا لہجہ بہت دھیما دھیما اور پُراثر تھا۔ نہ جانے وہ کون تھا اور وہ عظمٰی سے کیوں بات کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال اس نے کوئی غیر شائستہ بات نہیں کی تھی یا اسے کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ دوپہر کے بعد اس نے دوبارہ فون کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ شاید عظمٰی کے سخت لہجے کے سبب وہ مایوس ہو گیا تھا۔ عظمٰی نے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکا اور رفتہ رفتہ نیند کی وادی میں اترتی چلی گئی۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے دس بجے تھے اور عظمٰی روزانہ کی خریداری کر کے گھر میں داخل ہوئی تو فون کی گھنٹی تسلسل کے ساتھ بج رہی تھی۔ اس نے شاپرز ایک طرف رکھنے کے بعد ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔

"ہیلو..." عظمٰی نے کہا۔

"شکر ہے آپ نے فون تو ریسیو کیا، میں کتنی دیر سے کوشش کر رہا تھا۔" دوسری طرف سے وہی اجنبی آواز سنائی دی جو عظمٰی نے گزشتہ روز فون پر سنی تھی۔

"آپ باز نہیں آئیں گے، اپنی اس حرکت سے۔" عظمٰی نے ترش لہجے میں کہا۔

"آپ ایک مرتبہ میری پوری بات سن لیں اگر پھر بھی آپ نے یہ کہا کہ میں فون نہ کروں تو پھر میں آپ کو فون نہیں کروں گا۔"

دوسری طرف سے قدرے جلدی جلدی کہا گیا۔ گویا اسے خطرہ تھا کہ عظمٰی اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے کہیں فون بند نہ کر دے۔

"ہوں..." عظمٰی نے طویل سانس لیتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ "فرمائیں آخر آپ کیا کہنے کے خواہشمند ہیں۔"

"جی آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

"شکریہ کس بات کا ادا کر رہے ہیں مسٹر؟" عظمٰی کے لہجے میں حیرت تھی۔

"شکریہ اس بات کا کہ آپ مجھے اپنی بات پوری کرنے کا موقع دے رہی ہیں۔"

جواباً عظمٰی خاموش رہی۔

"بات دراصل یہ ہے کہ میں یکسانیت اور جمود کا شکار شخص ہوں۔ میری زندگی ایک مشین کے پرزے کے مانند ہے جو ہمیشہ ایک ہی جیسی حرکت پر مجبور ہوتا ہے اور یہی میری مجبوری اور مشکل ہے کہ میں زندگی میں رتی برابر تبدیلی کے لیے ترس رہا ہوں اور آپ سے صرف اتنی توقع رکھتا ہوں کہ دن کے کسی حصے میں آپ سے چند منٹ گفتگو ہو سکے اس کے سوا آپ سے کوئی اور فرمائش ہرگز نہیں کروں گا، یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔ آپ مجھے ایک اچھا ٹیلی فونک دوست پائیں گی۔" یہاں تک کہہ کر دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

عظمٰی بھی چند لمحوں تک خاموش رہ گئی۔ وہ بھی تو کچھ اسی قسم کی صورت حال سے دوچار تھی۔ زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ وہی لگے بندھے معمولات، وہی ایک جیسی صبح، وہی ایک جیسی شام، وقت گویا ایک جگہ ٹھہر سا گیا تھا اور یہ جمود ہی زندگی میں بے کیفی کی ایک بنیادی وجہ تھی۔

"اچھا... میں سوچوں گی کہ آپ سے فون پر بات کرنا مناسب رہے گا یا نہیں۔" عظمٰی نے چند لمحے کے سکوت کے بعد کہا۔

"اس میں اس قدر سوچنے کی کیا بات ہے؟"

"بالکل سوچنا چاہیے۔ آپ کا تو مجھے پتا نہیں لیکن میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور دو بچوں کی ماں بھی ہوں۔"

''مجھے آپ کے شادی شدہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں ہے اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بھی ایک شادی شدہ شخص ہوں... میرے بھی بچے ہیں لیکن کیا شادی شدہ افراد کو دوست بنانے یا دوستوں سے باتیں کرنے کا کوئی حق نہیں ہے؟''

''میں نے سوچنے کی بات صرف اس وجہ سے کی تھی کہ ہم زندگی کے اس موڑ پر نئی دوستی کے متحمل نہیں ہو سکتے، مجھے خدشہ ہے کہ کہیں ہم ٹیلی فونک دوستی کے نتیجے میں کسی پیچیدگی کا شکار نہ ہو جائیں۔'' عظمیٰ نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''پیچیدگی... اس کا بہترین حل یہ ہے کہ ہم کبھی ملنے کی کوشش نہ کریں اور ہمارا تعلق صرف فون تک محدود رہے۔''

''ان تمام باتوں پر غور کرنے اور سوچنے کے لیے وقت تو درکار ہوگا۔ اس لیے میں فون بند کر رہی ہوں تاکہ اس بارے میں اطمینان سے سوچ سکوں۔ یہ بات ہم آئندہ طے کریں گے کہ ہمیں یہ دوستی قائم کرنی چاہیے یا نہیں۔'' عظمیٰ نے حتمی انداز میں کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ اگر آپ یہ چاہتی ہیں تو یونہی سہی۔'' پھر رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد فون بند کر دیا گیا۔

یکساں معمولات کے ساتھ رفتہ رفتہ دن ڈھل گیا تھا اور اس عرصے میں دوبارہ فون کال نہیں آئی تھی۔ عظمیٰ نے اس معاملے پر کافی غور کیا کہ محض فون پر چند منٹ کی بات چیت سے اس کی یا اس کے خاندان کی زندگی میں کیا پیچیدگی یا الجھن پیدا ہو سکتی ہے۔ کم از کم دن کے ان اوقات میں جب وہ بالکل تنہا ہوتی ہے، کوئی اس سے بات کرنے والا مل جائے گا۔ اسی سہارے دن کا کچھ حصہ دلچسپ اور خوشگوار گزر جائے گا لیکن اس تعلق کو وہ کبھی فون کال سے آگے ہرگز نہیں بڑھنے دے گی۔ اسے اپنا گھر اور بچے بہر حال پیارے تھے۔

فون کی گھنٹی مقررہ وقت پر بجی تھی۔ عظمیٰ بھی منتظر تھی، اس نے لپک کر ریسیور اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

''ہیلو، میں شاہد ابراہیم بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے دبی دبی مخصوص آواز سنائی دی۔

''میرا نام عظمیٰ صفدر ہے، آپ مجھے صرف عظمیٰ بھی کہہ سکتے ہیں۔'' عظمیٰ نے اپنے ٹیلی فونک دوست کو پہلی مرتبہ اپنا تعارف کرایا۔

''نام بتانے کا شکریہ، ویسے آپ بھی مجھے شاہد کہہ سکتی ہیں۔''

''شاہد صاحب آپ کا کیا اندازہ تھا؟ کیا میں آپ سے گفتگو کے لیے آمادہ ہو جاؤں گی؟''

''امید پر دنیا قائم ہے محترمہ اور میں نے بھی اسی امید کے سہارے ایک مرتبہ پھر آپ سے رابطہ کر لیا اور اگر میں غلطی پر نہیں ہوں تو آپ نے میری الیکٹرونک قسم کی دوستی کو قبول کر لیا ہے۔''

''الیکٹرونک دوستی، بھئی واہ... آپ نے خوب عنوان تجویز کیا ہے، اس ٹیلی فونک رابطے کے لیے... اگر آپ کو گراں نہ گزرے تو ایک سوال پوچھوں؟'' عظمیٰ نے آخری جملہ سوالیہ انداز میں کہا۔

''بصد شوق پوچھیے اور لاتعداد سوال پوچھیے، آپ کو ہمیشہ کے لیے اجازت ہے۔'' شاہد ابراہیم کے لہجے میں خوشگواری تھی۔

''میں یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آپ کی یہ الیکٹرونک فرینڈ شپ اور کتنی خواتین کے ساتھ ہے؟''

''آپ کے علاوہ صرف ایک خاتون کو مجھے فون کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور وہ ہے میری بیوی۔'' شاہد کے لہجے میں شرارت تھی۔

''چلیں میں یقین کر لیتی ہوں کہ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور اگر غلط بھی کہہ رہے ہیں تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''مجھے آپ سے غلط بیانی کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔''

''اس موضوع کو چھوڑیے، مجھے یہ بتایئے کہ ابھی آپ نے فون کیا تو آپ کو یہ خدشہ نہیں ہوا کہ اگر فون میرے سوا کسی اور نے ریسیو کر لیا تو آپ کیا کہیں گے۔''

''بھئی سادہ سی بات ہے اگر کوئی اور فون ریسیو کر لیتا تو میں رانگ نمبر کہہ کے معذرت کر لیتا۔''

شاہد صاحب آپ کبھی شام کو مجھے فون نہیں کریں گے۔ کیونکہ شام کو میرے شوہر اور بچے گھر پر ہوتے ہیں۔''

''تو کیا آپ اپنے شوہر کو میرے بارے میں بتانا نہیں چاہتیں۔''

''میں ان سے کوئی بات چھپاتی نہیں ہوں اور ممکن ہے کہ آپ کے بارے میں بھی انہیں بتا دوں لیکن ان کے سامنے مجھے آپ سے بات چیت نہیں کرنی چاہیے۔''

''اچھا خیر، آپ بہتر سمجھتی ہوں گی۔ میں ویسے بھی آپ کو اسی وقت فون کر سکتا ہوں۔ شام یا رات کو میں اپنے گھر میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مصروف ہوتا ہوں۔''

''اور اس وقت آپ کہاں ہوتے ہیں؟''

''اس وقت میں اپنے آفس میں ہوتا ہوں۔'' شاہد ابراہیم نے آفس کا نام بھی بتایا تھا۔

☆☆☆

دونوں مسلسل ٹیلی فون کے ذریعے رابطے میں تھے اور اس سلسلے کو خاصا عرصہ بیت چکا تھا۔ عظمیٰ کو شاہد کے فون کا انتظار رہنے لگا تھا اور شاہد کو اسے فون کرنے کی بے چینی۔ دونوں خاصے بے تکلف ہو چکے تھے بلکہ کسی حد تک قریب آ چکے تھے اور فون پر اکثر وہ اپنی اس قربت کا اظہار بھی کر چکے تھے۔ عظمیٰ نے اس معاملے کی ہوا اپنے شوہر صفدر بیگ کو نہیں لگنے دی تھی۔ دونوں ہی شاید اپنی اپنی جگہ ایک دوسرے سے ملنے کے لیے بے چین تھے لیکن کھل کر ابھی تک دونوں نے اظہار نہیں کیا تھا لیکن کسی ایک کو تو پہل کرنی ہی تھی۔ محبت زندگی کے ایندھن میں چنگاری کے مانند ہوتی ہے۔ اگر یہ آگ ایک مرتبہ بھڑک جائے تو پھر مصلحتوں، اصولوں اور قاعدوں سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ جوں جوں شاہد اور عظمیٰ کے درمیان محبت کی آنچ بڑھتی جا رہی تھی، عظمیٰ اور اس کے شوہر صفدر بیگ کے درمیان ایک خلیج پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ دونوں کے تعلق کے درمیان سرد مہری بڑھتی جا رہی تھی اور اس کیفیت کی زیادہ تر ذمے داری بظاہر عظمیٰ پر عائد ہوتی تھی لیکن اس تناؤ کی کیفیت کی وجہ کسی قدر صفدر بیگ نے بھی پیدا کی تھی۔ اس نے اپنی بیوی کی بے اعتنائی کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور اس میں پیدا ہو جانے والی بے پروائی کی وجہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی کسی تشویش کا اظہار کیا تھا بلکہ سرد مہری کے جواب میں سرد مہری اور بے اعتنائی کے جواب میں بے اعتنائی اختیار کر لی تھی۔ اس قسم کی صورتِ حال میں عظمیٰ کا شاہد کی طرف التفات کا بڑھ جانا اور اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہو جانا ایک فطری بات تھی۔

☆☆☆

”شاہد... خدا کے لیے میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمام صورتِ حال تمہارے سامنے ہے، وہ شخص مجھ سے بیزار ہو چکا ہے اور اس کے رویّے سے مجھے شدید اذیت پہنچ رہی ہے۔“

”تو تم بتاؤ میں کیا کروں، تم جیسے چاہتی ہو، میں ویسے کر لیتا ہوں۔“

”تم جلد از جلد مجھ سے ملنے کی کوئی صورت پیدا کرو۔“ عظمیٰ نے بے تابی سے کہا۔

”میں تو خود تم سے ملنے کے لیے بے چین ہوں لیکن میں تمہارے اظہار کے انتظار میں تھا۔“

”تو ٹھیک ہے، ہم آج ہی مل رہے ہیں۔ تم بتاؤ شاہد میں کہاں آؤں؟“

دوسری طرف سے شاہد نے ایک مشہور ریسٹورنٹ کا نام اور وقت بتایا تھا۔

”لیکن ہم ایک دوسرے کو پہچانیں گے کیسے؟“ عظمیٰ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”یہ کوئی مشکل نہیں ہے۔ تم مخصوص رنگ کے لباس میں پہنچ جانا اور تمہارے ہاتھ میں سرخ رنگ کا رومال ہونا چاہیے۔ میں لباس کے رنگ اور رومال کے ذریعے تمہیں پہچان لوں گا۔“ شاہد ابراہیم نے تفصیل بتائی۔

”اور میں تمہیں کیسے پہچانوں گی؟“

”میرے ہاتھ میں زرد رنگ کا ایک لفافہ ہوگا۔ میں تمہیں پہچاننے کے بعد وہ لفافہ میز پر رکھ دوں گا جس پر تم بیٹھی ہوئی ہوگی۔“

”ٹھیک ہے شاہد، میں مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گی۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم دونوں ملنے کے بعد طے کریں گے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔“

”ٹھیک ہے عظمیٰ، میں بھی مقررہ وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ اب باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔ خدا حافظ۔“ شاہد ابراہیم نے فون بند کر دیا تھا۔

عظمیٰ مقررہ وقت پر مذکورہ ریسٹورنٹ کی ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ وہ بری طرح چونک اٹھی اس کا شوہر صفدر بیگ ریسٹورنٹ میں داخل ہوا تھا اور وہ اسی کی طرف آ رہا تھا اور پھر وہ اس کی میز پر آ کر ٹھہر گیا۔

”ہاں تو عظمیٰ بیگ تمہارا شاہد ابراہیم حاضر ہے۔“ اس نے ایک ایک لفظ کو گویا چباتے ہوئے ادا کیا اور ایک زرد رنگ کا لفافہ اس کے سامنے میز پر ڈال کر پلٹ گیا اور لمبے لمبے قدم اٹھاتا ہوا مرکزی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عظمیٰ ابھی تک سکتے کی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ کیا ہوا تھا اور کیوں... اسے کچھ اندازہ نہ ہو سکا۔

اس نے لرزتے ہاتھوں سے بے اختیار زرد لفافہ اٹھا کر چاک کیا۔ اس میں سے ایک تہ کیا ہوا سفید کاغذ برآمد ہوا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے کاغذ کھولا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کاغذ پر جلی حروف میں ”طلاق نامہ“ لکھا ہوا تھا اور ذیل میں جزئیات درج تھیں جن میں سب سے پہلی سطر میں یہ درج تھا کہ صفدر بیگ کو اپنی بیوی کی وفاداری پر شک ہونے لگا تھا جس کے سبب اس نے فون پر آواز بدل کر شاہد ابراہیم کا سوانگ رچایا تھا۔

طاہر جاوید مغل

انگارے

پانچویں قسط

نیکی کر دریا میں ڈال... بات محاورے کی حد تک ٹھیک ہو سکتی ہے لیکن خود غرضی اور سفاکی کے اس دور میں نیکی کرنے والے کو ہی کمر میں پتھر باندھ کر دریا میں ڈال دیا جاتا ہے۔ انسان بے لوث ہو اور سینے میں دردمند دل رکھتا ہو تو اس کے لیے قدم قدم پر ہولناک آسیب منہ پھاڑے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔ بستیوں کے سرخیل اور جاگیرداری کے بے رحم سرغنہ لہو کے پیاسے ہو جاتے ہیں... اپنوں کی نگاہوں سے نفرت کے انگارے برسنے لگتے ہیں... امتحان در امتحان کے ایسے کڑے مراحل پیش آتے ہیں کہ عزم کمزور ہو تو مقابلہ کرنے والا خود ہی اندر سے ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتا چلا جاتا ہے لیکن حوصلہ جوان ہو تو پھر ہر سازش کی کوکھ سے دلیری اور ذہانت کی نئی کہانی ابھرتی ہے۔ وطن کی مٹی سے پیار کرنے والے ایک بے خوف نوجوان کی داستان جسے ہر طرف سے وحشت و بربریت کے خون آشام سایوں نے گھیر لیا تھا مگر وہ ان پیاسی دلدلوں میں رکے بغیر دوڑتا ہی چلا گیا... اثر و رسوخ اور درندگی کی زنجیریں بھی اس کے بڑھتے ہوئے قدم نہیں روک سکیں۔ وقت کی میزان کو اس کے خونخوار حریفوں نے اپنے قدموں میں جھکا لیا تھا، مگر وہ ہار مان کر پسپا ہونے والوں میں سے نہیں تھا...

منظر منظر رنگ بدلتی... ایک لہو رنگ اور دل گداز داستان...
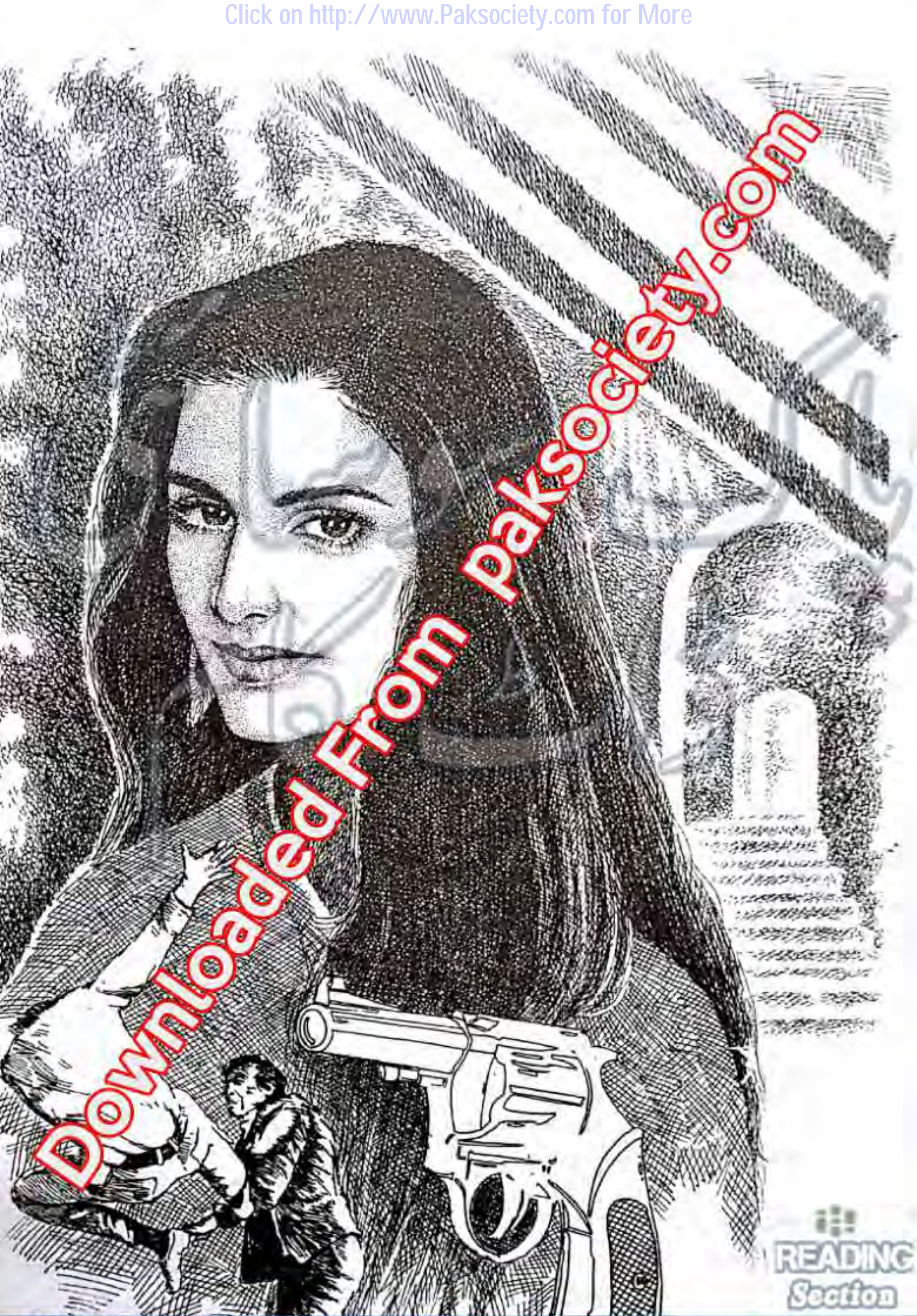
چند ہی سیکنڈ بعد ہم تینوں گھر سے باہر تھے۔ چاندنی کچھ مدھم ہوگئی تھی تاہم وہ ٹریکٹر ٹرالی صاف دکھائی دے رہی تھی جس پر مسلح افراد سوار ہو کر یہاں وکرم اور رام پیاری کے گھر تک آئے تھے۔ ایک بندہ ٹریکٹر کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دوسرا قریب ہی کھڑا تھا۔ مجھے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹے دستے کی کلہاڑی صاف نظر آئی۔ ہماری آمد پر دراز قد شخص چونکا اور اس نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔ تب تک میں رام پیاری کو اپنے ساتھ کھینچتا ہوا اس شخص کے قریب پہنچ چکا تھا۔

اس نے نیم تاریکی میں آنکھیں سکیڑ کر ہمیں پہچاننے کی کوشش کی، پھر گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کون ہے اوئے؟'' اس کے ساتھ ہی اس کی کلہاڑی بھی حرکت میں آئی تھی۔ اس کے تذبذب نے مجھے کافی وقت دے دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے روکنے یا مجھ پر وار کرنے کا فیصلہ کرتا میں نے ٹانگ کی زوردار ضرب عین اس کے سینے پر پسلیوں کے نیچے لگائی۔ یہ بڑا خطرناک مقام ہوتا ہے۔ ضرب شدید ہو تو مضروب کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے لیکن میں اسے مارنا نہیں چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صرف کراہا اور دہرا ہو کر گھٹنوں کے بل گر گیا۔

ہڈیوں کا ڈھانچا وکرم ابھی تک میرے کندھے پر تھا۔ میرے بائیں ہاتھ میں رام پیاری کا بایاں بازو تھا اور وہ میرے پہلو سے پیوست تھی۔ کلہاڑی بردار چوٹ کھا کر گھٹنوں کے بل گرا تو کلہاڑی اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے دو قدم بڑھ کر پستول کا وزنی دستہ اس کی کنپٹی پر رسید کیا اور اس کو مزاحمت کی کوشش سے آزاد کر دیا۔ رام پیاری خوف سے چلا اٹھی۔ دوسرا ردِعمل یہ ہوا کہ ٹریکٹر کی سیٹ پر بیٹھا ہوا دبلا پتلا شخص ہراساں ہو کر نیچے کود گیا اور مخالف سمت میں بھاگتے ہوئے پکارا۔

''بشیرے...... کرموں۔''

یہ سارا واقعہ بمشکل تین چار سیکنڈ کے اندر ہوا تھا۔ ٹریکٹر کے اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے ہلکے پھلکے وکرم کو ٹریکٹر ٹرالی میں ڈالا پھر رام پیاری کی دونوں بغلوں میں ہاتھ دیا اور اسے بھی اٹھا کر ٹرالی میں ڈال دیا۔ اس کے بعد پھرتی سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ٹریکٹر اسٹارٹ ہی تھا۔ میں نے صرف ہیڈ لائٹس روشن کیں اور اسے تیزی سے آگے بڑھا دیا۔ پستول میں نے گود میں رکھ لیا تھا۔

تب تک سات آٹھ افراد صورتِ حال کی نزاکت سے آگاہ ہو چکے تھے اور شور مچاتے ہوئے ٹریکٹر کی طرف لپک رہے تھے۔ رام پیاری ابھی تک ٹرالی میں کھڑی تھی۔ میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''نیچے لیٹ جاؤ۔''

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا اور ٹرالی کے فرش پر لیٹ گئی۔ ٹرالی کے پیچھے آنے والے بس پچاس ساٹھ میٹر دور ہی ہوں گے۔ ان کی طرف سے چلائی جانے والی کوئی گولی میرے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہو سکتی تھی۔ بہرحال یہ رسک تو مجھے لینا ہی تھا۔ کمال کی بات تھی، صرف چند دن پہلے میں نے لاہور کے مضافاتی علاقے میں ٹریکٹر ٹرالی چلانے کی پریکٹس کی تھی اور آج یہ پریکٹس ایک خطرناک صورتِ حال سے نکلنے میں میرے کام آرہی تھی۔ میں آناً فاناً ٹرالی کو کھینچتا ہوا نیم پختہ راستے پر لے گیا۔ میں جانتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس گھوڑے بھی ہیں، وہ تیزی سے میرے پیچھے آسکتے ہیں۔

میں نے مڑ کر دیکھا، میرا اندازہ فوراً ہی درست ثابت ہوگیا۔ مدھم چاندنی میں مجھے کچھ گھوڑے حرکت کرتے دکھائی دیے۔ ان کے پس منظر میں وکرم اور رام پیاری کی خستہ حال رہائش گاہ نظر آرہی تھی۔ اس کے ایک حصے میں سرخ روشنی دکھائی دے رہی تھی اور دھوئیں کے بادل اٹھ رہے تھے۔

''یہ لوگ ہم کو مار دیں گے۔ تم ہمیں پولیس چوکی پر لے جاؤ۔'' عقب سے رام پیاری کی روتی بلکتی آواز سنائی دی۔

میرے اپنے ذہن میں بھی یہی بات آرہی تھی۔ میں نے بلند آواز میں رام پیاری سے پوچھا۔ پولیس چوکی کس طرف ہے؟''

''ابھی سیدھے چلتے جاؤ۔ پل کے پاس سے نیچے ہو جانا سامنے ہی نظر آجائے گی۔'' وہ پکار کر بولی۔

میں نے اس کے کہنے پر عمل کیا۔ اس کے خاوند کے مسلسل کھانسنے کی آوازیں بھی میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ گھوڑے قریب آرہے تھے اور پھر دھماکے کے ساتھ ایک شعلہ چمکا۔ ہم پر فائر کیا گیا تھا۔ شاید ٹرالی یا ٹریکٹر کے ٹائروں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ چند لمحے بعد جب دوسرا فائر ہوا تو میں نے بھی پستول سے دو ہوائی فائر کر دیے، مقصد ان لوگوں کو خود سے فاصلے پر رکھنا تھا۔

چند سیکنڈ بعد مجھے چھوٹی نہر کے پل کی جھلک نظر آگئی۔ رام پیاری کی ہدایت کے مطابق میں نے ٹریکٹر ٹرالی

کوئیں کے پاس سے نشیبی راستے پر اتار لیا۔ جو لوگ ٹریکٹر ٹرالی چلاتے ہیں، وہ جانتے ہوں گے کہ ٹریکٹر ٹرالی کو موڑنا، اوپر چڑھانا یا نیچے اتارنا کتنا دشوار ہوتا ہے۔ بہرحال میری دو روزہ سخت مشق نے میری مدد کی اور میں ڈانواں ڈول ٹرالی کو نیچے اتارنے اور پولیس چوکی کی طرف بھگا لے جانے میں کامیاب ہوگیا۔ گھڑسوار تیزی سے پیچھے آرہے تھے اور ان کا فاصلہ کم ہورہا تھا۔ مجھے کچھ فاصلے پر پولیس چوکی کی مدھم روشنی نظر آئی۔ خوش قسمتی سے بجلی آرہی تھی اور پولیس چوکی کی نیم پختہ عمارت کی ایک دو کھڑکیاں روشن تھیں۔ میں ٹریکٹر ٹرالی کو اندھا دھند بھگاتا گیٹ پر لے گیا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں ٹریکٹر روکتا اور پولیس والوں سے گیٹ کھولنے کی استدعا کرتا۔ میں نے لکڑی کے گیٹ کو ٹریکٹر سے ٹکر ماری۔ ٹریکٹر اور ٹرالی دونوں بری طرح اچھلے۔ گیٹ کے ساتھ ہی ایک طرف کی دیوار بھی دھماکے سے ڈھے گئی۔ اگلے ہی لمحے ٹریکٹر ٹرالی چوکی کے احاطے میں تھی۔

میں نے برآمدے میں موجود ایک پولیس اہل کار کو بری طرح چونکتے اور کرسی سے کھڑے ہوتے دیکھا۔ دیوار ڈھے جانے سے گرد کا ایک بادل سا اٹھ کر ٹریکٹر ٹرالی کو ڈھانپ چکا تھا۔ میں جست لگا کر نیچے اترا اور اس گرد و غبار سے فائدہ اٹھاتا ہوا چار دیواری سے نکلا اور دائیں جانب کے کھیتوں میں گھس گیا۔ مکئی کے یہ اونچے کھیت میرے لیے بہترین پناہ گاہ ثابت ہوئے۔ میں قریباً سو میٹر تک کھیت کے اندر ہی بھاگتا چلا گیا پھر ایک جگہ رک کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ میری توقع پوری ہوئی۔ تعاقب میں آنے والے گھڑسوار چوکی سے دور ہی رک گئے۔ ان میں سے دو تین کے پاس ٹارچیں بھی تھیں، ٹارچوں کی روشنی ان کی لوکیشن کا پتا دے رہی تھی پھر ایک دیہاتی تانگا نظر آیا۔ وہ ہمارا کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تھا۔ وہ بھی گھڑسواروں کے قریب ہی رک گیا۔ اب جو کچھ بھی تھا لیکن وکرم اور رام پیاری پولیس چوکی میں تھے۔ میں اب یہاں سے واپس جاسکتا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز پورے گاؤں میں رات والے واقعے کا چرچا تھا۔ اس سارے واقعے کے بارے میں، میں نے انیق کو کل رات ہی بتا دیا تھا۔ وکرم کی رہائش والے گھر کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا تھا۔ ایک حصے کو جو آگ لگائی گئی تھی وہ حملہ آوروں میں سے ہی کچھ لوگوں نے بجھا دی تھی۔ کچھ توڑ پھوڑ ضرور ہوئی تھی۔ مجھے حق نواز کی زبانی پتا چلا کہ وکرم اور رام پیاری اس سے پہلے گاؤں کے اندر ہی مارواڑیوں کے محلے میں رہتے تھے۔ وکرم چونکہ بیمار تھا اس لیے چھوت کے ڈر سے اسے گاؤں سے باہر رہنے کے لیے زمیندار عالمگیر نے ایک پرانا مکان دے دیا تھا۔ یہ کوئی ڈیڑھ دو مہینے پہلے کی بات تھی۔ وکرم کو گاؤں سے باہر نکالنے میں کچھ ہاتھ اس کے پڑوسی ریاست علی کا بھی تھا۔ ریاست کے بچے اکثر وکرم کے گھر کھیلنے چلے جاتے تھے۔ ریاست کا بڑا لڑکا جس کی عمر چھ سات سال تھی، بیمار رہنے لگا تھا۔ اسے اسپتال میں دکھایا گیا تو پتا چلا کہ اسے ٹی بی ہوگئی ہے۔ ریاست علی کو پہلا خیال یہی آیا کہ بچے کو یہ بیماری وکرم کے گھر جانے سے لگی ہے۔ اس بات پر ریاست کی بیوی اور وکرم کی بیوی کے درمیان بہت جھگڑا بھی ہوا تھا۔ ریاست علی کی بیوی نے کہا کہ وکرم اور رام پیاری نے بیماری والی بات محلے داروں سے ایک عرصے تک چھپائے رکھی۔ وہ اپنے بچے کی بیماری کے لیے وکرم کو قصوروار ٹھہراتے تھے۔ اب ایک دن پہلے وہ بچہ گوجرانوالہ کے بڑے اسپتال میں دم توڑ گیا تھا۔ بچے کے وارث غم و غصے کے عالم میں وکرم اور رام پیاری کے گھر پر چڑھ دوڑے تھے۔ گاؤں کے اکثر لوگ اس چڑھائی کو غلط قرار دے رہے تھے۔ بہرحال کچھ حمایت بھی کررہے تھے۔

میری اور حق نواز کی بات چیت کے دوران میں ہی میواتی پہلوان حشمت راہی بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ایک ہاتھ پر چوٹ کا نشان دکھائی دے رہا تھا جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چوٹ رات والے ہنگامے کا نتیجہ تھی۔ پہلوان پتا کرنے آیا تھا کہ سونگی کو ابھی پولیس والوں سے رہائی ملی ہے یا نہیں۔ حق نواز نے اسے بتایا کہ امید ہے آج وہ حوالات سے چھوٹ جائے گا۔ میں نے رات کو حشمت پہلوان کو مولوی فدا کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے دیکھا تھا مگر پہلوان کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ کیونکہ میرا چہرہ اس وقت چھپا ہوا تھا۔ حق نواز نے پہلوان سے رات والے واقعے کی تفصیل پوچھی۔ اس نے اپنے مخصوص لہجے میں بتایا۔

”یہ سراسر مارواڑیوں کا ہی قصور تھا۔ ان کا بچہ دنیا سے چلا گیا لیکن زندگی موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہووے ہے۔ اس میں وکرم اور اس کی پتنی کا کیا گناہ۔ اور لوگ بھی تو وکرم کے گھر آتے جاتے تھے اس سے ملتے جلتے تھے، یہ بیماری اس بچے راشد کو ہی کیوں لگی۔ بس اس بے چارے کی

آئی ہوئی تھی۔“

”لیکن پہلوان جی سنا ہے کہ جب مارواڑیوں نے وکرم کے گھر پر ہلا بولا تو اس ویلے مولوی فدا بھی وہاں تھے۔وہ کیا کرنے گئے تھے؟“حق نواز نے کہا۔

”مولوی فدا دل کا بُرا بندہ نا ہیں ہے۔سب جانت ہیں کہ وہ وہاں کیوں گیا تھا۔بس اب باتیں بنا کر چسکا لیوت ہیں اور تم بھی ایسا ہی کر رہے ہو۔“ پہلوان نے برا سا منہ بنایا۔

”پہلوان جی، سنا ہے کہ اگر وہ ڈھاٹا پوش بندہ وہاں نہ پہنچتا اور وکرم اور اس کی بیوی کو وہاں سے نکال کر نہ لے جاتا تو ان دونوں کے ساتھ کچھ بہت بُرا ہو جاتا تھا۔“ انیق بولا۔

”ہاں یہ بات تو سولہ پیسے ٹھیک ہے۔“ پہلوان نے اپنا تربوز جیسا سر اوپر نیچے ہلایا۔ وہ غالباً سولہ آنے کہنا چاہتا تھا۔”بھیا جی، اس نے بڑی دلیری دکھائی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔“

”پہلوان! تم تو وہاں موجود تھے۔تمہیں بھی کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کون تھا؟ اس کی آواز تم نے سنی ہوگی۔ اس کی چال ڈھال، اس کے قد کاٹھ سے کچھ پتا نہیں چلا؟“ حق نواز نے پوچھا۔

”نہیں کوئی خاص اندازہ نہیں ہوا لیکن وہ لگتا ہمارے گاؤں کا ہی ہے۔“ پہلوان حشمت نے کہا۔

”پہلوان جی! ہم نے ایک اور بات سنی ہے۔مولوی جی کا شاگرد طارق بھی زخمی ہوا ہے۔اسے کسی نے سر پر بڑی بری چوٹ لگائی اور پھر وکرم کے گھر کے کمرے میں بند کر دیا۔“

”ہاں، یہ ہوا تو ہے بلکہ میں نے تو مولوی فدا کے سر پر بھی چوٹ دیکھی ہے۔اب پتا نہیں کہ یہ مارواڑیوں میں سے کسی کا کام ہے یا کوئی اور چکر۔ابھی بات کھلی نا ہیں مگر دودھ کا پانی اور پانی کا دودھ تو ہووے گا ہی۔“ پہلوان نے پھر ایک محاورے کا حلیہ بگاڑا۔

”یہ طارق اب کیسا ہے؟“ حق نواز نے پہلوان سے پوچھا۔

”اسے بھی اسپتال لے کر گئے تھے وہاں سے مرہم پٹی کروا کے آ گیا ہے۔صبح اپنے گاؤں چلا گیا تھا۔“

پہلوان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ طارق نامی وہ لڑکا قریبی گاؤں روہی والا کا رہنے والا ہے۔میری ٹھوکر سے اس کی کنپٹی پر خاصی چوٹ آئی تھی۔وہ کافی دیر بہکی بہکی باتیں کرتا رہا تھا بہرحال اب وہ ٹھیک ہے۔

میرا ذہن بار بار مولوی فدا اور اس کے طارق نامی شاگرد کی طرف جا رہا تھا۔کل رات جو کچھ ہوا اس سے مولوی فدا کی پوزیشن کچھ صاف ہو گئی تھی لیکن دو چار باتیں ابھی تک سمجھ سے باہر تھیں۔اگر مولوی فدا اتنے ہی سچے کھرے بندے تھے اور ایسی ہی خدا خوفی رکھتے تھے تو پھر وہ تاجور کے سلسلے میں لوگوں کو گمراہ کیوں کر رہے تھے۔ کیوں اس سلسلے میں پیر ولایت کے ہمنوا بن گئے تھے۔وہ بھی گاؤں میں دو بدصورت عورتوں کے گشت کی بات کرتے تھے اور لوگوں کو ہراساں کر رہے تھے۔گھروں میں پتھر پڑنے، آگ لگنے اور مرغیوں کے کٹے ہوئے سر ملنے کو بھی وہ ہوائی چیزوں کی کارستانی قرار دے رہے تھے۔کیا اس کے پیچھے کوئی حکمت تھی یا پھر واقعی وہ بھی لالچ یا دباؤ کے دھارے میں بہہ گئے تھے۔

رات والے واقعے میں پہلوان حشمت نے اپنے کردار کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور بتایا کہ بے شک پینٹ جیکٹ والے ڈھاٹا پوش بندے نے دلیری دکھائی اور میاں بیوی کو خطرے سے نکالا لیکن اس میں ان کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ پہلوان نے کہا۔”ایک موقع پر مولوی جی اور وہ ڈھاٹے والا دونوں پیچھے ہٹ گئے تھے لیکن میں نے کلہاڑی پکڑلی اور صاف کہہ دیا کہ اگر کسی نے دہلیز سے آگے قدم رکھا تو خون خرابا ہووے گا۔تمہیں پتا ہی ہے جب مجھے غصہ آتا ہے تو پھر میں بھاؤ تاؤ نہیں دیکھتا۔“ شاید پہلوان آؤ تاؤ کہنا چاہ رہا تھا۔دہلیز پار کرنے والی جو بات وہ کہہ رہا تھا وہ کل رات کم از کم میرے سامنے تو نہیں ہوئی تھی۔

جاتے جاتے پہلوان نے ایک پرانا شعر بھی سنا دیا۔ جس کا مطلب سلیس اردو میں یہ تھا کہ اس دھرتی پر اب بہت کچھ انوکھا ہونے والا ہے۔جو لوگ سمجھ بوجھ رکھتے ہیں، انہیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا۔

پہلوان کے جانے کے بعد میرے اشارے پر انیق نے حق نواز سے پوچھا کہ اس کی ملاقات تاجور یا تاجور کے والد دین محمد سے ہوئی ہے؟

حق نواز نے اس کا جواب اثبات میں دیتے ہوئے کہا۔”آج سویرے میں نے چھوٹی مالکن (تاجور) کو مالک کے ساتھ تانگے میں بیٹھتے ہوئے دیکھا تھا۔مجھے لگتا ہے باپ بیٹی دو تین دن کے لیے چاند گڑھی سے چلے گئے ہیں۔“

''وہ کیوں؟'' انیق نے پوچھا۔

''وہی تھانے دار سجاد کا ڈر۔ ایسے لوگوں سے ڈرنا ہی چنگا ہوتا ہے۔ شاید مالک کا خیال ہو کہ حالات ذرا ٹھیک ہو جائیں تو واپس آجائیں گے۔''

''پر اس طرح تو تھانے دار سجاد اور بھی شک میں پڑ جائے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ ایک دو دن کے لیے دائیں بائیں ہو جانے کا مشورہ مالک کو کسی سیانے نے ہی دیا ہوگا۔ یہ بات تو پکی ہے کہ نمبردارنی کو مارنے اور زخمی کرنے والی چھوٹی مالکن (تاجور) نہیں تھی۔ پر ابھی یہ تو پتا نہیں چلا نا کہ اصل جرم وار کون ہے۔ جرم وار کا پتا چل گیا تو پھر چھوٹی مالکن یا مالک کی گرفتاری کا ڈر نہیں رہے گا۔''

حق نواز کی بات میں وزن تھا۔ اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ پتا چلے کہ نمبردارنی کی حالت کا اصل ذمے دار کون ہے۔ نمبردارنی نادرہ کی حالت مسلسل خراب تھی۔ اسے پھر اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔ لکڑی کے وزنی ڈنڈے نے اس کے سر کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ اس کی ناک سے گاہے بگاہے خون بھی رسنے لگتا تھا۔ کسی وقت میں یہ سوچ کر کانپ جاتا تھا کہ اگر یہ سب کچھ تاجور کے ساتھ ہو گیا ہوتا، تو کیا ہوتا؟ میرا دھیان ایک بار پھر مولوی فدا اور اس کے شاگرد طارق کی طرف جانے لگا۔ پتا نہیں کیوں میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ میں ان سے کوئی خاص بات معلوم کر سکتا ہوں۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے طارق سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

طارق کا پورا نام محمد طارق وارثی تھا۔ وہ مدرسے کے پرانے طالب علموں میں سے تھا۔ آج حق نواز اور انیق کی باتوں سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ ساتھ والے گاؤں روہی والا کے پاس چلا گیا ہے۔ انیق آج سہ پہر روہی والا کی بڑی نہر دیکھنے کے بہانے وہاں گیا تھا اور طارق کا پورا اتا پتا لے آیا تھا۔

پروگرام کے مطابق رات دس بجے کے لگ بھگ میں نے اپنا صندوق کھولا۔ یہ بڑا خاص طرح کا صندوق تھا۔ باہر سے دیکھنے پر عام سا ٹرنک نما بکس لگتا تھا لیکن اس کے پیندے کی دو تہیں تھیں۔ اسی طرح ڈھکنا بھی دو پرتوں کا تھا۔ درمیانی خلا میں مختلف اشیا چھپائی جا سکتی تھیں اور انہیں آسانی سے ڈھونڈنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے اپنی پتلون، اپنا نقاب نما ڈھاٹا اور پستول پیندے والی پرت میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے علاوہ میں اپنے ساتھ ایک چھوٹا اسپائی کیمرا، ایک ننھا وائس ریکارڈر، ایک ڈکٹافون اور اسی طرح کی ایک دو مزید چیزیں اپنے ساتھ لایا تھا۔ یہ اشیا ڈھکن والی پرت میں چھپائی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ خاص طرح کے جوگر جیسے بوٹ تھے جنہیں تہ کر کے مختصر جگہ میں رکھا جا سکتا تھا۔

میں نے صندوق میں سے اپنی مطلوبہ چیزیں نکال لیں۔ پتلون، جوگر اور ڈھاٹا۔ بالائی جسم کے لیے جیکٹ تھی اور یہ وہی بوسیدہ سی جیکٹ تھی جو میں سارا دن پہنے رہتا تھا لیکن یہ دوہری جیکٹ تھی یعنی اسے الٹا کر بھی پہنا جا سکتا تھا۔ الٹانے سے یہ بالکل مختلف رنگ اور مختلف ریگزین کی جیکٹ بن جاتی تھی۔ اس سارے لباس کو بس ایک لمبی گرم چادر سے ڈھانپ سکتا تھا۔

چادر اوڑھ کر میں باہر نکلا اور پیدل ہی طارق کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ سردیوں کی ایک اور دھند آلود رات تھی۔ کھیتوں، کھلیانوں پر خاموشی چھائی ہوئی تھی اور راستے بالکل سنسان دکھائی دیتے تھے۔ بس کبھی کبھی کھیت میں روشنی کی جھلک نظر آتی تھی یا پھر کوئی سکڑا سمٹا راہی دکھائی دے جاتا تھا۔ کھیتوں کے درمیان، ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر سفر کر کے میں قریباً آدھے گھنٹے میں روہی والا اور پھر طارق کے گھر پر پہنچ گیا۔ یہ رات کے قریباً گیارہ بجے کا عمل تھا۔ قریب ہی کسی گلی سے چوکیدار کی خمار آلود آواز ابھری۔

''جاگدے رہنا۔'' اس کے ساتھ ہی کسی دور کی گلی میں کتے شور مچانے لگے۔ طارق کا گھر شناخت کرنے میں مجھے قطعی کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ ان علاقوں میں کھجور کا درخت نہیں ہوتا لیکن طارق کے گھر کے صحن میں کھجور کے دو درخت موجود تھے۔ انیق کی حاصل کردہ معلومات کے مطابق، اس کا باپ شہر، مزدوری کے لیے گیا ہوا تھا۔ اس کی ادھیڑ عمر والدہ اور چھوٹا بھائی گھر میں ہوتے تھے۔ میں نے بیرونی دیوار پھاندی اور چند سیکنڈ کے اندر اس کمرے کے عین سامنے پہنچ گیا جہاں طارق لحاف اوڑھے سو رہا تھا۔ دروازے پر دباؤ ڈالا تو وہ غیر متوقع طور پر اندر سے بند نہیں تھا۔ اس کے پٹ تھوڑے سے کھل گئے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اندر کی صورتِ حال دکھائی دے رہی تھی۔ طارق کی کنپٹی پر سفید رنگ کی بینڈیج، میڈیکل ٹیپ سے چپکی ہوئی تھی۔ پاس ہی ایک چارپائی پر اس کا تیرہ چودہ سالہ بھائی سویا ہوا تھا۔

یکا یک مجھے چونکنا پڑا۔ میں یہاں اس لیے آیا تھا کہ طارق سے مل کر اس سے مولوی فدا اور پیر ولایت وغیرہ کے

بارے میں کچھ معلومات حاصل کرسکوں مگر جب میں نے ادھ کھلے دروازے سے کمرے میں جھانکا تو میری نگاہ بے ساختہ ایک چیز پر ٹھہر گئی۔ میں نے دوبارہ آنکھیں سکیڑ کر دیکھا اور مجھے دل کی دھڑکنیں بڑھتی محسوس ہوئیں۔ طارق کے سرہانے کی طرف لکڑی کی ایک چھوٹی میز رکھی تھی۔ اس پر دواؤں کی دو تین بوتلیں تھیں اور شیشے کا گلاس رکھا تھا اور اس کے ساتھ ایک چھوٹی سی تسبیح بھی رکھی تھی۔ یہی تسبیح تھی جس کو دیکھ کر میرا دورانِ خون بڑھا تھا۔ ایسی ہی تسبیح کا ذکر تاجور نے کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ واردات کی رات اسے مضروب نمبردارنی نادرہ کی چارپائی کے پاس ایک چھوٹی تسبیح پڑی ہوئی ملی تھی۔ میری نگاہیں بدستور تسبیح پر جمی ہوئی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ یہ طارق کی تسبیح تھی۔ تو کیا...... وہ تسبیح بھی اس جوشیلے نوجوان کی تھی؟ کیا تاجور کے گھر میں گھس کر نمبردارنی پر حملہ کرنے والا وہی تھا۔ ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اگر واقعی ایسا ہوا تھا تو پھر کئی سوال ذہن میں ابھرتے تھے۔ طارق نے ایسا کیوں کیا؟ اسے نمبردارنی سے کیا دشمنی ہوسکتی تھی اور تاجور کے گھر والوں سے کیا ہمدردی ہوسکتی تھی یا پھر اس نے تاجور اور اس کے گھر والوں کو پھنسانے کے لیے یہ کارروائی کی تھی؟

اس تسبیح کو دیکھنے کے بعد کچھ اور ثابت ہوتا ہو یا نہیں لیکن میرے اندر مولوی فدا کے اس شاگرد کے حوالے سے بے پناہ تجسس ضرور جاگ اٹھا تھا۔ میں نے دروازہ کھولا اور بہت آہستہ سے اندر داخل ہوگیا۔ میں نے پہلے طارق کے منہ پر مضبوطی سے اپنا ہاتھ جمایا پھر ٹھوکا دے کر اسے جگا دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی نیند سے سرخ آنکھوں میں کوئی تاثر نہیں تھا۔ شاید وہ ابھی تک صورتِ حال کو سمجھا نہیں تھا اور پھر جب وہ سمجھا تو اس نے تڑپنے مچلنے کی کوشش کی۔ میں نے پستول کی نال اس کی پیشانی سے لگا دی اور سرسراتی آواز میں سرگوشی کی۔ ”تمہیں کل والا سبق بھولا نہیں ہوگا طارق وارثی! اگر تڑپو پھڑکو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔ اگر میری بات پر عمل کرو گے تو کوئی نقصان نہیں ہوگا۔ کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہیں دوں گا۔“

اس نے ہوش و حواس میں آنے اور صورتِ حال کو سمجھنے میں قریباً نصف منٹ لے لیا۔ بہرحال جب ایک بار وہ پچویشن کو سمجھ گیا اور میری طاقت کو بھی جان گیا تو اس نے عقل مندی کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں نے کہا۔ ”اگر تم شور نہیں کرو گے تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا دیتا ہوں۔“

اس نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے ہاتھ منہ سے ہٹا لیا۔ پستول کا رخ بدستور اس کے سر کی طرف تھا۔ کل رات اس کی کنپٹی پر جہاں میری ٹھوکر لگی تھی وہاں باقاعدہ زخم ہوگیا تھا۔ یہ خوف ناک ضرب اسے بھولی نہیں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میری ہدایت پر بے چون و چرا عمل کررہا تھا۔ اس کا سارا جوش و ولولہ دھیما پڑ گیا تھا۔ میں اسے لے کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے چند ضروری سوال پوچھ کر یہاں سے چلا جاؤں گا لہٰذا اس کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ مجھے کسی ایسے کمرے میں لے چلے جہاں اطمینان سے آدھ پون گھنٹا بات ہوسکے۔

کچھ ہی دیر بعد ہم بیرونی دروازے کے پاس ایک چھوٹی سی بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ یہاں آنے سے پہلے میں نے طارق کے کمرے کی میز پر سے وہ چھوٹی تسبیح اٹھالی تھی۔ میری ہدایت پر اس نے اپنے کمرے کی لالٹین بجھا دی تھی۔ مقصد یہی تھا کہ اگر اس کا چھوٹا بھائی جاگ جاتا تو اسے بڑے بھائی کی غیر موجودگی کا پتا نہ چلتا۔

بیٹھک میں آکر طارق نے ایک لیمپ جلایا۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ میں نے کہا۔ ”طارق! میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ اس لیے سیدھی سیدھی بات کرتے ہیں۔ یہ تسبیح تمہاری ہے نا؟“

اس نے ذرا تعجب سے میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلایا۔

”تمہیں پتا ہی ہے چار دن پہلے دین محمد کے گھر آئی ہوئی نمبردارنی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور اس کی حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں۔“ میں نے کہا۔

طارق نے تھوک نگل کر ایک بار پھر سر کو ہاں میں حرکت دی۔

”نمبردارنی کی چارپائی کے پاس سے ایک بالکل ایسی ہی تسبیح ملی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ وہ اس شخص کی ہے جس نے نمبردارنی کو زخمی کیا۔“

طارق کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔ اس نے ڈری ڈری نظروں سے مجھے دیکھ کر کہا۔ ”میں تمہاری بات نہیں سمجھا؟“

”مگر میں کچھ کچھ سمجھ رہا ہوں۔ مجھے شک ہورہا ہے کہ نمبردارنی پر اس رات حملہ تم نے کیا تھا بلکہ نمبردارنی پر نہیں، تم نے شاید دین محمد کی بیٹی تاجور کو نشانہ بنایا تھا لیکن وہ اس وقت اپنے کمرے کے بجائے گھر کی بیٹھک میں سو رہی

تھی۔اس لیے غلطی سے نمبردارنی کا کباڑا ہوگیا......''

طارق کے تاثرات سخت گھبراہٹ والے تھے۔ پتلی پتلی مونچھوں اور چھدری داڑھی کے درمیان اس کے ہونٹ بالکل خشک ہونے لگے تھے۔میرے دل نے گواہی دی کہ میرے اندھیرے میں چلائے ہوئے تیر ایک دم نشانے پر لگ رہے ہیں۔

وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔

''آپ......کون......ہو؟''

''خدائی فوج دار...... سمجھو کہ میں اس چاند گھڑی کے بگڑوں تگڑوں کو ٹھیک کرنے کے لیے اسپیشل ڈیوٹی پر تشریف لایا ہوں۔تم فضول سوالوں میں وقت ضائع کرو گے تو تمہاری جان کسی بڑی مصیبت میں بھی پھنس سکتی ہے۔بہتر یہی ہے کہ بات کا دائرہ چھوٹا رکھو۔تم نے دین محمد کی بیٹی تاجور کو مارنے کی کوشش کیوں کی؟''

''مم......میں نے نہیں کی۔مجھے کچھ نہیں پتا۔''

''تو پھر کسے پتا ہے؟ آج شام نمبردارنی تھوڑی دیر کے لیے ہوش میں آئی تھی۔اس نے حملہ کرنے والے کا جو حلیہ بتایا ہے وہ ایک سو دس فی صد تم سے مل رہا ہے۔''میں نے طارق کے پاؤں اکھاڑنے کے لیے نمبردارنی کے بارے میں جھوٹ بولا۔

اس کا رنگ کچھ مزید پھیکا پڑ گیا،ایک اور تیر نشانے پر لگا تھا۔

''طارق! مجھے لگتا ہے کہ ابھی ایک آدھ گھنٹے میں پولیس نے یہاں پہنچ جانا ہے کیونکہ ساری شہادتیں تمہاری ہی طرف جارہی ہیں اور تمہیں پتا ہی ہے کہ سجاد کس طرح کا تھانیدار ہے۔اگر پولیس کی زبردست مار سے بچنا چاہتے ہو تو مجھے سب کچھ صاف صاف بتادو۔میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ تمہارے لیے جو کچھ کرسکا کروں گا اور اگر تم نے یہ سب کچھ کسی کے کہنے پر کیا ہے تو پھر ہوسکتا ہے کہ تمہیں اس معاملے سے صاف ہی بچالوں۔''

اس نے ایک بار پھر مجھے سرتاپا دیکھا۔گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔''لیکن آپ ہو کون؟ کیا آپ بھی پولیس والے ہو؟''

''تم ایک بار پھر فضول سوالوں میں وقت ضائع کررہے ہو اور میں تمہیں بتاچکا ہوں کہ تمہارے پاس وقت زیادہ نہیں ہے۔تم صرف میری بات کا جواب دو۔''

تین چار منٹ کے اندر میں طارق کو اپنے ڈھب پر لے آیا اور وہ اپنی زبان کھولنے پر آمادہ ہوگیا۔

اگلے تقریباً پندرہ منٹ میں ہمارے درمیان بڑی انکشاف انگیز گفتگو ہوئی۔اس گفتگو نے اس سارے معاملے کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔سب سے پہلے تو طارق نے تسلیم کیا کہ نمبردارنی پر حملہ اس نے کیا تھا۔اس وقت وہ بہت جذباتی حالت میں تھا اور اسے بس یہی لگ رہا تھا کہ اگر آج اس نے کچھ نہ کیا تو پھر حالات حد سے زیادہ بگڑ جائیں گے۔

''اگر تم نمبردارنی کو مارنا چاہتے تھے تو کیوں؟''میں نے پوچھا۔

اس کا جواب حیرت انگیز تھا اور میرے ایک مضبوط شک کے مطابق بھی تھا۔اس نے اشک بار آواز میں کہا۔ ''میں نے نمبردارنی پر نہیں دین محمد کی بیٹی پر حملہ کیا تھا۔میں......میں چاہتا تھا کہ اسے مار ڈالوں یا پھر اس کی شکل اتنی بگاڑ دوں کہ وہ کسی کے کام کی نہ رہے۔''

میں نے اپنے طیش کو بمشکل دبایا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔''کیوں؟ایسا کیا جرم سرزد ہوگیا تھا اس لڑکی سے؟''

''جرم اس لڑکی سے نہیں اس کی وجہ سے سرزد ہوا ہے اور اتنا بڑا ہے کہ اس نے کسی کی زندگی عذاب بنا کر رکھ دی ہے۔''

''کس کی؟''

''مولوی جی کی......میرے مولوی جی کی۔میرے استاد جی کی۔وہ میرے استاد نہیں میرے روحانی باپ ہیں۔میں ان کے لیے سب کچھ قربان کرسکتا ہوں۔میں انہیں اس طرح مجبور و بے بس نہیں دیکھ سکتا تھا۔''اس کی آواز بھرا گئی۔

''تمہارا مطلب ہے کہ مولوی صاحب،تاجور کی وجہ سے کسی مصیبت میں ہیں؟''

''تاجور کی وجہ سے نہیں،اس کے کمینے عاشق کی وجہ سے اور عاشق کے حمایتیوں کی وجہ سے۔ان لوگوں نے میرے مولوی جی کی زندگی عذاب بنادی ہے۔ان کا جینا،موت سے بُرا کردیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ مولوی جی وہی کہیں جو ان کا حکم ہے۔وہ مولوی جی جیسے سچے کھرے بندے کے منہ میں اپنی جھوٹی،منحوس زبان رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔نہ یہ دین محمد کی بیٹی ہوتی نہ یہ سارا فساد ہوتا......''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔شاید مولوی فدا کو کسی بات پر مجبور کیا جارہا تھا اور ان کی مجبوری و بے بسی دیکھ کر ان کا جوشیلا شاگرد

طارق شعلہ جوالا بن گیا تھا۔

''کیا ہوا ہے مولوی فدا کے ساتھ؟''میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا ہے۔ تم کہتے ہو میں خدائی فوجدار بن کر آیا ہوں یہاں چاند گڑھی میں۔ تم کیسے خدائی فوجدار ہو۔ تمہیں پتا ہی نہیں کہ گاؤں کے سب سے نیک اور بھلے مانس بندے کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے اس پر۔''

کہنے کو تو وہ یہ بات کہہ گیا لیکن پھر اس کا رنگ ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ جیسے اسے احساس ہوا کہ وہ ضرورت سے زیادہ بول گیا ہے۔

بہرحال میں جو کچھ نوٹ کر چکا تھا اسے اب نظر انداز کر دینا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسی نکتے کو اپنی گفتگو کا محور بنا لیا۔ طارق پہلے تو شدید تذبذب اور اندیشوں کا شکار رہا مگر جب اس نے دیکھ لیا کہ کچھ بتائے بغیر اب اس کی جان چھوٹے گی نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں اس کی مدد کرنے کے وعدے سے بھی پھر جاؤں تو اس نے سخت رازداری کی شرط پر یہ انکشاف کیا کہ مولوی فدا کی نوعمر بیٹی ایک عجیب وغریب بیماری کا شکار ہو گئی ہے۔ مولوی صاحب نے اس کی بیماری کا چرچا تو نہیں کیا مگر وہ اتنے پریشان ہیں کہ لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

میرے استفسار پر اس نے بتایا۔''اس کا نام زینب ہے۔ مولوی صاحب کی پہلی بیوی سے ہے۔ اس کی عمر مشکل سے بارہ تیرہ سال ہو گی۔ زمیندار عالمگیر کی والدہ بہت نیک اور ہمدرد عورت ہے۔ اس کی نظر بہت کمزور ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ زینب کو اپنے گھر بلاتی تھی تاکہ وہ اس کے پوتے پوتیوں اور نواسوں وغیرہ کو قاعدہ پڑھائے پھر زینب عالمگیر کی بوڑھی والدہ کے چھوٹے موٹے کام بھی کرنے لگی۔ کبھی کبھی وہ ان کے گھر رات بھی رہ لیتی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ وہیں پر رہنے لگی مگر چار پانچ مہینے پہلے مولوی جی نے اس کا وہاں جانا ختم کروا دیا۔ وہ اب چھوٹی سی بچی تو نہیں رہی تھی۔ زینب چند ہی دن بعد ضد کرنے لگی کہ وہ واپس جائے گی۔ مولوی جی یہ بات نہیں مانے پھر ایک دن زینب کو سخت بخار ہوا اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگی۔ گاؤں کے کمپاؤنڈر سے بھی اسے دوا لا کر دی گئی۔ پر یہ مرض بڑھتا چلا گیا۔ بیٹھے بیٹھے ایک دم زینب کی حالت غیر ہو جاتی اور وہ گر کر تڑپنے لگتی۔ اس کے ماتھے پر گاڑھے پسینے آتے۔ پورا جسم لرزنا شروع ہو جاتا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ جب اسے عالمگیر کے گھر اس کی والدہ کے پاس بھیجا جاتا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی۔ لگتا تھا کہ اسے کوئی تکلیف ہے ہی نہیں۔

''کسی بڑے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا گیا اسے؟''میں نے طارق سے پوچھا اس کے ساتھ ہی میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سا انتہائی حساس وائس ریکارڈر آن کر دیا۔

''پچھلے مہینے مولوی جی بڑی خاموشی سے اسے گوجرانوالہ لے کر گئے تھے وہاں اس کے ایک دو ٹیسٹ ہوئے لیکن کچھ پتا نہیں چلا۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اسے لاہور لے جائیں شاید کچھ معلوم ہو سکے۔ وہ لاہور چلے گئے مگر وہاں کسی نے نہیں سنی۔'' طارق نے بتایا۔

''اب کیا پوزیشن ہے؟''میں نے پوچھا۔

طارق نے سرد آہ بھر کر کہا۔''ایک خیال یہ بھی ہے کہ شاید عالمگیر کے گھر والوں میں سے کسی نے بچی پر تعویز گنڈا کیا ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ واپس وہیں جانا چاہتی ہے لیکن عالمگیر کی والدہ پر تو اس قسم کا شک کسی صورت نہیں کیا جا سکتا۔ پورے علاقے میں ان جیسی نیک پرہیزگار عورتیں دو چار ہی ہوں گی۔ بڑے چھوٹے سب انہیں بڑی عزت سے وڈی اماں کہتے ہیں۔ پچھلے دنوں جب مولوی جی نے اس بات کا شک ظاہر کیا کہ شاید ان کی بچی پر کسی نے تعویز دھاگا کیا ہے تو عالمگیر سخت غصے میں آ گیا۔ اس نے مولوی جی کو فوراً اس کے گھر واپس بھیج دیا اور کہا کہ اب یہ ہمارے گھر نہ آئے لیکن تین چار دن بعد ہی اسے پھر عالمگیر کے گھر بھیجنا پڑا بلکہ مولوی جی بے چارے اسے خود چھوڑ کر آئے۔''

''وہ کیوں؟''

''وہی ہوا جو آپ کو بتایا ہے۔ اس بے چاری کی حالت بہت بگڑ گئی۔ چکر آنے لگے، پورا جسم کانپنے لگا اور کپڑے پسینے سے بھیگنے لگے پھر بے ہوشی میں بہکی بہکی باتیں کرنے لگی......''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ عالمگیر کے گھر جانے کے بعد ٹھیک ہو جاتی ہے؟''

''بالکل، ایسے لگتا ہے کہ اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں۔ بچوں کو پڑھاتی بھی ہے، وڈی اماں کے کام بھی کرتی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے مچھلی واپس پانی میں آ گئی ہو۔ یہ بات ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آ رہی۔''

''اس بات کا کس کس کو پتا ہے؟''میں نے پوچھا۔

''ابھی تک تو یہ بات صرف مولوی جی کے گھر میں ہے یا پھر عالمگیر اور اس کی بیوی کو پتا ہے یا ہو سکتا ہے کہ تھوڑا

بہت وڈی اماں کو بھی پتا ہو۔"

یہ طارق بڑی عجیب بات بتا رہا تھا۔ اگر یہ سب کچھ ایسے ہی تھا تو پھر قابلِ غور تھا۔ ایک نوعمر لڑکی نہ صرف خود مصیبت میں تھی بلکہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی مصیبت بنی ہوئی تھی۔ میں نے طارق سے پوچھا۔ "اس بارے میں تمہارا اپنا کیا خیال ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بچی زینب، عالمگیر کے گھر میں کسی کے ساتھ بہت اٹیچ ہوگئی ہو جیسے کہ وڈی اماں یا پھر کوئی اور...... کہیں ایسا معاملہ تو نہیں کہ عالمگیر نے اسے کسی جال میں پھنسالیا ہو۔ تم بچی کی عمر بارہ تیرہ سال بتارہے ہو، یہ بالکل کچا ذہن ہوتا ہے اور......"

"نہیں...... بالکل نہیں۔" طارق نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "عالمگیر درمیانی عمر کا سخت گیر بندہ ہے۔ اس کے ساتھ تو پتا نہیں اس کی بیوی کیسے گزارا کرتی ہوگی اور پھر زینب کا ذہن بھی ابھی ایسی باتیں سوچنے کے قابل نہیں ہے۔ بالکل اور طرح کی بچی ہے، دبلی پتلی سی۔"

طارق کو ڈھاٹے میں سے صرف میری آنکھیں ہی نظر آرہی تھیں۔ وہ بات کرتے ہوئے مسلسل میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا جیسے لاشعوری طور پر یہ جاننے کی کوشش کررہا ہو کہ میں کون ہوں؟

میں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "تم نے ابھی بتایا ہے کہ تاجور کا منگیتر اسحاق اور عالمگیر دونوں مولوی جی کو مجبور کررہے ہیں کہ وہ اپنی بولی چھوڑ کر ان کی زبان میں بات کریں اور ان کی ہاں میں ہاں ملائیں۔ تمہاری باتوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ زینب والا معاملہ ہی مولوی جی کی مجبوری ہے۔"

"بالکل ایسا ہی ہے۔" طارق نے کہا۔ "وہ خبیث عالمگیر اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ مولوی جی اپنی بچی کی وجہ سے بے بس ہیں اور اس سے اپنے تعلقات کسی صورت نہیں بگاڑ سکتے۔ وہ ان سے کہتا ہے کہ وہ تاجور اور ساتے کی شادی کی حمایت کریں۔ مولوی جی نے دو تین بار بچی کی نازک حالت دیکھی ہوئی ہے۔ وہ لاچار ہوگئے ہیں۔ ورنہ ان جیسا بندہ تو پیر ولایت کی باتوں پر سو بار لعنت بھیجے۔"

اچانک کسی قریبی کمرے میں آہٹ ہوئی پھر ایک آواز آئی، یہ طارق کی ادھیڑ عمر والدہ تھی جو شاید غنودگی میں بڑبڑائی تھی پھر وہ کھانسنے لگی۔

طارق بولا۔ "شاید وہ پانی مانگ رہی ہیں، اگر میں نہ گیا تو وہ خود اٹھ کر باہر آجائیں گی۔"

"تو ٹھیک ہے جاؤ مگر کسی طرح کا فتور اپنے دماغ میں نہ لانا۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہیں یا تمہارے گھر کے کسی بندے کو مجھ سے کوئی نقصان پہنچے۔ میں اس وقت یہاں تمہارے خیر خواہ کی حیثیت سے بیٹھا ہوں اور مجھے اسی حیثیت میں رہنے دینا۔"

وہ میری بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے تسلی دینے والے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔ پستول میری گود میں پڑا تھا۔ میں نے طارق کو اشارہ کیا، وہ والدہ کو دیکھنے کے لیے باہر چلا گیا۔ میں نے دروازہ تھوڑا سا کھلا رہنے دیا تاکہ گھر کے صحن اور برآمدے پر میری نظر رہے۔ ایک سرد تاریکی نے گھر کے درودیوار کو ڈھانپ رکھا تھا۔ کمرے میں چھوٹے لیمپ کی مدھم روشنی تھی۔ اس روشنی میں میری نظر ایک ادھ کھلی دراز کے اندر ایک موبائل فون پر پڑی۔ میں نے وہ نکال لیا۔ اس دور دراز علاقے میں جہاں سڑک اور بجلی، پانی جیسی بنیادی سہولتیں بھی میسر نہیں تھیں، موبائل فون موجود تھے۔ یہ بات ذرا حیران کن تھی۔

میں نے موبائل چیک... کیا فوراً پتا چل گیا کہ یہ طارق کا ہی تھا۔ کافی پرانا تھا۔ بمشکل ہزار پندرہ سو کا ہوگا لیکن کیمرا اور ایف ایم ریڈیو جیسی ایپلی کیشنز اس میں موجود تھیں۔ کونٹیکٹس میں دوستوں کے نام تھے۔ ان بکس میں دو درجن کے قریب میسج موجود تھے۔ ان میں بھی کوئی قابلِ اعتراض بات نظر نہیں آئی۔ بھیجے گئے پیغامات میں ایک پیغام طارق نے اپنے کسی وقاص نامی دوست کو بھیجا تھا، اس سے پتا چلتا تھا کہ طارق مولوی جی سے کتنی گہری عقیدت رکھتا ہے اور ان کو دکھی دیکھ کر کس طرح خود بھی دکھی ہو جاتا ہے۔ آٹھ دس دن پہلے طارق نے وقاص نامی دوست کو جو پیغام بھیجا تھا، وہ اس طرح تھا۔

"ہمارے مولوی جی کی مشکلوں کی ایک جڑ ہے...... کسی دن اس جڑ کو ہی اکھاڑ پھینکوں گا۔"

تو کیا اس نے تاجور کو ہی جڑ قرار دیا تھا اور پھر اس پر حملہ کیا تھا لیکن اس حملے میں تاجور کے بجائے نمبردارنی گھائل ہو گئی تھی۔

اچانک میری نظر ایک وڈیو کلپ پر پڑی اور میں حیران رہ گیا۔ یہ وڈیو کلپ یقیناً مولوی جی کی بچی زینب کا ہی تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا بچی کی حالت سرگودھا کے ایک معالج کو دکھانے کے لیے یہ کلپ مولوی جی نے ہی بنوایا تھا۔ زینب بارہ تیرہ سال کی دبلی پتلی لڑکی تھی، گوری چٹی تھی اور یقیناً نقوش بھی اچھے تھے مگر وہ کلپ کے اندر بری حالت میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کچی زمین پر گری ہوئی تھی اور سمٹ کر گٹھڑی سی بن گئی تھی۔ اس کا پورا جسم تھر تھر کانپ رہا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھی ہوئی تھیں اور پسینا دھاروں کی صورت چہرے اور گردن سے بہہ رہا تھا۔ مولوی جی اس کا سر دوپٹے سے ڈھانپنے اور اسے پانی پلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کے چہرے پر ایسا کرب تھا جسے لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بچی ان کے پاؤں کو ہاتھ لگا رہی تھی اور کچھ کہہ بھی رہی تھی۔ غالباً یہی کہہ رہی تھی کہ اسے وڈی اماں کے گھر واپس بھیج دیا جائے۔ کلپ میں آڈیو بھی موجود تھی مگر آوازیں صاف نہیں تھیں۔ بس کسی وقت مولوی جی کی دکھ بھری آواز ابھرتی تھی۔

"زینب...... ہوش کر میرا پتر...... زینب۔"

برآمدے کی طرف سے قدموں کی چاپ ابھری۔ طارق اپنی والدہ کو پانی پلا کر واپس آرہا تھا۔ میں نے موبائل فون جلدی سے واپس اس کی جگہ پر رکھ دیا اور طارق کی طرف سے چوکس ہو گیا۔

اب واقعات کی کئی کڑیاں مل گئی تھیں اور ایک چھوٹی سی کہانی مکمل ہو گئی تھی جو کچھ اس طرح سے تھی۔

"تاجور کے گرد گھیرا تنگ سے تنگ کیا جا رہا تھا۔ اسحاق ہر صورت اسے بیاہ کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ اس کا رابطہ پیر ولایت اور زمین دار عالمگیر جیسے کرپٹ لوگوں سے تھا۔ وہ سب مل کر تاجور اور اس کے گھر والوں کے گرد جال بُن رہے تھے۔ مولوی فدا ان چند لوگوں میں سے تھے جو اسحاق اور اس کے ساتھیوں کے خلاف آواز اٹھاتے تھے اور چاند گڑھی میں مولوی جی کی رائے کی بہت اہمیت تھی مگر اب وہ بھی اس گھیرے میں آگئے تھے۔ ان کی بچی کے ساتھ کوئی ایسا مسئلہ ہو گیا تھا کہ وہ زمیندار عالمگیر کے گھر میں رہنا چاہتی تھی اور اگر وہاں نہیں ہوتی تھی تو اس کی حالت غیر ہو جاتی تھی۔ عالمگیر وغیرہ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا رہے تھے اور مولوی صاحب کو اپنی مرضی کی زبان بولنے پر مجبور کر رہے تھے۔ مولوی صاحب کی بے بسی دیکھ کر ان کا جوشیلا شاگرد طارق کچھ اور انداز سے سوچنے لگا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس فساد کی جڑ تاجور ہے۔ چند دن پہلے اس نے جنون کے عالم میں تاجور پر حملہ کیا تھا مگر تاجور کے بجائے نمبردارنی نادرہ نشانہ بن گئی تھی۔

یہاں تک تو سب سمجھ میں آگیا مگر ایک نیا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ مولوی جی کی معصوم بچی کے ساتھ کیا معاملہ تھا۔ جادو ٹونے والی بات تو مجھ جیسے شخص کو کسی طور ہضم نہیں ہو سکتی

تھی۔ تو کیا پھر یہ کوئی جسمانی عارضہ تھا یا نفسیاتی معاملہ؟

طارق مسلسل میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ مری مری آواز میں کہنے لگا۔ ''آپ مولوی جی کے لیے کیا کر سکتے ہیں؟''

''جو بھی کر سکا۔'' میں نے کہا۔ ''بچی کی خاطر بلیک میل ہوتے رہنا مسئلے کا حل نہیں ہے۔ بچی کو علاج معالجے کے لیے شہر بھجوایا جا سکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، آپ جو بھی کرو لیکن میری ایک منت ہے، اس زینب والی بات کو آپ اپنے تک ہی رکھنا۔ یہ مولوی جی کے لیے بڑی بدنامی کی بات ہے اور ان کی بدنامی یا بے عزتی مجھ سے کسی طرح برداشت نہیں ہوتی۔''

''اگر مولوی جی کی عزت کا اتنا ہی خیال تھا تو پھر ایسی حرکت کیوں کی؟ دین محمد کی بیٹی تاجور کا کیا گناہ تھا کہ اسے مارنے کے لیے چڑھ دوڑے۔ وہ تو خود ظلم سہہ رہی ہے۔ اس کا پورا گھر سہہ رہا ہے۔ اس کے لیے تمہیں شرم آنی چاہیے تھی۔''

وہ روہانسی آواز میں بولا۔ ''میں کیا کرتا...... میں نے ایک رات پہلے مولوی جی کو حجرے میں ہچکیوں سے روتے دیکھا اور غم کی وجہ سے کچھ بھی میرے بس میں نہ رہا پھر بھی میں کسی کو جان سے مارنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا......''

''بس شکل بگاڑ دینا چاہتے تھے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کے کان سرخ ہو رہے تھے۔ پتا نہیں یہ شرم کی سرخی تھی یا غصے کی۔

اتنے میں ایک بار پھر قریبی کمرے سے اس کی والدہ کے بڑبڑانے کی آواز آئی۔ اب وہ شاید کچھ اور مانگ رہی تھی۔ میری توجہ بس ایک سیکنڈ کے لیے اس آواز کی طرف گئی تھی کہ پھرتیلے طارق نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا، وہ لپک کر میری طرف آیا۔ وہ میری گود میں رکھا ہوا پستول پکڑنا چاہتا تھا۔ اس نے بہت تیزی دکھائی تھی پھر بھی یہ کم تھی۔

میں نے تڑپ کر اپنا گھٹنا اوپر اٹھایا۔ طارق کا آگے کو جھپٹتا ہوا جسم میرے گھٹنے سے ٹکرایا، وہ پہلو کے بل گرا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پیچ کس آ گیا۔ اس نے مجھے زخمی کرنے کے لیے بے دریغ وار کیا۔ پیچ کس میرے کندھے کو چھوتا ہوا نکل گیا۔ اپنی جھونک میں وہ خود ہی کرسی سے ٹکرا کر پشت کے بل گرا۔ میں نے پلٹ کر اسے چھاپ لیا۔ پیچ کس والا ہاتھ میری گرفت میں تھا۔ وہ سینے کی پوری قوت سے چلانے لگا اور اس کے ساتھ ساتھ میرے چہرے سے ڈھاٹا نوچنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ میری شکل دیکھنا چاہ رہا تھا لیکن اسی دوران میں اس کی ٹانگ لگنے سے لیمپ گر کر چکنا چور ہو گیا اور کمرے میں تاریکی چھا گئی۔ میرا ایک بھرپور مکا کھا کر وہ صحن میں گرا۔ تاہم دوبارہ میری طرف آنے کے بجائے وہ مٹی کی سیڑھیوں کی طرف لپک گیا۔ میں نے بھی اس کے پیچھے جانا ضروری نہیں سمجھا اور کمرے کا بیرونی دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ طارق کا واویلا سن کر گھر والے جاگ گئے تھے اور اب شاید اس کے چھوٹے بھائی کے پکارنے کی آواز آ رہی تھی۔

''بھائی جان! کہاں ہو؟''

بھائی جان شاید چھت پر پہنچ گیا تھا اور ہو سکتا ہے کہ گلی کی طرف کود گیا ہو۔ میں ایک قریبی گلی سے گزر کر کھیتوں میں داخل ہو گیا اور مکئی کے اونچے پودوں میں اندر ہی اندر چلتا ہوا گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھنے لگا۔ میں نے گرم چادر کو ایک بڑی بکل کی طرح لپیٹ رکھا تھا۔ اس بکل میں سے صرف میرے پاؤں ہی دکھائی دیتے تھے۔ دیکھنے والے کے لیے میں ایک چادر پوش دیہاتی ہی تھا۔

☆☆☆

رات کو میں نے اپنے جدید وائس ریکارڈر پر طارق وارثی کا اعترافی بیان ریکارڈ کر لیا تھا۔ واپس آ کر یہ بیان میں نے انیق کو بھی سنایا۔ آواز واضح تھی اور صاف پہچانی جاتی تھی۔ یہ طارق کے خلاف ایک زبردست ثبوت بن سکتی تھی مگر اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ صبح سویرے پہلوان حشمت کی زبانی ایک سنسنی خیز خبر مل گئی۔ حشمت پہلوان نے بتایا۔ ''کل رات بہت بڑا دھماکا ہوا ہے، پولیس والے بھی اش اش کر اٹھے ہیں۔''

''دھماکے پر اش اش؟'' انیق نے حیرانی سے پوچھا۔

''ارے نامعقول دھماکے سے مطلب یہ ہے کہ یہ دھماکا میں نے کیا ہے۔ سمجھو کہ ایک بھاگتے مجرم کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کیا ہے۔ ویسے وہ بندہ تھا تو مولوی جی کا لیکن جب جرم کیا ہے تو پھر بھگتنا تو پڑے گا ہی نا۔''

انیق اور حق نواز کے پوچھنے پر پہلوان نے اپنے انداز میں جو تفصیل بتائی وہ کچھ یوں تھی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے کے قریب پہلوان جی نے گنے کا کافی سارا رس پیا اور ساڑھے بارہ بجے کے قریب حاجت کے لیے کھیتوں

کی طرف چل پڑے۔ ابھی وہ کھیتوں میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ بھاگو پکڑو کی آوازیں آئیں۔ ٹارچوں کی روشنی بھی چمک رہی تھی، یہ پولیس والے تھے۔ کوئی ان کے آگے آگے بھاگ رہا تھا۔ پہلوان جی نے ہمت کی اور آگے بڑھ کر اس بندے کو بازوؤں میں جکڑ لیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی بڑی کوشش کی مگر پہلوان جی کے جن جپھے سے خود کو چھڑانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہ دونوں کانٹے دار جھاڑیوں میں گرے۔ اسی دوران میں پولیس والے بھی پہنچ گئے اور انہوں نے بھاگنے والے کو گرفت میں لے لیا۔ بعد میں پتا چلا کہ یہ تو مولوی فدا کا پرانا شاگرد طارق وارثی ہے۔ طارق بھاگتا ہوا جارہا تھا کہ پولیس والوں نے اسے روکا۔ اس نے ایک پولیس والے کی ران میں پیچ کس مار کر اسے زخمی کردیا اور دوڑ لگا دی۔ اس کے بعد اسے پہلوان حشمت نے جکڑ لیا۔ پھر پولیس والے اسے تھانے لے گئے۔

کانٹے دار جھاڑیوں میں گرنے سے پہلوان حشمت کی پیٹھ پر دو تین کانٹے چبھے تھے اور گہری خراشیں آئی تھیں۔ اسے خراشوں کی تکلیف تو تھی ہی مگر اس سے زیادہ تکلیف یہ تھی کہ خراشیں نامناسب جگہ پر آئی تھیں۔ وہ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتا تھا۔

اس نے ذرا مسکرا کر فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”کبھی کبھی تو ہمارے کو لگت ہے کہ اردو کی اکثر کہاوتیں ایک دم غلط ہیں۔ کہتے ہیں کہ بہادر کو سینے پر زخم آوت ہے۔ اب دیکھو بھائی، ہم نے بہادری دکھائی اور زخم بھی پیٹھ پر آیا۔“

”آپ مزیدار باتیں کرتے ہیں۔“ انیق نے اس کی تعریف کی۔

”تمہاری اردو اتنی اچھی ناہیں ہے۔“ پہلوان حشمت نے کہا۔ ”مزے کا لفظ کھانے پینے کے لیے استعمال ہووت ہے۔ یہاں تو زخم کی بات ہے۔“

”آپ نے بھی زخم کھایا ہی ہے نا۔“ انیق نے ترت جواب دیا۔

”زبان تمہاری بھی کافی چلت ہے بہرحال رات کو جو کچھ ہوا وہ کافی پریشان کرنے والا ہے۔ یہ بات بالکل سمجھ میں ناہیں آرہی کہ طارق کو بھاگنے اور پھر پولیس والے کو زخمی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو وہی بات ہوگئی نا کہ آبیل مجھے مار... آبیل بل کرکریں آہ وزاریاں۔“

محاورے کی بے حرمتی پر انیق سر کھجا کر رہ گیا۔

پہلوان مسلسل گفتگو جاری رکھے ہوئے تھے اور میرا ذہن صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ یہ کوئی ایسی پیچیدہ گتھی نہیں تھی۔ رات کو میں نے طارق کو دھمکایا تھا کہ پولیس سارے معاملے سے باخبر ہوچکی ہے اور ہوسکتا ہے کہ ایک آدھ گھنٹے میں وہ لوگ اسے گرفتار کرنے یہاں پہنچ جائیں۔ اسی ڈر سے طارق میرے ہاتھوں سے نکل کر بھاگا تھا۔ شومیِ قسمت اس نے راستے میں پولیس کو دیکھ لیا۔ پولیس نے اسے روکنا چاہا تو وہ مزید ڈر گیا اور ان سے بچ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں اس کے ہاتھوں ایک پولیس کانسٹیبل زخمی ہوگیا۔ پولیس نے اس کا پیچھا کیا اور پہلوان حشمت کے تعاون سے پکڑ لیا۔ اب عین ممکن ہے کہ پکڑے جانے کی گھبراہٹ میں طارق نے پولیس کو کچھ نہ کچھ بتا بھی دیا ہو۔

میرا یہ اندازہ تقریباً ایک گھنٹے بعد بالکل درست ثابت ہوگیا۔ طارق نے یہی سمجھا تھا کہ اس کا راز فاش ہوچکا ہے اور میرے بیان کے مطابق زخمی نمبردارنی نے پولیس کو اس کا حلیہ بتادیا ہے۔ اس نے تھانے میں اس بات کا اعتراف کرلیا کہ دین محمد کے گھر میں گھس کر حملہ کرنے والا وہی تھا۔

یہ ساری صورتِ حال بے شک مولوی فدا اور طارق کے لیے پریشان کن تھی مگر اس میں تاجور اور اس کے گھر والوں کے لیے اطمینان کا پہلو موجود تھا۔ تاجور یا دین محمد کی گرفتاری کا خطرہ بھی ٹل گیا تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ ختم ہی ہوگیا تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ سہ پہر کے وقت میں نے ایک دیہاتی تانگے کو چاند گڑھی کی طرف آتے دیکھا۔ یہ وہی تانگہ تھا جس پر دو دن پہلے تاجور اور دین محمد چاند گڑھی سے باہر گئے تھے۔ وہ اب واپس آرہے تھے۔ میں اس وقت ایک کھیت میں ٹریکٹر چلا رہا تھا۔ میں نے دور سے تاجور کو دیکھا۔ بس ایک جھلک ہی دکھائی دی۔ سنہری دھوپ میں اس کا رنگ تازہ گلاب کی طرح دہک رہا تھا۔ ایک بار پھر میرے ذہن میں یہ سوال پوری شدت سے ابھرا کہ جس طرح میں نے اسے پہچانا ہے، وہ مجھے کیوں نہیں پہچان سکی۔ کیا تین چار سال پہلے کے وہ سارے مناظر اس کے ذہن سے محو ہوچکے ہیں۔ کیا میرا نام، میری آواز، وہ سب بھول چکی ہے؟

شام تک سونگی تھانے سے واپس آگیا۔ دو تین دن میں ہی وہ برسوں کا بیمار نظر آنے لگا تھا۔ اس کے پاؤں کے تلوے پولیس کی مار سے سوجے ہوئے تھے اور وہ بمشکل چل پار ہا تھا۔ بہرحال اس کے لیے یہ بھی خوشی کی بات تھی

کہ اس کی جان چھوٹ گئی تھی۔ تھانے دار سجاد تو ان لوگوں کے نزدیک زمینی خدا تھا۔ چاہے تو معمولی سی غلطی پر کسی کو پھانسی کے پھندے تک پہنچا سکتا تھا۔ اسی طرح پٹواری، تحصیل دار، چودھری وغیرہ ان لوگوں کے ساتھ جو چاہے سلوک کر سکتے تھے۔ مزید ستم یہ تھا کہ یہ لوگ احتجاج کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ سونگی کی جیتی جاگتی مثال میرے سامنے تھی۔

اگلے روز بارہ بجے کے لگ بھگ میں کام سے فارغ ہو کر کھیت کے کنارے بیٹھ گیا اور اردگرد کے مناظر دیکھنے لگا۔ ٹھنڈی ہوا نے سنہری دھوپ کے ساتھ مل کر عجیب سماں باندھ رکھا تھا۔ کھیتوں کے ہرے سمندر لہریں لے رہے تھے اور پرندوں کی ڈاریں گہرے نیلے آسمان پر دائرے بناتی تھیں۔ مٹی کی کھالوں میں پانی کی کل کل، رہٹ کی آواز، مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں اور کسی تندور سے اٹھنے والی گرم روٹی کی بھینی بھینی خوشبو، یہ سب کچھ جنت نشان تھا۔ میں ان مناظر میں جیسے ڈوب سا گیا۔ تو یہ تھا میرا اصل پاکستان۔ یہ تھا میرا وہ بچھڑا دیس جس کی باتیں والد صاحب اور دادا جی کیا کرتے تھے۔ ہاں...... یہی تھی وہ سنہری مٹی جس سے البیلی کہانیوں کا خمیر اٹھتا تھا۔ یہی تھی وہ دھرتی جس کے لیے شاعروں نے گیت لکھے تھے اور مصوروں نے شاہکار بنائے تھے۔

ایک تتلی میرے سر پر منڈلاتی ہوئی خودرو پھولوں کی طرف چلی گئی اور پتا نہیں کیوں ایک دم تاجور مجھے بہت شدت سے یاد آئی۔ وہ میرے آس پاس ہونے کے باوجود مجھ سے بہت دور تھی۔ پتا نہیں کن دیواروں میں چھپی ہوئی تھی۔ میرا دل اس کے لیے جیسے بے کل ہو گیا۔ کبھی کبھی کسی کو شدت سے یاد کیا جائے تو وہ سامنے بھی آ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی اس روز بھی ہوا۔ ایک خوشگوار اتفاق نے نہ صرف مجھے تاجور کے گھر پہنچایا بلکہ اس سے باتیں کرنے کا موقع بھی مل گیا حالانکہ بعد میں معلوم ہو گیا کہ وہ اتفاق نہیں تھا۔

میں کھیت کی منڈیر پر بیٹھا تھا جب ملازم حق نواز تیز قدم اٹھاتا میری طرف آیا۔ اس نے اشاروں کنائیوں سے بتایا کہ مجھے دین محمد کے گھر میں بلایا جا رہا ہے اور غالباً تاجور بلا رہی ہے۔ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ میں فوراً شلوار قمیص جھاڑ کر اور رومال کندھے پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے سیدھا گھر میں لے گیا۔ ایک چھوٹے زمیندار کا یہ صاف ستھرا گھر تھا۔ بڑی اچھی لیپا پوتی کی گئی تھی اور ہر چیز اپنی جگہ سلیقے سے رکھی نظر آتی تھی۔ دین محمد صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تاجور کے دونوں بھائی بھی اسکول میں ہیں۔ صرف اس کی والدہ کسی کمرے میں چارپائی پر لیٹی تھیں۔ حق نواز مجھے ایک چھوٹے سے واٹر پمپ کے پاس لے آیا۔ گاؤں میں کبھی کبھار بجلی شکل ضرور دکھاتی تھی۔ ایسے مبارک موقعوں کے لیے دو چار گھروں نے بورنگ کروا کر یہ واٹر پمپس لگا رکھے تھے۔ حق نواز نے اشاروں میں مجھے بتایا کہ پمپ خراب ہے اور میں اسے ٹھیک کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے زوروشور سے اثبات میں سر ہلایا۔ تاجور اندر سے ہتھوڑی، اسکریو رینچ اور اسکریو ڈرائیو وغیرہ لے آئی۔ میں موٹر کو چیک کرنے میں مصروف ہو گیا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کا پاور والا تار اندر سے نکلا ہوا ہے۔ بہرحال میں یونہی ٹھوکا ٹھاکی کرتا رہا۔ حق نواز جا چکا تھا۔ تاجور میرے قریب ہی کھڑی تھی۔ گھر میں سکوت تھا۔ وہ ہولے سے بولی۔

''آپ ٹھیک ہیں ناں؟''

''ہاں، بہت اچھا وقت گزر رہا ہے۔''

تاجور نے ذرا سنجیدگی سے کہا۔ ''وقت تو گزرتا ہی جا رہا ہے لیکن ہمیں جلد کچھ کرنا پڑے گا۔''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''دو تین دن پہلے تو یہ ڈر پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں مجھ پر اور اباجی پر پرچہ ہی نہ ہو جائے۔ پر اب اللہ بھلا کرے چھوٹے تھانے دار کا۔ اس نے مولوی فدا کے لڑکے طارق کو پکڑ لیا ہے۔ اس نے قبول کر لیا ہے کہ ہمارے گھر میں گھسنے والا وہی تھا۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ وہ چھوٹے تھانے دار کو دعائیں دے رہی تھی حالانکہ جان جوکھم میں ڈال کر طارق کا کھرا دبانے والا میں ہی تھا۔

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''پہلے صرف شک تھا اب پکا یقین ہو گیا ہے کہ مولوی فدا نے بھی ساتے اور پیر ولایت سے یاری جوڑی ہوئی ہے۔''

''کئی دفعہ جو نظر آتا ہے وہ ہوتا نہیں تاجور۔ ہو سکتا ہے کہ مولوی فدا قصوروار نہ ہوں۔''

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ ''کیا...... آپ ملے ہیں مولوی فدا سے؟''

''یہی کچھ لو...... مجھے کافی باتیں معلوم ہوئی ہیں اور مجھے لگتا ہے کہ میں بہت جلد تمہیں کوئی اچھی خبر دے سکوں گا لیکن مجھے تم سے ایک دو بہت ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔ کیا کسی طرح تم مجھے گھر سے باہر کہیں مل سکتی ہو...... میرا

مطلب ہے کہ پندرہ بیس منٹ ہم تسلی سے بات کرسکیں۔''

''آ...... آپ...... یہیں کرلیں۔'' اس نے کہا۔

میں نے چور نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ دونوں ریشمی لٹیں حسبِ معمول چہرے پر ڈھلک آئی تھیں اور جیسے ایک خوب صورت تصویر مکمل ہوگئی تھی۔ دیوار کے ساتھ کھڑی وہ کسی فرانسیسی مصور کا شہ پارہ لگتی تھی۔ دل موہ لینے والے نقوش، پُرکشش و سادہ، موم کا مجسمہ جس میں سرخی کی جھلک تھی اور جھیل سی شفاف آنکھیں جن کے اندر فنا ہوجانے کو دل چاہتا تھا۔ اور یہ تھا میرا پاکستان اور یہاں کے حسین لوگ۔ یہ قیمتی کاسمیٹکس اور ریشم وکم خواب کے بغیر بھی حسین تھے۔ مٹی سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں اور بوسیدہ کپڑوں کے اندر سے بھی ان کی خوب صورتی لشکارے مارتی تھی۔ مقابلۂ حسن منعقد کرکے عالمی حسیناؤں کا انتخاب کرنے والے مجھے ملتے تو میں انہیں کہتا کہ ''آؤ دیکھو چاند گڑھی کے اس گھر میں کچی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑی اس لڑکی پر نظر ڈالے بغیر تمہارے انتخاب کی کوئی حیثیت نہیں۔ میں انہی خیالوں میں گم تھا کہ تاجور کی کھنک دار آواز نے مجھے چونکا دیا۔ وہ اپنی بات دہراتے ہوئے بولی۔

''ہاں ہاں کرلیں۔''

''لیکن...... مجھے یہ جگہ مناسب نہیں لگ رہی۔'' ابھی میری بات منہ میں ہی تھی کہ میرا کہا درست ثابت ہوگیا۔ باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔ وہ کسی ہرنی کی طرح بدکی، پھر سنبھل کر بولی۔ ''میرا خیال ہے کہ کاکا اور چھوٹو آگئے ہیں۔''

اس نے جا کر دروازہ کھولا۔ تاجور کے دونوں بھائی گلے میں بستے لٹکائے اندر آگئے۔ وہ تاجور ہی کی طرح سرخ وسپید اور خوش شکل تھے۔ ایک بار پہلے بھی مجھے مل چکے تھے۔ میرا ''گونگا'' ہونا ان کے لیے دلچسپی کا باعث تھا۔

''یہ کیا کرنے آیا ہے؟'' بڑے بھائی کاکے نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

تاجور نے اسے ٹوکا۔ ''تمیز سے بات کرتے ہیں۔ یہ بڑے ہیں۔ موٹر خراب تھی اسے ٹھیک کرنے آئے ہیں۔''

''لگتا ہے یہ بڑے کاریگر ہیں۔ ہر چیز ٹھیک کرلیتے ہیں۔'' کاکے نے کہا۔

''ہاں، سیانے لوگ کہتے ہیں نا کہ اللہ کسی بندے کو کوئی چیز کم دیتا ہے تو کچھ زیادہ بھی دیتا ہے۔ اب دیکھ لو یہ بول نہیں سکتے مگر کاریگر کتنے اچھے ہیں۔''

دونوں بچے مجھے موٹر ٹھیک کرتے دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ چھوٹا بھائی بولا۔ ''ابا جی کہتے تھے گونگوں میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ کیا ان میں بھی بہت طاقت ہے؟''

تاجور ہولے سے مسکرائی۔ ''طاقت کا تو پتا نہیں لیکن ہمت ہے۔ دوسروں کی مدد کرتے ہیں۔ اللہ کرے یہ ہماری بھی مدد کرسکیں۔''

''یعنی ہمارے ٹریکٹر کو ٹھیک ٹھاک کردیں۔'' چھوٹے نے خیال آرائی کی۔

''ہاں۔'' تاجور نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر کچھ سوچ کر بولی۔ ''ابھی یہ اشاروں میں مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں ڈیرے پر آکر دیکھوں کہ انہوں نے ٹریکٹر کو کتنا فسٹ کلاس کردیا ہے۔ میں آج تو نہیں آسکوں گی۔ عید کی تیاری کرنی ہے۔ ہاں کل شام کو چکر لگاؤں گی۔''

تاجور نے باتوں باتوں میں مجھے سمجھایا تھا کہ وہ کل مجھ سے ملنے کی کوشش کرے گی۔

کاکے نے نکتہ اٹھایا۔ ''باجی! یہ گونگے بھائی عید کرنے اپنے گھر نہیں جائیں گے؟''

''پتا نہیں...... تم خود پوچھ لو۔'' وہ بولی۔

کاکے نے اشاروں کنائیوں میں اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کی۔ اس نے عید کی نماز کا اشارہ دیا، پھر بکرا قربان کرنے کا اشارہ دیا اور اسی طرح دیگر اشاروں کے ذریعے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں اپنے گھر نہیں جاؤں گا؟ میں نے بھی اشاروں کی زبان استعمال کی اور نفی میں جواب دیا۔

موٹر کا مسئلہ معمولی سا تھا اور مجھے شک ہوا کہ یہ مسئلہ بھی تاجور نے خود پیدا کیا تھا تاکہ وہ مجھے یہاں بلا کر مجھ سے بات کرسکے۔ میں نے ایک ڈھکن کے پیچ کھولنے کے بعد پاور والا تار تھوڑا سا چھیل کر جوڑ دیا۔ اب بجلی آنے پر موٹر چلائی جاسکتی تھی۔

اسی دوران میں تاجور اندر گئی اور ایک پلیٹ میں کھیر لے آئی۔ اس نے کھیر میرے پاس ہی ایک تپائی پر رکھ دی، اور کہا کہ میں کھالوں۔ میں تکلف کے انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔ چھوٹو نے معصومیت سے کہا۔ ''گونگے بھائی، کھالیں باجی نے خود اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے۔''

اس کے ہاتھ سے تو میں زہر بھی کھا سکتا تھا، یہ تو کھیر تھی۔ چاول، دودھ اور چینی کی بنی ہوئی اس سادہ سی سویٹ ڈش نے فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ''ڈیزرٹس'' سے بڑھ کر مزہ دیا۔ اسی دوران میں صحن میں بندھے ہوئے ایک دنبے نے عقب سے میری قمیص چبانی شروع کردی۔ تاجور نے لپک

کر اس سے قمیص چھڑائی، اس دوران میں اس کا جسم مجھ سے ٹکرایا۔ میری رگوں میں چنگاریاں سی پھوٹ گئیں۔ دبے نے قمیص چھوڑنے کے بعد تاجور کو ٹکر مارنے کی کوشش کی۔ وہ الھڑ انداز میں چلا کر تیزی سے ایک چارپائی پر چڑھ گئی۔ بچے ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے لگے۔

کچھ دیر بعد میں اشاروں کنائیوں میں تاجور اور دونوں بچوں سے اجازت لے کر واپس لوٹ آیا۔ بچے مجھے دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میں باہر نکل کر ڈیرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ دل میں ایک میٹھی میٹھی سی لہر تھی۔ آج میں نے تاجور کو پھر قریب سے دیکھا تھا۔ اس کے بدن کی انوکھی مہک محسوس کی تھی، بلکہ اس کے بدن کو بھی محسوس کیا تھا۔ وہ بدن...... وہ سراپا جو اپنے اندر ایک ناقابلِ بیان کشش رکھتا تھا۔ میں اس کشش کو کوئی نام نہیں دے پا رہا تھا اور آج اس نے مجھ سے ملنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ بے شک یہ وعدہ سنجیدہ نوعیت کا تھا اور کام کے سلسلے میں تھا لیکن وعدہ تو تھا۔

یہ بقر عید کے دن تھے۔ دیگر جگہوں کی طرح چاند گڑھی میں بھی عید کی گہما گہمی تھی۔ بچے قربانی کے جانوروں کی رسیاں پکڑے انہیں چہل قدمی کراتے نظر آتے تھے۔ سائیکل سوار پٹھان چھریاں چاقو تیز کر رہے تھے۔ لوگ قریبی قصبے کے بازار سے کپڑوں، جوتوں وغیرہ کی خریداری کر کے واپس آ رہے تھے۔ چودھری کی حویلی میں عید کے روز معزز لوگوں کی دعوت کا اہتمام تھا۔ عید پر اس طرح کی مصروفیت میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ ورنہ کوپن ہیگن میں تو عید کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ دفاتر میں چھٹی تک نہیں ہوتی تھی۔ قربانی کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ کبھی تو عید والے دن پتا چلتا تھا کہ آج عید ہے۔

عیدگاہ میں بڑے اہتمام سے عید کی نماز ہوئی۔ تاجور کے گھر سے باداموں اور کشمش وغیرہ سے سجا ہوا زردہ آیا۔ کچھ دیر بعد ایک رکابی میں بھنی ہوئی کلیجی آئی۔ پھر سہ پہر کے وقت ہم سب نے ڈیرے پر کھانا کھایا۔ قربانی کے گوشت کا یہ پُرتکلف کھانا تھا اور حق نواز کی بیوی نے بڑے چاؤ سے بنایا تھا۔ درختوں کے نیچے ایک بڑی دری بچھائی گئی۔ بھنا ہوا گوشت، ساتھ میں تندوری روٹیاں اور نمکین لسی۔ حق نواز کی بیوی نے چاند گڑھی کی دیگر عورتوں کی طرح زرق برق کپڑے پہن رکھے تھے اور چوڑیاں چھنکاتی پھر رہی تھی۔ وہ پینتیس چالیس سال کی تھی لیکن کام کاج کے سلسلے میں اس کے اندر جوان لڑکیوں جیسی ہمت تھی۔ اخلاق کی بھی اچھی تھی۔ کھانے کے بعد ہم سب لوگ باغ کی طرف چلے گئے۔ یہاں ایک کھیت میں کبڈی کا بہت بڑا میچ تھا۔ عورتیں، بچے، بڑے چھوٹے سب موجود تھے۔ عورتیں اور بچے درختوں کے نیچے موجود تھے۔ میری نگاہ بار بار اس طرف اٹھتی تھی۔

بے شک عید کی گہما گہمی مجھے اچھی لگ رہی تھی لیکن اس کے ساتھ ایک عجیب سی بے چینی نے بھی گھیرا ہوا تھا۔ آج شام کو تاجور نے ملنے کا وعدہ کیا تھا۔ پتا نہیں اسے کب آنا تھا اور آنا بھی تھا یا نہیں؟ کبڈی کے میچ کے دوران میں بھی میری نگاہ مسلسل اسے ڈھونڈتی رہی لیکن وہ کہیں دکھائی نہیں دی۔ ہاں اس کے دونوں چھوٹے بھائی نظر آئے۔ لیکن وہ دونوں بھی دوسرے بچوں سے الگ تھلگ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں یہاں پہلے دن سے ہی یہ دیکھ رہا تھا کہ گاؤں والوں نے دین محمد اور اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ شدید سرد مہری اختیار کر رکھی ہے۔ اس کی وجہ یقیناً پیر ولایت اور مولوی فدا کے بیانات ہی تھے۔ مولوی فدا کے بارے میں تو اب مجھے کافی معلومات حاصل ہو چکی تھیں لیکن پیر ولایت کو ابھی میں نے بس دور ہی سے دیکھا تھا۔ اس کا کردار ابھی اندھیرے میں تھا۔

جوں جوں شام گہری ہوتی گئی، میری بے چینی بڑھتی گئی۔ ڈیرے کے کمرے میں بس میں اور انیق تھے۔ پولیس کی مار کھانے کے بعد سونگی کو چند دن آرام کی ضرورت تھی۔ اس لیے وہ قصبے میں اپنے کسی عزیز کے پاس چلا گیا تھا۔ میں اور انیق مسلسل سوچ رہے تھے کہ کیا اس دن کی طرح تاجور پھر یہاں آنے کی ہمت کرے گی؟

انیق کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اچانک وہ بول اٹھا۔ ''لو جی...... وہ آ گئی ہے۔''

میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ میں نے انیق کی نظر کا تعاقب کیا۔ وہ آ رہی تھی لیکن اکیلی نہیں تھی۔ ایک اور لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی۔ یہ غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ بہرحال میں نے انیق سے کہا کہ وہ پروگرام کے مطابق باہر چلا جائے۔ تھوڑی دیر بعد چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دی۔ پھر تاجور کی آواز سنائی دی۔

''انیق...... تم اندر ہی ہو؟''

تاجور نے دروازے سے جھانکا اور پھر اپنی ساتھی سمیت اندر آ گئی۔ یہ دوسری لڑکی گھر کی ملازمہ نوری تھی۔ اس کے ہاتھ میں مسالا پیسنے والی بجلی کی مشین تھی۔ تاجور نے اشاروں میں مجھے بتایا کہ مشین خراب ہو گئی ہے۔ اس کی فوری ضرورت ہے کیونکہ کل گھر میں دعوت ہے۔

میں سمجھ گیا کہ کل دوپہر جس طرح تاجور نے واٹر پمپ کی موٹر کی خرابی کا بہانہ بنایا تھا۔ آج اس گرائینڈر مشین کو بہانہ بنایا ہے لیکن تھوڑا سا غصہ بھی آیا۔ وہ ملازمہ لڑکی کو ساتھ لے آئی تھی۔ اس کی موجودگی میں بھلا کیا بات ہو سکتی تھی لیکن جس وقت میں لالٹین کی روشنی میں گرائینڈر مشین کو دیکھ رہا تھا تاجور نے لڑکی کا حل بھی نکال لیا۔ اس نے ملازمہ سے کہا۔ ”ہو ہائے نوری، مشین کا جگ تو ہم بھول ہی آئے۔ جاوہ بھی لے آ۔ اس کی نیچے والی پھرکی گھوم جاتی ہے۔“

”اچھا باجی۔“ نوری نے کہا۔

”باورچی خانے میں یا ساتھ والے کمرے میں پڑا ہوگا۔ جہاں بھی ہے ڈھونڈ کے لے آ۔“

وہ ”جی اچھا“ کہتی ہوئی باہر نکل گئی۔ تاجور نے میری طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ”اب پانچ دس منٹ تو لگ ہی جاتے ہیں اس کو۔ ہم بات کر سکتے ہیں۔“

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک عید کے جھلملاتے لباس میں تھی۔ گورے ہاتھوں پر مہندی اور کلائیوں میں ست رنگی چوڑیاں تھیں۔ ایک گلابی شال نے اس کے بالائی جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ وہ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی بول اٹھی۔ ”آپ کو کچھ پتا چلا ہے کہ مولوی فدا کے لڑکے طارق نے تھانے میں کیا بیان دیا ہے؟“

”تم نے بتایا تو تھا، اس نے مان لیا ہے کہ تمہارے گھر گھس کر نمبردارنی کو زخمی کرنے والا وہی تھا۔“

”لیکن یہ پوری بات نہیں ہے۔“ تاجور نے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ”طارق نے کہا ہے کہ اس نے نمبردارنی پر نہیں، مجھ پر حملہ کیا تھا پر غلطی سے نمبردارنی زخمی ہو گئی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ گاؤں میں جو بھی فساد ہے میری وجہ سے ہے۔ میں چاند گڑھی کے لیے مصیبت بنی ہوئی ہوں۔ اب بتائیں آپ، یہ کوئی کرنے والی باتیں ہیں۔ میں تو خود سخت مصیبتوں میں ہوں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں یہاں کس طرح مجھے اور میرے گھر والوں کو بے بس کیا جارہا ہے۔ ہمارا حقہ پانی بند ہو گیا ہے، ہمیں منحوس کہا جارہا ہے اور اب ایسا کہنے والوں میں وہ مولوی فدا بھی شامل ہو گیا ہے۔“

”تاجور! میں نے تمہیں کہا تھا نا کہ بعض دفعہ حقیقت وہ نہیں ہوتی جو نظر آرہی ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ جب تمہیں مولوی صاحب کے بارے میں ساری حقیقت معلوم ہو جائے گی تو تمہاری رائے ان کے بارے میں بدل جائے گی۔“

”کیا ہے حقیقت؟“ وہ ذرا اٹک کر بولی۔

”میں کافی کچھ جان چکا ہوں، لیکن ابھی کچھ جاننا باقی بھی ہے۔ تمہیں بس تھوڑا سا انتظار اور کرنا پڑے گا۔“

اس کے چہرے پر شدید الجھن کے آثار نظر آئے۔ وہ شپٹائے لہجے میں بولی۔ ”میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا کہ گاؤں میں کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے۔ کوئی کالی پگڑی والا بھی ہے، جو پہلے وکرم اور رام پیاری کے گھر میں نظر آیا پھر طارق کے گھر میں بھی پہنچا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ وہ کوئی پولیس والا ہی ہے جو بھیس بدل کر لوگوں کی ٹوہ لیتا ہے...... کچھ کا خیال ہے کہ......“

ابھی تاجور کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ہم دونوں کو بُری طرح چونکنا پڑا، کھیتوں کے دوسری طرف سرپٹ دوڑتے گھوڑوں کی آواز آئی۔ کچھ للکارے سنائی دیے، پھر لوگوں کے چلانے کی صدائیں ابھرنے لگیں۔ تاجور اور میں نے ایک ساتھ کھڑکی میں سے دیکھا۔ یہ دو چار نہیں درجنوں گھڑ سوار تھے اور غالباً مسلح بھی تھے۔ کچھ کے ہاتھوں میں ٹارچیں دکھائی دے رہی تھیں۔ ”ہائے میں مر گئی۔“ تاجور نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ”یہ تو سیالکوٹی کے لوگ لگتے ہیں۔“ تاجور کی آواز دہشت سے پھٹی ہوئی تھی۔

”سیالکوٹی! یہ کون ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”سجاول سیالکوٹی۔ بڑا خبیث بندہ ہے۔ لوٹ مار کرتا ہے۔ ہائے ربا۔ اب کیا ہوگا۔“

تاجور کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی تھی۔ ہاتھ بدستور سینے پر تھے۔

ہم دور سے دیکھ سکتے تھے۔ گاؤں میں افراتفری کا عالم تھا پھر دو تین فائر بھی ہوئے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ گھڑ سواروں کی طرف سے کیے گئے تھے یا گاؤں والوں کی جانب سے۔ یہ بھی پتا نہیں تھا کہ کسی کو گولی ماری گئی ہے یا ہوا میں فائر ہوا ہے۔

پھر اچانک بائیں جانب سے چار پانچ تیز رفتار گھوڑے نمودار ہوئے اور سیدھا ڈیرے کی طرف آئے۔ تاجور تقریباً چلا اٹھی۔ ”ہمیں بھاگ جانا چاہیے۔“

مگر ان لوگوں نے بھاگنے کا موقع نہیں دیا۔ ہم بمشکل دروازے تک پہنچے تھے کہ انہوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ایک شخص کے سوا سب نے اپنے چہرے پگڑیوں یا بڑے رومالوں میں چھپا رکھے تھے جو چہرہ نظر آرہا تھا وہ کسی چھٹے ہوئے بدمعاش کا ہی تھا۔

ایک شخص نے بیٹھے بیٹھے میرے سینے پر لات ماری اور گالی دے کر بولا۔ ''نکال، کیا ہے تیرے پاس۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی ٹارچ کی روشنی سیدھی میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اسی دوران میں ساتھ والے کمرے سے حق نواز کی بیوی نذیراں واویلا کرتی ہوئی باہر نکلی۔ دو افراد اس سے کھینچا تانی کر رہے تھے۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ایک شخص نے اس کے دونوں کانوں سے بالیاں نوچ لیں اور حق نواز کے ہاتھ سے گھڑی اتروالی۔ حق نواز کی ناک سے خون نکل رہا تھا۔ تاجور ایک گوشے میں سمٹ گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں دو طلائی چوڑیاں تھیں جو شاید اس نے عید کی مناسبت سے پہن رکھی تھیں۔ اس نے خود ہی زور لگا کر چوڑیاں اتار دیں اور ایک حملہ آور کے حوالے کر دیں لیکن ایسا کرنے سے تاجور کی گلوخلاصی نہیں ہوئی۔ دوسرے شخص کی نگاہ تاجور کے کانوں پر پڑی۔

نذیراں کے کانوں میں چاندی کی بالیاں تھیں لیکن یہاں تو سونے کی تھیں۔ ان کو کیسے چھوڑ دیا جاتا۔

وہ شخص گھوڑے سے اتر کر بالیوں کی طرف جھپٹا اور یہی وہ غلطی تھی جو ان لوگوں کو مہنگی پڑ سکتی تھی۔ میں ابھی تک خاموش تھا مگر جب تاجور کے کان سے بالیاں نوچنے کی کوشش کی گئی اور وہ اپنا کان دبا کر درد سے چلائی تو میرے لیے تماشائی بنے رہنا ممکن نہ رہا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر میں زبردستی کرنے والے پر جھپٹا۔ میں نے اس کی دونوں کلائیاں پکڑ کر اس بری طرح مروڑیں کہ اس نے پلک جھپکتے میں تاجور کو چھوڑ دیا۔ میرے سر کی بھرپور ٹکر نے اسے اچھال کر اپنے ساتھی پر پھینک دیا۔ اس کا ساتھی چارپائی کے نیچے سے سونگی کا ٹیپ ریکارڈر نکال رہا تھا۔ دونوں اوپر نیچے گرے اور ٹیپ ریکارڈر کے ٹوٹنے کی آواز آئی۔

ایک شخص نے مجھے عقب سے دبوچا۔ اس کے فرشتوں کو بھی پتا نہیں ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میں الٹے پاؤں پیچھے ہٹتا چلا گیا۔ ہم دونوں کمرے کے دروازے سے باہر گرے۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک نوک دار کدال پڑی تھی۔ وہ کئی انچ تک اس شخص کے کندھے میں گھس گئی۔ میں اس شخص کے اوپر سے اٹھ گیا لیکن اٹھتے اٹھتے اس کے ہولسٹر سے پستول نکال لیا۔ باقی کسی شخص کے پاس آتشیں ہتھیار نہیں تھا۔ ہاں دو افراد کے پاس چھوٹے دستے کی کلہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے ان کے پاؤں کے بالکل پاس زمین پر گولیاں چلائیں اور پھر تاجور کو اپنے ساتھ لے کر بھاگا۔

ایک کھیت پار کرتے ہی ہم گنے کے اونچے کھیت میں گھس گئے۔ وہ افراد چلا رہے تھے اور اپنے ساتھیوں کو مدد کے لیے بلا رہے تھے۔ ان کی ہمت اور دلیری کا بھانڈا پھوٹ گیا تھا۔ پستول کی وجہ سے انہوں نے فوراً ہمارے پیچھے لپکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میرے لیے یہی تیس چالیس سیکنڈ کا وقت کافی تھا۔ میں تاجور کو اپنے ساتھ بھگاتا ہوا کافی آگے نکل گیا۔ وہ ہانپ رہی تھی اور دہشت زدہ آواز میں کہہ رہی تھی۔ ''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ یہ بہت بُرے لوگ ہیں۔ اب یہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔''

''کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے بھاگتے بھاگتے اسے تسلی دی۔ ''یہ ایک بار اور پیدا ہو جائیں تو بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔''

''نہیں...... آپ کچھ نہیں جانتے...... آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہائے، پتا نہیں میرے گھر میں کیا ہوا ہو گا۔'' وہ گرتے گرتے بچی۔ میں نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے سنبھال لیا۔

گنے کا کھیت سات آٹھ فٹ سے کم اونچا نہیں ہوگا۔ درمیان میں ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ ''ہائے اللہ، وہ آ رہے ہیں۔'' تاجور نے کراہ کر کہا۔

میں جان گیا کہ اس نے ایسا کیوں کہا ہے۔ دائیں طرف ٹارچوں کی روشنیاں چمک رہی تھیں۔ گنے کے پودوں کے اندر سے یہ روشنی چھن چھن کر ہم تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے اپنا رخ تھوڑا سا بدل لیا۔ پستول ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق کم از کم تین گولیاں اس میں موجود تھیں۔ اب مجھے اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ میں ہتھیار کے برانڈ اور اس کے وزن کو دیکھ کر اندازہ لگا لیتا تھا کہ اس میں کتنی گولیاں ہوں گی۔ اکثر یہ اندازہ ٹھیک ہی نکلتا تھا۔

اب ہمیں اپنے پیچھے للکارے سنائی دے رہے تھے اور گالیاں بھی۔ اپنے بندے کے زخمی ہونے کے بعد یقیناً وہ لوگ بہت طیش میں آ گئے تھے۔ ''وہ ہمیں نہیں چھوڑیں گے۔'' تاجور نے ایک بار پھر ہراساں آواز میں کہا۔ اس کے لہجے میں میرے لیے کسی حد تک ملامت بھی تھی۔

ایک بار پھر ٹھوکر لگنے سے ہم گرتے گرتے بچے۔ تاجور کے پاؤں سے جوتی نکل گئی۔ اتنی مہلت نہیں تھی کہ اسے ڈھونڈا جا سکتا۔ وہ ویسے ہی بھاگنے لگی۔

ایک للکارتی ہوئی آواز آئی۔ ''اس طرف گئے ہیں۔ ادھر دیکھو۔''

ایک بار پھر ٹارچوں کی روشنیاں چمکیں۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ بھی سنائی دی۔ میں نے دوبارہ رخ بدلا اور باغ کی طرف بھاگتا چلا گیا۔

ہمارا اس طرح رخ بدلنا ہمارے لیے مفید ثابت ہوا۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ اور گالیوں کی بوچھاڑیں ہم سے کچھ فاصلے پر چلی گئیں۔ باغ کے گنجان درختوں میں ہمیں ایک شہ زور لوڈر کھڑا نظر آیا۔ قریب پہنچ کر دیکھا، اس میں بکروں، دنبوں وغیرہ کی بہت سی کھالیں لدی ہوئی تھیں۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ میں نے تیزی سے فیصلہ کیا اور تاجور کو کھینچ کر لوڈر کے اندر لے گیا۔ خون آلود کھالوں کو ادھر ادھر کر کے میں نے جگہ بنائی اور تاجور سمیت ان کے اندر گھس گیا۔ کھالیں تازہ تھیں۔ بو وغیرہ نہیں اٹھ رہی تھی، پھر بھی تاجور کراہ کر بولی۔ ''مجھے الٹی آجائے گی۔''

''جو بھی ہے ابھی چپ لیٹی رہو۔'' میں نے کہا۔

''میں...... میں منہ باہر نکال لوں۔''

''نکال لو۔'' میں نے کہا۔

چار پانچ منٹ خیریت سے گزر گئے۔ لیکن یہ مکمل خیریت نہیں تھی۔ وہ ہمارے اردگرد موجود تھے۔ ہوا کے دوش پر تیر کر ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسی دوران میں چاند گڑھی کی طرف سے آٹومیٹک رائفل کے کئی برسٹ چلنے کی آواز بھی آئی۔ ''ہائے میں مرگئی۔'' تاجور نے پھر گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

اچانک ہم ٹھٹک گئے۔ کسی نے تیزی سے لوڈر کی طرف قدم بڑھائے۔ اس کا اگلا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بمشکل دو سیکنڈ بعد لوڈر اسٹارٹ ہوا اور جھٹکے سے حرکت میں آگیا۔

''یہ کیا؟'' تاجور کے ہونٹوں سے پھر بے ساختہ ڈری ڈری صدا نکلی۔

میں نے اس کا منہ اپنی ہتھیلی سے ڈھانپ لیا۔ لوڈر نے آٹھ دس سیکنڈ کے اندر خاصی رفتار پکڑ لی اور ایک نیم پختہ راستے پر تیزی سے اچھلنے لگا۔ دو صورتیں ہوسکتی تھیں یا تو یہ گاڑی ڈاکو حضرات کے ہتھے چڑھ گئی تھی یا پھر اس کا مالک اسے ڈاکوؤں کی دسترس سے بچانے کے لیے باغ سے نکال لے آیا تھا۔ پہلی صورت تشویش ناک تھی لیکن دوسری اتنی تشویش ناک نہیں تھی۔ بہرحال دونوں صورتوں میں ایک اطمینان کا پہلو موجود تھا اور وہ یہ کہ تاجور میرے ساتھ تھی۔ بلکہ اس ہچکولے کھاتی گاڑی میں میرے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ یقیناً ماحول کوئی ایسا شاعرانہ اور قابلِ رشک نہیں تھا

لیکن ماحول اور موسم تو بدلتے ہی رہتے ہیں۔ یہ ساری سچویشن خطرناک ہونے کے باوجود مجھے لطف دے رہی تھی۔ ایسے خطرات سے نمٹنا تو میرے مزاج کا حصہ بن چکا تھا۔ ہاں ایک فکر ضرور تھی۔ چاند گڑھی میں تاجور کے گھر والے اور انیق وغیرہ خیریت سے ہوں۔

''یہ کہاں لے جارہے ہیں؟'' تاجور نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

''کیا پتا مری یا ایوبیہ لے جائیں، سنا ہے وہاں کا موسم ان دنوں بہت اچھا ہوتا ہے۔'' میں نے ہلکے پھلکے لہجے میں سرگوشی کی۔

''آپ مذاق کررہے ہیں۔ آپ کو پتا نہیں...... آپ نے سیالکوٹی کے بندوں پر ہاتھ اٹھا کر کتنی بڑی غلطی کردی ہے۔''

لوڈر نے تیزی سے ایک موڑ کاٹا اور کسی سخت ناہموار راستے پر دو تین منٹ زوردار ہچکولے کھانے کے بعد اچانک رک گیا۔ نہ صرف رک گیا بلکہ اس کی ہیڈ لائٹس بند ہوگئیں اور انجن بھی خاموش ہوگیا۔ ڈرائیو کرنے والا شخص باہر نکلا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اکیلا ہی ہے۔ اس نے اگلا دروازہ لاک کیا۔

اسی دوران میں ایک اور شخص تیز قدموں سے چلتا بلکہ دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ''خیریت تو ہے بشارت؟'' ایک بھاری آواز نے پوچھا۔

''خیریت نہیں ہے بھولو...... سیالکوٹی کے بندوں نے پھر ہلا بولا ہے۔ چنگی بھلی لٹ مار کی ہے۔ خبیثوں کو پتا تھا کہ عید ہے، پولیس چوکی بھی خالی پڑی ہوئی ہے......''

''مجھے پہلے ہی ڈر سا لگ رہا تھا۔'' بھولو کی آواز سنائی دی۔ ''پچھلی دفعہ بھی انہوں نے دن دیہاڑے ہی قیامت مچائی تھی نا۔ ایک گڈی اور تین موٹر سائیکلیں بھی چھین کر لے گئے تھے۔''

''اسی لیے تو گاڑی لے کر نکل آیا ہوں۔''

''اوپر ترپال ڈال دیں؟'' بھولو نے پوچھا۔

''نہیں...... یہاں تو ترپال کی ضرورت نہیں ہے...... بس پھاٹک بند کردو۔''

وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے فاصلے پر چلے گئے پھر پھاٹک بند ہونے کا کھٹکا سنائی دیا۔ اس کے بعد مکمل خاموشی چھا گئی۔ یوں لگا جیسے ہمارے قرب وجوار میں میلوں تک کوئی بندہ بشر موجود نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ہم چاند گڑھی سے کم وبیش سات آٹھ میل آگے آگئے تھے۔

قریباً دس منٹ کا وقفہ دے کر میں نے اپنے اوپر سے نمک لگی ہوئی آلودہ کھالیں ہٹائیں اور آواز پیدا کیے بغیر لوڈر سے اُتر آیا۔ تاجور بھی اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن اندر ہی رہی۔ میں نے سر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ کوئی ورکشاپ ٹائپ جگہ لگتی تھی۔ ڈیزل انجن سے آرا مشین چلائی جاتی تھی اور لکڑی کاٹ کر پھلوں کی پیٹیاں وغیرہ تیار کی جاتی تھیں۔ چاروں طرف کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ میں تھوڑا آگے گیا۔ کان لگا کر سنا تو پتا چلا کہ کسی کمرے میں چند افراد موجود ہیں۔ احاطے کی دوسری جانب رکھوالی کے کتے کی آواز بھی آرہی تھی۔ وہ مسلسل شور مچا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کے شور کی وجہ ہم دونوں ہوں۔ میں واپس آیا اور تاجور کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنی چادر سنبھالتی ہوئی اتر آئی۔ اس وقت پتا چلا کہ وہ ننگے پاؤں ہے۔ اس نے اپنی دوسری چپل بھی کہیں اتار پھینکی تھی۔

ہم احتیاط سے چلتے پھاٹک تک پہنچے۔ وہ مقفل نہیں تھا۔ ہم کنڈی کھول کر باہر نکل آئے۔ کتے کا شور بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ یقیناً وہ زنجیر میں تھا ورنہ اب تک ہم سے ملاقات کر چکا ہوتا۔

”کہاں جانا ہے؟“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

”ابھی یہاں سے تو نکلیں۔“ میں نے کہا۔

وہ چلنے میں تکلیف محسوس کر رہی تھی۔ کچھ آگے جا کر میں نے اپنی ہلکی پھلکی پشاوری چپل اتاری اور تاجور سے کہا کہ وہ پہن لے۔ وہ پہلے انکار کرتی رہی پھر میرے اصرار پر مان گئی۔ ظاہر ہے چپل اسے بہت بڑی تھی مگر اتنا تو ہوا تھا کہ اس کے تلوے زخمی ہونے سے بچ گئے تھے۔ کچھ آگے گل عباسی کے پودے نظر آئے۔ ہم ان کے عقب میں جا بیٹھے اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگے۔ میرا اندازہ تھا کہ ہم چاند گڑھی سے سات آٹھ میل دور ہو گئے ہیں لیکن یہ خیال غلط بھی ہو سکتا تھا۔ ممکن ہے کہ ہم نے اتنا فاصلہ طے نہ کیا ہو (بعدازاں یہ شک درست ثابت ہوا۔ ہم نے صرف چار میل فاصلہ طے کیا تھا) شال کی وجہ سے تاجور کے کپڑے تو داغ دار ہونے سے بچ گئے تھے تاہم میری جیکٹ اور قمیص پر خون آلود کھالوں کے دھبے تھے۔ تاجور کے ایک رخسار اور سر کے بالوں پر کھالوں کی آلودگی نمایاں نظر آرہی تھی۔ میں نے اس کی شال کے پلو سے اس کا رخسار صاف کیا۔

وہ بولی۔ ”سیالکوٹی کے بندے پنڈ والوں کو روپے پیسے کا نقصان تو دیتے ہیں پر کسی کو مارتے کوٹتے نہیں۔ ہاں جوان پر ہاتھ اٹھاتا ہے اس کو نہیں بخشتے اور آپ نے ان کے بندے کو زخمی کر دیا۔“

”تم کہتی ہو کہ مارتے کوٹتے نہیں۔ وہ تمہارے کان چیر کر بالیاں اتار رہا تھا، یہ مار پیٹ سے کم بات تھی۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔“

”مگر اب جو کچھ برداشت کرنا پڑے گا، وہ کون بھگتے گا۔ آپ ان کا پستول بھی چھین کر لے آئے ہو۔ وہ پستول اور بدلہ لیے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔“

”کچھ نہیں ہوگا تاجور...... میں نے ان کے دم خم کا تھوڑا بہت اندازہ لگا لیا ہے۔ تم نے دیکھا تھا جب پستول میرے ہاتھ میں آگیا اور ہم وہاں سے بھاگے تو وہ فوراً ہمارے پیچھے نہیں آئے... بلکہ اپنے ساتھیوں کو آوازیں دیں۔“

”ہائے ربا! آپ نے ان پر گولیاں بھی تو چلائی تھیں۔ کہیں کسی کو گولی ہی نہ لگ گئی ہو۔“

”نہیں، گولیاں زمین میں لگیں۔ میرا نشانہ اتنا خراب نہیں۔ میں نے انہیں بس ڈرایا تھا۔“

”پر یہ تو سیالکوٹی کے عام سے کارندے تھے۔ آپ کو نہیں پتا کہ بجاول سیالکوٹی خود کیا چیز ہے۔“

”چلو تم بتا دو کیا چیز ہے؟“ میں نے پستول کی گولیاں چیک کرتے ہوئے کہا۔ وہ تین ہی تھیں۔

”وہ کئی قتل کر چکا ہے۔ جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے۔ اب اس نے جتھا بنا لیا ہے۔ لوٹ مار کر کے پھر پہاڑیوں کی طرف چلا جاتا ہے۔“

”سب ٹھیک ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو۔ ہم نے جو کچھ کیا ہے اپنے آپ کو بچانے کے لیے کیا ہے۔“

”لیکن کچھ کرنے سے پہلے آپ کو یہ سوچنا تو چاہیے تھا کہ آپ یہاں نئے ہیں۔ آپ کو یہاں کے حالات کا کچھ پتا نہیں۔ اب پتا نہیں وہاں میرے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ وہ تو ڈھونڈتے پھر رہے ہوں گے مجھے ہر طرف...... اللہ جانے کیا کیا سوچ رہے ہوں گے۔“ اس کا گلا رندھ گیا۔

”میرا خیال ہے کہ جب ہم وہاں سے بھاگے تو حق نواز اور اس کی بیوی میں سے کسی ایک نے یا پھر دونوں نے ہمیں ضرور دیکھا ہوگا۔ وہ بتا دیں گے کہ تم اکیلی نہیں ہو اور یہ بھی بتا دیں گے کہ تمہیں اور مجھے کیوں بھاگنا پڑا۔ تمہاری نوکرانی نوری کے بیان سے بھی سب کچھ واضح ہو جائے گا۔ وہ کہے گی کہ تم دونوں خراب گرائینڈر دکھانے کے لیے ڈیرے پر آئی تھیں۔“

"پتا نہیں گھر میں کیا ہوا ہوگا؟" وہ سسکی۔

"دیکھو تاجور! اتنا بڑا گاؤں ہے۔ یہ تو نہیں ہوسکتا کہ وہ لٹیرے گاؤں کے ہر گھر میں گھسے ہوں۔ پھر تم یہ کیوں سوچ رہی ہو کہ وہ تمہارے گھر میں بھی گئے ہوں گے۔ بس اللہ سے خیر مانگو۔"

ہم کچھ دیر وہاں بیٹھے دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ لیکن یہاں سرد ہوا کی کاٹ تھی۔ ویسے بھی یہ جگہ زیادہ محفوظ نہیں تھی۔ ہمیں لگا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈ سے جمنا شروع ہو گئے ہیں۔ کچھ فاصلے پر کیلے کے درختوں کا ایک جھنڈ سا نظر آرہا تھا۔ ہم اس طرف چل دیے۔ وہاں پہنچے تو اندازہ ہوا کہ یہ جگہ رکنے اور چھپنے کے لیے کافی محفوظ ہے۔ کیلے کے درخت بالکل ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے۔ ان کے اردگرد جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ پانی کا ایک بڑا کھالا اس جھنڈ کے عین درمیان سے گزر رہا تھا۔ ہم دیکھ کر حیران ہوئے کہ یہ بالکل تازہ پانی تھا اور اس میں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ ہاتھ لگایا تو نیم گرم محسوس ہوا۔ یقیناً یہ کسی کھیت کی طرف جارہا تھا مگر اس کا ماخذ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں ہوا بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایک جگہ تھوڑی سی چمک نظر آئی۔ "یہ کیا ہے؟" تاجور نے حیران ہو کر پوچھا۔

ہم نے آگے جاکر دیکھا۔ یہ ایک چھوٹا سا گڑھا تھا جس میں ادھ بجھے انگارے اور راکھ تھی۔ خوشگوار حرارت کا احساس ہوا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک یہاں کسی نے گوشت وغیرہ بھونا تھا۔ شاید قربانی کا گوشت۔ ایک دو ہڈیاں بھی نظر آئیں۔ بہرحال اب یہ جگہ بالکل خالی تھی۔ دور دور کوئی متنفس دکھائی نہیں دیتا تھا۔ گیارھویں رات کا چاند بدلیوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ اس کی مدھم روشنی میں قرب وجوار سحر زدہ نظر آنے لگے۔

"میں اپنی چادر دھولوں؟" تاجور نے کہا۔

"چادر دھولو اور سر بھی۔"

وہ پانی کی طرف چلی گئی۔ پہلے اس نے اپنی شال دھوئی۔ پھر نیچے جھک کر اپنے لمبے بالوں کو پانی میں ڈبویا اور انہیں صاف کیا۔ میں بیٹھا اسے محویت سے دیکھتا رہا۔ اس کی چوڑیوں کی مدھم چھن چھن، اس کے جسم کے دلکش زاویے، اس کی بے ساختہ ادائیں اور چاندنی کرن کرن گردوپیش پر اترتی ہوئی، یہ سب کچھ ایک حسین سپنے کی طرح تھا۔ میں نے بھی اپنی جیکٹ دھونے کے لیے اتاری مگر اس طرح کہ جیکٹ کے اندرونی حصے پر تاجور کی نظر نہ پڑے۔ جب میں ڈھاٹا باندھ کر نکلتا تھا تو اسی جیکٹ کو الٹ کر پہنتا تھا۔ سر دھونے کے بعد تاجور نے اپنی گردن ٹیڑھی کی اور گیلے بالوں کو بل دے کر نچوڑا۔

اچھی طرح ہاتھ منہ دھو کر ہم ادھ بجھے انگاروں کے پاس آبیٹھے۔ اب رات کے قریباً گیارہ بج چکے تھے۔ تاجور کا دھیان بار بار اپنے گھر کی طرف جارہا تھا۔ وہ پریشان لہجے میں بولی۔ "شاہ زیب صاحب! ہم اور کتنی دیر یہاں رہیں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ ہمیں دن نکلنے سے پہلے یہ جگہ چھوڑنی نہیں چاہیے......" ابھی میں نے فقرہ مکمل نہیں کیا تھا کہ کہیں دور سے ہوا کے دوش پر تیر کر ایک آواز سنائی دی۔ یہ رائفل کے فائر کی آواز تھی۔

تاجور نے بھی یہ آواز سنی اور ڈری ڈری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں جو بات کہنے والا تھا اس کی تصدیق پہلے ہی ہوگئی تھی۔

میں نے کہا۔ "تاجور! مجھے لگتا ہے کہ آج کی رات خطرے سے خالی نہیں۔ وہ لوگ اس علاقے میں موجود ہیں اور یہ جگہ ہمارے لیے ہر لحاظ سے محفوظ ہے۔"

"ابھی دن چڑھنے میں کتنا وقت ہے؟"

"آدھی رات تو ہوگئی ہے۔ پانچ چھ گھنٹے اور گزارنے ہوں گے۔"

تاجور نے اپنی دھلی ہوئی چادر انگاروں کے پاس دو خشک ٹہنیوں پر پھیلا دی تھی۔ وہ ننگے سر تھی اور انگاروں کے پاس سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ اس کے پاؤں میں ابھی تک میری چپل تھی۔

چاند دھیرے دھیرے مغرب کی طرف جھکنا شروع ہوگیا تھا۔ میں یک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بے چین سی نظر آنے لگی۔

میں نے کہا۔ "تاجور! آج مجھے ایک بات صاف صاف بتاؤ...... کیا تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟"

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ "کیا مطلب؟"

"اگر تم اداکاری کررہی ہو تو بہت اچھی کررہی ہو لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہاری یادداشت بہت کمزور ہے۔"

"آپ...... پہیلیاں بجھوا رہے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لی۔ "اچھا میری طرف غور سے دیکھو...... میری آواز پر غور کرو۔ کیا تمہیں کچھ یاد نہیں آرہا؟ کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ہم پہلے بھی ملے ہیں۔"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور بولی۔ "پتا نہیں کیوں...... کبھی کبھی لگتا ہے کہ آپ کی آواز...... پہلے سنی

ہوئی ہے...... آپ کا لہجہ......''

میں نے اس کے تاثرات دیکھنے چاہے لیکن چاند پھر تیزی سے کسی بدلی کی اوٹ میں چلا گیا اور روشنی اتنی نہ رہی کہ کسی کو دیکھا جا سکے۔

اگلے چار پانچ منٹ میں ہم دونوں کے درمیان اسی موضوع پر بات ہوئی۔ آخر میں نے کہا۔ ''تاجور...... یہ میرا چہرہ دیکھو، اگر میری لمبی براؤنش داڑھی ہو۔ یہاں اوپر گھنی مونچھیں ہوں۔ سر کے بال بھی ہلکے براؤن ہوں اور یہاں میرے کندھوں تک جاتے ہوں...... اور میں تمہیں لاہور کے شاہی قلعے کے دروازے سے کچھ آگے کھڑا نظر آؤں تو کیا تم پھر بھی مجھے نہیں پہچانو گی؟''

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا...... پھر عجیب انداز سے بولی۔ ''ہاں، پھر آپ کو پہچان لوں گی۔''

مجھے زبردست شاک لگا۔ میں ششدر سا اس کی طرف دیکھتا چلا گیا۔ اس نے اپنی نیم خشک شال پرے اٹھائی اور سر ڈھانپ لیا۔ میں سناٹے میں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے شروع میں ہی پہچان گئی تھی پھر اس نے اتنے دن اظہار کیوں نہیں کیا؟ عورت کو ایک پہیلی کہا جاتا ہے۔ آج اس سرورات میں کیلے کے اس جھنڈ کے اندر، گرم شال کا گھونگٹ نکالے...... وہ پہیلی میرے سامنے بیٹھی تھی۔

''اوہ گاڈ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''شکر ہے تم نے تسلیم تو کیا۔''

شال کا پلو اس کے سر پر یوں ڈھلکا ہوا تھا کہ صرف ناک اور ہونٹ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ ''جب میں فرح کے ساتھ اس ریسٹورنٹ میں آپ سے ملی تو دس پندرہ منٹ بعد ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ آپ کون ہیں۔''

''پھر تم نے بتایا کیوں نہیں؟''

''پتا نہیں۔'' اس کے جواب میں سادگی اور معصومیت کا ایسا انداز تھا کہ میں گنگ ہو کر رہ گیا۔

''ہر بات کی کوئی وجہ ہوتی ہے تاجور۔ اس کی بھی ضرور ہوگی۔''

وہ خاموش رہی۔ عورت کی وہی بھیدوں بھری خاموشی جو بڑے بڑے دانشوروں اور فلاسفروں کو بے بس کر دیتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں میرے انداز نے ضرور سمجھا دیا ہوگا کہ میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔''

''ہوں...... کسی حد تک۔''

''پھر تمہاری خاموشی کا کیا مطلب تھا؟ کیا تم یہ سمجھتی تھیں کہ اگر تم مجھے نہ پہچانو گی تو میں بھی اس بارے میں خاموش ہی رہوں گا؟''

''شش...... شاید۔''

''اگر تم مجھ سے گریز ہی کرنا چاہتی تھیں تو پھر...... تم وہاں لاہور میں ہی فرح کو بتا سکتی تھیں کہ تمہیں میری مدد کی ضرورت نہیں۔''

وہ ایک توقف کے بعد بولی۔ ''میں نے یہ سوچا تھا...... لیکن پھر پتا نہیں کیوں......'' وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی اور اپنی کلائی کی چوڑیوں کو گھمانے لگی۔

''ہاں، عورت پہیلی ہے۔ کبھی کبھی اس کے دل کی گہرائی تک اترنا ناممکن ہو جاتا ہے یا شاید یہ گریز اور کشش کا وہی درمیانی رویہ ہے جو ہر جاندار میل اور فی میل میں پایا جاتا ہے۔''

''تم نے جب مجھے ریسٹورنٹ میں دیکھا اور پھر پہچان لیا تو تمہیں کیسا لگا؟''

''میں بہت حیران ہوئی تھی۔''

''حیران یا کچھ اور بھی۔ میرا مطلب ہے کہ کوئی خوشی نہیں ہوئی تمہیں کہ اتنے عرصے بعد ہم اچانک پھر مل گئے ہیں۔''

وہ کوئی جواب نہ دے پائی۔

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا...... تم نے مجھے جو فون نمبر دیا تھا، وہ غلط تھا۔ میں نے اس پر سیکڑوں بار کوشش کی لیکن کوئی جواب نہ ملا۔ کچھ اور نہیں تو تمہیں اس بات کی شرمندگی تو ضرور ہوگی۔''

''میں اس کے لیے...... آپ سے معافی مانگنا چاہتی تھی۔''

''تو پھر مانگی کیوں نہیں؟''

''میں نے سوچا تھا کہ جب مجھے پکا یقین ہو جائے گا کہ آپ نے مجھے پہچان لیا ہے اور آپ اس بارے میں مجھ سے بات کریں گے تو پھر میں معافی بھی مانگ لوں گی۔''

میں نے کیلے کے ایک تنے سے ٹیک لگائی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''چلو، اب تو پکا یقین ہو گیا۔''

چاند پھر نکل آیا تھا۔ اس کی روشنی اس کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ تھرائے اور وہ بولی۔ ''میں اس کے لیے معافی مانگتی ہوں۔ مجھے آپ کو دھوکے میں نہیں رکھنا چاہیے تھا۔''

''اگر میں معاف نہ کروں تو......؟''

''مجھے پتا ہے، آپ ایسے نہیں ہیں۔''

اب سب کچھ کھل گیا تھا۔ ایک بار باتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر دراز ہوتا چلا گیا۔ میں نے دل فگار لہجے میں کہا۔ ''تاجور! پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں بہت یاد کیا، بہت زیادہ۔ کیا تم نے بھی کبھی میرے بارے میں سوچا تھا؟''

''ہاں...... لیکن اتنا زیادہ نہیں جتنا آپ کہہ رہے ہیں۔''

''کیوں نہیں سوچا؟''

وہ توقف کر کے بولی۔ ''آپ نے دیکھ ہی لیا ہے، میں جس ماحول میں رہتی ہوں وہاں سوچنا کتنا مشکل ہے۔''

اس کا جواب بڑا معنی خیز تھا۔ میرے اندر جیسے ایک پھلجھڑی سی چھوٹ گئی۔ دوسرے لفظوں میں شاید اس نے یہ کہا تھا کہ وہ سوچنا چاہتی تھی مگر یہاں سوچ پر پہرے ہیں۔ پھول کھلنے سے پہلے مرجھا جاتے ہیں۔ بیلیں دیوار پر چڑھنے سے پہلے گر پڑتی ہیں۔ یقیناً وہ یہی کہہ رہی تھی تو اس کا کیا مطلب تھا۔ اس کے ذہن میں بھی میرا خیال آتا تھا۔ کبھی کبھی ہی سہی مگر آتا تھا۔

''تم میرے بارے میں کیا سوچتی تھیں تاجور؟''

اس نے سر پر شال درست کی۔ ''یہی کہ آپ بہت اچھے ہیں۔ آپ دوسروں کی مدد کرنے والے ہیں۔ آپ نے میری مدد کی بلکہ تھوڑا سا خطرہ بھی مول لیا۔ ایک ہمدرد ساتھی کی طرح میرے ساتھ رہے...... اور پھر خاموشی سے چلے گئے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''تاجور! وہ دو دن میں کبھی نہیں بھول سکا۔ تمہارے ساتھ گزرا ہوا ہر ہر لمحہ میں سیکڑوں بار اپنی سوچوں میں دہرا چکا ہوں۔ جب میں تم سے جدا ہوا تو میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دو دن مجھے اس طرح بے چین کریں گے۔ میں اپنا دھیان تمہاری طرف سے جتنا ہٹانا چاہتا تھا وہ اتنا ہی تمہاری طرف جاتا تھا۔ کوپن ہیگن کے ریستورانوں میں، لندن کی روشنیوں میں، پیرس کی تفریح گاہوں میں...... میں کہیں بھی تمہیں بھولا نہیں اور جتنی بار اور جہاں بھی تمہارے بارے میں سوچتا تھا، ذہن میں سیکڑوں سوالات اٹھتے تھے۔''

وہ ہولے سے مسکرائی۔ ''اور شاید یہ سوال بھی اٹھتا ہو گا کہ شاہی قلعے میں ملنے کے بعد میں آپ کے ساتھ وقت کیوں گزارنا چاہتی تھی اور شام سے پہلے گھر واپس جانا کیوں نہیں چاہتی تھی؟''

''ہاں، یہ سب سے زیادہ پریشان کن سوال تھا۔''

''اب تو اس کا جواب کچھ کچھ آپ کی سمجھ میں آ گیا ہو گا۔''

میں نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''کہیں اس بات کا تعلق بھی تو تمہارے منگیتر سے نہیں تھا۔ میرا مطلب ہے، کیا تم اس سے بچنے کے لیے گھر سے باہر رہتی تھیں؟''

''ہاں شاہ زیب صاحب...... میرا یہ روگ نیا نہیں ہے۔ پیچھے دیکھتی ہوں تو لگتا ہے کہ اب تک کی ساری زندگی اسی خوف کے سائے میں گزری ہے۔''

''کیا ان دنوں وہ بھی تمہارے ساتھ لاہور میں تھا؟''

''نہیں...... لیکن وہ وہاں پہنچ گیا تھا۔''

اس بارے میں تاجور نے جو کچھ بتایا، وہ یوں تھا۔ ساڑھے تین سال پہلے تاجور اپنی بڑی بہن کے گھر چھٹیاں گزارنے لاہور گئی تھی۔ انہی دنوں اس کے منگیتر اسحاق کا بھی لاہور آنا ہو گیا۔ دراصل وہ روزگار کے لیے دبئی جا رہا تھا۔ اس کا ویزا لگ گیا تھا اور ٹکٹ بھی مل گیا تھا۔ وہ جہاز پر سوار ہونے کے لیے گاؤں سے لاہور پہنچا۔ ایک چچازاد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کی فلائٹ کا وقت شام کے بعد تھا اور شام تک اس نے تاجور کی بہن کے گھر میں ٹھہرنا تھا۔ یہی وہ دن تھا جب شاہی قلعہ لاہور کے دروازے پر تاجور سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ اسحاق کی آمد کی خبر سنتے ہی اپنی بہن کے گھر سے نکل آئی تھی... بلکہ بہن نے ہی اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ شام تک گھر سے باہر رہے۔ بہن کا شوہر بھی گھر میں موجود نہیں تھا۔ بہن کو ڈر تھا کہ اسحاق، تاجور کو بے جا تنگ کرے گا اور ممکن ہے کہ دست درازی پر ہی اتر آئے۔ اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ تاجور افراتفری میں گھر سے نکل آئی لیکن وہ جاتی کہاں؟ وہ وقت گزارنے کے لیے ادھر ادھر منڈلاتی رہی۔ شاہی قلعے پہنچی تو اوباش لڑکے اس کے پیچھے لگ گئے اور اسے میری پناہ میں آنا پڑا۔ بعدازاں شام کے وقت وہ مجھ کو الوداع کہہ کے گھر واپس چلی گئی۔ لیکن یہاں الٹا یہ مسئلہ ہوا کہ سردی اور دھند کی وجہ سے اسحاق کی فلائٹ کینسل ہو گئی اور وہ تاجور کی بہن کے گھر واپس آ گیا۔ اسی لیے اگلے روز مجھے پھر تاجور کا فون آ گیا اور اس نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں آج پھر اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزاروں۔ یعنی اگلے روز وہ پھر گھر سے نکل گئی تھی اور شام تک باہر ہی رہی تھی۔ شام کو اس کا خطرناک منگیتر اسحاق دبئی کے لیے روانہ ہو گیا تھا۔ (لیکن وہ دبئی بھی زیادہ عرصے

نہیں تک سکا تھا۔ وہاں اپنے کفیل سے اس کا جھگڑا ہوا اور وہ اس کے بیٹے کو تھپڑ مار کر پاکستان بھاگ آیا تھا)

تاجور سے یہ سارے واقعات سن کر میرے ذہن میں عرصے سے موجود ایک سوال کا جواب مل گیا۔ میں جان گیا کہ ماضی کے وہ دو حسین ترین دن کیسے میری جھولی میں آگرے تھے۔

میں نے کہا۔ ”تاجور! تمہاری باتیں سن کر تو یہی لگتا ہے کہ تم مسلسل ایک عذاب جھیل رہی ہو۔ ساڑھے تین سال تو اس واقعے کو ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اسحاق اس سے پہلے بھی تمہارا منگیتر تھا اور اس کا خوف تمہارے سر پر سوار تھا۔“

اس نے اثبات میں سر ہلایا پھر خاموشی کو توڑنے کے لیے بولی۔ ”ہاں...... وہ ضد کا بڑا پکا ہے اور غصے والا بھی بہت ہے۔ ابا امی، میرے چچا وغیرہ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ ہمارا رشتہ ہو لیکن وہ کہتا ہے کہ کسی صورت اپنی منگ نہیں چھوڑوں گا۔ اس کی دھمکیوں کی وجہ سے سب چپ ہو جاتے ہیں۔“

”میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اسحاق کے والد نے پسند کی شادی نہ ہونے پر ایک لڑکی پر فائرنگ کر دی تھی اور وہ بے چاری بعد میں زخم خراب ہونے کی وجہ سے مر گئی تھی؟“

میرے سوال کا جواب تاجور نے ہاں میں دیا اور بولی۔ ”وہ ایک دفعہ ابا جی کو بھی صاف صاف دھمکی دے چکا ہے۔ کہتا ہے کہ میں مر جاؤں گا اور مار دوں گا لیکن تاجور کو کسی کی ڈولی میں نہیں بیٹھنے دوں گا۔“ وہ بہت دکھی لہجے میں بول رہی تھی۔

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”تاجور! ایک بات بتاؤ، بالکل سچ۔ کیا تم نے کبھی کسی سے پیار کیا ہے؟“

وہ چند لمحے کے لیے جیسے سناٹے میں رہی پھر سنبھل کر بولی۔ ”اپنے ابا امی سے کیا ہے اور اپنے چھوٹے بھائیوں سے۔“

”یعنی تم نے اپنی زندگی کا جیون ساتھی بنانے کے لیے کسی کو نہیں چاہا؟“

اس نے چادر کے نیچے نفی میں سر ہلایا۔

”لیکن، میں نے چاہا ہے۔“

”کون ہے؟“

”ایک لڑکی...... ایک دیہاتی لڑکی۔ جس کے لیے میں کوپن ہیگن سے یہاں پہنچا ہوں۔“

اس نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ ہم دونوں کے درمیان ایک بوجھل خاموشی طاری ہو گئی۔ اس خاموشی میں کبھی کبھی کسی شب بیدار پرندے کی آواز ابھرتی تھی یا پھر کوئی جھینگر اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگتا تھا۔ آخر اس خاموشی کو توڑتے ہوئے اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”آپ کی ساری زندگی باہر گزری ہے۔ آپ ہمارے دیہات اور ہماری لڑکیوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اور نہ ان پابندیوں کے بارے میں جانتے ہیں جن میں یہاں کے لوگ جکڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے لیے بہت اچھا ہے کہ دو چار دن یہاں گزارنے کے بعد واپس چلے جائیں۔“

”تو پھر اس مشن کا کیا ہوگا جس کے لیے میں یہاں آیا ہوں میں اس لڑکی کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ اسے اس کے مسئلوں کی دلدل سے نکالنا چاہتا ہوں اور بڑی حد تک میں اس کے مسئلوں کو سمجھ بھی چکا ہوں۔“

”آپ نے بہت کچھ کیا ہوگا لیکن آپ کی ایک بات نے آپ کی ساری کوششوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ آپ جس کو مسئلوں کی دلدل سے نکالنے کی بات کر رہے ہیں، اسے اور بری طرح پھنسا دیں گے۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے کہ آپ کے ساتھ یہاں کیا ہو سکتا ہے۔“ اس کے لہجے میں ایک دم زبردست بیگانیت پیدا ہو گئی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہونا چاہتی ہے۔

مگر پھر اچانک وہ زور سے چلائی اور میرے کندھے سے چمٹ گئی۔ میں نے اس کی نظر کا تعاقب کیا۔ چند فٹ کے فاصلے پر مجھے دو خوفناک چمکیلی آنکھیں نظر آئیں۔ جلد ہی پتا چل گیا کہ یہ ایک جنگلی بلا ہے جو شاید ہڈیوں کی خوشبو سونگھ کر اس طرف چلا آیا ہے۔ میں نے جھک کر پتھر اٹھایا تو وہ غائب ہو گیا۔ وہ بدستور میرے کندھے سے چمٹی ہوئی تھی۔ میں اس کے جسم کی نرمی اور حرارت کو محسوس کر رہا تھا۔ اس کی انگلیوں کے ناخن میرے بازو کے گوشت میں پیوست تھے۔

پھر یکایک اسے اس قربت کا احساس ہوا۔ وہ خجل انداز میں پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”عورت کمزور ہوتی ہے لیکن اسے مناسب مرد کا سہارا مل جائے تو اس کے خوف دور بھی ہو جایا کرتے ہیں۔“ اس کی خاموشی سے اندازہ ہوا کہ وہ میری بات کا مطلب سمجھ رہی ہے۔

اس نے ملتجی انداز میں کہا۔ ”میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ آپ اس بارے میں پھر بات نہ کریں۔

اگر آپ...... اس قسم کی بات کریں گے...... تو پھر میں اٹھ کر چلی جاؤں گی۔"

میں کٹ سا گیا۔ فوری طور پر سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ واقعی اس جیسی لڑکی کا مجھے کوئی تجربہ نہیں تھا۔ ایک طرف وہ میری بات سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ دوسری طرف مجھے لاہور میں پہچان لینے کے باوجود یہاں اپنی مدد کے لیے لے آئی تھی۔ خاموشی طویل ہوئی تو وہ ایک دم موضوع بدلنے والے انداز میں بولی۔ "آپ نے مولوی فدا کی بات کی تھی اور کہا تھا کہ وہ ایسا نہیں جیسا میں اسے سمجھ رہی ہوں، آپ کو اس میں کیا نظر آیا ہے؟"

"مجھے اس کی مجبوری نظر آئی ہے اور میں بہت جلد اس مجبوری کو اختیار میں بدلنے والا ہوں پھر مولوی جی وہی زبان بولیں گے جو وہ بولنا چاہتے ہیں۔"

"ایسی کیا مجبوری تھی کہ انہوں نے اپنے شاگرد کے ذریعے ہمارے گھر حملہ کروا دیا اور اب ثابت ہو گیا ہے کہ طارق نمبردارنی کو نہیں مجھے مارنا چاہتا تھا۔"

"اس میں مولوی جی کا کوئی قصور نہیں۔ یہ طارق کا ذاتی فعل تھا۔ وہ مولوی جی کو مصیبت میں دیکھ کر برداشت نہ کر سکا اور جوش میں تمہارے گھر گھس گیا۔"

"میں نے اس کا کیا بگاڑا تھا؟"

"وہ سمجھتا تھا کہ تم بالواسطہ طور پر مولوی جی کی پریشانیوں کی ذمے دار ہو۔"

"مجھ سے کیا پریشانی تھی مولوی جی کو؟" وہ سٹپٹا کر بولی۔

"سمجھو، یہ ایک بھید ہے۔ دو چار دن میں تم پر کھل جائے گا یا ہو سکتا ہے کہ......"

اچانک میرا فقرہ ادھورا رہ گیا۔ ہمیں کسی گاڑی کے انجن کی مدھم آواز سنائی دی تھی۔ ہم کان لگا کر یہ آواز سننے لگے۔ آواز دائیں جانب سے آرہی تھی اور بتدریج واضح ہو رہی تھی۔ میں نے ادھ بجھے انگاروں پر مٹی ڈال دی۔ اب گھوڑوں کی ٹاپیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ مدھم چاندنی میں تاجور کی آنکھوں میں ہراس کے سائے تھے۔ میں نے پستول جیکٹ کی جیب سے نکال لیا۔ بائیں ہاتھ میں تاجور کا دایاں ہاتھ تھاما اور کیلے کے جھنڈ میں کچھ اور اندر چلا گیا۔ انجن کا شور اور گھوڑوں کی ٹاپیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ تاجور نے ایک بار پھر بے ساختہ میرا بازو تھام لیا۔ موقع سنگین تھا پھر بھی تاجور کی لرزاں گرفت مجھے مزہ دینے لگی۔ آوازیں بتا رہی تھیں کہ شاید ہمارے اندیشے درست

بچت

ایک کنجوس گھنٹا بھر سے بھاٹی گیٹ پر رکشے کے انتظار میں کھڑا تھا۔ آخر اس کی مراد پوری ہوئی اور سامنے سے ایک رکشا آتا نظر آیا۔ کنجوس آدمی نے جلدی سے آگے بڑھ کر رکشے والے سے پوچھا۔ "ارے بھائی! شالامار باغ کے کتنے پیسے لو گے؟"

رکشے والے نے جواب دیا۔ "تیس روپے۔"

یہ جواب سن کر کنجوس آدمی خاموشی سے آگے چل دیا۔ رکشے والے نے اس کے قریب جا کر پوچھا۔ "آپ ہی بتا دیجیے، آپ کتنے پیسے دیں گے؟"

کنجوس نے کہا۔ "مجھے تمہارے رکشے میں نہیں جانا ہے۔ میں تو یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شالامار باغ تک پیدل جا کر میں کتنے روپے کی بچت کر سکتا ہوں۔"

ثابت ہو گئے ہیں۔ چاند گڑھی والے لٹیروں کی کوئی ٹولی یہاں پہنچ گئی ہے لیکن پھر دفعتاً تاجور نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ بولی۔ "مجھے تو کچھ اور لگ رہا ہے۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"مجھے تو یہ ملک عالمگیر کی گاڑی کی آواز لگ رہی ہے۔"

وہ کان سے شال ہٹا کر دھیان سے آواز سننے لگی پھر بولی۔ "ہاں، یہ اسی کی گاڑی ہے...... شاید اسحاق بھی اس کے ساتھ ہو گا۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ لوگ تمہیں ڈھونڈتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں؟"

"ایسا ہی لگتا ہے۔" اب اس کی آواز میں خوف کا عنصر کافی حد تک کم ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ مزید گزرے، تب آوازیں جھنڈ کے سامنے پہنچ گئیں۔

"آپ ان کو آواز دیں۔ میں نے دیکھ لیا ہے۔ یہ عالمگیر کی ہی گاڑی ہے۔" تاجور نے پورے یقین سے کہا۔

میں اور تاجور واپس انگاروں والی جگہ پر آ گئے۔ یہاں سے راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ دس بارہ گھڑسوار تھے۔ ان کے آگے ایک بڑے سائز کی بے ہودہ سی جیپ تھی۔ ممکن تھا کہ وہ لوگ جھنڈ کی طرف آتے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ سیدھے نکل جاتے۔ میں اور تاجور جھنڈ سے باہر آ گئے۔ تاجور نے زور سے پکارا۔ میں نے بھی ہاتھ ہلائے۔ ہمیں دیکھ لیا گیا۔

میں نے تاجور کی طرف دیکھے بغیر سرگوشی میں کہا۔
''تاجور! کسی بھی صورت ہمت نہ ہارنا۔ میں یہاں ہوں اور تمہیں اس مشکل سے نکال کر رہوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔''
جیپ رک گئی۔ پھر گھوڑے بھی ٹھہر گئے۔ جیپ کا رخ ہماری طرف ہوا۔ اس کی ہیڈ لائٹس سیدھی ہم دونوں پر پڑیں۔ کچھ افراد تیزی سے نیچے اترے۔ تاجور دوڑ کر آگے گئی اور ان میں سے ایک شخص کے ساتھ لپٹ گئی۔ میں نے دھیان سے دیکھا۔ یہ تاجور کے والد دین محمد تھے۔ ان کے پیچھے چوڑے جبڑوں والا اسحاق کھڑا تھا۔ اسحاق کے ساتھ ہی ایک غیر معمولی لمبے چہرے والا شخص نظر آیا۔ اس نے کلف دار سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ کندھے سے پستول جھول رہا تھا۔ بعدازاں پتا چلا کہ یہی زمیندار عالمگیر ہے۔ اسے ملک عالمگیر بھی کہا جاتا تھا۔ درحقیقت یہی شخص چاند گڑھی کا کرتا دھرتا تھا۔ یہاں کا چودھری نیاز تو ایک چودہ پندرہ سالہ لڑکا تھا۔ بڑے چودھری کی موت کے بعد اسے چودھری بنا پڑا۔ ورنہ اس عمر میں وہ کیا فیصلے کر سکتا تھا۔ عالمگیر بڑے چودھری کے بہت قریب تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی بنا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی موت کے بعد اصل چودھراہٹ اس کے حصے میں آگئی تھی۔
تاجور نے اپنے گھر والوں کی خیر خیریت دریافت کر لی تھی اور اب اپنے باپ کے سینے سے لگی ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ دین محمد نے پوچھا۔ ''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی دھی رانی؟ تو ٹھیک ہے نا؟''
تاجور نے زور سے اثبات میں سر ہلایا اور مزید شدت کے ساتھ باپ سے چمٹ گئی۔
''شکر ہے مولا...... تیرا لکھ لکھ شکر ہے۔'' دین محمد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
لمبے چہرے والا عالمگیر اور اسحاق سیدھا میری طرف آئے۔ دین محمد کا ملازم حق نواز ان کے پیچھے تھا۔ عالمگیر نے اشاروں میں مجھ سے پوچھا کہ وہ پستول کہاں ہے جو میں نے سیالکوٹی کے بندوں سے چھینا تھا۔
میں نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پستول ان کے حوالے کر دیا۔ موقع تو یہ تھا کہ عالمگیر اور اسحاق وغیرہ میری کارکردگی پر مجھے شاباش دیتے، اس کے بجائے وہ مجھے قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ خاص طور پر اسحاق کی نظروں میں کینہ تھا۔ وہ چوڑے جبڑوں اور چھوٹی آنکھوں والا کرخت سا شخص تھا۔ ماتھے پر چوٹ کا پرانا نشان تھا۔ میں تاجور کے منگیتر کو آج پہلی بار قریب سے دیکھ رہا تھا۔
تاجور نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے والد سے کہا۔ ''اس نے بڑی ہمت دکھائی۔ نہیں تو وہاں ڈیرے پر کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے نشہ کیا ہوا تھا۔ گالیاں دے رہے تھے۔'' اس نے اپنا زخمی کان والد کو دکھایا۔ دین محمد میری طرف آئے۔ میرا کندھا سہلایا۔ اسحاق رخ پھیر کر دوسری طرف چلا گیا۔
تاجور، عالمگیر، اپنے والد اور دیگر لوگوں کو بتانے لگی کہ وہ کس طرح اتنی بڑی مشکل سے بچ پائی ہے۔
تاجور اپنے والد اور اسحاق کے ساتھ عالمگیر کی جیپ میں بیٹھی۔ مجھے ایک گھوڑے سوار کے ساتھ بٹھایا گیا۔ مسلح گھڑ سوار ہمارے آگے پیچھے رہے۔ ہم سردی اور تاریکی میں قریباً چار پانچ میل کا فاصلہ طے کر کے واپس چاند گڑھی پہنچ گئے۔ اب رات کا آخری پہر شروع ہونے والا تھا۔ چاند گڑھی کے بیشتر گھروں میں لوگ جاگ رہے تھے۔ کچھ لوگ پہرے کے انداز میں گھومتے پھرتے نظر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں اور کلہاڑیاں تھیں۔ دو تین رائفل برداروں پر بھی نظر پڑی۔
گاؤں میں داخل ہونے کے ایک منٹ بعد ہی میرے کانوں میں رونے پیٹنے کی آوازیں آئیں۔ یہ آوازیں چودھری کی حویلی کے ساتھ والی حویلی سے آرہی تھیں۔ عورتیں دلدوز انداز میں بین کر رہی تھیں۔ پتا چلا کہ سیالکوٹی کا گاؤں پر حملہ اس مرتبہ خون خرابے سے خالی نہیں رہا۔ عالمگیر کے سگے بھائی کی چھاتی پر گولی لگی ہے اور وہ گاؤں میں ہی دم توڑ گیا ہے۔ اس کا نام پرویز ہے اور وہ عالمگیر سے چھوٹا تھا۔ اس واقعے میں دو افراد زخمی بھی ہوئے تھے۔
یہ سنگین صورت حال تھی۔ چاند گڑھی میں کہرام سا مچا ہوا تھا۔ مجھے عالمگیر کی آنکھیں خون کی طرح سرخ دکھائی دیں۔ ایسے لگتا تھا کہ وہ چند گھنٹے پہلے تک دھاڑیں مار مار کر روتا رہا ہے۔ شاید یہ مکافاتِ عمل کی ہی کوئی شکل تھی۔ عالمگیر چاند گڑھی میں اصلی چودھراہٹ کے مزے لے رہا تھا اور من مرضی کے فیصلے کر رہا تھا۔ اس نے دین محمد جیسے شریف النفس بندے کا اور اس کی فیملی کا حقہ پانی بند کر رکھا تھا۔ بے چاروں پر عرصۂ حیات تنگ کیا ہوا تھا اور آج وہ خود زندگی کی شدید ترین کڑواہٹ چکھ رہا تھا۔
میں ڈیرے پر پہنچا تو انیق مجھ سے لپٹ گیا۔ وہ میرے لیے بے حد فکرمند تھا۔ جب شام کے بعد تاجور

گرائینڈر مشین ٹھیک کرانے کے بہانے مجھ سے ملنے آئی تھی تو میں نے انیق کو کمرے سے باہر بھیج دیا تھا اور اسی دوران میں سیالکوٹی کے مسلح افراد آدھمکے تھے۔ مجھے اور انیق کو تنہائی ملی تو ہم سرگوشیوں میں بات کرنے لگے۔ میں نے انیق کو مختصراً اپنی روداد سنائی۔ انیق نے بھی یہاں کے حالات سے آگاہ کیا۔

اس نے بتایا۔ ''ایک سال میں یہ تیسرا ہلا ہے جو سیالکوٹی کے گروہ نے بولا ہے۔ پچھلا ہلا گرمیوں میں ہوا تھا۔ اس میں دو تین بندے زخمی ہوئے تھے مگر اس بار تو ایک بندے کی جان بھی چلی گئی ہے۔ گاؤں والے سخت غصے میں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی جان و مال ہر وقت خطرے میں ہے۔ وہ پولیس والوں پر بھی لعن طعن کر رہے ہیں جو ان لٹیروں کے خلاف کچھ کر نہیں پاتے۔''

''پولیس آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں آئی تو ہے لیکن ویسے ہی جیسے آیا کرتی ہے جب مجرم اپنا کام کر کے اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکے ہوتے ہیں۔ سنا ہے کہ اب شہر سے بھی کچھ پولیس والے یہاں آ رہے ہیں۔ آخر عالمگیر کا بھائی مرا ہے، کوئی معمولی بات تو نہیں۔''

''یہ سجاول سیالکوٹی ہے کیا بلا؟''

''جو کچھ اب تک مجھے پتا چلا ہے جی اس کے مطابق تو وہ مفرور ڈکیت ہی ہے۔ یہاں سے پندرہ بیس میل آگے نکلیں تو پہاڑیاں اور ٹیلے شروع ہو جاتے ہیں۔ بڑا دشوار علاقہ ہے پوٹھوہار کی طرح۔ سیالکوٹی اور اس کے لوگ چاند گڑھی اور آس پاس کے دو تین دیہاتوں میں مار دھاڑ کر کے اس علاقے میں روپوش ہو جاتے ہیں۔ ایک دو دفعہ پولیس نے آپریشن بھی کیا ہے پر نتیجہ کچھ نہیں نکلا۔ بہرحال لگتا ہے، اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔''

''اس لیے کہ عالمگیر کا بھائی مرا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، یہ وجہ بھی ہے۔ اس کے علاوہ پہلے تو یہ لوگ صرف قیمتی چیزوں پر ہی ہاتھ صاف کرتے تھے، کوئی جانی نقصان نہیں پہنچاتے تھے، نہ کسی عورت پر ہاتھ ڈالتے تھے مگر اس دفعہ تو دونوں کام ہوئے ہیں۔''

''کیا مطلب؟''

''انہوں نے ایک لڑکی کے کپڑے پھاڑے اور اسے نوچا کھسوٹا۔ عالمگیر کا بھائی پرویز اس بات پر مشتعل ہو کر سامنے آیا تو انہوں نے اس پر سیدھا فائر کر دیا۔ اس کے علاوہ جو کچھ تاجور بی بی کے ساتھ ہوا ہے اس کا پتا تو آپ کو ہے ہی۔ جس طرح وہ لوگ آپ دونوں کے پیچھے بھاگے تھے اگر خدانخواستہ آپ ان کے ہتھے چڑھ جاتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔''

''تو اب کیا کہہ رہے ہیں لوگ؟''

''یہی کہ یا تو پولیس ان کی حفاظت کی ذمے داری لے یا پھر ان کو ہتھیار دے تا کہ وہ ان لٹیروں سے خود نمٹ سکیں۔''

عید کا سارا ماحول برباد ہو کر رہ گیا تھا۔ اگلے روز بھی چاند گڑھی میں سوگ کی کیفیت رہی۔ عالمگیر کے بھائی پرویز کی میت کو دفنانے سے پہلے اسے ٹریکٹر ٹرالی پر رکھ کر پکی سڑک تک لے جایا گیا اور وہاں کئی گھنٹے تک علاقے کے لوگوں نے مظاہرہ کیا۔ سیالکوٹ سے آئے ہوئے پولیس آفیسرز کی یقین دہانی پر پرویز کو چاند گڑھی میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس موقع پر ایک جمِ غفیر موجود تھا۔ میں نے جلالی طبیعت والے پیر ولایت کو جنازے کے وقت بڑے قریب سے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ وہ گمبھیر آواز میں بولتا تھا اور جب بولتا تھا تو لوگ بڑی توجہ سے سنتے تھے۔ وہ کافی کیم شحیم شخص تھا۔ عمر چالیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کی آنکھیں سرمے سے لبالب بھری ہوئی تھیں اور کوئی تیز قسم کی خوشبو تھی جس نے اسے اپنے حصار میں لیا ہوا تھا۔ وہ اس موقع پر بھی اپنے مطلب کی بات کرنے سے باز نہیں آیا۔ جنازے کے فوراً بعد اس نے لوگوں کے سامنے تقریر کرنے والے انداز میں کہا۔ ''یہ جو کچھ ہمارے پنڈ میں ہو رہا ہے، نحوست کی وجہ سے ہے۔ ہم اپنی مرضیاں کر رہے ہیں اور جب بندہ اپنی مرضیاں کرتا ہے تو پھر اس کی سزا تو بھگتنی ہی پڑتی ہے۔ پورا گاؤں ایک طرف ہے اور صرف ایک گھر ایسا ہے جو اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ میں پنڈ کے ہر بندے پر...... ہر چھوٹے بڑے پر مصیبت کے پرچھاوے دیکھ رہا ہوں۔''

اتنے میں پگڑی والا ایک بندہ اٹھا اور اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''پر سائیں! اگر یہاں یہی کچھ ہوتا رہا تو پھر بہت سے لوگ پنڈ چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ پچھلی بار جب سیالکوٹی نے لوٹ مار کی تھی تو آٹھ دس گھر پنڈ سے نکل گئے تھے۔ اس بار بھی کچھ لوگ کہیں اور جانے کا سوچ رہے ہیں۔ میرے چاچے نے تو آج اپنی زمین بیچنے کے لیے رکھ دی ہے۔ کہتا ہے میں نے یہاں نہیں رہنا۔''

اتنے میں ایک عورت کھڑی ہوئی، اس کے ساتھ اس کا دس بارہ سالہ بچہ بھی تھا۔ عورت نے اپنے بچے کے

کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''پیر سائیں! میرے پتر جیدے نے وہی سب کچھ کہا ہے جو آپ کہتے ہیں۔اس نے کل شام کے تھوڑی دیر بعد وہی دونوں بدشکل زنانیاں دیکھی ہیں۔یہ قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس نے اپنی آنکھوں سے ان دونوں کو قبرستان کے پاس والے ٹبے پر بیٹھے دیکھا ہے۔ انہوں نے لمبے چولے پہن رکھے تھے۔دونوں سگریٹ پی رہی تھیں اور ساتھ ساتھ مٹی کھا رہی تھیں۔یہ ان کو دیکھ کر ڈر گیا اور دوڑتا ہوا گھر آ گیا۔اس کے بعد آدھے پونے گھنٹے کے اندر اندر سیالکوٹی کے لوگ گولیاں چلاتے ہوئے آ گئے۔''

بہت سے افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔پھر پنچایت کے لوگوں نے ان کو چپ کرایا۔

چاند گڑھی کے سیدھے سادے لوگ بہت جلد باتوں میں آ جاتے تھے۔شام تک بہت سے لوگ اسی انداز میں بات کرنے لگے۔یہ لوگ سیالکوٹی کے حملے کو بھی تاجور اور اسحاق کا بیاہ نہ ہونے والے معاملے سے جوڑ رہے تھے۔ اس صورتِ حال کو نحوست قرار دے رہے تھے کہ سب کے کہنے کے باوجود دین محمد کا گھرانا اپنی بات پر اڑا ہوا ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا تھا کہ جب وہ بدصورت عورتیں کسی کو مٹی کھاتی ہوئی نظر آئیں تو گاؤں میں کسی کی موت ہو جاتی ہے۔اگلے روز نو عمر چودھری کی حویلی میں پنچایت ہوئی۔پنچایت میں بھی بہت بڑا ہنگامہ کھڑا ہوا۔پہلوان حشمت بھی وہاں موجود تھا۔ہمیں اس کی زبانی معلوم ہوا کہ پنچوں نے دین محمد اور اس کے بھائیوں پر سخت دباؤ ڈالا ہے اور کسی حد تک ان کو لاجواب بھی کر دیا ہے۔

انیق نے پہلوان سے پوچھا۔''لاجواب کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟''

پہلوان نے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔''پچھلی سے پچھلی پنچایت سردیوں کی شروعات میں ہوئی تھی۔اس پنچایت میں دین محمد کے منہ سے جوش میں ایک بات نکلی تھی۔اس نے کہا تھا کہ وہ مولوی فدا صاحب کی بات کے علاوہ کسی کی بات ناہیں مانتا۔اگر مولوی صاحب ایک بار کہہ دیویں کہ پنڈ کے گھروں میں خون کے جو چھینٹے نظر آوت ہیں اور جو پتھر پڑت ہیں ان کی وجہ میری بیٹی ہے تو میں ہر بات مان لوں گا۔''

''ہاں یہ بات تو کہی تھی اس وقت مالک نے۔'' حق نواز نے تائید کی۔

''بس اب وہی بات دین محمد کے گلے پڑ رہی ہے۔''

پہلوان حشمت بولا۔''اس وقت مولوی صاحب کی رائے کچھ اور تھی مگر اب آہستہ آہستہ وہ کچھ اور کہنا شروع ہو گئے ہیں۔پنچوں نے کل شام مولوی جی کو بھی پنچایت میں بلایا ہے۔مجھے تو لگت ہے کہ دین محمد اب تاجور کی شادی والے معاملے کو اور زیادہ ناہیں ٹال سکے گا۔وہ کیا کہوت ہیں...... بکرے کی ماں کب تک دودھوں نہائے گی۔''

سنجیدہ گفتگو ہو رہی تھی اس کے باوجود پہلوان حشمت کے محاورے پر انیق اپنی مسکراہٹ نہیں روک سکا۔پہلوان نے کڑے تیوروں سے کہا۔''تم کیوں بتیسی نکال رہے ہو؟''

انیق نے کہا۔''معافی چاہتا ہوں۔آپ نے پھر دو محاوروں کو ایک کر ڈالا ہے۔''

''کون سے دو محاورے؟''

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی...... اور دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو۔''

حشمت نے انیق کو گھورا اور خشک لہجے میں بولا۔ ''ویسے تم کوئی اتنے بابائے اردو ناہیں جتنا خود کو سمجھتے ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو یہاں اس گونگے کے ساتھ مل کر گھاس نہ کاٹ رہے ہوتے۔''

اس سے پہلے کہ انیق جواب میں کچھ کہتا' دائیں جانب شور سنائی دیا۔بہت سے افراد کسی کو گھسیٹتے اور مارتے ہوئے حویلی کی طرف لے جا رہے تھے۔پتا چلا کہ اس شخص پر سیالکوٹی کا ساتھی ہونے کا شک ہے۔عالمگیر کے کارندوں نے اسے قریبی گاؤں روہی والا سے پکڑا ہے۔اب اسے پولیس چوکی لے کر جا رہے ہیں۔یہی لگ رہا تھا کہ بھائی کی موت کے بعد عالمگیر جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا ہے اور سیالکوٹی سے بدلہ لینے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

اس شخص کو دیکھنے کے لیے ہم بھی کمرے سے نکل کر موقع پر پہنچے۔یہ ایک جواں سال شخص تھا۔جھاڑ جھنکاڑ داڑھی تھی۔کپڑے پھٹ گئے تھے اور جسم پر جگہ جگہ تازہ چوٹوں کے نشان تھے۔پتا چلا کہ اس بندے سے پستول بھی برآمد ہوا ہے۔میں نے اس کا پاؤں دیکھا۔وہ سوج کر کپا ہو رہا تھا۔ٹخنے سے ذرا اوپر کس کر رسی باندھی گئی تھی۔ٹخنے پر زخم کا نشان بھی دکھائی دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' انیق نے پہلوان سے پوچھا۔

''مجھ کو لگت ہے کہ اس کو سانپ نے بھی کاٹا ہے۔''

وہ شخص نیم بے ہوش ہو چکا تھا پھر بھی اس کی دھنائی جاری تھی۔اس کا بالائی جسم گرد اور خون میں لتھڑ گیا تھا۔وہ

لوگ اسے لے کر آگے چلے گئے تو ایک شخص نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگائے اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''واہ میرے مولا! تیری قدرت...... اور واہ پیر سائیں تیری کرامت۔''

میں نے انیق کو ٹہوکا دیا۔ اس نے دیہاتی سے پوچھا۔ ''کیا اسے پیر سائیں نے پکڑوایا ہے؟''

''انہوں نے نہیں پکڑوایا لیکن ان کی وجہ سے ہی پکڑا گیا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں اس کو سانپ نے کاٹا ہے۔'' وہ بولا۔

انیق مزید وضاحت چاہ رہا تھا جب حق نواز نے اس کا بازو دبا کر اسے خاموش کر دیا۔

انیق خاموش ہو گیا۔ لمبا تڑنگا دیہاتی آگے چلا گیا۔ حق نواز نے کہا۔ ''مجھے ڈر تھا کہ کہیں تم پیر ولایت کے بارے میں کوئی الٹی سیدھی بات نہ کہہ دو۔ چاند گڑھی میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو پیر کے خلاف چھوٹی سی بات سن کر بھی مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔''

''یہ سانپ کے کاٹنے والی کیا بات کہہ رہا تھا؟'' انیق نے پوچھا۔

''پیر ولایت نے بہت سے سانپ بھی پال رکھے ہیں۔ کئی لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیر جی رات کے وقت کچھ سانپوں کو کھلا چھوڑ دیتے ہیں اور یہ سانپ پنڈ کے اردگرد گھوم کر پنڈ کا پہرا دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے سیالکوٹی کے اس ساتھی کو پکڑا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ بھاگنے لگا تھا مگر پھر اسے سانپ نے کاٹ لیا اور یہ گر کر تڑپنے لگا۔''

''سبحان اللہ!'' انیق نے جذباتی انداز میں اپنا سر ہلا کر پیر ولایت کے لیے ''عقیدت'' کا اظہار کیا۔

اگلے روز جو پنچایت ہوئی وہ دین محمد اور تاجور وغیرہ کے لیے سخت تباہ کن تھی۔ اس پنچایت میں مولوی جی کو بھی بلایا گیا تھا۔ پنچایت کے بعد سرپنچ نے دین محمد کو دوٹوک فیصلہ سنا دیا۔ اسے فوراً تاجور کی شادی کی تیاری کرنا تھی اور دو ہفتوں کے اندر اندر اس کا ہاتھ اسحاق کے ہاتھ میں تھما دینا تھا۔ دوسری صورت میں یہ پنچایت کی اور گاؤں کے معززین کی ذمے داری تھی کہ وہ گاؤں پر سے سخت نحوست ٹالنے کے لیے خود کارروائی کریں اور تاجور کو اسحاق کے ساتھ رشتۂ ازدواج میں باندھیں۔

یہ بڑی نازک صورتِ حال تھی۔ گاؤں میں سیالکوٹی کے حملے اور پرویز کی موت کی وجہ سے پہلے ہی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اب پنچایت کے اس حتمی فیصلے نے اور بھی سنسنی پھیلا دی۔

میری نگاہوں میں تاجور کی من موہنی صورت گھومنے لگی۔ سیالکوٹی والے واقعے کے بعد سے وہ مجھے دکھائی نہیں دی تھی مگر اس کا تصور تو پلک جھپکتے میں میرے سامنے آ جاتا تھا۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں مجھ سے پوچھنے لگی۔ کیا آپ بھی کچھ نہیں کریں گے شاہ زیب؟ کیا آپ بھی یہاں صرف میری بربادی کا تماشا دیکھنے ہی آئے ہیں؟ کیا میں پرانے زمانے کی کسی زرخرید لونڈی کی طرح آپ سب کی آنکھوں کے سامنے ایک بے رحم مرد کے حوالے کر دی جاؤں گی؟

اس رات میں نے پھر اپنا ٹرنک نما صندوق کھولا جو میرے لیے عمرو عیار کی زنبیل کی حیثیت رکھتا تھا اور جس میں میرے کام کی بہت سی چیزیں پوشیدہ تھیں۔ میں نے اپنا وہی سیاہ ڈھاٹے والا کاسٹیوم پہنا۔ جیکٹ کو الٹ کر زیب تن کیا اور اس کی جیب میں اعشاریہ 38 کا پستول رکھ کر نکل کھڑا ہوا۔ اس کے علاوہ میں نے .... ایک سرنج بھی اپنی جیب میں رکھ لی۔ آج میں پھر مولوی فدا کے گھر جا رہا تھا۔ پچھلی مرتبہ تو مولوی صاحب کے گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی ان سے ملاقات ہو گئی تھی۔ (تب مولوی صاحب اور ان کا شاگرد طارق صدقے کی بکری اور گھی وغیرہ لے کر بیارو کرم کے ہاں جا رہے تھے اور میں بھی ان کا تعاقب کرتا ہوا کرم کے گھر جا پہنچا تھا) مگر اب یہی لگ رہا تھا کہ مجھے مولوی صاحب کو میزبان بنانے کا شرف حاصل ہو جائے گا۔ یہ بات مجھے آج شام ہی معلوم ہو گئی تھی کہ مولوی صاحب کی بچی زینب ایک دن کے لیے ان کے پاس آئی ہوئی ہے۔ میں اصل میں تو اس بچی سے ہی ملنا چاہتا تھا۔

میں ایک ایسی چادر میں لپٹا ہوا تھا جو میرے گھٹنوں سے نیچے تک جاتی تھی۔ میرا ڈھاٹا، جیکٹ اور پتلون سب کچھ اس چادر نے ڈھانپ رکھا تھا۔ یہ رات کے قریباً گیارہ بجے کا وقت تھا۔ گاؤں کے اکثر گھروں کی چار دیواریاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ مولوی فدا کے گھر کی باؤنڈری بھی پانچ فٹ کے قریب تھی اور کچی مٹی کی بنی ہوئی تھی۔ میں بہ آسانی اسے پھاند کر اندر داخل ہو گیا۔ گھر کا سروے میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ گاؤں کے اکثر گھروں کی طرح مولوی فدا کے گھر کی چھت میں بھی ایک بڑا سوراخ موجود تھا۔ ایسے سوراخ عام طور پر لکڑی یا ٹین وغیرہ کے ڈھکن سے ڈھانپ دیے جاتے ہیں۔ ایسے سوراخوں کو ''مگ'' کہا جاتا ہے۔ یہ عام طور پر روشنی کے لیے رکھے جاتے ہیں یا پھر جب چھتوں

پر اناج وغیرہ سکھایا جاتا ہے تو ان سوراخوں کے ذریعے کمرے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ بڑی سادگی والی بات تھی کہ گھروں میں ناجائز طور پر گھسنے کے لیے خود ہی ایک راستہ فراہم کر دیا جاتا تھا۔ بہرحال آج رات یہ راستہ میرے کام آرہا تھا۔ میں کچھ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر پہنچا۔ مگ پر لوہے کی چادر کا ڈھکن تھا اور اوپر تین چار اینٹیں وزن کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ میں نے آواز پیدا کیے بغیر ڈھکن ہٹایا اور مگ یعنی سوراخ کے کنارے سے لٹک کر ایک تاریک کمرے میں کود گیا۔ یہاں دائیں بائیں دو کمرے اور موجود تھے۔ ایک کمرے میں لالٹین کی بہت مدھم روشنی تھی۔ یہاں مولوی فدا کی نوجوان بیوی لحاف اوڑھے سورہی تھی۔ بچی زینب بھی اس کے ساتھ ہی لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے دبلے پتلے چہرے سے میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ لحاف اس کے جسم سے سرکا ہوا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن میں عمر سے کچھ پہلے ہی بلوغت کے آثار نمودار ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر میں بائیں طرف والے کمرے میں پہنچا جہاں مولوی فدا ایک پلنگ پر محوِ استراحت تھے۔ میں نے درمیانی دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے سے ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ مولوی صاحب کسمسائے پھر انہوں نے گھبرا کر کہا۔ ''کون ہے؟''

میں نے لپک کر ان کا منہ اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ ان کے توانا جسم میں کافی زور تھا مگر میری گرفت ایسی تھی کہ وہ جنبش بھی نہ کر پائے۔ انہوں نے مدھم روشنی میں میرا سراپا دیکھ لیا تھا اور یقیناً پہچان بھی لیا تھا کہ رام پیاری اور وکرم کے گھر میں، میں ان سے شرفِ ملاقات حاصل کر چکا ہوں۔ میں نے بڑی دھیمی لیکن ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔ ''مولوی جی! میں یہاں دشمن نہیں دوست بن کر آیا ہوں۔ آپ نے رام پیاری کے گھر میں مجھے اپنے بارے میں جو کچھ بتایا تھا میں نے اس پر یقین کیا ہے اور اب...... اسی سلسلے میں آپ سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔''

مولوی فدا کا خوف جتنی تیزی سے بڑھا تھا اتنی ہی سرعت سے کم بھی ہو گیا۔ میں نے ان کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا۔ وہ ہانپتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگے۔

''تت...... تم یہاں بھی پہنچ گئے ہو۔ آخر کیا چاہتے ہو تم؟''

''وہی جو کچھ آپ چاہتے ہیں۔ موجودہ مصیبت سے آپ کا چھٹکارا۔ تاکہ آپ پھر اطمینان وسکون کی زندگی کی طرف آسکیں اور آپ کو اپنے ضمیر کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''

''لیکن پہلے پتا تو چلے تم ہو کون۔ اگر تم راہِ راست پر ہو تو پھر اپنا آپ چھپا کیوں رہے ہو؟''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا آپ کو آم کھانے سے مطلب ہونا چاہیے پیڑ گننے سے نہیں۔''

''تم کہتے ہو کہ دوست اور ہمدرد کی حیثیت سے آئے ہو، لیکن تم نے وہاں طارق کے ساتھ کیا کیا۔ پہلے اسے زخمی کیا پھر اس کے گھر میں گھسے اور اسے ڈرا دھمکا کر اس سے اقبالی بیان دلوا دیا۔ اب وہ جیل میں ہے۔''

''اس کی بات چھوڑیں۔ اگر وہ جیل پہنچا ہے تو اپنی غلطی سے۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ سب کچھ سچ بتائے گا تو میں ہر طرح اس کی مدد کروں گا اور ہوسکتا ہے کہ اسے صاف ہی بچالوں لیکن اس نے حماقت کی۔ بھاگ کھڑا ہوا اور پولیس کے ہتھے چڑھ گیا۔ چلو اچھا ہے۔ اس نے جو جرم کیا اس کی سزا اسے مل جائے گی۔ ہوسکتا ہے کہ دو ڈھائی سال بعد جیل سے باہر آجائے۔ آپ خود ہی تو اپنے خطبوں میں کہتے ہیں کہ آخرت کی سزا بہت سخت ہوگی۔ اس لیے دنیا میں ہی حساب صاف کرالیا جائے تو بہتر ہے۔''

''اس نے جو کچھ کیا، وہ اپنے طور پر کیا۔ اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ میرے علم میں ہوتا تو...... اسے کبھی ایسا نہ کرنے دیتا۔''

''آپ اپنی صفائی پیش کر کے مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ میں بڑی اچھی طرح جان گیا ہوں آپ زیادتی کر نہیں رہے بلکہ زیادتی سہہ رہے ہیں۔ آپ کی بچی کی جو صورتِ حال ہے وہ مجھے طارق سے معلوم ہوگئی ہے اور یہ سب کچھ واقعی تکلیف دہ ہے، بہت زیادہ تکلیف دہ۔''

مولوی فدا کی آنکھوں میں نمی تیر گئی۔ پستول میرے ہاتھ میں تھا، وہ میں نے لاک کر کے جیکٹ کے اندر رکھ لیا اور مولوی جی کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو آپ اس شکنجے سے نکلیں گے جس میں عالمگیر اور پیر ولایت جیسے لوگ آپ کو کس رہے ہیں۔''

''میں طارق کے بارے میں بڑا فکر مند ہوں۔ اگر نمبردارنی کو کچھ ہو گیا تو وہ تو پھانسی لگ جائے گا۔''

''آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے کہ نمبردارنی کو ہوش آگیا ہے اور اب وہ خطرے سے باہر ہے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' مولوی جی نے اوپر دیکھتے

ہوئے کہا اور پھر آنکھوں کی نمی پونچھی۔ ان کی آنکھیں دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ سونے سے پہلے دیر تک روتے رہے ہیں۔ میں جوں جوں ان کو جان رہا تھا ان کے بارے میں میری رائے تبدیل ہو رہی تھی۔ مجھے اپنے ان سابقہ خیالات پر افسوس ہو رہا تھا جو میرے ذہن میں مولوی صاحب کے حوالے سے موجود رہے تھے اور تاجور وغیرہ کے ذہن میں اب بھی موجود تھے۔

مولوی صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''طارق نے تمہیں میری بچی کے بارے میں کیا بتایا ہے؟''

''وہ سب کچھ جو میرے لیے جاننا ضروری ہے لیکن آپ اس بارے میں بالکل بے فکر رہیں۔ میں نے طارق سے وعدہ کیا تھا اور اب آپ سے بھی کرتا ہوں کہ آپ کی بچی کا معاملہ اس وقت تک راز میں رہے گا جب تک آپ نہ چاہیں گے۔''

اس کمرے میں لالٹین کی دھیمی روشنی میں میرے اور مولوی فدا کے درمیان قریباً آدھ گھنٹے تک سرگوشیوں میں بات ہوئی۔ ہمارے درمیان ایک بالکل دوستانہ ماحول بن گیا۔ مجھے لگا کہ میری شناخت کے بارے میں بے حد تجسس کا شکار ہونے کے باوجود وہ مجھ پر بھروسا کر رہے ہیں۔ گاؤں کے دیگر لوگوں کی طرح مولوی صاحب کا خیال بھی شاید یہی تھا کہ میں پولیس، رینجرز یا آرمی کا کوئی بندہ ہوں اور بھیس بدل کر گاہے بگاہے چاند گڑھی میں وارد ہو رہا ہوں۔

میری درخواست پر مولوی جی بچی زینب کو جگا کر میرے سامنے لانے پر رضامند ہو گئے۔ انہوں نے دوسرے کمرے میں جا کر پہلے اپنی بیوی کو اور پھر بچی کو جگایا۔ پانچ دس منٹ انہیں سمجھانے اور تسلی دینے میں لگائے۔ بہرحال اس دوران میں، میں کسی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے بھی تیار رہا۔ کچھ دیر بعد مولوی جی بچی کو لے کر میرے پاس آ گئے۔ وہ ڈری سہمی تھی۔ اس نے دوپٹا بڑی مضبوطی سے اپنے چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔ وہ خاص طور سے اس بات پر پریشان تھی کہ میں نے ڈھاٹا باندھ رکھا تھا اور میرا چہرہ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ مولوی فدا نے بچی کا خوف کم کرنے کے لیے کہا۔ ''زینب! سمجھو یہ تمہارے چاچا ہیں۔ بہت اچھے ہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ تمہاری بیماری بالکل دور ہو جائے گی۔ ایک دم چنگی بھلی ہو جاؤ گی تم۔ شہر میں کوئی بہت بڑے ڈاکٹران کے جاننے والے ہیں......''

زینب کی سہمی سہمی نگاہیں بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ مولوی صاحب نے بچی کی کیفیت بھانپتے ہوئے کہا۔ ''زینب! اصل میں یہاں گاؤں میں ان کی دو چار لوگوں سے دشمنی ہے، ان سے بچنے کے لیے ہی انہوں نے اپنا چہرہ چھپایا ہوا ہے۔ ان سے ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

میں نے زینب سے اس کی طبیعت کے بارے میں پوچھا۔ وہ بولی۔ ''اب میں بالکل ٹھیک ہوں چاچا جی۔''

''لیکن اگر تمہیں دو چار دن یہاں اپنے ابا جی کے گھر میں رہنا پڑے گا تو تمہاری طبیعت پھر خراب ہو جائے گی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''مجھے نہیں پتا جی۔''

''تم کیا محسوس کرتی ہو۔ کیا اداس ہو جاتی ہو...... یا یہاں تمہیں کسی طرح کا ڈر لگنے لگتا ہے یا پھر کسی چیز کی کمی محسوس ہونے لگتی ہے؟''

''مجھے نہیں پتا۔ بس میری طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ دم گھٹتا ہے۔'' اس نے ذرا خشک لہجے میں کہا۔

یوں لگتا تھا کہ بیماری کا ذکر اسے پریشان کر رہا ہے۔ میں نے نوٹ کیا کہ وہ ذرا کھینچ کر سانس لینے لگی ہے۔

میں نے موضوع بدل دیا اور پھر باتوں کے ذریعے

اسے آمادہ کرلیا کہ وہ سرنج کے ذریعے مجھے اپنے خون کا نمونہ لینے دے، کچھ ہچکچاہٹ کے ساتھ اس نے بازو پر سے آستین اٹھائی اور میں نے نس میں سے اس کا بلڈ سیمپل لے لیا۔ میں نے بچی کے سر پر پیار دیا اور وہ رخصت ہو کر اپنی ماں کے پاس دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ مولوی جی کو کچھ ضروری ہدایات دے کر میں ان کے گھر سے واپس آ گیا۔ میرے اور مولوی جی کے درمیان یہ بھی طے ہوا کہ ہمارے رابطے کا علم کسی تیسرے فرد کو نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھے جب بھی ضرورت پڑی میں اسی حلیے میں مولوی صاحب کے گھر آؤں گا اور وہ مجھ سے بات کریں گے۔

اگلے روز صبح سویرے میں نے انیق کو دین محمد صاحب سے چار دن کی چھٹی لے دی۔ یہ چھٹی قریبی عزیزہ کی فوتگی کے بہانے سے لی گئی تھی۔ انیق چاند گڑھی کے اس دور دراز دیہہ سے ڈسکے اور ڈسکے سے لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔ انیق کے پاس زینب کے خون کا نمونہ موجود تھا۔

☆☆☆

انیق کو واپس آنے میں پانچ دن لگے۔ ان پانچ دنوں میں چاند گڑھی کے حالات کافی دگرگوں رہے جس بندے کو سیالکوٹی کا ساتھی ہونے کے شک میں پکڑا گیا تھا، وہ جانبر نہ ہو سکا۔ تحصیل اسپتال میں اس کی موت واقع ہو گئی۔ یہ عالمگیر وغیرہ کے لیے بڑا نقصان تھا۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اس بندے کے ذریعے وہ سیالکوٹی کے موجودہ ٹھکانے تک رسائی حاصل کر سکیں گے۔

دوسری طرف تاجور کے حوالے سے بھی گاؤں میں ہلچل کی کیفیت تھی۔ آٹھ نو دن باقی رہ گئے تھے اور اس دوران میں پنچایت کے فیصلے پر عمل درآمد ہونا ضروری تھا۔ اس وقت صورتِ حال مزید سنگین ہو گئی جب پتا چلا کہ دین محمد اور اس کے گھر والے خاموشی سے گاؤں چھوڑنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اب پتا نہیں کہ یہ افواہ تھی یا اس میں کچھ سچائی بھی تھی، بہرحال گاؤں کے سرپنچ غلام قادر نے فوراً حکم صادر کیا اور دین محمد کے گھر کے قریب پہرا بٹھا دیا گیا۔ اڑوس پڑوس والوں کو بھی تاکید کر دی گئی کہ وہ گھر والوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں۔ یہ صورتِ حال کسی طور پر قابلِ قبول نہیں تھی۔

میں کوئی بھی براہِ راست قدم اٹھا سکتا تھا اور میں خود کو اس قابل سمجھتا تھا کہ تاجور کو اس سنگین ترین صورتِ حال سے بچا سکوں۔ میرے اندر محبت کی طاقت تھی۔ اور یہ طاقت کسی پہاڑی دریا کی طرح ہر رکاوٹ کو بہا لے جانے

کی صلاحیت رکھتی تھی۔ میں ایسے بہت سے مرحلوں سے گزر چکا تھا۔ کوپن ہیگن، لندن اور روم جیسے شہروں میں، میں نے بہت سی قیامتیں اپنے سینے پر جھیلی تھیں۔ یہ میری زندگی کا وہ تہلکہ خیز باب تھا، جس کے کم سے کم ورق پلٹنے کی میں خواہش رکھتا تھا۔

انیق نے چاند گڑھی واپس آنے کے بعد جو کچھ بتایا اس نے صورتِ حال کو ایک بالکل نیا رخ دے دیا۔ انیق لاہور کے بعد اسلام آباد پہنچا تھا۔ وہاں کے ایک ماہر فزیشن کے مشورے سے اس نے ایک بہترین لیبارٹری میں زینب کے خون کے ٹیسٹ کرائے تھے۔ یوں تو اس نے پہلے دین محمد نے بھی لاہور میں زینب کا خون وغیرہ ٹیسٹ کرایا تھا مگر وہ ابتدائی نوعیت کے ٹیسٹ تھے۔ انیق نے اسلام آباد میں خون کا جو تجزیہ کروایا اس نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا۔ زینب کے خون میں دو تین غیر معمولی تبدیلیاں پائی گئیں۔ ان میں سے ایک اہم تبدیلی خون میں ہیڈی ٹاکسن نامی کیمیکل کا پایا جانا بھی تھا۔ یہ ہیڈی ٹاکسن سانپ کے زہر میں بکثرت پایا جاتا ہے۔ یہ کوبرا سانپ کے زہر کا بھی ایک اہم جزو ہوتا ہے۔ خون کے خصوصی معائنے سے اس عنصر کی موجودگی سامنے آئی تھی۔

انیق کی فراہم کردہ رپورٹ پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں شعلہ سا لپک گیا۔ مجھے چھ سات دن پہلے کا وہ واقعہ یاد آ گیا جب ملک عالمگیر کے کارندے ایک مشکوک بندے کو مارتے پیٹتے حویلی لے جا رہے تھے۔ اسے سانپ نے ڈسا ہوا تھا۔ بعد ازاں ایک شخص کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ پیر ولایت نے کچھ سانپ بھی پال رکھے ہیں اور ان میں سے کچھ خاص قسم کے سانپ گاؤں کا ''پہرا'' دیتے ہیں۔

تو کیا زینب کی اس رپورٹ اور پیر ولایت کے پالتو سانپوں میں کچھ تعلق تھا؟

انیق بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، بولا۔ ''میں نے لاہور میں ایک کیمسٹ اور ایک سنیاسی سے بھی اس بارے میں تھوڑی سی بات کی ہے۔ ان لوگوں کی گفتگو سے پتا چلتا ہے کہ بعض لوگ سانپوں کے زہر کو نشے کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کے بارے میں تو یہ کہا جاتا ہے کہ وہ براہِ راست خود کو سانپوں سے ڈسواتے ہیں لیکن یہ بات تو طے شدہ ہے کہ سانپ کے زہر کو نشہ آور ادویات اور نسخوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔''

''تو کیا عالمگیر کے گھر میں اس بچی کے ساتھ بھی یہی کچھ ہو رہا ہے؟''

"یہ بالکل ممکن ہے جی۔ آپ نے فلم ناگ منی دیکھی تھی؟"

"یار! یہ سنجیدہ بات ہے۔ خوامخواہ پٹری نہ بدلا کرو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"سوری سر۔" وہ جلدی سے بولا۔ "دراصل میرا دھیان بار بار عالمگیر اور پیر ولایت کے گٹھ جوڑ کی طرف جارہا ہے۔ عین ممکن ہے کہ پیر ولایت نے ہی عالمگیر کو کوئی ایسی چیز دی ہو جو زینب کو اندر ہی اندر تباہ کررہی ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر زینب کو کوئی ایسی چیز کھلائی جارہی ہے تو وہ بتاتی کیوں نہیں؟ کیا وہ خود بھی اس کھیل میں شریک ہوچکی ہے؟"

"نہیں۔ میرا خیال کچھ اور ہے انیق...... بہت ممکن ہے کہ یہ سب کچھ اس کی لاعلمی میں ہورہا ہو۔ اسے کھانے میں ملاکر چپکے سے کچھ دے دیا جاتا ہو...... یقیناً ایسا ہی ہے۔" میں اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کڑیاں آپس میں مل رہی تھیں۔ معما حل ہورہا تھا۔

زینب بے خبری میں کسی خطرناک نشے کی عادی ہورہی تھی۔ وہ عالمگیر کے گھر میں ہوتی تھی تو خوب چوکس اور ہشاش بشاش نظر آتی تھی لیکن جب عالمگیر کے گھر میں نہیں ہوتی تھی تو نشے کی ڈوز سے محروم ہوجاتی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہورہا ہے۔ اس کے اعصاب جواب دینے لگتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی آسیب کا شکار ہوگئی ہے۔ دو تین دن کے اندر اس کی حالت پتلی ہوجاتی تھی۔

انیق نے پریشان لہجے میں کہا۔ "یہ عالمگیر کوئی اچھا بندہ تو نہیں۔ اس نے بچی کو جس طرح نشے کا غلام بنارکھا ہے وہ اس کے ساتھ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اب نہیں تو ایک ڈیڑھ سال بعد وہ ایک نوخیز لڑکی کا روپ دھارلے گی۔"

"سب کچھ ہوسکتا ہے...... اور اب جو کچھ ہورہا ہے وہ بھی کچھ کم سنگین نہیں ہے۔ اس بچی کے ذریعے مولوی صاحب کو بلیک میل کیا جارہا ہے اور یہ بلیک میلنگ اتنی کارگر ہے کہ مولوی صاحب جیسا بے باک اور سچا آدمی بھی تاجور کے حوالے سے پیر ولایت کی زبان بولنے پر مجبور ہوگیا ہے۔ اس گاؤں میں مولوی صاحب کی رائے کی بڑی اہمیت ہے اور اب وہ بھی گاؤں پر نحوست کی بات کررہے ہیں۔ دو بدصورت عورتوں کے گشت کی تصدیق کررہے ہیں۔"

وقت بہت کم تھا۔ ہمیں جلد از جلد کچھ کرنا تھا۔ ورنہ چاندگڑھی والوں کی اکثریت تو اس بات پر تلی ہوئی تھی کہ روتی چلاتی تاجور کو بھی باندھ کر اسحاق کے حوالے کردیا جاتا۔

اس شب میری اور مولوی فدا کی ملاقات پھر ہوئی۔ میری جیب میں اس وقت بیس ہزار کی رقم بھی تھی۔ میں حسب سابق اپنے ڈھاٹے والے لباس میں تھا۔ میری دستک پر مولوی فدا نے میری آواز پہچانی اور دروازہ کھول دیا۔ ہم اندرونی کمرے میں آن بیٹھے۔ میرا ڈھاٹے میں پوشیدہ چہرہ مولوی صاحب کو الجھن میں مبتلا کرتا تھا۔ اس کے باوجود وہ بڑی حد تک مجھ پر بھروسا کرنے لگے تھے۔

میں نے کہا۔ "مولوی جی! میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے ایک بات صاف صاف بتائیں۔ اگر زینب ٹھیک ہوجاتی ہے اور آپ کی یہ مجبوری ختم ہوجاتی ہے کہ آپ اسے ملک عالمگیر کے گھر رہنے کے لیے بھیجیں، تو پھر آپ کا رویہ کیا ہوگا؟"

"مم...... میں سمجھا نہیں۔"

"مولوی جی! چاندگڑھی میں آپ کی رائے کی بڑی قدر ہے۔ یہ آپ کی بدلی ہوئی رائے ہی ہے جس کے بعد گاؤں کی اکثریت دین محمد کے بجائے اسحاق اور عالمگیر وغیرہ کا ساتھ دینے لگی ہے اور آپ بھی اچھی طرح جانتے

فقیری اندازے

بعض فقیر تو اپنے "سخی" کو اپنے غلط اندازے کی وجہ سے ناراض بھی کر بیٹھتے ہیں۔ لبرٹی مارکیٹ میں فقیروں کو فوج کے ایک "رنگروٹ" نے کار میں بیٹھی ایک خوب صورت خاتون سے امداد کے لیے کہا تو اس مردم بیزار قسم کی خاتون نے تختی سے کہا۔ "بابا معاف کرو۔" اس پر اس نے ڈرائیور والی سیٹ پر بیٹھے کالے بھجنگ سے شخص کو مخاطب کیا اور کہا۔ "بھاء ڈرائیور تم ہی اپنے اس غریب بھائی کی کچھ مدد کرو۔" اور بھاء ڈرائیور اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا کیونکہ وہ ڈرائیور نہیں اس حسینہ کا شوہر تھا، تب اس فقیر پہ کھلا کہ اس کے برابر میں بیٹھی ہوئی حسینہ اتنی مردم بیزار کیوں تھی؟

ایک اسی طرح کے نالائق فقیر کی تو پٹائی بھی ہوگئی تھی جس نے ایک بزرگ کے ساتھ ایک نوعمر لڑکی کو دیکھ کر دعا دی۔ "اللہ تمہاری بیٹی کے ہاتھ پیلے کرے۔" جبکہ یہ باپ بیٹی نہیں، میاں بیوی تھے، کئی دفعہ اس طرح کے ناتجربہ کار فقیر بہن بھائی کو یہ دعا دے بیٹھتے ہیں۔ "اللہ جوڑیاں سلامت رکھے۔" اور پھر اس کا خمیازہ بھی بھگتتے ہیں!

ولید بلال کی جستجو عطاالحق قاسمی کی کتاب "تنازہ و نامنع ہے" سے اقتباس

ہیں کہ آپ کی یہ نئی رائے غلط ہے اور اس کی وجہ آپ کی مجبوری ہے۔"

"تم ...... کیا کہنا چاہتے ہو بھائی؟"

"اگر زینب والی مجبوری بالکل ختم ہو جائے اور یہ بھی ثابت ہو جائے کہ آپ کو گھیرنے کے لیے زینب کی بیماری کو استعمال کیا جا رہا تھا تو آپ اپنی پہلے والی رائے پر واپس آ جائیں گے۔ یعنی...... لڑکی کی مرضی اور رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہو سکتا؟"

مولوی صاحب کے چہرے پر کرب بڑھ گیا۔ انہوں نے سر جھکایا اور اپنا ماتھا پکڑ لیا۔

میں نے کہا۔ "یہ بڑا نازک معاملہ ہے مولوی جی۔ آپ کی رائے کی وجہ سے بے قصور لڑکی کی زندگی تباہ ہو رہی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہوگا آپ پر۔"

وہ نمناک لہجے میں بولے۔ "میں سمجھتا ہوں...... سب سمجھتا ہوں۔ مجھے زینب کے لیے کوئی اور چارہ نظر نہیں آتا۔ تم نے اس کی حالت نہیں دیکھی ہے۔ تمہیں کیا پتا ہم پر کیا گزرتی ہے۔"

"میں نے اس کی حالت دیکھی ہے اور یہ بھی دیکھ رہا ہوں پورے یقین کے ساتھ کہ وہ اب ٹھیک ہونے جا رہی ہے۔ شہر سے خون کی رپورٹس آ گئی ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ان رپورٹس نے عالمگیر کا سارا بھانڈا پھوڑ دیا ہے...... شاید آپ کو یہ بات "بے وقت" لگے لیکن میں اعتماد کے ساتھ آپ کو آپ کی بچی کی صحت کی پیشگی مبارکباد دے سکتا ہوں۔"

مولوی جی نے اپنا سر اٹھایا اور نم آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگے۔

اگلے آدھ گھنٹے میں ہم دونوں کے درمیان جو گفتگو ہوئی وہ بے حد نتیجہ خیز تھی۔ مولوی جی ششدر تھے۔ اس گفتگو کے آخر میں، میں نے بے حد اصرار کے ساتھ بیس ہزار روپیا مولوی جی کی جیب میں ڈال دیا تھا اور کہا کہ وہ کل ہی زینب کو لے کر اسلام آباد روانہ ہو جائیں۔ میں نے انہیں ایک نہایت قابل ڈاکٹر کا ایڈریس بھی دیا۔ یہ ایڈریس میں نے آج ہی بذریعہ فون اپنے بہی خواہ داؤد بھاؤ سے حاصل کیا تھا۔ (داؤد بھاؤ اس بات پر بہت خوش تھا کہ میں ابھی تک پاکستان میں ہوں۔ میرے نزدیک داؤد بھاؤ ایک بالکل صاف ہاتھوں والا بدمعاش تھا اور اس کے یہ "صاف ہاتھ" بہت لمبے بھی تھے۔ اس نے مولوی جی کے سلسلے میں مجھ سے ہر طرح کے تعاون کا وعدہ بھی کیا تھا۔ ایمرجنسی کی صورت میں مجھے جو زبردست معاون ملا ہوا تھا وہ بھی بھاؤ کی دین تھا)

میں نے کہا۔ "مولوی جی! یہ عالمگیر اور اسحاق کی سوچی سمجھی سازش ہے۔ شاید وہ پہلے سے جانتے تھے کہ اس طرح کے حالات پیدا ہونے والے ہیں۔ انہوں نے پچھلے سال ڈیڑھ سال میں زینب کو بتدریج نشے کی طرف راغب کیا اور اس کی بے خبری میں ایک نہایت خطرناک نشہ اس کے اندر اتارتے رہے ہیں۔ میں آپ کو مشورہ دیتا ہوں آپ بے خوف و خطر ان کی اس سازش کا بھانڈا پھوڑ دیں۔ چاند گڑھی والوں کو بتا دیں کہ بچی کی اصل بیماری اور بیماری کی جڑ کیا ہے۔"

مولوی جی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بولے۔ "اگر تم ٹھیک بھی کہہ رہے ہو تو جھیل میں رہ کر مگرمچھ سے بیر کیسے کیا جا سکتا ہے؟"

میں نے بڑے اطمینان سے مولوی صاحب کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ اس بارے میں ایک فیصد شک بھی نہ کریں کہ زینب ٹھیک نہیں ہوگی۔ انشاء اللہ آپ چند روز یا دو تین ہفتوں میں اسے پہلے کی طرح ہنستا مسکراتا دیکھیں گے۔ باقی رہی مگرمچھ والی بات، تو یہ سمجھیں کہ اس جھیل کا مگرمچھ اب کوئی اور نہیں میں ہوں۔ میں دیکھ لوں گا ان سب کو۔ کوئی آپ کا بال بھی بیکا کرے تو میں ذمے دار ہوں۔ آپ مجھ پر پورا بھروسا کریں اور دل بڑا کر کے حق بات کہہ دیں۔"

"لیکن یہ ساری تو بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے یہ پتا تو چلے کہ زینب کے ساتھ کیا معاملہ ہے اور یہ کب ٹھیک ہوگی اور کس طرح؟"

مولوی فدا کے ذہن سے اب بھی یہ بات پوری طرح نکل نہیں رہی تھی کہ زینب پر آسیب وغیرہ ہے۔ اس معاملے میں ہمارے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ میں نے مولوی فدا کو رپورٹس دکھائیں اور ان کا مطلب سمجھایا۔ اس نشے کے بارے میں بتایا جو سانپوں کے زہر سے کشید کیا گیا تھا۔ میری یہ بات مولوی صاحب کے دل کو لگی۔ ان کے تاثرات کچھ بدلے بدلے نظر آنے لگے۔ انہوں نے بتایا۔ 'پچھلے سال یہ بات مشہور ہوئی تھی کہ ملک عالمگیر نے اپنے کچھ سانپ پیر ولایت کو دیے ہیں اور پیر ولایت ان کے زہر سے سانپ کے کاٹے کی دوا بنا رہا ہے۔ کوئی کشمیری جوگی بھی اس کام میں شامل تھا۔'

"ایسے لوگ دوا کہاں بناتے ہیں مولوی جی، ایسے لوگ تو بیماری ہی بناتے ہیں۔ یہ بندہ عالمگیر آپ کی بچی کی زندگی

تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا لیکن اب ایسا نہیں ہوگا انشاء اللہ۔‘‘

مولوی جی آہستہ آہستہ بات کی تہ تک پہنچ رہے تھے اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے اندر یہ احساس بھی شدت پکڑ رہا تھا کہ ان کی وجہ سے تاجور کی زندگی تباہ ہونے جارہی ہے لیکن وہ فوری طور پر کوئی فیصلہ کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ آخر انہوں نے اس کا ایک درمیانی راستہ نکالا۔ انہوں نے کہا۔ ’’سرپنچ غلام قادر میری بہت عزت کرتا ہے۔ میں اس سے ملتا ہوں اور اسے اعتماد میں لیتا ہوں۔‘‘

’’کیا کہیں گے آپ؟‘‘

انہوں نے سر پر ٹوپی درست کی اور بولے۔ ’’میں اسے یہ ساری بات بتاتا ہوں لیکن پابند کرتا ہوں کہ وہ ابھی یہ سب کچھ اپنے تک ہی رکھے گا۔‘‘

’’اس سے دین محمد اور تاجور کو کیا فائدہ ہوگا؟‘‘

’’میں زینب کے علاج کے لیے شہر جاؤں گا تو غلام قادر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ سرپنچ ہی نہ ہوگا تو پنچایت کے فیصلے پر عمل کرانا مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے غلام قادر خود ہی اعلان کر دے گا کہ دین محمد کو ایک دو ہفتوں کی مہلت اور دے دیتے ہیں۔ دو ہفتوں کی مہلت دین محمد نے کل خود بھی مانگی ہے۔ اس کے قریبی عزیزوں میں کوئی فوت ہوا ہے۔‘‘

’’اس کے بعد کیا ہوگا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

مجھے مولوی فدا کی آنکھوں میں ایک عزم نظر آیا۔ انہوں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ’’میں نے زندگی میں پہلی بار اپنی بچی کی خاطر جھوٹ بولا ہے، اگر میری بچی والی مجبوری ختم ہو جاتی ہے تو میں کفارہ ادا کروں گا۔ گاؤں والوں کے سامنے ہر بات کھول دوں گا۔ چاہے نتیجہ کچھ بھی نکلے۔‘‘ ان کی آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے۔

مولوی فدا کی شخصیت مجھے متاثر کر رہی تھی۔ انہوں نے کئی سال تک اپنی بیمار بیوی کی دیکھ بھال اور دل جوئی کی جو تھوڑی بہت آمدنی تھی وہ اس پر لگاتے رہے آخر وہ اس دنیا میں نہ رہی۔ اب وہ زندگی کو ایک نئے رخ سے دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ انہوں نے بیاہ کیا تھا۔ اپنے گھر کی حالت درست کی تھی اور اب مدرسے کی تعمیر کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ بے شک اپنی بچی کی مجبوری نے انہیں ایک بہت بڑے امتحان سے دو چار کر دیا تھا لیکن اب جب انہیں امید کی کرن نظر آئی تھی، وہ کفارے کی بات کرنے لگے تھے اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایسا کریں گے بھی۔ وہ ببانگِ دہل اپنی غلطی کا اعتراف کریں گے اور سچ بات کہہ دیں گے۔

انہوں نے اپنی بات پھر دہرائی۔ ہاں میرے بھائی! اگر زینب کی زندگی کو خطرہ نہیں رہتا تو میں گاؤں والوں کے سامنے ہر بات کھول دوں گا۔ چاہے پھر مجھے یہ مسجد، یہ گاؤں ہی چھوڑنا پڑے۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ اولاد کی محبت سے مجبور ہو کر میں نے کچھ ایسی باتیں کہیں جو مجھ جیسے شخص کو ہرگز نہیں کہنا چاہیے تھیں۔ زینب ٹھیک ہو جائے۔ میں ہاتھ جوڑ کر سب سے معافی مانگوں گا اور چھوڑ جاؤں گا یہ گاؤں...... یہ علاقہ۔‘‘

میں نے پھر ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ’’آپ کو کچھ چھوڑنا نہیں پڑے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔‘‘

ساتھ والے کمرے سے ان کی بیوی کے چلنے پھرنے کی مدھم آوازیں آرہی تھیں۔ پھر اس نے پردے کے پیچھے سے پوچھا۔ ’’مولوی صاحب! چائے بنالوں؟‘‘

مولوی جی کے بجائے میں نے جواب دیا۔ ’’نہیں میری بہن، میں چائے نہیں پیوں گا۔ بس اب اٹھ رہا ہوں، مجھے جلدی ہے۔‘‘

مولوی جی کی سوالیہ نظریں ایک بار پھر میرے چہرے کی طرف اٹھنے لگیں۔ یہ نظریں بڑی شدت سے جاننا چاہ رہی تھیں کہ میں کون ہوں۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا۔ پرندے گھونسلوں میں واپس آرہے تھے۔ درختوں میں ہر طرف چہکار سی تھی۔ میں نے اپنے کمرے کی کھڑکی کھولی۔ آہنی سلاخوں میں سے مغرب کی طرف دیکھا۔ سردیوں کا سورج گنے کے اونچے کھیتوں کے پیچھے اوجھل ہو رہا تھا۔ مویشی اپنے گلے بندھے راستوں پر چلتے گاؤں کی طرف آرہے تھے۔ سامنے والے جوہڑ میں بطخیں تیر رہی تھیں اور کناروں پر مرغیاں بھاگ دوڑ کر رہی تھیں۔ تین چار لڑکیاں سروں پر پانی کے مٹکے رکھے عین کھڑکی کے سامنے سے گزریں۔ ان کی الھڑ پنی نے جیسے اس سارے منظر میں رنگ بھر دیے۔

اچانک انیق کی آواز نے مجھے چونکایا۔ ’’شاہ زیب بھائی!‘‘

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی ابھی اندر آیا تھا۔ اس کا چہرہ کچھ کہہ رہا تھا۔ ’’کیا ہوا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

اس نے دروازہ بند کیا اور قدرے پریشان لہجے میں بولا۔ ’’ابھی کچھ دیر پہلے تاجور بی بی سے بات ہوئی ہے۔‘‘

’’کب؟ کہاں؟‘‘

"سرسوں والے کھیت میں۔ انہوں نے مجھ سے کچھ ساگ توڑنے کے لیے کہا تھا۔ میں ساگ توڑتا رہا، وہ میرے پاس کھڑی باتیں کرتی رہیں۔"

"کیا باتیں؟"

انیق نے بوجھل انداز میں کہا۔ "وہ آپ سے ناراض لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ کافی مایوس بھی ہیں۔ انہوں نے کہا ہے کہ سات آٹھ دن بعد ان کی شادی ہے۔ اس لیے...... اب وہ نہیں چاہتیں کہ ہم دونوں یہاں گاؤں میں رہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دونوں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش کی، اس کا شکریہ۔ لیکن اب وہ سمجھتی ہیں کہ بات بہت آگے نکل گئی ہے۔"

"پھر تم نے کیا کہا؟"

"میں نے کیا کہنا تھا۔ وہ کچھ سننے کے موڈ میں ہی نہیں تھیں۔ دوٹوک لہجے میں کہنے لگیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ کل دوپہر تک یہاں سے چلے جائیں۔"

میں نے بان کی چارپائی پر نیم دراز ہو کر تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "اسے کہتے ہیں ٹھنڈے دودھ کو پھونکیں۔ اب سب کچھ ٹھیک ہونے جارہا ہے اور وہ دل چھوڑ بیٹھی ہے۔"

"تو آپ ان سے مل کر انہیں سمجھائیں۔"

"سمجھانے کی ضرورت ہی نہیں۔ سب کچھ خود ہی اس کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کی شادی ملتوی ہو رہی ہے۔ میرے خیال میں کل تک پنچایت والے خود اس کا اعلان کر دیں گے۔"

"یعنی پنچایت والوں کو ملک عالمگیر اور اسحاق کی سازش کا بتا دیا جائے گا؟"

"ساری پنچایت کو نہیں، صرف سرپنچ غلام قادر کو، بلکہ ہوسکتا ہے کہ وہ زینب کے علاج کے لیے مولوی جی کے ساتھ ہی شہر جائے۔ اب یہ معاملہ بالکل صاف ہونے جارہا ہے۔"

"میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ تاجور بی بی کو تھوڑا بہت بتا دوں لیکن آپ سے پوچھنا بھی ضروری تھا۔"

"اب پوچھ لیا ہے نا۔ اب وہ جہاں نظر آئے، اسے سب سے پہلے پیشگی مبارک باد دو اور بتاؤ کہ وہ سب کچھ ہونے جارہا ہے جو وہ چاہتی ہے اور اس کے گھر والے چاہتے ہیں اور یہ بھی کہو کہ مان نہ مان، ہم اس کے مہمان ہیں... ہمیں اب کہیں آنا جانا نہیں ہے۔ یہیں رہنا ہے اور ان سب کی ایسی تیسی فرمانی ہے جو اس سے پہلے اس کی ایسی تیسی کررہے تھے۔"

اچانک انیق کی نظر کھڑکی سے باہر گئی۔ وہ چونک کر بولا۔ "ارے وہ دیکھیں، وہ پھر آرہی ہیں۔"

میں نے انیق کی نظر کا تعاقب کیا۔ ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں تاجور کی روشن پیشانی کو منور کررہی تھیں۔ چال میں ساحلی ہوا کی سی روانی تھی اور ایک ایسا سنجیدگی آمیز وقار تھا جو دیکھنے والے کو مرعوب کرتا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی ملازمہ نوری بھی تھی۔ وہ دونوں تیز قدموں سے سرسوں کے کھیت کی طرف ہی جارہی تھیں۔

انیق بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ساگ کم پڑ گیا ہے۔"

"تو جاؤ، مدد کرو اس کی...... اور اگر موقع ملے تو بات بھی کرلو۔ پوری تسلی دوا سے۔"

انیق باہر نکل گیا۔ وہ دونوں اپنے کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر سنبھل سنبھل کر چلتی درختوں کے پیچھے اوجھل ہوگئیں۔ میں نے گاؤں کے ایک ہٹے کٹے لاٹھی بردار کو دیکھا۔ یہ شخص عالمگیر کے کارندوں میں سے تھا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ تاجور کے لیے "نگراں" کا کردار ادا کررہا ہے۔

دھوپ کی آخری کرنیں درختوں کے پتوں سے اٹھکیلیاں کررہی تھیں۔ گھروں کے اندر سے چولہوں کا دھواں اٹھنا شروع ہوگیا تھا۔ جوہڑ میں تیرتی بطخوں نے ایک ساتھ شور مچایا اور جیسے اعلان کیا کہ چاند گڑھی کا ایک اور سنہرا دن اختتام پذیر ہورہا ہے۔

انیق کا اندازہ درست تھا۔ تاجور اور نوری مزید ساگ لینے ہی کھیت کی طرف گئی تھیں۔ وہ واپس لوٹیں تو نوری کے ہاتھوں میں ساگ کا گٹھا تھا۔ ان کی واپسی کے پانچ منٹ بعد ہی انیق بھی آگیا۔ اس نے بتایا۔ "لمبی بات کرنے کا موقع تو نہیں ملا جی، دو منٹ کے لیے نوری ذرا آگے گئی تو میں نے آپ کی بات ان تک پہنچائی۔"

"کیا کہا؟"

"یہی کہ اب بہت جلد سب اچھا ہونے جارہا ہے۔ یہ پریشان ہونے کا نہیں بلکہ خوش ہونے کا اور شکر ادا کرنے کا موقع ہے۔"

"اس نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں۔ بس حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔ تھوڑا تھوڑا غصہ بھی تھا۔ اتنے میں نوری واپس آگئی۔"

☆☆☆

اگلی صبح بڑی تہلکہ خیز تھی۔ مولوی فدا کی موت کی خبر سن کر ہم سب سکتے میں آگئے۔ کانوں پر یقین ہی نہیں آیا۔ ابھی اندھیرا پوری طرح اوجھل نہیں ہوا تھا۔ ہمارے کمرے

کا دروازہ بڑے زور سے کھٹکھٹایا گیا۔ انیق اٹھ کر باہر نکلا تو حق نواز نے رندھی ہوئی آواز میں بتایا۔ ''مولوی جی کا پتا چلا کیا ہوا ہے؟''

''کیا ہوا؟'' انیق نے لرز کر پوچھا۔

''وہ مسجد کی سیڑھیوں سے گر گئے۔ وہیں پر ختم ہو گئے۔''

ہم بھاگم بھاگ مسجد پہنچے۔ وہاں ایک بڑا مجمع اکٹھا ہو چکا تھا۔ مسجد کے صحن میں اور دروازے پر لوگ ہی لوگ نظر آ رہے تھے۔ کچھ دہاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے کو دلاسا دے رہے تھے۔ قریباً ہر آنکھ میں حیرت تھی اور آنسو تھے۔

مولوی جی کی میت مسجد کے دروازے کے سامنے ہی ایک چارپائی پر رکھ دی گئی تھی۔ اوپر ایک چادر تھی جو جگہ جگہ سے خون آلود ہو چکی تھی۔ مولوی جی کا چہرہ خون سے لتھڑا ہوا تھا مگر چہرے پر کوئی چوٹ نہیں تھی۔ وہ جیسے سو رہے تھے۔ چہرے پر سکون تھا اور ویسا ہی اجالا تھا جیسا چاند گڑھی کے گلی کوچوں میں پھیل رہا تھا۔ یقین نہیں آیا کہ پرسوں رات یہی جیتا جاگتا، باہمت شخص مجھ سے گفتگو کر رہا تھا۔ اپنی بچی کو شہر لے جانے کے لیے پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور...... ایک ایسے کفارے کی باتیں کر رہا تھا جو بے گناہ تاجور کی زندگی کو برباد ہونے سے بچا سکتا تھا۔

مسجد کے صحن میں اینٹوں کا فرش تھا۔ ایک طرف سے کچی سیڑھیاں چھت تک جاتی تھیں۔ بجلی نہ ہونے کی صورت میں مولوی جی فجر کی اذان مسجد کی چھت پر ہی دیتے تھے۔ وہ اذان دے کر نیچے آ رہے تھے جب سیڑھیوں سے گرے۔ صحن میں ایک جگہ اینٹوں سے ایک دائرہ سا بنایا گیا تھا۔ یہ دائرہ اس جگہ کی نشاندہی کر رہا تھا جہاں مولوی صاحب گرے تھے۔ یہاں پر خون موجود تھا جس پر راکھ وغیرہ ڈال دی گئی تھی۔

ہجوم میں مجھے اشک بار پہلوان حشمت بھی نظر آیا۔ انیق نے اس سے اس المناک واقعے کے بارے میں پوچھا تو حشمت نے کہا۔ ''لگتا تو یہی ہے کہ سیڑھیوں سے نیچے آتے ہوئے مولوی جی کا پاؤں اپنے تہ بند میں الجھا اور وہ گر گئے۔ بعد میں ایک نمازی مسجد میں آیا تو اس نے مولوی جی کو فرش پر پڑے دیکھا۔ وہ بالکل آخری سانس لے رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہو گئے۔''

مجمع میں سے کسی نے پوچھا۔ ''چار پانچ دن پہلے اذان دینے کے لیے لڑکا بھی تو رکھا گیا تھا؟''

''مگر فجر کی اذان مولوی جی ہمیشہ خود ہی دیتے ہیں، سب جانتے ہیں۔'' پہلوان حشمت نے کہا پھر ایک دم پہلوان نے چونک کر کہا۔ ''وہ لڑکا کہاں ہے؟ ابھی تک نظر نہیں آیا۔''

''ہاں، میں نے بھی نہیں دیکھا۔'' ایک ادھیڑ عمر نمازی بولا۔

''وہ لڑکا عبدالرحیم کہاں ہے؟'' پہلوان حشمت نے بلند آواز سے پوچھا۔

کئی افراد ایک ساتھ بولنے لگے۔ لڑکا کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میرے ذہن میں شکوک تو اسی وقت پیدا ہو گئے تھے جب میں نے مولوی جی کی ناگہانی موت کی اطلاع سنی تھی۔ اب یہ شکوک پختہ ہو رہے تھے۔ میں نے مولوی جی کے سر کا زخم دیکھا تھا اور کچی سیڑھیاں بھی دیکھی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ یہ زخم پختہ فرش پر گرنے سے نہیں آیا یا یوں کہا جائے کہ یہ صرف پختہ صحن پر ہی گرنے کا زخم نہیں تھا۔ انہیں کسی چیز سے مزید ضرب بھی لگائی گئی تھی۔

یہ شک درست تھا تو پھر......؟ صرف دس بارہ گھنٹے پہلے مولوی صاحب نے عالمگیر کا کچا چٹھا کھولنے کا عزم کیا...... اور اب وہ خاموشی اوڑھ کر منوں مٹی کے نیچے جانے والے تھے۔ میرے ذہن میں فوراً سرپنچ غلام قادر کا نام آیا۔ مولوی جی نے کہا تھا کہ غلام قادر ان کی بہت عزت کرتا ہے اور بھروسا مند آدمی ہے۔ وہ پہلے اس سے بات کرنا چاہتے تھے تو کیا وہ اس سے بات کر پائے تھے؟

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ غلام قادر اندر سے وہ نہ ہو جو مولوی جی اسے سمجھتے ہوں۔ اس نے مولوی جی کی بات عالمگیر تک پہنچا دی ہو اور عالمگیر نے مولوی جی کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا ہو؟ کئی سوال میرے ذہن میں ہلچل مچانے لگے۔ ہر سوال بہت سنگین تھا۔ اس پورے گاؤں میں میرے سوا شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ کل میرے اور مولوی جی کے درمیان کیا گفتگو ہوئی ہے اور اس گفتگو کے نتیجے میں عالمگیر اور اسحاق وغیرہ کے خلاف کیسا تہلکہ خیز انکشاف ہونے والا تھا۔

میں نے اشاروں کنائیوں کی زبان میں حق نواز سے پوچھا کہ سرپنچ غلام قادر کون ہے؟

حق نواز نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی پھر چھوٹی داڑھی اور کھڑی ناک والے ایک دراز قد شخص کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی عمر پچپن سال کے قریب ہوگی۔ رونے سے اس کی

آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور وہ حسرت بھری نظروں سے مولوی جی کی میت کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس کا رنج وغم حقیقی ہے یا بناوٹی؟ مگر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ وہی شعر ذہن میں آیا:

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

میرے سینے میں آگ سی سلگنے لگی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مولوی جی کی آنکھوں کے ساتھ ہی اس خوشگوار تبدیلی کی راہیں بھی بند ہوگئی ہیں جس کی مبارک باد میں کل تاجور کو دینا چاہ رہا تھا۔ ایک بار پھر ہم وہیں پر آن کھڑے ہوئے تھے جہاں چاند گڑھی میں آمد کے وقت تھے۔

اسی دوران میں ہجوم میں ہلچل محسوس ہوئی۔ پتا چلا کہ چودھری صاحب آرہے ہیں۔ لوگوں نے اِدھر اُدھر ہٹ کر راستہ بنایا۔ چودھری صاحب نمودار ہوئے۔ یہ چودہ پندرہ سال کا دبلا پتلا لڑکا تھا اس نے کڑھائی دار کرتہ اور کھسا وغیرہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں طلائی کنٹھا (ہار) تھا۔ وہ حیران حیران اور ڈرا ڈرا سا مولوی جی کی میت کو دیکھنے لگا۔ اصل چودھری تو عالمگیر تھا جو اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے چوڑے جبڑوں والا اسحاق نظر آیا۔ دونوں کے چہروں پر حزن و ملال کی کیفیت تھی۔ پتا نہیں کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کیفیت جو بھی ہے مصنوعی ہے۔

عالمگیر نے بڑے سوگوار انداز میں مولوی جی کے سرہانے کھڑے ہو کر پندرہ بیس سیکنڈ کی خاموشی اختیار کی۔ پھر وہ جھکا اور مولوی جی کی پیشانی کو بوسا دے کر پیچھے ہٹ گیا۔ تاجور کے منگیتر اسحاق نے تسلی دینے والے انداز میں عالمگیر کا شانہ سہلایا۔ میں خاموشی سے یہ مناظر دیکھتا رہا اور میرے سینے میں ایک الاؤ سا بھڑکتا رہا۔ یہاں چاند گڑھی میں صورتِ حال نارمل نہیں تھی۔ یہاں جو کچھ ہو رہا تھا بہت برا تھا اور بڑے سفاک طریقے سے ہو رہا تھا۔

میں ڈیرے پر واپس آگیا۔ دل پر بہت بھاری بوجھ تھا۔ لگتا تھا کہ مولوی فدا کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اس کا ذمے دار میں بھی ہوں۔ میں نے ہی انہیں عالمگیر وغیرہ کی سازش سے آگاہ کیا اور اس کے نتیجے میں وہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ابھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملا تھا مگر دل کی گواہی یہی تھی کہ مولوی جی کے ساتھ حادثہ نہیں ہوا، انہیں مارا گیا ہے۔ ان کی جواں سال بیوی کا تصور بار بار نگاہوں کے سامنے آتا تھا۔ ابھی تو اس سہاگن کی مہندی کا رنگ بھی پھیکا نہیں پڑا تھا اور پھر مولوی جی کی بیمار بچی...... وہ اپنی ماں کو تو پہلے ہی کھو چکی تھی اب باپ سے بھی محروم ہوگئی تھی۔

میرا دھیان بار بار سرپنچ غلام قادر کی طرف ہی جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس مؤذن لڑکے کا خیال بھی آتا تھا جو صرف چار پانچ دن پہلے ملازم رکھا گیا تھا اور اب بغیر بتائے مسجد سے غائب تھا۔

عصر کے بعد مولوی جی کی چارپائی اسی میدان میں رکھی تھی جہاں اس سے پہلے وہ ان گنت لوگوں کی نمازِ جنازہ پڑھا چکے تھے۔ آج وہ خود سفرِ آخرت پر رواں تھے۔ میں نے دوپہر کو ہی اتیق کے ذمے یہ کام لگا دیا تھا کہ وہ سرپنچ غلام قادر اور مؤذن نوجوان عبدالرحیم کے بارے میں پتا کرے۔

مولوی جی کی تدفین کے فوراً بعد ہی اتیق کی صورت نظر آگئی۔ ڈیرے پر پہنچ کر اتیق نے بتایا۔ ”لڑکے کا تو ابھی تک کوئی کھوج نہیں ملا۔ اس کا نام پتا بھی کسی کے پاس نہیں۔ اگر ہوگا تو مولوی جی کے پاس ہی ہوگا۔ قیاس یہی ہے کہ وہ کسی قریبی گاؤں کا ہے۔“

”غلام قادر کے بارے میں کیا خبر ہے؟“

”غلام قادر آج دوپہر ہی جہلم چلا گیا ہے۔ سنا ہے کہ وہاں اس کا کوئی عزیز سخت بیمار ہے۔ غالباً ایک دو دن تک تو وہ نہیں آئے گا۔“

میں جیسے تلملا کر رہ گیا۔ جی چاہا کہ سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر سیدھا عالمگیر کی حویلی میں گھس جاؤں اور تب تک اسے مارتا رہوں جب تک اس کی ساری ہڈیاں نہ ٹوٹ جائیں یا پھر وہ بتا نہ دے کہ مولوی جی کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ میں ایک انجان جگہ پر کچھ نہایت فسادی لوگوں کے درمیان ہوں اور مجھے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہے۔

رات ابر آلود تھی لیکن بارش کے آثار نہیں تھے۔ میرے سینے میں جیسے چنگاریاں سی بھڑک رہی تھیں اس لیے سردی مجھ پر کچھ زیادہ اثر نہیں کر رہی تھی۔ میں صرف شلوار قمیص میں ملبوس درختوں کے نیچے ٹہل رہا تھا۔ چارپائی اور بستر کا تصور بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ رات کا زیادہ تر حصہ اسی طرح گھومتے ہوئے ہی گزار دوں۔ مولوی جی کا غمزدہ چہرہ اور ان کی یتیم بچی کی صورت بار بار نگاہوں کے سامنے گھومتی تھی اور اس کے ساتھ ہی تاجور کی مشکلات بھی نگاہوں کے سامنے آجاتی تھیں۔

اچانک میری نظر کچھ سایوں پر پڑی۔ یہ شیشم اور کیکر کے درختوں کے درمیان موجود تھے۔ ساتھ ہی کوئی گاڑی

بھی تھی۔ میں تھوڑا سا آگے گیا تو مجھے دیکھ لیا گیا۔ ایک ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر پڑی پھر کسی نے کہا۔ ''اوئے یہ تو دین محمد کا گونگا نوکر ہے۔ یہ بھی انجن شنجن ٹھیک کرلیتا ہے۔''

دو افراد تیزی سے قریب آئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ عالمگیر کے کارندے ہی تھے۔ لمبوترے چہرے والا عالمگیر بھی عقب میں موجود تھا۔ کارندوں نے مجھ سے اشاروں کی زبان میں بات کی اور بتایا کہ گاڑی رک گئی ہے۔ سیلف نہیں اٹھا رہی۔

میں نے نیازمندی سے اثبات میں سر ہلایا اور بونٹ کے پاس پہنچ گیا۔ اسی دوران میں گاڑی کے نیچے سے بھی ایک شخص نکل آیا۔ یہ تاجور کا منگیتر اسحاق تھا۔ گاڑی ٹھیک کرنے کی کوشش میں اس کے ہاتھ بھی کالے ہو رہے تھے۔ دو ٹارچوں کی روشنی انجن پر مرکوز کر دی گئی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ فیول لائن میں رکاوٹ ہے۔ میں گاڑی کے پچھلے حصے میں موجود آئل فلٹر کھولنے میں مصروف ہو گیا۔ وہ لوگ میری موجودگی میں ہی بے دھڑک باتیں کر رہے تھے۔ میں ان کے نزدیک گونگا بہرا تھا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ لوگ کسی ''مشن'' پر ہیں۔ عالمگیر کا ایک فقرہ میرے سر پر بم کا دھماکا ثابت ہوا۔ اس نے اسحاق سے پوچھا تھا۔ ''تیرا کیا خیال ہے، سیالکوٹی کو شاہ پور سے ڈیرے تک آنے میں کتنا ٹائم لگے گا؟''

اسحاق اپنی بھدی آواز میں بولا۔ ''اگر گھوڑیوں پر ہوئے تو آدھے پونے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔ اگر جیپ ہوئی تو پھر زیادہ وقت لگ سکتا ہے۔''

''کیا اندازہ ہے تمہارا...... ہمیں کتنا ٹائم لگے گا؟''

''اب یہ تو گونگا ہی بتا سکتا ہے۔ ہاں گڈی ٹھیک ہو گئی تو ایک گھنٹے میں ہم وہاں پہنچ سکتے ہیں۔''

عالمگیر کے کندھے سے سیاہ ہولسٹر جھول رہا تھا اور اس میں مشین پسٹل صاف نظر آ رہا تھا۔ عالمگیر نے ہولسٹر کو کندھے پر درست کرتے ہوئے کہا۔ ''جو بھی ہے یہ سوچ لو کہ ہمیں دن چڑھنے سے پہلے پہلے پنڈ واپس پہنچنا ہے۔''

اسحاق نے اثبات میں سر ہلایا پھر اشاروں کی زبان میں مجھے یہ سمجھانے بلکہ دھمکانے لگا کہ میں گاڑی جلدی ٹھیک کروں، اور یہ راستے میں خراب بھی نہیں ہونی چاہیے ورنہ...... میرے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔

آئل فلٹر میں رکاوٹ تھی، وہ میں نے صاف کر دی۔ گاڑی اسٹارٹ ہو گئی۔ عالمگیر نے بخشش کے انداز میں سو کا نوٹ میرے ہاتھ پر رکھا اور اپنے مسلح کارندوں کے ساتھ آگے روانہ ہو گیا۔ میں نے جو کچھ کرنا تھا وہ میں پہلے ہی طے کر چکا تھا۔ میں رفتار سے دوڑتا ہوا واپس اپنے ٹھکانے پر آیا۔ یہاں حق نواز کے بھائی کی ایک کھٹارا موٹر سائیکل کھڑی تھی جسے میں نے آج دوپہر ہی ٹھیک کیا تھا۔ ٹنکی میں پیٹرول بھی موجود تھا۔ میں نے انیق کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا اور تیزی سے جیپ کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

شروع میں مجھے کافی رفتار سے جانا پڑا۔ جو خطرناک تھا کیونکہ میں نے ہیڈ لائٹ آف کر رکھی تھی۔ جونہی مجھے جیپ کی عقبی سرخ بتی نظر آنا شروع ہوئی میں نے رفتار کم کر دی۔ ٹیڑھے میڑھے کچے راستوں پر یہ ایک نہایت مشکل تعاقب تھا۔ بس جیپ کی پچھلی سرخ بتی ہی میری رہنمائی کر رہی تھی۔ میں اپنا فاصلہ بھی کم نہیں کر سکتا تھا کہ کہیں رات کے سناٹے میں موٹر سائیکل کی آواز جیپ سواروں کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔

یہ طویل اور نہایت مشکل تعاقب تقریباً 50 منٹ جاری رہا۔ بالآخر ہم ایک بیلا نما مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں چاروں جھاڑیاں اور درخت ہی دکھائی دیتے تھے۔ بالکل سنسان جگہ تھی۔ جیپ رک چکی تھی۔ میں نے بھی کافی فاصلے پر موٹر سائیکل روک کر اس کا انجن بند کر دیا۔ دل کی دھڑکنیں تیز ہو چکی تھیں۔ آثار بتا رہے تھے کہ اب کچھ ہونے والا ہے اور جو ہے وہ سنسنی خیز ہے۔ شاید ان لوگوں کا سامنا خطرناک سجاول سیالکوٹی سے ہونے والا تھا۔

ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ آوازیں میرے کانوں تک پہنچیں اور میں حیران رہ گیا۔ اس ویرانے میں ایسی آوازوں کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ لگتا تھا کہ قریب ہی کسی جگہ کوئی طوائف ناچ رہی ہے اور تماش بین اس پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہے ہیں۔ گاہے بگاہے سرور و نشاط سے بھرپور قہقہے بھی سنائی دیے جاتے تھے۔ وہ سازندوں کی سنگت میں گا رہی تھی۔

''بجلی بھری ہے میرے انگ انگ میں
جو مجھ کو چھوئے گا وہ جل جائے گا۔''

خونریزی اور بربریت کے خلاف
صف آرا نوجوان کی کھلی جنگ
باقی واقعات آیندہ ماہ پڑھیے

”ہنی، آج رات میں ایک کانفرنس میں جا رہا ہوں۔“ گریگ نے شاور لیتے ہوئے چیخ کر کہا۔ ”سنسنیٹی سے وہ نیا بون ایکسپرٹ شہر میں چند دلکش موضوعات پر لیکچر دینے کے لیے آیا ہوا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد مجھے شہر میں کنڈومینیم میں رکنا پڑ جائے۔ تم تو جانتی ہو کہ سٹی کلب میں آفٹر اسپیکر ڈنرکس نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سرخ انگوری شراب کی بھرمار ہوتی ہے۔ سو ہوسکتا ہے کہ میں ڈرائیونگ سے گریز کروں۔“

جواب میں خاموشی چھائی رہی۔

گریگ کو معلوم تھا کہ کیتھی کو اس کا رات گھر سے باہر گزارنا پسند نہیں ہے۔ وہ ویسے بھی اپنا خاصا وقت اپنی فیملی سے دور رہ کے گزارتا ہے کیونکہ شام کو اسے اپنا کلینک چلانا ہوتا تھا اور دن میں اکثر اسپتال سے ایمرجنسی کال آجاتی تھی۔ فیملی ڈاکٹر ہونے کے ناتے اس کے کام کے اوقات کافی طویل اور محنت طلب ہوتے تھے۔

”اوہ! اوکے گریگ!“ کیتھی نے کچھ دیر کے بعد جواب دیا۔

کیتھی کے لہجے سے وہ سمجھ گیا کہ معاملہ اوکے نہیں ہے۔ گریگ کو اپنے دل میں ایک خلش سی محسوس ہوئی۔ کیتھی آج صبح سے قدرے زود رنج دکھائی دے رہی تھی۔

”تمہیں کیا واہمہ ہے؟“ گریگ نے پوچھا۔

”تم سمجھو گے کہ میں احمق ہوں۔“ کیتھی نے کہا۔ ”لیکن میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ تمہاری ملاقات ایک دلکش خاتون ڈاکٹر سے ہوئی ہے اور تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہو اور پھر کبھی لوٹ کر نہیں آئے۔ اس خاتون ڈاکٹر کا نام ڈاکٹر کیرولین ہے۔“

”کیا تم نے اس کا پورا نام معلوم کیا؟“ گریگ نے پوچھا۔

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔“ کیتھی نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

گریگ نے اپنے شانے اچکا دیے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد اپنی ارمانی ٹائی کی ڈبل ونڈسر گرہ باندھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”یہ عورتیں بھی بڑی وہمی ہوتی ہیں۔“ یہ تو اچھا ہوا کہ کیتھی نے اسے بڑبڑاتے ہوئے نہیں سنا۔

پھر وہ ٹاؤن ہاؤس سے نکل کر اپنی سیڈان کار میں سوار ہوا ... اور اسپتال کی سمت روانہ ہوگیا۔

وہ دن اس کے لیے قدرے مشکل ثابت ہو رہا تھا۔ اسپتال کے راؤنڈ میں ایک کے بعد دوسری پیچیدگی سامنے آرہی تھی۔ بعض دن کچھ ایسے ہی دشوار گزار ثابت ہوتے ہیں، اس نے سوچا۔ پہلے مسز جوزف کے آپریشن کے ٹانکے کھل جانے کا

واہمے اگر قدم بہ قدم ساتھ چلتے رہیں تو بالآخر حقیقت کا روپ دھار ہی لیتے ہیں... توہمات و شبہات کے کڑے شکنجے میں گھری مختصر کتھا... ایک ڈاکٹر کی رفیقۂ حیات کا خواب جو بالآخر تعبیر کے مرحلے طے کر گیا...

خواب گزیدہ

سکندر علیم

معاملہ دیکھنا پڑا۔ پھر مسز فلپ کے جڑواں بچوں کو رات بھر ہونے والے بخار کے لیے ٹریٹمنٹ دینا پڑی۔

بالآخر جب وہ اپنے دفتر پہنچا تب تک ایک گھنٹا لیٹ تھا۔ اس کا ویٹنگ روم مریضوں سے بھرا ہوا تھا اور وہ سب ناموافق نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔

''مسز ہینڈرسن لائن ون پر موجود ہیں، ڈاکٹر گریگ۔'' اس کی ریسپشنسٹ جینی نے بتایا۔ ''ان کے سینے میں پھر وہی عجیب سا درد اٹھ رہا ہے۔''

''لعنت ہو۔'' ڈاکٹر گریگ نے دل ہی دل میں کہا۔ ''اب آدھا گھنٹا اور ضائع کرنا پڑے گا۔''

''ان سے کہو کہ وہ دو بجے آجائیں۔'' اس نے جینی سے کہا۔

وہ سہ پہر ناگفتہ بہ تھی لیکن جیسے تیسے گزر ہی گئی۔

خوش قسمتی سے اس رات نہ تو ڈاکٹر گریگ کی کوئی اور اپائنٹمنٹ تھی اور نہ ہی اسپتال کی نائٹ ڈیوٹی۔ گریگ اب صرف رات کے لیکچر اور اس کے بعد۔۔۔۔ پُررونق ڈنر کا منتظر تھا۔

وہ اپنی کار لے کر سیدھا سٹی کلب پہنچ گیا۔ اس نے کار کلب کی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کردی۔ عمارت کا داخلی حصہ بے حد شاندار بنا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر مین لیکچر ہال میں داخل ہوگیا اور درمیانی راستے کے برابر کی ایک سیٹ پر براجمان ہوگیا۔

''ہائے گریگ، کیسی گزر رہی ہے؟'' آرتھوپیڈک سرجن چارلی وارنر نے پوچھا جو اس کا کلاس میٹ رہ چکا تھا اور میڈیکل اسکول کے دنوں کا ساتھی بھی تھا۔

''زندگی خوش کن نہیں ہے۔'' گریگ نے جواب دیا۔ ''میرا دفتر آج جہنم بنا ہوا تھا۔ اسپتال میں داخل میرے تمام مریض بیمار سے بیمار تر ہوتے جارہے ہیں اور کیتھی مجھ سے ناراض ہے کیونکہ میں نے اسے بتادیا تھا کہ آج رات مجھے کنڈومینیم میں رکنا پڑے گا۔''

''زندگی واقعی ناخوشگوار ہے۔'' ڈاکٹر چارلی نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ہاں۔'' گریگ نے اپنے ذہن میں سوچا۔ ''بہ شرطیہ کہ آپ ایک خبط الحواس سرجن نہ ہوں۔''

سنسناٹی سے آنے والا سرجن اور اس کا لیکچر بے حد پھسپھسا ثابت ہوا۔ ''بورنگ!'' گریگ کے ساتھ بیٹھا ہوا فرد بار بار زیرلب یہی بڑبڑا رہا تھا۔

''امید کرتے ہیں کہ ڈنر اتنا بور ثابت نہ ہو۔'' گریگ نے جواباً کہا۔

گریگ کو ڈنر کے بارے میں مایوسی نہیں ہوئی۔ کھانا بے حد شاندار، ذائقے دار اور لذیذ تھا۔ سرخ انگوری شراب بھی پرانی اور نایاب اقسام میں سے تھی۔ پھر ڈیزرٹ بھی سٹی کلب کے ورلڈ کلاس معیار کے مطابق تھے۔

''کھانے کے دوران ڈاکٹر گریگ نے اطمینان کے ساتھ پرانی سرخ انگوری شراب کے تین چار گلاس حلق سے نیچے اتار لیے۔

ڈنر سے فارغ ہونے کے بعد جب اس نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر نگاہ ڈالی تو چونک پڑا۔

''گڈ گاڈ! ساڑھے گیارہ بج گئے، اب چلنا چاہیے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

پھر وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا رخ فون بوتھ کی جانب تھا تاکہ کنڈومینیم جانے کے لیے فون پر ٹیکسی طلب کرسکے۔

''نہیں۔'' وہ کچھ سوچتے ہوئے راستے میں رک گیا۔ ''کیتھی نہایت غصے میں بھری بیٹھی ہوگی۔ خاص طور پر وہ احمقانہ خواب دیکھنے کے بعد وہ بہت زیادہ زودرنج ہورہی ہوگی۔''

گریگ نے اپنا رخ سیڑھیوں کی جانب گھما دیا اور سیڑھیاں اتر کر داخلی دروازے کی سمت چل دیا۔

''گڈ نائٹ، ڈاکٹر گریگ۔'' کلب کے داخلی دروازے پر کھڑے ہوئے دربان ایرک نے کہا۔ ''کیا آپ کے خیال میں، میں آپ کے لیے ٹیکسی طلب کرلوں، سر؟'' اس نے ڈاکٹر کے ڈگمگاتے قدموں کو بھانپتے ہوئے یہ بات کہی تھی۔

''نہیں، شکریہ ایرک۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' گریگ نے جواب دیا اور پارکنگ لاٹ کی جانب بڑھنے لگا۔

پارکنگ لاٹ میں تین بار کی کوشش کے بعد وہ کار کے دروازے کے تالے میں چابی گھمانے میں کامیاب ہو پایا۔ اس نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور پارکنگ سے نکل کر فری وے کی جانب بڑھنے لگا۔ اس کی سیڈان کار اتنی خراب نہیں تھی بلکہ یہ اس کی پرانی اسپورٹس کار کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور تھی۔

چڑھائی پر پہنچ کر گریگ نے گیئر تبدیل کیا اور ایکسلریٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔ اس کی توجہ اس اٹھارہ پہیوں والے بڑے ٹریلر کی جانب نہیں جاسکی تھی جو برابر کی لین میں تیزی سے دوڑتا ہوا آگے آرہا تھا۔ جب تک وہ چونکا، اسے بہت دیر ہوچکی تھی۔

☆☆☆

جب ایمرجنسی روم ڈاکٹر ٹراما روم میں داخل ہوئی تو نرس نے آہستگی سے اپنا سر ہلا دیا۔

وہ دلکش خاتون ڈاکٹر بے حد سنجیدہ دکھائی دے رہی تھی۔

روم نرس آہستہ سے گویا ہوئی۔ ''اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی موت واقع ہوچکی تھی۔ آپ اس شخص کے لیے کچھ نہیں کرسکتیں، ڈاکٹر کیرولین!''

اعترافِ جرم

ایس انور

اعترافِ جرم وہ لوگ کرتے ہیں جو بہادر اور دلیر ہوتے ہیں یا پھر وہ بزدل جو... ایک ہی جھٹکے میں سب کچھ اگل دیتے ہیں... قتل کی وجوہ اور قاتل کی تلاش میں سرگرداں سراغ رساں کی ذہنی و جسمانی مشقت کا دلچسپ احوال...

ان قریبی رشتوں سے بندھی کہانی... جو زر کے ساتھ تعلق جوڑ بیٹھے تھے...

''داخلی دروازے میں قدم رکھنے سے پہلے ہی مجھے احساس ہوگیا تھا کہ معاملہ کچھ گڑبڑ ہے۔'' لیری والٹن نے کچن میں میز کے کنارے کو اپنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا۔ وہ اس وقت اپنی مقتولہ بہن کے گھر میں تھا۔

''اس کی وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے ہیلن کے ٹی وی کی کان پھاڑ دینے والی آواز سنائی دے رہی تھی جبکہ وہ کبھی بھی اتنی اونچی آواز میں ٹی وی نہیں دیکھتی تھی۔'' لیری والٹن نے بتایا۔

''لیکن اس وقت تو ٹی وی کی آواز بلند نہیں ہے۔''
میرے پارٹنر سراغ رساں ڈینی نے کہا۔
''وہ اس لیے کہ 911 پر فون کرنے کے بعد میں نے اس کی آواز بند کردی تھی۔''
یہ سن کر ڈینی نے تیوریاں چڑھالیں۔ ''تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ایسے موقع پر کسی شے کو ہاتھ لگانا یا چھیڑنا نہیں چاہیے۔''
''میں ذہنی طور پر پریشان ہوگیا تھا۔ مجھے اسی وقت پتا چلا تھا کہ میری بہن کو گولی ماردی گئی ہے جو میرے لیے حیرانی کی بات تھی' پھر ٹی وی پر ریکارڈ شدہ قہقہوں کی بلند آوازوں نے مجھے ذہنی خلفشار میں مبتلا کردیا تھا۔ میرا جی بری طرح متلا رہا تھا۔ او کے؟''
ڈینی اور میں نے لیری والٹن کو ایک باوردی پولیس مین کے پاس چھوڑا اور گھر سے باہر کی جانب چل دیے۔
''شاید کسی پڑوسی نے کوئی غیر معمولی بات دیکھی ہو جو ہماری تفتیش میں کارآمد ثابت ہوسکے۔'' میں نے کہا۔
''مقتولہ کے بھائی کی ٹی وی کی کان پھاڑ دینے والی آواز کی داستان مجھے بالکل بھی ہضم نہیں ہورہی ہے، ہیری۔'' میرے پارٹنر سراغ رساں ڈینی نے فرنٹ پورچ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔
''تمہیں وہ شخص پسند نہیں آیا۔'' میں نے کہا۔
''تم نے صحیح قیاس لگایا ہے۔ مجھے بھی اس کی کہانی پسند نہیں آئی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے یہ کہانی اس لیے گھڑی ہو تا کہ مکان میں اپنی موجودی اور بظاہر اپنی بہن کی لاش دریافت کرنے کا جواز پیش کرسکے۔'' ڈینی نے کہا۔
میں نے شانے اچکا دیے۔ ''ہوسکتا ہے کہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ البتہ یہ بھی ممکن ہوسکتا ہے کہ قاتل کوئی اور ہو، وہ کوئی جس نے ٹی وی کی آواز بلند کی ہوگی... شاید اس لیے تا کہ فائر کی آواز ٹی وی کی کان پھاڑ دینے والی آواز میں دب جائے۔''
باہر کولنز نامی ایک سادہ لباس سراغ رساں شوخ گلابی رنگ کی جینز میں ملبوس ایک تومند عورت کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے پاس آنے کا اشارہ کیا۔
''یہ سیلی میکڈونلڈ ہے اور سڑک پار رہتی ہے۔ اس کے پاس کچھ معلومات ہیں جو اہم ہوسکتی ہیں۔'' سراغ رساں کولنز نے بتایا۔
''اہم ہو نہیں سکتیں بلکہ اہم ہیں۔'' اس عورت نے کہا۔
میں نے اس عورت سے... دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں سراغ رساں ہیری پراکٹر ہوں مس سیلی۔ اور یہ سراغ رساں ڈینی ہے۔ تم ہمیں کیا بتانا چاہتی ہو؟''
''یہ بات ہیلن کے قتل سے متعلق ہے... میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ قتل کا تعلق ڈکیتی کی واردات سے جوڑنا لازمی ہے۔''
ڈکیتی کی واردات؟''
''تو تم لوگوں کو علم نہیں ہے۔'' سیلی نے قدرے حیرانی سے کہا۔ ''گزشتہ پیر کی شب کوئی چور چھپے ہیلن کے گھر میں نقب لگا کر داخل ہوا تھا۔ وہ اس وقت اپنے مسٹری ریڈر گروپ کلب گئی ہوئی تھی۔ چور نے اس کی نقدی اور زیورات چوری کرلیے تھے۔ یقیناً پولیس آئی تھی لیکن ان کے جانے کے بعد ہیلن ان کی کارکردگی سے بالکل بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس چوری کی اپنے طور پر تحقیقات کرے گی۔'' سیلی نے اپنے رخسار سے آنسو پونچھتے ہوئے بتایا۔ ''ہیلن اسی مزاج کی عورت تھی۔ وہ کسی کی بکواس کو خاطر میں نہیں لاتی تھی اور اب چور نے اسے قتل کردیا ہے۔''
''تم یہ بات پورے یقین کے ساتھ تو نہیں کہہ سکتیں نا؟'' سراغ رساں ڈینی نے کہا۔
تب سیلی نے حقارت بھری نظروں سے ڈینی کی طرف دیکھا۔ ''ہاں، اوکے، شاید میں سو فیصد یقین سے تو یہ بات نہیں کہہ سکتی لیکن بڑی حد تک مجھے اس بارے میں پورا یقین ہے کہ جو میں کہہ رہی ہوں، ایسا ہی ہوگا۔'' وہ یہ کہہ کر سراغ رساں کولنز اور میری جانب گھوم گئی۔ ''میرے ذہن میں تین مشتبہ افراد ہیں۔ ان کے نام سننا چاہتے ہو؟''
''یقیناً۔'' میں نے فوراً ہی جیب سے اپنی نوٹ بک نکالتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھا کہ سراغ رساں کولنز اور میرا پارٹنر ڈینی دونوں ہی اپنے دیدے گھما رہے تھے۔ اس کے باوجود جب سیلی گویا ہوئی تو ان دونوں نے آگے جھکتے ہوئے اپنے کان اس کی طرف لگا دیے۔
''اس فہرست میں سب سے پہلا نام ہیلن کے بھائی لیری والٹن کا ہے۔'' سیلی نے کہا۔ ''ڈرائیو وے میں کھڑی ہوئی وہ خستہ حال سرخ رنگ کی پک اپ اسی کی ہے۔ کیا وہ یہ دعویٰ کررہا ہے کہ ہیلن کی لاش اسی نے دریافت کی ہے؟''
''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔
''ہا! اب وہ یہ بات بہ آسانی کہہ سکتا ہے۔ وہ ہمیشہ

ے ہیلن سے پیسوں کا طلب گار رہا ہے۔ پھر گزشتہ ہفتے ہیلن نے اسے رقم دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کا بھائی شراب اور جوئے میں پیسا اُڑا رہا ہے۔ لہٰذا اس چوری کی واردات کا سبب یہ بات ہو سکتی ہے۔ اسے رقم چاہیے تھی اور ہیلن نے اسے پیسا دینا بند کر دیا تھا۔ آج صبح موقع پر اس کی موجودگی کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ ہیلن نے اسے چوری کا مرتکب قرار دیا ہو اور اس نے طیش میں آ کر اپنی بہن کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا ہو۔''

''اور پھر 911 پر فون کر دیا ہو؟'' کولنز نے کہا۔

''یقیناً۔ لیری کاہل اور لالچی ہو سکتا ہے لیکن وہ احمق ہرگز نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کو مارنے کے بعد وہاں سے اپنی پک اپ میں جان بوجھ کر فرار نہیں ہوا۔ اس لیے کہ اسے خدشہ تھا کہ کہیں کسی نے اس کے پک اپ ٹرک کو ہیلن کے ڈرائیو وے میں نہ دیکھ لیا ہو۔ سو اس کو وہی کچھ کرنا تھا جو ایک معصوم بے گناہ شخص کو کرنا چاہیے تھا۔''

''یہ واقعی دلچسپ بات لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور تمہاری مشتبہ افراد کی فہرست میں باقی دو نام کن کے ہیں، مس سیلی؟''

''نینسی ٹیمپل اور اس کا شوہر جارج۔ نینسی ہیلن کی بھتیجی ہے۔ وہ پہاڑی پر ایک خستہ حال جگہ میں رہتی ہے۔ ہیلن کے قریبی زندہ رشتے داروں میں وہی واحد بچی ہے۔ جارج اور نینسی بھی لیری کی طرح اتنے ہی مشتبہ قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہیلن نے گزشتہ ہفتے ان دونوں کو بھی بخشش دینا بند کر دی تھی۔ میں اتفاق سے اس موقع پر وہاں موجود تھی۔ حتیٰ کہ میں نے ہیلن کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا تھا کہ ہو سکتا ہے وہ اپنی وصیت بدل دے اور ہر شے خیرات میں دے دے۔''

''سو ان میں سے کسی ایک یا دونوں نے اس کے گھر چوری کر لی؟'' ڈینی نے پوچھا۔

''یہ بات میرے لیے باعثِ حیرت نہیں ہوگی۔ ان دونوں کو علم تھا کہ ہیلن گھر کے اندر اچھی خاصی رقم اپنے پاس رکھتی ہے اور انہیں یہ بھی پتا تھا کہ ہیلن کے پاس خاصی بیش قیمت جیولری بھی ہے اور سب سے اہم بات یہ کہ آج صبح میں نے دیکھا کہ...''

اتنے میں ایک مردانہ آواز نے سیلی کی بات کاٹ دی۔

''ہمارے بارے میں جھوٹی باتیں پھیلا رہی ہو،

ملک کا مایۂ ناز وکٹ کیپر جو اپنی پھرتی اور تیزی کے باعث انتہائی ہردلعزیز تھا، ایک رات تنہا ٹہلتا ہوا گھر سے دور نکل گیا۔ اچانک ایک گلی میں اسے ایک ایسا گھر نظر آیا جس میں آگ لگ گئی تھی۔ پڑوسی گھر کے اطراف میں کھڑے مکان جلنے کا تماشا دیکھ رہے تھے، ایک خاتون دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ ''ہائے میرا بچہ اندر ہی رہ گیا ہائے، ہائے۔''

وکٹ کیپر نے انتہائی حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے چھلانگ لگائی، گھر میں گیا اور پلک جھپکتے میں بچے کو اٹھا لیا۔

لوگوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔ ''واہ، واہ شاباش، بھئی، شاباش۔''

وکٹ کیپر لوگوں کی تعریف سے اتنا متاثر ہوا کہ وہ اپنے آپ کو کھیل کے میدان میں محسوس کرنے لگا۔ عادت سے مجبور ہو کر اس نے بچے کو دوبارہ جلتے ہوئے مکان میں اچھال دیا اور ایک ہاتھ اٹھا کر رقص کرتے ہوئے بولا۔ ''ہاؤ زٹ؟''

تانیہ مرزا، لنڈی کوتل سے

سیلی؟''

ساتھ ہی ایک مرد اور ایک عورت ہمارے گروپ میں آن ملے۔ مرد کی نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنی سگریٹ منہ سے نکال کر زمین پر پھینک دی اور اسے اپنے جوتے سے مسل دیا۔

سیلی کا چہرہ تمتما گیا۔ ''تت... تم ایسا کیوں سوچ رہے ہو؟ جارج؟''

''اس لیے کہ ہم نے اتفاقاً وہ سب کچھ سن لیا ہے جو تم کہہ رہی تھیں۔'' اس مرد کی ساتھی عورت نے غراتے ہوئے کہا۔

پھر وہ عورت میری جانب گھوم گئی۔ ''مجھے اس بات کی پروا نہیں جو فضول باتیں سیلی تمہیں بتا رہی تھی۔ لیکن میں نے کبھی اپنی... آنٹی کو کوئی گزند نہیں پہنچائی۔ اور یہی میں جارج کے بارے میں بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں۔''

''تو پھر تمہیں معلوم ہے کہ ہیلن شیفر کو قتل کیا جا چکا ہے؟'' سراغ رساں ڈینی نے پوچھا۔

نینسی ٹیمپل نے اپنا ہاتھ لہرایا تو اس کی کلائی میں موجود بریسلیٹ کھنکھنانے لگا۔ ''یقیناً، یہاں اتنی ساری

پولیس کاروں اور ایمبولینسوں کی موجودگی سے کچھ کھٹکا تو ہوا تھا۔ پھر سیلی تم لوگوں سے جو کچھ کہہ رہی تھی، وہ بھی سن لیا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے اس نے خفگی سے تنومند سیلی کی جانب دیکھا اور بولی۔ ''یہ حقیقت میں تمہارا الھڑ پن ہے سیلی کہ تم اتنے ہولناک جرم کا الزام ہمارے سر تھوپنے کی کوشش کررہی ہو۔''

''میں کسی کے سر کوئی الزام نہیں تھوپ رہی ہوں۔'' سیلی نے تڑاخ سے جواب دیا۔ ''میں تو بس حقائق بیان کررہی ہوں۔ ان حقائق کا سلسلہ کہاں جا کر مل رہا ہے، میں وہی کچھ ان سراغ رسانوں کو بتارہی ہوں۔ میں نے آج صبح سویرے تمہیں ہیلن کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا، نینسی۔ تمہارے پاس اس کی کیا وضاحت ہے؟''

نینسی کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''میں یہ بات کررہی ہوں کہ آج صبح آٹھ بجے کے قریب میں نے تمہیں اپنے بیڈروم کی کھڑکی سے دیکھا تھا۔''

''تم نے جسے دیکھا ہوگا، وہ نینسی نہیں ہوگی۔'' جارج نے کہا۔ ساتھ ہی اس نے ایک جھٹکے سے اپنا لائٹر نکالا اور سگریٹ سلگا کر اس کا کش لیتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو پوری صبح گھر میں ہی موجود رہی ہے۔ ہے نا، ڈیئر؟''

نینسی ہچکچائی تو میں نے بات پکڑ لی۔ ''اگر تم صبح سویرے اپنی آنٹی کے گھر گئی تھیں تو بہتر ہوگا کہ تم پوری بات خود ہی ہمیں بتادو۔''

نینسی نے اپنی مٹھیاں سختی سے بھینچ لیں۔ ''اگر میں وہاں گئی تھی تو کیا ہوا؟'' اس نے کہا۔

''نینسی!'' جارج تلملا گیا۔

''یہ اس وقت کی بات ہے جب تم جاگنگ کرنے گئے ہوئے تھے، جارج۔ لیکن میری آنٹی ہیلن سے ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ میں ان سے تھوڑی سی کافی ادھار لینے گئی تھی لیکن انہوں نے میرے بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود کوئی جواب نہیں دیا تھا۔''

''تمہیں کوئی آوازیں سنائی دی تھیں؟'' میرے پارٹنر ڈینی نے پوچھا۔ ''کوئی شور؟ کوئی فائر کی آواز؟''

''فائر کی آواز؟ کیا ان کے مرنے کا یہی سبب رہا ہے...؟'' وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے بولی اور اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ وہ یوں سانس لینے لگی جیسے اسے نزلہ ہورہا ہو۔

جارج نے اسے تسلی دینے کی خاطر اپنا ہاتھ اس کے گرد حمائل کردیا۔ ''ڈیئر... ڈیئر!'' وہ اسے دلاسا دینے لگا۔ پھر ہمیں گھورتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال نہیں کہ ٹیلی وژن کے شور میں نینسی کو کچھ سنائی دیا ہوگا اور صرف اس بنا پر کہ سیلی کا کہنا ہے اس نے نینسی کو اپنے بیڈروم کی کھڑکی سے دیکھا تھا، ہوسکتا ہے کہ بات یہ نہ رہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ سیلی خود ہیلن کے گھر میں موجود رہی ہو اور ہوسکتا ہے جب نینسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی تو سیلی نے عین اسی وقت بے چاری ہیلن کو قتل کیا ہو۔''

''کیا؟ یہ حقیقت نہیں ہے۔'' سیلی چیخ پڑی۔

جارج نے شانے اچکا دیے۔ ''تمہاری خاطر میں یہ امید رکھتا ہوں کہ یہی حقیقت نہ ہو، سیلی۔ لیکن کیا تم یہ بات ثابت کرسکتی ہو؟''

پھر اس نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما اور بولا۔ ''اب ہم واپس گھر جارہے ہیں۔ اگر تم لوگ ہم سے مزید بات کرنا چاہتے ہو تو تم اُدھر آکر بات کرسکتے ہو... لیکن اس گستاخ اور زہر اگلنے والی عورت کے بغیر آنا۔'' وہ یہ کہہ کر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہمیں وہیں کھڑا چھوڑ کر پہاڑی کی جانب چل پڑے۔

''اوہ، میں اس شخص سے نفرت کرتی ہوں۔'' سیلی کراہنے لگی۔ ''اگر لیری والٹن قاتل نہیں ہے تو پھر قاتل یقینی طور پر یہی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ ملتجیانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ''اور نینسی صبح سویرے حقیقت میں ہیلن کے گھر دکھائی دی تھی۔ یہ ایک ایمان دارانہ سچ ہے لیکن میں نے اسے حقیقت میں ہیلن کے داخلی دروازے سے باہر قدم رکھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ البتہ میں نے اسے ہیلن کے پورچ کی سیڑھیوں سے اترتے ہوئے ضرور دیکھا تھا۔''

میں ایک لمحے تک سیلی کو غور سے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''تھینک یو میڈم، اب تم گھر واپس جاسکتی ہو۔''

سیلی نے اپنا منہ کھولا لیکن پھر کچھ کہے بغیر فوراً ہی بند کردیا۔

سراغ رساں کولنز نے آہستگی سے اس کا بازو تھاما اور بولا۔ ''آجاؤ میڈم، میں تمہیں سڑک پار پہنچا دیتا ہوں۔''

چند لمحوں بعد میرا پارٹنر سراغ رساں ڈینی گویا ہوا۔ ''یہ کیسے لوگوں کا گروپ ہے؟''

میں نے اس کی تائید میں سر ہلا دیا۔

''کیا تمہارا تبصرہ صرف سر ہلانے تک محدود ہے؟'' ڈینی نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''فی الحال تو یہی تبصرہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

"کسی نے کوئی بات کہی تھی... مجھے کچھ دیر سوچنے کا موقع دو... شاید وہ بات یاد آجائے۔"

ڈینی خاموشی سے انتظار کرنے لگا۔ وہ کیونکہ کافی عرصے سے میرے ساتھ کام کر رہا تھا اسی لیے اسے میرے طریقۂ کار کا بخوبی اندازہ تھا اور میرے مزاج کو سمجھتا تھا۔

کچھ دیر تک سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد بالآخر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھر آئی۔ "ہاں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"کچھ یاد آگیا کیا؟" ڈینی نے پوچھا۔

"ڈینی، مجھے یقین ہے کہ اب ہم کسی کو گھسیٹ کر قانون کے رُوبرو لانے کے لیے ڈاؤن ٹاؤن لے جا سکتے ہیں۔ ہمیں تلاشی کے وارنٹ کی ضرورت بھی پڑے گی۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ کس لیے؟ ریوالور کے لیے؟ چوری شدہ زیورات کے لیے؟" ڈینی نے جاننا چاہا۔

"بالکل درست۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "قاتل کے پاس ایک یا یہ دونوں چیزیں ابھی تک موجود ہو سکتی ہیں۔"

"لیکن آخر قاتل ہے کون؟"

"جارج ٹیمپل۔"

"تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ قاتل وہی ہے، ہنری؟ میں تم سے اختلاف تو نہیں کر رہا ہوں لیکن مجھے یہ لگتا ہے کہ مقتولہ کا بھائی، ٹیمپل کی اپنی بیوی اور حتیٰ کہ وہ عورت سیلی بھی قاتل ہو سکتے ہیں۔" ڈینی نے اپنے خیال کو زبان دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں، لیکن جارج ٹیمپل کی زبان سے غیر ارادی طور پر ایک ایسا جملہ ادا ہو گیا تھا جو اس کے ملوث ہونے کا واضح اشارہ تھا۔"

"اوہ، اور وہ جملہ کیا تھا...؟"

"وہ جملہ یہ تھا کہ 'میرا خیال نہیں کہ ٹی وی کے شور میں نینسی کو کچھ سنائی دیا ہوگا۔'" میں نے جارج ٹیمپل کا جملہ دہراتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟ ہو سکتا ہے کہ نینسی کو ٹی وی کے شور میں واقعی کچھ سنائی نہ دیا ہو۔ یہ بات تم خود بھی کہہ چکے ہو کہ ہو سکتا ہے قاتل نے فائر کی آواز کو دبانے کے لیے ٹی وی کی آواز زیادہ تیز کر دی ہو۔"

"یہ درست ہے۔ لیکن جارج ٹیمپل کو کیسے پتا تھا کہ ٹی وی آن تھا اور پھر مزید کہ یہ اس کی آواز بھی بہت زیادہ تیز تھی؟"

"ہوں..." ڈینی تیزی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ "لعنت ہو۔ تم نے بالکل درست اندازہ لگایا ہے۔ مجھ سے یہ بات کیسے مس ہو گئی؟ وہ اس بات سے کیوں کر واقف ہو سکتا تھا... سوائے اس کے کہ وہ بذاتِ خود جائے واردات پر موجود تھا۔" ڈینی نے میری جانب دیکھتے ہوئے دانت نکال دیے۔ "نہایت عمدہ، پارٹنر۔"

پہلے تو جارج ٹیمپل نے کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔

لیکن جب تلاشی کے وارنٹ کے نتیجے میں اس کی کار کی ڈکی میں موجود اسپیئر وھیل کے نیچے سے ہیلن شیفر کی کچھ جیولری چھپی ہوئی برآمد ہو گئی تو اپنے وکیل کے مشورے کے باوجود اس نے خاموش رہنے کا اپنا قانونی حق استعمال نہیں کیا اور اس کے برخلاف روانی سے بولتا چلا گیا۔

"میں اسے قتل نہیں کرنا چاہتا تھا۔" جارج ٹیمپل نے کہا۔ "لیکن اس احمق عورت نے میرے لیے کوئی چوائس ہی نہیں چھوڑی۔ اسے اپنے صحن کے فرش پر مسلی ہوئی ایک سگریٹ مل گئی تھی اور اسے اس بارے میں یقین تھا کہ اس کے گھر میں چوری کرنے سے پہلے وہ سگریٹ میں نے وہاں فرش پر پھینکی تھی۔ میں نے اسے قائل کرنا چاہا کہ یہ کوئی ثبوت نہیں ہے لیکن وہ بس مجھ پر ہنستی رہی۔ اس نے کہا کہ پولیس سگریٹ پر سے میرا ڈی این اے بھی حاصل کر سکتی ہے اور شاید انہیں اس پر میری انگلیوں کے نشانات بھی مل جائیں۔ اس نے کہا کہ اگر میں دوپہر تک اس کی چوری شدہ ہر شے واپس لوٹا دوں تو شاید وہ میری خطا درگزر کر دے گی۔ لیکن مجھے اس کی اس بات پر ایک سیکنڈ کے لیے بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ تو بس چاہتی تھی کہ میں اس کا مال و اسباب لوٹا دوں تاکہ پھر وہ حقیقت میں مجھے گرفت میں لے لے۔ ویسے بھی اگر میں چاہتا تب بھی اس کا تمام مال و اسباب واپس نہیں کر سکتا تھا۔ میں پہلے ہی نقد رقم تمام کی تمام خرچ کرنے کے علاوہ کچھ جیولری بھی فروخت کر چکا تھا۔ صبح اپنی جاگنگ کے دوران میں اس کے مکان کے عقبی دروازے پر رکا تھا۔ میں اس وقت بھی پکا ارادہ کیے ہوئے تھا کہ اس کو قائل کر لوں گا کہ وہ میری اس خطا کو درگزر کر دے۔ وہ مجھ پر ہنستی رہی اور میرا مذاق اڑاتی رہی۔ لیکن پھر اس کی ہنسی جاری نہ رہ سکی اور اس کے قہقہے تھم گئے جب میں نے اپنا ریوالور نکالا اور ٹی وی کی آواز بہت تیز کر دی۔"

بے ایمانی کے راستوں سے گزرتی دیانت داری کی جانب گامزن زندگی کا سفر...

ذہانت اور علم کے بغیر کوئی انسا ان باتوں پر یقین نہیں کر سکتا... جن کا مشاہدہ اس کی آنکھیں کرتی ہیں... وہ علم و ذہانت دونوں رکھتا تھا... مگر جس ماحول و واقعات سے گزر رہا تھا... وہ اس کے نزدیک حقیقت سے دور تھے... اس کی متلاشی نگاہیں اصلیت کی کھوج میں تھیں... بالآخر اسے ایک دن تمام تر حقیقت کا پتا لگ گیا...

ذریعۂ آمدنی

آصف ملک
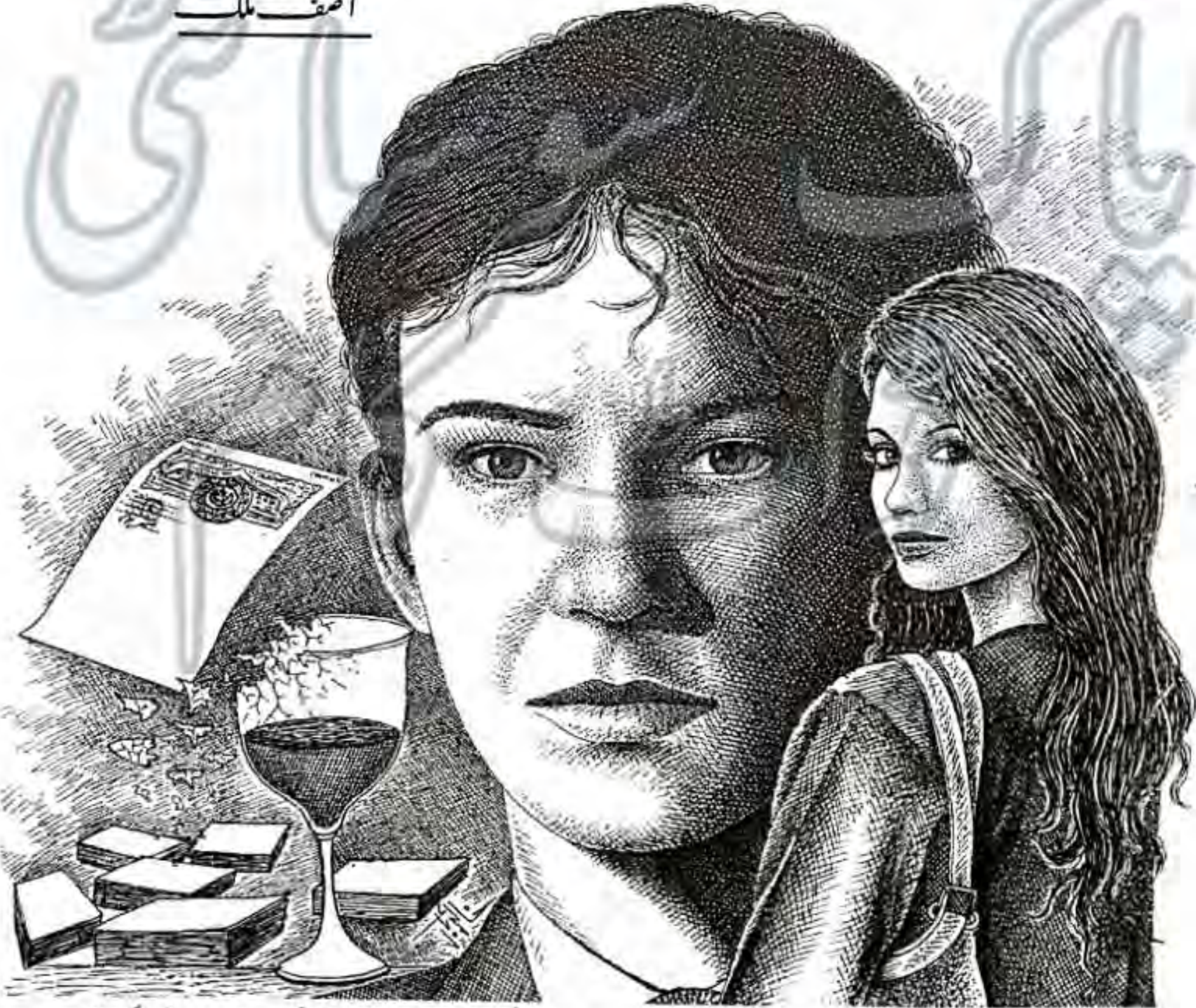
عبیداللہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو اس نے خلافِ توقع دفتر کو خاصا شاندار پایا۔ ورنہ سٹی کورٹ کے پاس جس عمارت کے دوسرے فلور پر یہ دفتر تھا، وہ خاصی پرانی اور خستہ حال تھی۔ سامنے استقبالیہ تھا۔ ایک سیاہ لکڑی اور گلاس ٹاپ ٹیبل کے پیچھے سیاہ رنگ کی دھات اور فوم کی بنی ریوالونگ چیئر تھی۔ میز پر جدید دفتری نوعیت کے لوازمات تھے۔ عبیداللہ نے داخلی دروازہ کھولا تو اس کے اوپر لگی مترنم گھنٹی بج اٹھی، چند لمحے بعد درمیانی دروازے سے ایک لڑکی

نے جھانکا۔

''یس مسٹر۔''

''عبید... عبیداللہ۔'' اس نے کسی قدر نروس لہجے میں کہا۔ ''وہ میں جاب انٹرویو کے لیے آیا ہوں۔''

''آپ بیٹھیں۔'' لڑکی نے کہا اور اندر غائب ہو گئی۔ کمرا اے سی تھا کیونکہ اے سی کی مخصوص خنکی اور مہک رچی ہوئی تھی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید عبیداللہ سوچتا کہ لڑکی خاصی حسین ہے۔ مگر اس وقت اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ تھی۔ اگر اسے یہ نوکری نہ ملی تو اسے واپسی کا ٹکٹ لینا پڑے گا۔ پھر اسے اپنی سوچ پر ہنسی آگئی۔ وہ واپس کہاں جاتا؟ وہ گاؤں سے طارق بن زیاد کی طرح نکلا تھا۔ یعنی تمام کشتیاں جلا کر آیا تھا۔ ابھی اس کے ہونٹوں سے ہنسی جدا نہ ہوئی تھی کہ لڑکی نے اچانک دروازہ کھولا اور اسے اکیلے بیٹھے مسکراتے دیکھ کر کسی قدر حیران ہوئی۔ عبیداللہ جلدی سے سنجیدہ ہو گیا۔ لڑکی نے کہا۔

''مسٹر عبیداللہ، کم ان۔''

وہ اندر آیا۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرا ثابت ہوا جس میں صرف ایک میز اور اس پر کمپیوٹر اور دوسرے لوازمات تھے۔ دیواروں کے ساتھ فائل کیبنٹ تھیں۔ یہاں کمرا دو حصوں میں تقسیم تھا۔ لڑکی نے اسے دوسرے کمرے میں جانے کا اشارہ کیا۔ ''سر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

وہ دوسرے کمرے میں آیا، یہ کسی قدر بڑا تھا۔ بڑی گلاس ٹاپ ٹیبل اور اس کے گرد چھ عدد کرسیاں زیادہ لگژری اور قیمتی تھیں۔ فرش پر دبیز قالین تھا۔ دیواروں کے ساتھ شیشے اور لکڑی سے بنی فکس الماریاں تھیں جن میں قانون کی کتابیں تھیں۔ یہ احسان شاہ ایڈووکیٹ کا دفتر تھا۔ حیرت انگیز چیز ایک طرف اوپر جانے والی لکڑی کی سیڑھی تھی جو تقریباً سیدھی اوپری فلور پر جا رہی تھی۔ احسان شاہ کسی قدر بے ترتیب حلیے والا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اس کی عمر چالیس سے پینتالیس کے لگ بھگ تھی۔ سامنے سے بال کسی قدر اڑ گئے تھے۔ ناک نقشہ برا نہیں تھا مگر آنکھوں کے نیچے لٹک جانے والے گوشت اور سوجن نے اسے بدہیئت بنا دیا تھا۔ اس کی وجہ بھی سامنے موجود تھی۔ ایک گلاس میں ام الخبائث، وہ پہلے سے خاصی پیے ہوئے تھا۔

اس نے اشارے سے عبیداللہ کو سامنے بیٹھنے کو کہا اور گلاس اٹھا لیا۔ اسے خالی کر کے میز پر رکھا اور شرٹ کی آستین سے منہ صاف کیا۔ عبیداللہ کا خیال تھا کہ اس سے انٹرویو ہوگا اور نشے میں ڈوبا ہوا احسان شاہ اس سے احمقانہ سوالات پوچھے گا۔ عبیداللہ کو سوالات پر کوئی اعتراض نہیں تھا وہ کسی بھی سوال کا جواب دینے کو تیار تھا۔ آخر اس نے بھی ایل ایل بی کیا تھا اور وکیل کا ہنر اس کی زبان میں ہوتا ہے۔ مگر احسان شاہ نے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس نے ڈھیلی ٹائی کو مزید ڈھیلا کیا اور بولا۔

''مسٹر عبیداللہ تمہیں اپائنٹ کیا جاتا ہے۔ کل سے تم دفتر آنا شروع کر دو۔''

''لیکن سر وہ انٹرویو...''

''ماریہ تمہیں تمہارا کام بتا دے گی۔'' احسان شاہ نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ''اب تم جا سکتے ہو، وش یو گڈ لک۔'' احسان شاہ نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اسے اٹھنا پڑا۔ مصافحہ کر کے وہ باہر آیا تو ماریہ اپنی میز پر موجود تھی اور سامنے رکھے کی بورڈ پر انگلیاں چلا رہی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ ہچکچا کر بولا۔

''انٹرویو نہیں ہوا لیکن انہوں نے مجھے جاب دے دی ہے۔''

''تھینک گاڈ۔'' ماریہ نے اطمینان کا طویل سانس لی۔ وہ صرف خوش شکل ہی نہیں بلکہ اسمارٹ بھی تھی۔ لان کا جدید اسٹائل اور فٹنگ کا سوٹ اس پر جچ رہا تھا۔ ''اگر اب کوئی اپائنٹ نہ ہوتا تو میں استعفا دے دیتی۔''

''کیوں؟'' عبید نے بے ساختہ پوچھا پھر شرمندہ ہو گیا۔ ''سوری...''

''کوئی بات نہیں، اب ہم کولیگ ہیں، بیٹھو۔'' ماریہ نے سامنے اشارہ کیا۔ ''میں دو مہینے سے سب ڈیل کر رہی ہوں اور یہ بہت مشکل کام ہے۔''

''سر نے کہا ہے کہ میری ذمے داریاں آپ بتائیں گی۔''

''ذمے داریاں خاص نہیں ہیں۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''کسٹمرز دیکھنے ہوتے ہیں، مگر دن میں دو تین سے زیادہ کسٹمرز نہیں آتے ہیں۔ ہم زیادہ تر جائداد کی خرید فروخت کے معاملات کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ سیل کا بزنس ہے۔''

''سیل کیا چیز؟''

''اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ سارا کام تمہیں کرنا ہے۔''

ماریہ اس سے بہت بے تکلفی سے بات کر رہی تھی اس لیے اس کی جھجک خود دور ہو گئی۔ ''سر نے کہا ہے میں کل سے آجاؤں۔ لیکن انہوں نے مزید کچھ اور نہیں بتایا۔''

"مزید سے کیا مراد ہے؟"
"یہی کہ ٹائمنگ کیا ہوں گی اور... سیلری۔"
"سیلری کا تو سر ہی طے کریں گے۔ باقی ٹائمنگ وہی آفس والی ہیں نائن ٹو فائیو۔"
"کورٹ کا کام بھی ہوگا؟"
"نہیں کورٹ کے سارے معاملات سر خود دیکھتے ہیں۔" ماریہ کے جواب سے اسے کسی قدر مایوسی ہوئی۔ وہ تو بہ طور وکیل اپنا کیریئر بنانا چاہتا تھا۔ وکلا تحریک کے دوران اس نے گریجویشن کیا تھا اور پھر اس تحریک سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے وکیل بننے کا فیصلہ کیا اور ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا۔ اس نے کالج کی ساری تعلیم ایوننگ کلاسز میں حاصل کی تھی کیونکہ صبح سے دوپہر تک وہ دودھ دہی کی دکان پر کام کرتا تھا۔ عزیز اللہ اس کا رشتے کا چچا تھا اور شہر میں وہ اسی کے پاس رہا تھا۔ اس نے عبید کا سارا خرچ اٹھایا تھا اور جواب میں وہ اس کی دکان پر کام کرتا تھا۔ مگر اب اس کے اپنے بچے جوان ہو گئے تھے اس لیے اسے عبید کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب جہاں عبید کی ضرورت تھی وہاں وہ تیار نہیں تھا۔ عزیز اللہ کی ایک ہی بیٹی تھی۔ صورت شکل کی ایسی تھی کہ اسے باڑے کی بھینسوں کے درمیان چھوڑ دیا جاتا تو فرق ذرا مشکل سے سمجھ میں آتا۔ عزیز اللہ چاہتا تھا کہ عبید اس سے شادی کر لے مگر عبید کسی قیمت پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مسئلہ صرف شکل صورت کا نہیں تھا تعلیم اور عقل میں بھی وہ بھینس سے کم نہیں تھی یعنی اسکول کا منہ نہیں دیکھا تھا اور سب سے زیادہ رغبت کھانے سے تھی۔ اس لیے عزیز اللہ نے اسے وارننگ دے دی تھی کہ اس کے پاس یہ آخری مہینہ ہے، وہ اپنا بندوبست کر لے۔

اس لیے کورٹ سے فی الحال دوری ایسا مسئلہ نہیں تھا کہ وہ سرے سے انکار کر دیتا۔ اسے ہر حال میں نوکری کی ضرورت تھی چاہے وہ اس دفتر میں چپڑاسی کی کیوں نہ ہوتی۔ ماریہ اسے استقبالیہ والے کمرے میں لائی اور میز کی طرف اشارہ کیا۔ "اب یہ تمہاری ہے۔ ویسے تم فکر مت کرو کام بہت زیادہ نہیں ہے۔ اگر سر چاہتے تو میں ہی کر لیتی مگر ان کے خیال میں اس کے لیے الگ سے آدمی رکھنا ضروری ہے۔ مجھے دو جگہ کام سے الجھن ہوتی ہے۔"

عبید نے دل ہی دل میں احسان شاہ کے اس خیال کو سراہا جس کی وجہ سے اسے یہاں نوکری مل گئی تھی۔ ورنہ ماریہ کے خیال میں تو اس کی ضرورت ہی نہیں تھی، اس پر ایک لمحے کے لیے اس کا دل ماریہ سے برا ہوا مگر فوراً اچھا ہو گیا۔ وہ اتنی خوب صورت اور دلکش تھی کہ کوئی مرد اس سے ناراض ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ اسے کام کا مینول سمجھانے لگی۔

عبید کا اصل کام مختلف معاہدوں کے ڈرافٹ بنانا تھا بلکہ ڈرافٹ بھی بنے بنائے ہوتے تھے وہ صرف انہیں معاہدے کے حساب سے ترتیب دیتا اور پھر یہ احسان شاہ کے پاس چلے جاتے۔ وہ انہیں فائنل چیک کر کے اسٹامپ پیپرز پر پرنٹ کر لیتا۔ ماریہ نے بتا دیا تھا کہ دن میں ایسے دو تین معاہدے تیار کرنے ہوں گے اور یہ مشکل سے دو گھنٹے کا کام تھا۔ اس کے علاوہ اسے ہر صبح اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ دیے جاتے جو اسے آنے والوں کو سیل کرنا ہوتے تھے۔ عبید نے پوچھا۔ "یہ کون خریدتا ہے کورٹ اور اس کے آس پاس بے شمار سیل کرنے والے موجود ہیں۔"

"ہم تین فیصد ڈسکاؤنٹ دیتے ہیں۔" ماریہ نے بتایا۔ "اس وجہ سے بہت سے وکیل اور منشی ہم سے لیتے ہیں۔ ایک دن میں اچھی خاصی سیل ہو جاتی ہے۔"

"یعنی سارا دن خریدنے والے آتے ہوں گے۔"

"نہیں، مشکل سے پندرہ بیس گاہک ہیں اور لگے بندھے ہیں۔ وہ سر کو پہلے ہی کال کر کے بتا دیتے ہیں اور وہ صبح مجھے اسی حساب سے چیزیں دے دیتے ہیں۔"

عبید نے پوچھا۔ "مجھ سے پہلے جو کام کرتا تھا اس نے کیوں ملازمت چھوڑ دی؟"

"چھوڑی نہیں سر نے اسے لات مار کر نکال دیا۔"

یہ سن کر عبید پریشان ہو گیا کہ یہاں لات مار کر نکالنے کا رواج بھی موجود ہے۔ "مگر کیوں؟"

"وہ دو سال سے یہاں جاب کر رہا تھا مگر اچانک اس کے ذہن میں کیا خناس آیا کہ مجھ سے بے تکلف ہونے لگا۔ حالانکہ اس سے پہلے بالکل ٹھیک تھا۔ ایک دن اس نے کچھ زیادہ ہی بے تکلفی دکھائی تو میں نے پہلے اسے تھپڑ مارا اور پھر سر سے شکایت کی تو انہوں نے اسے کھڑے پیروں جاب سے نکال دیا۔"

"یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔ پتا نہیں آپ کو میری کون سی بات بری لگ جائے اور مجھے بھی لات مار کر نکال دیا جائے۔"

"بس اس کا خیال رکھنا۔" ماریہ نے کسی قدر شوخی سے کہا۔ عبید وہاں سے نکلا تو خوشی کے باوجود ایک کھٹک تھی کہ احسان شاہ نے اسے اتنی آسانی سے رکھ لیا مگر تنخواہ کا ذکر بھی نہیں کیا۔ پتا نہیں اسے کتنی تنخواہ ملے اور اس کا گزارا ہو یا نہ ہو۔ ابھی اسے رہائش کے لیے مکان بھی تلاش کرنا تھا اور

یہ اتنا مسئلہ نہیں تھا جن دنوں وہ ایل ایل بی کر رہا تھا تو اس کے کئی کالج فیلو اسی طرح چھڑے چھانٹ رہ رہے تھے اور وہ فلیٹ یا مکان کرائے پر لے کر اس کا کرایہ اور دوسرے اخراجات آپس میں بانٹ لیتے تھے۔ اس کی واقفیت ایسے دو تین لڑکوں سے تھی۔ وہ ان سے بات کرتا تو اسے کہیں نہ کہیں جگہ مل جاتی۔ اس نے فی الحال عزیز اللہ کو نہیں بتایا کہ اسے پکی جاب مل گئی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ ایک ہفتے اسے ٹرائل پر رکھیں گے اور پھر پکا کریں گے۔ اگلے دن وہ آفس پہنچا تو دروازہ بند تھا، اس نے بیل کا بٹن تلاش کیا مگر اس کا کوئی بٹن نہیں تھا پھر وہ دروازہ بجانے جارہا تھا کہ وہ خود کھل گیا اور سامنے احسان شاہ نائٹ گاؤن میں ملبوس کھڑا تھا۔ اس نے سلام کا جواب دے کر کہا۔

''دروازہ ٹھیک نو بجے ان لاک ہوجاتا ہے۔ آج پہلا دن ہے اس لیے بتا رہا ہوں۔ کل سے تمہیں نو بجے کھلا ملے گا۔''

''جی سر۔'' اس نے کہا اور اندر آ گیا۔ احسان شاہ کے آفس میں سیڑھی دیکھ کر وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی رہائش اوپر تھی اس لیے اسے یوں نائٹ گاؤن میں دیکھ کر تعجب نہیں ہوا۔ رات کی مے نوشی کے آثار اس کے چہرے پر تھے مگر لہجہ بالکل صاف تھا۔ اس نے پوچھا۔

''ماریہ نے بتادیا تھا۔''

''جی سر۔'' عبید نے پھر کہا۔

''دین ویٹ فار ہر۔'' وہ اندر کی طرف بڑھ گیا۔ عبید اپنی کرسی پر آن بیٹھا، اس نے وقت گزاری کے لیے میز کی درازیں کھول کر دیکھنا شروع کر دیں۔ ان میں سے ایک دراز لاک تھی۔ ان میں صرف اسٹیشنری کا اضافی سامان تھا۔ پھر وہ فائل کیبنٹ دیکھ رہا تھا کہ ماریہ آ گئی۔ سلام اور حال احوال کے بعد وہ اندر چلی گئی۔ پندرہ منٹ بعد وہ اندر سے ایک بڑا فولڈر اور ایک پلاسٹک بکس لے کر آئی۔ عبید کے سامنے رکھ کر اس نے فولڈر کھولا۔

''یہ اسٹامپ پیپرز ہیں۔ مختلف مالیت کے اور یہ بکس میں ٹکٹ ہیں۔'' اس نے پلاسٹک بکس کھول کر دکھایا جس میں مختلف مالیت کے ٹکٹس کی پوری پوری شیٹس تھیں۔ ''شیٹس پوری پوری سیل کرنی ہے یعنی کوئی اس میں سے آدھے یا کم مالیت کے ٹکٹ نہیں مانگے گا اور نہ تم دو گے۔ باقی اسٹامپ کوئی ایک بھی مانگے تو دینا ہوگا۔''

''میں سمجھ گیا۔''

ماریہ نے اسے ایک چابی دی۔ یہ اس دراز کی تھی جو لاک تھی۔ ''یہ سمجھو کیش بکس ہے اس میں چینج ہے۔ مگر تمہیں بھی خیال رکھنا ہوگا کہ چینج ختم نہ ہونے پائے۔''

عبید کو کیش ہینڈلنگ کا تجربہ تھا کیونکہ وہ چھ سال سے دکان پر کام کر رہا تھا۔ اس نے اعتماد سے کہا۔ ''میں کرلوں گا۔''

''گڈ مجھے بھی یہی توقع ہے۔ شام کو تم مجھے مکمل حساب دے کر جاؤ گے۔'' ماریہ نے اسے مطلع کیا۔ ''چائے کافی اور کولڈ ڈرنک میری ذمے داری ہیں تم جب چاہے طلب کرسکتے ہو۔''

''شکریہ میں دن میں دو بار چائے پیتا ہوں۔ کافی اور کولڈ ڈرنک کا شوق نہیں ہے۔''

''اوکے جب ضرورت ہو تو مجھے انٹرکام پر بتادینا۔''

ماریہ نے کہا اور اندر چلی گئی۔ عبید نے دو الگ درازوں میں اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ بکس رکھا۔ کیش والی دراز میں تقریباً ہزار روپے کا چینج تھا۔ اس میں بیس، پچاس اور سو کے نوٹ الگ الگ خانوں میں تھے۔ ان کے علاوہ دو خانے اور تھے جن میں ہزار اور پانچ سو کے نوٹ آتے۔ اس نے چابی لاک میں لگی رہنے دی اور کمپیوٹر کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایک گھنٹے تک وہ اس کا معائنہ اور اپنے حساب سے اس کی سیٹنگ کرتا رہا۔ اس کے کام کے لیے ایک الگ فولڈر موجود تھا جس میں معاہدوں کی ہر ممکن دستاویزات کی ورڈ فائلیں موجود تھیں۔ درحقیقت اس دفتر میں ہر چیز بہترین تھی۔

جب کرنے کو کچھ نہیں رہا تو اس نے ماریہ سے چائے کا کہا۔ اسے چائے کی طلب بھی نہیں تھی مگر وہ ماریہ کو دیکھنا چاہتا تھا اس لیے چائے کا کہا۔ وہ پانچ منٹ بعد ٹی بیگ والی چائے لے آئی۔ ٹی بیگ نفیس قسم کے مگ میں لگا ہوا تھا۔ ساتھ میں کنڈینسڈ ملک اور شکر دان بھی تھا۔ اس نے تمام چیزیں اس کے سامنے رکھیں کہ اپنی مرضی سے بنا لے۔ وہ اس سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اسی لمحے دروازے کی گھنٹی بجی اور ایک شخص اندر آیا۔ ماریہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ آنے والا عام سافرد تھا اور ایک وکیل کا فرستادہ تھا۔ وہ اس سے اسٹامپ پیپرز لینے آیا تھا۔ اس نے سات سو روپے کے مختلف مالیت کے اسٹامپ پیپرز مانگے اور عبید نے اسے دے کر اور کیش لے کر دراز میں ڈال دیا۔ دوپہر تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اس دوران میں دو گاہک بھی آئے جنہیں احسان شاہ کی خدمات کی ضرورت تھی۔ ان کے جانے کے بعد احسان شاہ نے ان کے کیسز کے بارے میں اسے تحریری ہدایات دیں کہ اسے کون سے معاہدے کن

باتوں کا خیال رکھ کر تیار کرنے تھے۔ ساتھ ہی اس نے کہا۔
''یہ کام لنچ کے بعد کرنا۔ لنچ تک ہر چیز کا رش ہوتا ہے۔''
اس کا کہنا درست ثابت ہوا تھا۔ ایک بجے تک اسٹامپ اور اسٹامپ پیپرز خریدنے والے آتے رہے اور تقریباً دس ہزار سے اوپر کی فروخت ہوئی تھی۔ ماریہ کی ہدایت کے مطابق عبید ہر خریداری پر تین فیصد ڈسکاؤنٹ دے رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لنچ کے لیے اسے باہر ہی جانا پڑے گا اور اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ اس کی جیب خالی تھی مگر ساڑھے بارہ بجے ماریہ نے کمرے سے جھانکا اور پوچھا۔ ''تم لنچ میں کیا لو گے؟''
وہ چونکا۔ ''کیا لنچ آفس کی طرف سے ہے؟''
''بالکل۔'' وہ بولی۔ ''ہمیں اپنی پسند کا لنچ کرنے کی اجازت ہے، پانچ سو روپے تک کا آرڈر کر سکتے ہیں۔''
عبید خوش ہو گیا۔ ''یہاں سے کیا اچھا ملتا ہے؟''
''سب اچھا ملتا ہے لیکن میں زیادہ تر پزا اور پاستا کو ترجیح دیتی ہوں۔''
''میں ہوں پینڈو آدمی میرے لیے بریانی منگوا لو۔''
ماریہ اندر چلی گئی، اس نے فون پر آرڈر کیا۔ ایک بجے تک لنچ آ گیا تھا۔ ماریہ کی ہدایت پر اس نے دروازے کے باہر لنچ بریک کی تختی لٹکا دی اور دروازہ اندر سے لاک کر دیا۔ انہوں نے لنچ ساتھ ہی کیا تھا۔ احسان شاہ اندر تھا۔ ماریہ نے بتایا کہ آج کورٹ کا کوئی کام نہیں تھا اس لیے سر نہیں گئے۔ عبید نے اس کے کھانے کا پوچھا تو ماریہ نے کہا۔
''وہ خود ناشتا بناتے ہیں اور پھر لنچ نہیں کرتے۔ شام کا کھانا کہیں باہر کھاتے ہیں۔''
''وہ اکیلے رہتے ہیں؟''
''میں نے کبھی ان کا اپارٹمنٹ نہیں دیکھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ وہ اکیلے رہتے ہیں۔''
عبید نے حیرت سے کہا۔ ''آپ کو یہ بھی نہیں معلوم، آپ کب سے یہاں کام کر رہی ہیں؟''
''تین سال ہو گئے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''جب مجھے یہ جاب ملی تو مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔''
''جیسے ابھی مجھے ہے۔'' عبید نے بے ساختہ کہا۔
ماریہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم ایل ایل بی ہو اور پھر لڑکے ہو۔ میں تو انٹر پاس تھی اور کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ کمپیوٹر استعمال کرنا دور کی بات ہے، میں نے کبھی کمپیوٹر پاس سے بھی نہیں دیکھا تھا۔''
''مالی مسئلہ تھا؟''
''وہ تو تھا لیکن اس سے بڑھ کر اپنی زندگی خود بنانے کا مسئلہ تھا۔'' ماریہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ ایک لڑکی جس کے ماں باپ اس کے بچپن میں گزر گئے ہوں اور وہ اپنے دور پرے کے رشتے داروں کے ہاں پلی ہو۔ جب وہ اچانک اسے کہیں کہ وہ اپنا بندوبست کر لے تو اس پر کیا گزرتی ہے۔''
عبید حیران ہوا۔ ''یہ تو میری کہانی ہے، لیکن آپ نے ٹھیک کہا میں اتنی مشکل میں نہیں ہوں جتنی آپ نے برداشت کی ہے۔''
''اس لیے تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب سر نے مجھے یہ جاب دی تو میری کیا کیفیت تھی اور میں ان کی کتنی شکر گزار تھی۔ ان تین سالوں میں میں نے جتنے سکون سے زندگی گزاری ہے، یہ میرے ان اٹھارہ سالوں کا صلہ ہے جو میں نے بہت تکلیف اور مشکل میں گزارے۔''
''اب آپ کہاں رہتی ہیں؟''
''سر نے ہی ایک وومین ہوسٹل میں جگہ دلوائی ہے۔ اس کی مالکن ان کی جاننے والی ہے اور وہ میرا بلکہ سب لڑکیوں اور عورتوں کا بہت خیال رکھتی ہے۔ پیسے لیتی ہے مگر اس کے بدلے سہولتیں بھی ساری ملتی ہیں اور ماحول بہت اچھا ہے۔ رات کو ہم آپس میں گپ شپ کرتے ہیں، ٹی وی اور موویز دیکھتے ہیں۔ چھٹی والے دن مل کر کام نمٹاتے ہیں اور مہینے میں ایک بار سب مل کر کہیں پکنک پر جاتے ہیں۔''
''یہ تو مزے کی لائف ہے، دعا کریں کہ مجھے بھی کوئی ایسی جگہ مل جائے۔''
''پلیز یہ آپ جناب چھوڑ دو۔'' ماریہ نے اسے ٹوکا۔ ''ہم کولیگ ہیں اور اس طرح تکلف سے بات کرنا اچھا نہیں لگتا۔''
''ٹھیک ہے۔'' عبید نے سر ہلایا۔
لنچ کے بعد اس نے احسان شاہ کی ہدایت کے مطابق معاہدے تیار کیے اور انہیں احسان شاہ کو ای میل کر دیا۔
دوپہر میں بھی اسٹامپ پیپر اور اسٹامپ کے کچھ گاہک آئے تھے۔ ان میں سب ہی وکیل یا عدالت کا کام کرنے والے نہیں تھے بلکہ دوسرے شعبوں کے لوگ جنہیں اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ کی ضرورت ہوتی ہے وہ بھی لینے کے لیے آ رہے تھے۔ شام تک اس نے بارہ ہزار کی سیل کر دی تھی اور بہت تھوڑے سے اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ بچے تھے۔ ایک گھنٹے بعد احسان شاہ نے اسے ایک معاہدے

میں چند معمولی غلطیاں ٹھیک کرنے کو کہا۔ جو اس نے ٹھیک کر کے اسے فائل دوبارہ ای میل کر دی۔ چار بجے تک وہ فارغ ہو گیا تھا۔ اس لیے اس نے ماریہ کو رقم اور باقی رہ جانے والے اسٹامپ پیپرز، ٹکٹ اور حساب حوالے کیا۔ حساب اس نے ایکسل شیٹ پر بنا کر اسے ای میل کر دیا، وہ خوش ہو گئی۔ ''یہ ٹھیک ہے زبانی اور ہاتھ کا لکھا ہوا مشکل ہوتا ہے تم روزانہ اسی طرح ایکسل شیٹ پر بنا کر بھیج دینا۔''

پانچ بجے وہ چھٹی کر کے اٹھ گیا۔ ماریہ اس کے جانے کے بعد جاتی جیسے وہ اس کے آنے کے بعد صبح دفتر آئی تھی۔ گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا کہ ماریہ یقیناً خود اعتماد لڑکی ہے ورنہ ہر لڑکی اس طرح اکیلے اور ایک شرابی کے ساتھ کام نہیں کر سکتی تھی۔ مگر وہ جس طرح احسان شاہ کی تعریف کر رہی تھی، ایسا لگتا تھا کہ اس سے زیادہ اچھا اور نیک آدمی کوئی اور نہیں ہے۔ ماریہ ایسی لڑکی نہیں لگ رہی تھی جو کسی کی بے جا تعریف کرے۔ دو دن بعد اتوار تھا اس نے فیصلہ کیا کہ اتوار کے دن وہ اپنے لیے کوئی جگہ تلاش کرے گا۔ اُس نے کئی جاننے والوں سے بات کر لی تھی اور انہوں نے اسے بتایا تھا کہ ایسی کئی جگہیں تھیں بس وہ آ کر وزٹ کر لے۔ عبید کسی قدر ہچکچاہٹ کا شکار بھی تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے تنخواہ کیا ملے گی؟ جتنی اس کی آمدنی ہوتی اسی حساب سے اسے اخراجات رکھنے تھے اس لیے ہفتے کی شام چھٹی سے پہلے اس نے احسان شاہ سے ملاقات کی درخواست کی۔ احسان شاہ نے اسے دفتر میں بلوالیا۔ پہلے دن کے برعکس وہ بالکل تک سک سے تیار اور تازہ دم لگ رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی آنکھوں کے نیچے موجود گوشت کا بھاری پن اور چہرے کی سوجن بھی غائب تھی۔ اس وقت وہ اچھا اور سوبر لگ رہا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے عبید کی طرف دیکھا۔

''یس۔''

''سر مجھے اب تک یہ نہیں معلوم کہ مجھے تنخواہ کتنی ملے گی۔''

''تم سے پہلے جو کام کر رہا تھا، اسے میں پندرہ ہزار دیتا تھا مگر کیونکہ تم نے مجھے مطمئن کیا ہے اس لیے تمہیں پندرہ سے اسٹارٹنگ دے رہا ہوں۔ اگر تم نے اسی طرح کام کیا تو تین مہینے بعد تنخواہ بڑھ جائے گی۔ سال کے سال اضافہ بھی ہوگا۔''

عبید خوش ہو گیا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ اسے آغاز میں ہی پندرہ ہزار ملیں گے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اسے دس کے آس پاس تنخواہ ملے گی۔ اس نے احسان شاہ کا شکریہ ادا کیا۔

''تھینک یو سر، کیا مجھے پیر تک کچھ رقم ایڈوانس مل سکتی ہے۔''

احسان شاہ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تمہیں ایڈوانس کی ضرورت کیوں ہے، کم آن کھل کر بتاؤ۔''

عبید نے اسے صاف گوئی سے اپنے بارے میں سچ سچ بتا دیا کہ وہ کن حالات میں رہ رہا تھا اور اسے ایڈوانس کی ضرورت کیوں تھی۔ احسان شاہ نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے تم پیر والے دن ماریہ سے دس ہزار ایڈوانس لے لینا اور یہ اگلی تنخواہ سے نہیں کٹے گا بلکہ دو ہزار کر کے ہر مہینے کاٹا جائے گا۔''

''تھینک یو ویری مچ سر۔'' اس بار عبید سچ مچ ممنون ہو گیا۔

''شکریے کی ضرورت نہیں ہے، اب تم یہاں کام کرتے ہو اور تمہارے مسائل میرے بھی ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ ہو بلا جھجک مجھ سے یا ماریہ سے کہہ دینا۔''

عبید باہر آیا تو اسے لگا وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ اس کی تنخواہ توقع سے بڑھ کر تھی ساتھ ہی احسان شاہ اس سے جس طرح پیش آیا تھا، اس کا اس نے سوچا نہیں تھا۔ خاص طور سے اولین ملاقات کے موقع پر اس کا جو تاثر سامنے آیا تھا اس کے بعد عبید کو لگ رہا تھا کہ وہ شاید آسانی سے یہاں ملازمت نہ کر سکے۔ مگر یہاں تو آسانیاں ہی آسانیاں تھیں۔ اچھی تنخواہ، فری لنچ اور ہر مسئلہ پیش کرنے کی پیشکش۔ ایسی جاب کہاں ملتی ہے۔ کام بھی مزے کا تھا۔

اتوار کو عبید نے ایک نزدیکی بیچلر ہوسٹل میں کمرا لے لیا۔ اسے بلوں اور ناشتے سمیت وہ پانچ ہزار کا پڑا تھا۔ ماریہ سے ایڈوانس کی رقم لے کر اس نے اگلے دن ہی ہوسٹل میں کمرا لے لیا اور وہاں منتقل ہو گیا۔ ہوسٹل سے آفس تک پیدل کا سفر تھا۔ وہ پونے نو بجے تک ناشتا کر کے نکل آتا اور آفس پہنچ جاتا۔ لنچ اس کا دفتر میں ہوتا تھا اور رات کے لیے کھانے کے لیے وہ کوئی ہلکی چیز جاتے ہوئے لے جاتا تھا۔ رات میں اسے بھاری کھانے کی عادت نہیں تھی۔ ایک مہینہ پورا ہونے سے پہلے وہ یوں سیٹ ہو گیا جیسے ہمیشہ سے یہی زندگی گزارتا آیا تھا۔ البتہ اسے زیادہ مزہ آفس میں آتا تھا۔ اتوار کا دن وہ مشکل سے گزارتا تھا حالانکہ اس دن خاصے کام نمٹانے ہوتے تھے، وہ اپنے ہفتے بھر کے کپڑے دھوتا۔ ہوسٹل میں لانڈری تھی۔ اپنے کمرے کی تفصیلی صفائی کرتا اور خریداری کرتا تھا۔ اس کے باوجود یہ دن مشکل سے گزرتا تھا اور پیر آتا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا۔

اتنے عرصے میں صرف ایک بات عبید کو کھٹکی تھی اور

اس کا تعلق بھی براہِ راست اس سے نہیں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ دفتر کی آمدنی اتنی نہیں تھی جتنے کہ اخراجات تھے۔ دو تین معاہدے کرانے والوں اور پھر سیل سے اتنا کہاں ملتا ہوگا کہ اتنے اعلیٰ انداز میں اخراجات کیے جائیں۔ مگر اس نے فی الحال ماریہ سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ ماریہ کا ہوسٹل یہاں سے کچھ دور تھا اور اسے بس میں جانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی بس نہیں ملتی تو وہ رکشے سے چلی جاتی تھی۔ ایک شام جب وہ چھٹی کر کے نکلنے والے تھے، موسم غیر متوقع طور پر خراب ہوگیا۔ دو دن سے شدید گرمی تھی۔ اگرچہ اے سی میں پتا نہیں چلتا تھا مگر جب وہ آفس سے نکلتے تو ان کو معلوم ہو جاتا۔ وہ باہر نکلے تو آسمان سیاہ بادلوں سے بھر گیا تھا۔ ماریہ نے پریشان ہو کر کہا۔ ”بارش...“

عبید ہنسا۔ ”جب نہیں ہو تب بھی ہم پریشان ہوتے ہیں اور جب ہو تو زیادہ پریشان ہو جاتے ہیں۔“

”ابھی سب گاڑیاں غائب ہو جائیں گی۔“ ماریہ بولی اسی لمحے آسمان سے جیسے پانی کی چادر گرنے لگی۔ اتنی تیز بارش تھی کہ لمحوں میں سب جل تھل ہوگیا اور دس منٹ سے بھی پہلے سڑک پانی میں غائب ہو چکی تھی۔ گاڑیاں اس سے بھی پہلے غائب ہو گئی تھیں۔ ماریہ نے عبید کی طرف دیکھا۔ ”دیکھا میں نے کیا کہا تھا؟“

”کوئی بات نہیں، ہم انتظار کر سکتے ہیں۔“ عبید نے اسے تسلی دی۔

”اس کے بعد بھی کچھ نہیں ملے گا۔ تم مزے سے ٹہلتے ہوئے اپنے ہوسٹل چلے جاؤ گے، میں کیسے جاؤں گی؟“

”میں تمہیں پہنچا کر جاؤں گا۔“ عبید نے اسے تسلی دی۔ وہ شیڈ کے نیچے سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ کیونکہ دفتر خالی ہو گئے تھے اس لیے اب کوئی آ جا نہیں رہا تھا۔ اوپر رہائشی فلیٹوں کے لیے آمد و رفت کا راستہ دوسرا تھا جو اس عمارت کے عقبی حصے میں تھا۔ ماریہ نے پاؤں اوپر کیے کیونکہ چھینٹے آرہے تھے اور بولی۔

”سر بھی آفس بند کر کے فلیٹ میں جا چکے ہوں گے ورنہ ہم بارش رکنے تک آفس میں رک جاتے۔“

”یہاں بھی بُرا نہیں ہے۔“ عبید نے کہا۔ ”یہاں آنے کے بعد پہلی بار اتنی تیز بارش دیکھ رہا ہوں۔“

”ہاں اچھا لگ رہا ہے لیکن میرا چائے پینے کو دل چاہ رہا ہے۔“

”کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ عبید نے کہا اور اسی عمارت کے نیچے موجود چائے والے کو آواز دے کر دو کپ چائے کا

کہا۔ ماریہ مسکرائی۔

''تھینک یو۔''

چائے آئی تو وہ دفتر کے بارے میں بات کرنے لگے۔ دونوں اپنے بارے میں بتا رہے تھے اور دونوں کا خیال تھا کہ یہ جاب ان کی توقع سے کہیں بڑھ کر تھی۔ ماریہ نے کہا۔ ''تم سوچ نہیں سکتے کہ اس جاب کی وجہ سے مجھے کتنی سہولت ہوئی ہے۔ میں نے اتنی بچت کرلی ہے کہ اب کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے کر آگے پڑھ سکتی ہوں۔ میں نے ایوننگ کالج سے گریجویشن کرلیا ہے۔''

''میرا بھی یہی ارادہ ہے۔'' عبید نے کہا۔ ''لیکن ابھی میری جاب کا اسٹارٹ ہے۔ کچھ رقم جمع ہوجائے تو میں ایل ایل ایم کروں گا۔ میرا ارادہ ہائی کورٹ اور پھر سپریم کورٹ کا وکیل بننا ہے۔''

''تمہیں پتا ہے مجھے آگے پڑھنے کا مشورہ سر نے دیا ہے۔'' ماریہ نے انکشاف کیا۔

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تو مجھے سر بہت عجیب سے آدمی لگتے ہیں۔''

''وہ تو بہت سیدھے ہیں۔'' ماریہ بولی۔

''تم شاید کہنا چاہ رہی ہو کہ وہ بہت شریف ہیں۔ میری مراد یہ نہیں ہے کہ ان میں کوئی خامی ہے بلکہ میں کہہ رہا ہوں کہ وہ زیادہ ہی اچھے ہیں۔''

''یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔'' ماریہ چہکی۔

''لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔''

''کون سی بات؟''

''یہی کہ فرم کا بزنس اتنا نہیں ہے تو پھر سر اخراجات کیسے پورے کرتے ہیں؟''

''کماتے ہیں تو پورے کرتے ہیں۔'' ماریہ نے سادگی سے کہا۔

''تم دیکھو نا، دن میں دو تین آدمی وکیل کے لیے آتے ہیں وہ پانچ چھ سو سے زیادہ فیس نہیں دیتے ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے اس قسم کے معاہدوں کی اس سے زیادہ فیس نہیں دی جاتی ہے بہت ہوا تو ہزار روپے دیتے ہوں گے۔''

''اور وہ جو ہم اسٹامپ پیپرز اور اسٹامپ سیل کرتے ہیں۔''

''ہم تو لکھی قیمت پر تین فیصد ڈسکاؤنٹ دے رہے ہیں جب کہ کوئی ایک روپیہ کم نہیں کرتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق حکومت تین فیصد ڈسکاؤنٹ پر ہی آگے سیل کرتی ہے گویا ہم جتنے میں لیتے ہیں، اتنے ہی میں سیل کر رہے ہیں۔''

ماریہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''واقعی اس لحاظ سے دیکھا جائے تو روز کی آمدنی تین ہزار بھی نہیں بنتی ہے اور اخراجات اس سے کہیں زیادہ ہیں۔''

''یہ تو صرف ہماری تنخواہوں اور آفس کے اخراجات سے بھی کم ہیں پھر سر کی اپنی زندگی اور لائف اسٹائل ہے۔'' عبید نے ہاتھ سے ہوٹل کا اشارہ کیا۔ ''یہ سستا تو نہیں ہوگا۔''

''وہ عام طور سے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر کرتے ہیں۔'' ماریہ بولی۔ ''وہاں کا بل ہی دو تین ہزار سے کم کیا ہوگا۔''

''تب یہ خرچہ کیسے پورا ہوتا ہے؟''

ماریہ سوچ میں پڑ گئی پھر اس نے شانے جھٹکے۔ ''ہمیں کیا سر کسی طرح پورا کرتے ہوں گے۔''

ماریہ نے شانے جھٹکے تو اس کے دلکش وجود میں لہریں سی اٹھیں عبید اسے دیکھتا رہ گیا۔ ماریہ کو کچھ دیر سے احساس ہوا اور اس نے پوچھا۔ ''یوں کیا دیکھ رہے ہو؟''

''وہ... کچھ نہیں۔'' عبید گڑبڑا کر بولا پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''میرا خیال ہے بارش رکنے والی ہے، میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔''

بارش رکتے ہی وہ پیدل روانہ ہوئے۔ سڑک پر پانی کے ریلے بہہ رہے تھے اور انہیں کھلے مین ہولز کا خیال بھی رکھنا پڑ رہا تھا اس لیے جب وہ ماریہ کے ہوسٹل پہنچے تو تاریکی چھا چکی تھی۔ بارش دوبارہ برسنے کے لیے تیار تھی۔ جو بھی سہی گاڑیاں تھیں، وہ بھی غائب ہوچکی تھیں اور ابھی عبید کو واپس بھی جانا تھا۔ ماریہ مجبور تھی، اسے روک بھی نہیں سکتی تھی۔ ہوسٹل میں ملاقاتی صرف لاؤنج تک آسکتے تھے اور وہ بھی اگر رشتے دار یا واقف کار ہوں۔ وہ زیادہ دیر وہاں بھی نہیں رک سکتا تھا اس نے ماریہ سے کہا۔ ''مجھے واپس تو جانا ہے اچھا ہے جتنی جلدی پہنچ جاؤں۔''

واپسی کے سفر میں پھر بارش کا آغاز ہوگیا اور بھیگتا ہوا عبید ہوسٹل پہنچا تو اسے چھینکیں آرہی تھیں۔ اگلی صبح اسے حرارت تھی مگر وہ آفس چلا آیا۔ اگرچہ اس کی امید کم تھی کہ کام ہوگا کیونکہ بارش نے سٹی کورٹ کے آس پاس سارے علاقے میں پانی ہی پانی کر دیا تھا اور راستے بند تھے۔ مگر آفس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ماریہ بھی کسی قدر تاخیر سے آئی اور اس نے اندر آکر سب سے پہلے ٹشو سے شلوار کے پائنچے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ''خدا کی پناہ

اتنی کیچڑ ہے باہر۔"

"تم آئی کیسے؟"

"ایک اللہ کا بندہ رکشے والا مل گیا تھا۔" اس نے کہا اور پھر عبید کی طرف دیکھا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟"

"نہیں رات چھینکیں آتی رہیں اور ابھی ہلکا سا بخار ہے مگر میں ٹھیک ہوں اسی لیے تو آ گیا۔"

"اگر کل تم نہ ہوتے تو میں بہت مشکل میں پڑ جاتی۔" وہ بولی۔

"ارے یہ کوئی بات نہیں ہے۔" عبید بولا۔ "ہم کولیگ ہیں۔"

"میرے پاس دوا ہے، وہ دیتی ہوں۔" ماریہ نے کمرے میں جاتے ہوئے کہا اور کچھ دیر میں چائے کے ساتھ دوا لے آئی۔ عبید دوا لے کر خود کو بہتر محسوس کرنے لگا تھا۔ اس کا اندازہ درست نکلا تھا، نہ تو کوئی اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ لینے آیا تھا اور نہ ہی کوئی وکیل کے لیے آیا۔ حد یہ کہ احسان شاہ بھی دفتر کھولنے کے بعد سے غائب تھا اور وہ اوپر سے نیچے نہیں آیا۔ یہ سارا دن ماریہ اور عبید نے ایک دوسرے کے ساتھ گزارا اور اس تنہائی میں ان پر کئی اسرار کھلے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے نزدیک آئے اور انہوں نے ایک دوسرے کے احساسات کو جانا تھا۔ اس شام جب وہ آفس سے نکلے تو وہ ایک دوسرے کے لیے بدل چکے تھے۔ اب وہ صرف کولیگ نہیں رہے تھے۔ مگر صرف یہ رہ گئی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے کھل کر کہہ نہیں سکے تھے۔ کئی مہینے گزر گئے۔ دل کی بات جو دل میں تھی، ایک دن اچانک زبان پر آ گئی۔ زبان ہی دل تک جانے کا راستہ ہے۔ عبید نے اسے پروپوز کر دیا۔ ماریہ مان گئی مگر اس نے کہا۔

"پہلے ہمیں اپنی تعلیم مکمل کرنی ہوگی۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" عبید نے کہا۔ اسے یہاں آئے ایک سال ہو گیا تھا اور اس نے خاصی رقم جمع کر لی تھی مگر یہ اتنی نہیں تھی کہ وہ ملازمت چھوڑ کر دل جمعی سے ایل ایل ایم کر سکتا۔ اس کے لیے پوری توجہ اور بہت زیادہ محنت کے ساتھ خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ اس نے حساب لگایا تو اسے ابھی ایک سال مزید ملازمت کی ضرورت تھی۔ احسان شاہ نے حسبِ وعدہ تین مہینے بعد اس کی تنخواہ اٹھارہ ہزار کر دی تھی اور ایک سال بعد مزید تین ہزار کا انکریمنٹ لگایا تھا۔ ماریہ کی تنخواہ چوبیس ہزار تھی۔ پھر روز کے لنچ کے پانچ سو سے جو بچتا، وہ بھی اسی کا ہوتا تھا۔ وہ چار سال سے

پاس اور فیل

باپ بیٹے میں لاڈ پیار ہو رہا تھا۔ بیٹے نے اٹھلا کر پوچھا "ابا! میں امتحان میں پاس ہو گیا تو تم مجھے کیا دو گے...... میں موٹر سائیکل لوں گا۔"

"ہاں بیٹا! تو پاس ہو گیا تو سیونٹی دلاؤں گا...... فیل ہو گیا تو ففٹی دلا دوں گا۔"

"فیل ہونے پر بھی ففٹی!" بیٹے نے حیرت اور خوشی سے کہا۔

"ہاں ففٹی...... اس پر تو دودھ بیچے گا۔ آج کل اس میں بہت کمائی ہے۔"

محمد اقبال، کراچی

"پپیتے"

"تم نے پپیتے بیچنے والی لڑکی کا بوسہ کیوں لیا؟" پولیس والے نے نوجوان کی گردن پر جھانپڑ رسید کرتے ہوئے سختی سے سوال کیا۔

"غلطی ہو گئی۔ وہ آواز ہی ایسے لگا رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو کہ پپی تے لے لو...... بس میں نے پپی لے لی...... آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔"

زاہد صادق...لاہور

☆☆☆

ایک رئیس نے اپنے لیے بعد از مرگ مقبرہ تعمیر کروایا جب وہ مکمل ہو گیا تو اس نے ماہر تعمیرات سے پوچھا کہ اس میں اب کس چیز کی کمی رہ گئی ہے۔

ماہر تعمیرات نے جواب دیا۔ "آپ کے وجود شریف کی۔"

☆☆☆

نواب آصف الدولہ کے ایک ملازم کا نام دولت تھا۔ نواب نے اس کی کسی بات پر خفا ہو کر اسے ملازمت سے نکال دیا۔ حکم سن کر وہ خاموشی سے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آ کر اس نے دربان کے ذریعے نواب سے کہلوایا کہ حضور دولت، دردولت پر حاضر رہے یا جائے۔ نواب نے "دولت" چلے جانے کی بات کو بدشگونی سمجھا اور ملازم کو بحال کر دیا۔

جاب کر رہی تھی اس لیے اس کی بچت کافی ہو گئی تھی اور اب وہ چاہتی تو ایم بی اے میں داخلہ لے سکتی تھی مگر اس نے عبید سے کہا۔

''ہم دونوں ساتھ ہی جاب چھوڑیں گے اور ساتھ پڑھیں گے۔''

عبید سمجھ رہا تھا کہ ماریہ صرف اس کی خاطر مزید جاب کرنا چاہ رہی تھی۔ شاید وہ مالی لحاظ سے بھی اسے سہارا دینا چاہتی تھی کیونکہ دو سال جاب کر کے بھی وہ اتنا نہیں بچا سکتا تھا کہ مزید دو سال بیٹھ کر کھائے اور پھر پڑھے بھی۔ ایسے میں ماریہ کی بچت اس کے کام آتی۔ ماریہ کی باتوں سے لگتا تھا کہ وہ ایسا چاہتی تھی۔ عبید کو بھی کوئی اعتراض نہیں تھا، اس کے خیال میں جب دو افراد دل سے ایک دوسرے کے ہو جاتے ہیں تو یہ باتیں ثانوی رہ جاتی ہیں۔

دوسرے سال آفس میں ایک تبدیلی آئی۔ احسان شاہ پینے کے باوجود پہلے باقاعدگی سے دفتری معمولات میں حصہ لیتا تھا اب وہ سست ہونے لگا تھا۔ صبح آفس کھولنے آتا اور پھر چلا جاتا۔ اکثر وکیل کے لیے آنے والے لوگ مایوس لوٹ جاتے کیونکہ یہ شعبہ احسان شاہ کا تھا اور وہ دفتر میں نہیں ہوتا اور جب ہوتا تب بھی نشے میں ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینے میں وکیل کے لیے لوگوں نے آنا چھوڑ دیا۔ عبید کو اجازت نہیں تھی ورنہ وہ یہ کام بھی سنبھال لیتا۔ البتہ اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ کی فروخت کا کام جاری تھا بلکہ سیل بڑھ گئی تھی اور وہ اوسطاً روزانہ پندرہ ہزار کی فروخت کر رہے تھے۔ اب عبید بچ جانے والے اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ اپنے پاس رکھتا تھا اور صرف رقم اور حساب ماریہ کو دیتا تھا۔ ایک شام جب عبید رقم ماریہ کے حوالے کر رہا تھا تو اس نے پوچھا۔ ''اب آفس کے اخراجات کیسے چل رہے ہیں اب تو کسٹمرز نے آنا چھوڑ دیا ہے۔''

''میں بھی حیران ہوں کیونکہ اخراجات میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ تمہیں پتا ہے آفس کا بجلی کا بل سولہ ہزار روپے آیا ہے۔''

''کیونکہ اے سی استعمال ہوتا ہے۔''

''سر نے بہت زیادہ پینا شروع کر دی ہے۔'' ماریہ نے تشویش سے کہا۔ ''پچھلے کچھ عرصے سے ان کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

''اسی وجہ سے تو وہ کام پر توجہ نہیں دے پاتے تھے۔'' عبید بولا۔ ''مجھے ڈر ہے کہیں کام بند ہی نہ ہو جائے۔''

''اللہ نہ کرے، ابھی ہمیں اس جاب کی ضرورت ہے۔'' ماریہ جلدی سے بولی۔ ''ایک بات تو بتانا بھول گئی تھی، سر نے اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ میرے حوالے کر دیے ہیں اب وہ مجھے ہفتے کے ہفتے دیں گے۔ روز کا چکر ختم ہو گیا ہے۔''

احسان شاہ نے غالباً اس لیے یہ کام ماریہ کے سپرد کر دیا تھا کہ اب وہ پورا پورا دن نیچے نہیں آتا تھا۔ عبید نے پوچھا۔ ''تم رقم کا کیا کرتی ہو؟''

''سر کی میز کی دراز میں رکھ دیتی ہوں یا وہ ہوتے ہیں تو براہِ راست ان کے حوالے کرتی ہوں۔''

''میرے ذہن میں ایک خیال آرہا ہے۔'' عبید نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''آخر یہ اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ آتے کب ہیں۔ کم سے کم میں نے آفس کے توسط سے آتے نہیں دیکھے۔''

''میں نے بھی نہیں دیکھے۔'' ماریہ نے اعتراف کیا۔ ''ممکن ہے کوئی براہِ راست فلیٹ میں پہنچاتا ہو یا سر خود لاتے ہوں۔ تم جانتے ہو فلیٹوں میں آنے جانے کا راستہ الگ ہے۔''

''شاید... اور وہ رکھتے بھی اوپر ہیں۔ ان کے آفس کی سیڑھی بہت تنگ ہے اور اس سے تو آدمی ہی چڑھ اتر جائے تو کافی ہے اتنا سامان لے جانا ممکن نہیں ہے۔''

''بالکل یہی بات ہو گی۔ سر ایک ساتھ لاتے یا منگواتے ہوں گے۔ اپنے فلیٹ میں رکھتے ہیں اور ضرورت کا ہمیں دیتے رہتے ہیں۔''

کیونکہ دفتر کے اخراجات اور دوسرے کام چل رہے تھے اس لیے انہوں نے زیادہ توجہ نہیں دی کہ اخراجات کیسے پورے ہو رہے ہیں۔ وہ نہیں جانتے تھے اس لیے اسے احسان شاہ کا دردِ سر سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔ البتہ انہیں احسان شاہ کی گرتی صحت اور اس کی وجہ یعنی بڑھتی شراب نوشی کی فکر تھی۔ وہ ایسا بلانوش تھا جو شراب نہیں پیتا تھا بلکہ شراب اسے پی رہی تھی۔ ماریہ نے عبید کو بتایا کہ اس نے کبھی احسان شاہ کو نشے کی کیفیت میں آپے سے باہر ہوتے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس نے کبھی اول فول بکا۔ نشے کا پتا اس کی آنکھوں اور بوجھل لہجے سے چلتا تھا۔ ایک بار عبید نے پوچھا۔ ''تمہیں ڈر نہیں لگا کہ تم ایک بلانوش کے دفتر میں کام کرتی ہو اور کئی مہینے تو اکیلے کام کیا؟''

''کبھی بھی نہیں۔'' ماریہ نے زور دے کر کہا۔ ''شرابی ہونا اچھی بات نہیں ہے۔ ایسے آدمی سے ہر برائی کی توقع کی

جا سکتی ہے لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے کبھی اس حوالے سے ان سے خوف محسوس نہیں ہوا بلکہ میں جب تک دفتر میں ہوتی خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ جب یہاں سے باہر جاتی تب مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔“

”اب باہر خوف محسوس نہیں ہوتا؟“ عبید نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ شرمائی۔ ”کیونکہ اب باہر تم ہو۔“

وہ بات کر رہے تھے کہ اندر سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی وزنی چیز گری ہو۔ ماریہ پریشان ہو گئی۔ ”سر کے کمرے سے آواز آئی ہے، خدا خیر کرے۔“

”آؤ دیکھتے ہیں۔“ عبید کھڑا ہو گیا۔ وہ ماریہ کے کمرے سے ہوتے احسان شاہ کے کمرے تک آئے۔ ماریہ نے پہلے دروازے پر دستک دی اور بلند آواز سے پوچھا۔

”سر آپ ٹھیک ہیں؟“

جب کوئی جواب نہیں آیا تو اس نے ذرا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکا مگر کمرا خالی تھا۔ وہ دروازہ بند کرنے جا رہی تھی کہ عبید کو میز کے دوسری طرف ہلکی سی جھلک دکھائی۔ ”ایک منٹ یہ کیا ہے؟“

ماریہ نے ذرا جھانک کر دیکھا اور پھر تیزی سے آگے بڑھی۔ اس نے چلّا کر عبید کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ... میرے خدا سر۔“

عبید آگے آیا تو اس نے احسان شاہ کو سیڑھیوں کے پاس بے ہوش پڑے پایا۔ اس نے جلدی سے اسے سیدھا لٹایا اور پھر اس کی نبض چیک کی۔ نبض ٹھیک چل رہی تھی۔ ”ایسا لگ رہا ہے یہ اوپر سے اترتے ہوئے گرے ہیں۔“

ماریہ ہچکچائی اور بولی۔ ”نشے میں؟“

”لازمی بات ہے۔“ عبید نے احسان شاہ کے ہاتھ پاؤں ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ”بہ ظاہر ٹھیک لگ رہے ہیں۔“

ماریہ بھاگ کر پانی لے آئی مگر عبید نے کہا۔ ”پانی نہیں سیاہ کافی بنا لاؤ۔“

ماریہ کافی بنا لائی جو ان دونوں نے چمچ کی مدد سے احسان شاہ کا منہ کھول کر اندر ٹپکائی اور اس کا مثبت ردِعمل ہوا۔ احسان شاہ ہوش میں آنے لگا۔ عبید نے کافی کا اس لیے کہا تھا کہ اس کے اندازے کے مطابق وہ نشے کی زیادتی کی وجہ سے بے ہوش ہوا تھا ورنہ نیچے گرنے سے اسے چوٹ نہیں آئی تھی۔ فرش پر نہایت دبیز قالین تھا۔ اسے کسی ایسی چیز کی ضرورت تھی جس سے نشہ اُتر جائے۔ کافی نے اثر دکھایا تھا۔ چند منٹ اس نے آنکھیں کھولیں اور انہیں پاس

ذریعۂ آمدنی

سینئر گدھے!

زندگی کے مختلف شعبوں میں کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو ایک عمر اس شعبے میں گزارنے کے باوجود اپنے نامۂ اعمال میں کوئی نیکی درج نہیں کرا سکتے یعنی انہوں نے کوئی ایسا کارنامہ انجام نہیں دیا جس پر وہ فخر کر سکیں، وہ صرف اپنی سنیارٹی پر فخر کرتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی ناقدری کا رونا ہی بہت روتے ہیں اور جب ان سے پوچھا جائے کہ بھائی وہ وجوہات بتائیں جن کی بنا پر آپ کی قدر کی جائے تو وہ جواب میں صرف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ وہ گزشتہ اتنے برسوں سے اس شعبے میں کام کر رہے ہیں مگر انہیں پوچھتا کوئی نہیں۔ کچھ ستم ظریفوں نے ایسے لوگوں کے لیے ”خرکہنہ مشق“ کی ترکیب ایجاد کی ہے جسے آسان لفظوں میں ”سینئر گدھے“ کہا جا سکتا ہے۔

دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ ماریہ نے کہا۔ ”لیٹے رہیے، سر آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”نہیں میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اٹھ بیٹھا اور ماریہ نے اسے کافی کا مگ دیا جو اس نے چند گھونٹ میں خالی کر دیا اور کسی قدر چاق چوبند نظر آنے لگا۔ ”شاید مجھے چکر آ گیا تھا۔ تم لوگ چھٹی کر کے گئے نہیں ہو؟“

”ابھی پانچ نہیں بجے ہیں۔“ ماریہ بولی۔ ”آپ کے گرنے کی آواز آئی تو ہم یہاں چلے آئے۔“

”میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“ اس نے آہستہ سے کہا اور کھڑا ہو کر سیڑھی چڑھنے لگا مگر اس کی حالت ایسی نہیں ہو رہی تھی عبید نے اسے سہارا دیا اور اس کے ساتھ اوپر تک گیا۔ اوپر لکڑی کا ایک گر جانے والا تختہ تھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ احسان شاہ کسی طرح گھسیٹ کر اوپر چڑھ گیا مگر جب عبید جانے لگا تو احسان شاہ نے اسے روک دیا۔ ”نہیں بس کافی ہے اب تم لوگ چھٹی کرو اور جاتے ہوئے دروازہ اندر سے لاک کر جانا۔“ یہ کہتے ہی اس نے تختہ گرا دیا۔ عبید نیچے آیا اور باہر آنے کے بعد ماریہ سے کہا۔

”مجھے سر کی حالت اچھی نہیں لگ رہی ہے، ان کو علاج کی ضرورت ہے۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے مگر وہ مانیں گے نہیں۔“

”کل تک دیکھتے ہیں۔“ عبید نے سر ہلایا۔ ماریہ نے آج کی سیل کی رقم لے جا کر احسان شاہ کی دراز میں رکھ دی۔ اب کرنے کو کچھ تھا نہیں اس لیے انہوں نے چھٹی کی اور جب جانے لگے تو ماریہ نے اندر سے بٹن دبا کر دروازہ

لاک کرنا چاہا تو عبید نے کہا۔ ''لاک کھلا نہ چھوڑ دیں۔''
''کیوں؟''
''اگر سر کی طبیعت ٹھیک نہ ہوئی اور وہ کل کھولنے کے لیے نیچے نہ آسکے اور انہیں مدد کی ضرورت ہوگی تو دروازہ اندر سے لاک ہوگا۔''
''تم ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن یہ مناسب نہیں ہے۔'' ماریہ نے کہا اور دروازہ کھینچ کر بند کر دیا۔ اب وہ اندر سے لاک کھولے بغیر نہیں کھل سکتا تھا۔ وہ باہر آئے اور اپنے اپنے ہوسٹل روانہ ہو گئے۔ اگلے دن اچانک حالات خراب ہوئے اور شہر بند ہو گیا۔ عبید آیا مگر ماریہ نہیں آسکی تھی۔ احسان شاہ نے آفس کا لاک کھول دیا تھا اور اوپر چلا گیا تھا۔ پہلے عبید نے سوچا کہ چھٹی کر کے واپس چلا جائے مگر پھر اسے خیال آیا کہ ہوسٹل میں بھی بور ہوگا۔ یہاں کمپیوٹر اور انٹرنیٹ تو تھا۔ وہ وقت گزاری کے لیے سرچنگ کرنے لگا۔ دوپہر تک تو وہ مزے کرتا رہا لیکن پھر اسے بھوک نے ستانا شروع کیا۔ حالات کی خرابی کی وجہ سے ہوٹل اور کھانے پینے کے دوسرے مراکز بند تھے۔ باہر سے کچھ منگوانا بھی ممکن نہیں تھا۔ درمیان میں ماریہ کی کال آئی اور اس نے بتایا کہ وہ اپنی ہوسٹل کی ساتھیوں کے ساتھ آج ون ڈش کر رہی تھی۔ عبید نے ٹھنڈی سانس لی۔
''تم لوگ مزے کرو، یہاں تو سرے سے کھانے کا چانس ہی نہیں ہے۔''
ماریہ ہنسی۔ ''تو یہاں آجاؤ۔''
''کاش کہ آسکتا۔'' عبید نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔
دو بجے بھوک برداشت سے باہر ہونے لگی تو اسے خیال آیا کہ باہر نکل کر دیکھے مگر وہ دفتر کھلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ اس نے احسان شاہ کے آفس میں جھانکا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ سیڑھیوں تک جاتے ہوئے وہ ہچکچا رہا تھا۔ اس نے خود سے کہا کہ اسے صرف باہر تک جا کر دیکھنا ہی تو ہے۔ وہ آفس کا دروازہ ایسے ہی بند کر کے نیچے آیا اور سڑک پر دیکھا تو اتفاق سے اسے ایک بھٹہ فروش نظر آیا۔ وہ اس کے پاس آیا اور اپنے لیے کچھ بھٹے تیار کرائے مگر جب وہ واپس آیا تو عمارت کی سیڑھیوں والی گرل بند تھی۔ دفتروں کے لیے ایک ہی چوکیدار تھا مگر اس کا کام صرف گرل کھولنا اور بند کرنا تھا اس کے علاوہ وہ شاذ ہی نظر آتا تھا۔ شاید اس نے سمجھا کہ آج کوئی دفتر نہیں کھلا ہے تو وہ گرل بند کر کے چلا گیا تھا۔ تالا باہر کی سمت لگا تھا اور چوکیدار غائب تھا۔ عبید پریشان ہو گیا۔ اوپر دفتر کھلا ہوا تھا۔ اس نے سوچا اور پھر احسان شاہ کو کال کی۔ اس کا سیل نمبر عبید کے پاس تھا مگر یہ اتفاق کی بات تھی کہ کبھی اسے کال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ آج پہلی بار وہ اسے کال کر رہا تھا۔ بیل جاتی رہی اور دوسری طرف سے کال ریسیو نہیں ہو رہی تھی۔ کئی بار ناکام کوشش کے بعد اس نے ماریہ کو کال کی اور اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ وہ پریشان ہو گئی۔
''ممکن ہے، وہ سو رہے ہوں۔''
''ہاں دروازہ تو کھولا تھا۔''
''تم ٹرائی کرتے رہو۔'' ماریہ نے مشورہ دیا۔
''فی الحال میں واپس جا رہا ہوں۔'' عبید نے کہا۔ ''ہوسٹل جا کر ٹرائی کرتا رہوں گا۔''
ہوسٹل پہنچ کر اس نے پھر احسان شاہ کا نمبر ملایا مگر وہی بیل جا رہی تھی اور آگے سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ شام تک وہ کرتا رہا پھر اس نے تھک ہار کر چھوڑ دیا۔ رات گئے ماریہ نے کال کر کے پوچھا اور اس نے صورتِ حال بتائی تو اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''کہیں ان کی طبیعت خراب نہ ہو۔''
''مجھے تو لگ رہا ہے کہ چھٹی پا کر انہوں نے بے تحاشا پی لی اور اب مدہوش پڑے ہوں گے۔''
''شاید۔'' ماریہ بولی۔
''کل صبح میں جلدی جاؤں گا۔'' عبید نے کہا۔ ''چوکیدار پونے نو بجے گرل کھولتا ہے۔ میں سب سے پہلے پہنچ جاؤں گا۔''
''یہ ٹھیک رہے گا۔'' ماریہ بولی۔ ''میں بھی جلدی آجاؤں گی۔''
اگلے دن عبید ساڑھے آٹھ بجے ہی ہوسٹل سے نکل گیا اور وہ ٹھیک وقت پر پہنچا کیونکہ اسی وقت چوکیدار آیا تھا اور گرل کا تالا کھول رہا تھا۔ عبید نے اسے ڈانٹا کہ وہ کل نہایت غیر ذمے داری سے تالا لگا کر چلا گیا تھا۔ اس نے دفتروں کو دیکھا نہیں کہ وہ کھلے ہیں یا نہیں۔ چوکیدار نے کہا۔ ''صاحب ہم نے ایک ایک دروازہ بجا کر پوچھا پر کہیں سے جواب نہیں آیا تو ہم تالا لگا کر چلا گیا۔''
''میں تھا اور اسی وقت کام سے باہر آیا تھا۔'' عبید نے اوپر جاتے ہوئے کہا۔ وہ اوپر آیا اور اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا تو وہ کھل گیا۔ عبید اندر آیا۔ وہ

سوچ رہا تھا کہ کیا احسان شاہ نیچے آیا ہوگا اور اسے علم ہوگا کہ دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور اس نے لاک کردیا ہوگا۔ آج صبح اس نے پھر کھول دیا ہوگا۔ دوسری صورت میں اگر وہ نیچے نہیں آیا اور اب آتا تو اسے پتا چل جاتا کہ کل عبید آفس لاک کیے بغیر چلا گیا تھا۔ دونوں صورتوں میں اسے جواب دہی کرنا پڑتی اگرچہ اس کے پاس عذر تھا مگر بنا بتائے آفس ایسے چھوڑ کر جانا بہرحال اس کی غلطی تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے احسان شاہ کے کمرے میں جھانکا اور پھر مزید ہچکچاتے ہوئے اس کی میز کی کیش والی دراز کو کھول کر دیکھا تو اس میں گزشتہ دن کی رقم جوں کی توں رکھی تھی۔ یعنی احسان شاہ سرے سے نیچے نہیں آیا تھا۔ وہ باہر آیا تھا کہ ماریہ آگئی اور عبید نے اپنی تفتیش سے آگاہ کیا۔ ماریہ نے احسان شاہ کے موبائل پر کال کی۔ اس بار بھی جواب نہیں آرہا تھا۔ ماریہ نے اس سے کہا۔

''میرے ساتھ آؤ۔'' وہ احسان شاہ کے کمرے میں آئے اور ماریہ نے پھر کال کی۔ ''غور سے سنو اوپر بیل بج رہی ہے۔''

''ہاں۔'' عبید نے غور کیا تو اسے آواز سنائی دی۔ ''سر اوپر ہیں لیکن وہ جواب نہیں دے رہے۔''

''تب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ہمیں اوپر جانا ہوگا۔'' ماریہ بولی۔ ''ایسا لگ رہا ہے ان کی طبیعت پھر خراب ہوئی ہے اور وہ بے ہوش ہوگئے ہیں۔''

عبید ہچکچایا مگر ماریہ کے حوصلہ دلانے پر سیڑھیوں سے اوپر چڑھا اور لکڑی کا تختہ بجایا۔ کئی بار بجانے پر کوئی جواب نہیں ملا تو اس نے اسے کھولنے کی کوشش کی۔ وہ اوپر سے لاک تھا۔ ماریہ نے کہا۔ ''دھکا مار کر دیکھو۔''

عبید نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ تیسرے دھکے پر تختہ غیر متوقع طور پر کھل گیا۔ عبید نے اسے پلٹا اور پلٹ کر ماریہ سے کہا۔ ''کھل گیا ہے۔''

''اوپر چلو، میں بھی آرہی ہوں۔''

عبید اوپر آیا۔ یہ لاؤنج تھا۔ یہاں لیدر کا بہترین صوفہ سیٹ تھا۔ فرش پر دبیز قالین تھا اور ایک طرف اعلیٰ درجے کے ساؤنڈ سسٹم کے ساتھ ایل ای ڈی ٹی وی دیوار میں فکس تھا۔ شیشے کی میز پر احسان شاہ کا آئی فون رکھا ہوا تھا۔ لاؤنج کے ساتھ بالکونی تھی اور اس میں ایک دروازہ برابر والے بیڈروم کا کھل رہا تھا۔ احسان شاہ انہیں کچن کے ساتھ والے لاؤنج میں مل گیا۔ وہ کرسی پر دراز تھا۔ اس کا چہرہ عنابی ہو رہا تھا اور منہ کھلا ہوا تھا۔ بہ ظاہر اس کی سانس

بھی رکی ہوئی تھی۔ ماریہ دیکھ کر ڈر گئی۔ "یہ سر کو کیا ہوا ہے؟"

عبید آگے آیا اور اس نے ڈرتے ڈرتے گردن پر احسان شاہ کی نبض دیکھی مگر اسے ہاتھ لگاتے ہوئے عبید کو پتا چل گیا کہ وہ ایک لاش کو چھو رہا ہے۔ وہ بہت سرد تھا۔ اسے مرے ہوئے یقیناً بیس گھنٹے ہو گئے تھے مگر اے سی نے لاش کو خراب ہونے سے بچایا تھا۔ عبید نے مایوسی سے سر ہلایا تو ماریہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ وہ رو رہی تھی اور پھر بے ساختہ عبید کے شانے سے لگ گئی۔ عبید نے اسے تسلی دی۔ "صبر کرو... صبر کرو۔"

ماریہ نے کچھ دیر میں خود پر قابو پا لیا۔ "ہمیں پولیس کو اطلاع دینی ہوگی۔"

"ہاں۔" عبید نے بے دھیانی میں کہا۔ وہ لاؤنج کے ساتھ والے کمرے کے دروازے کو دیکھ رہا تھا جس پر تالا لگا ہوا تھا۔ اس نے ماریہ کی توجہ دلائی۔ "جب یہاں کوئی اور نہیں رہتا تو سر نے اس جگہ تالا کیوں لگایا ہے؟"

"کیا کہہ سکتے ہیں۔" ماریہ نے چہرہ صاف کیا۔ "ہو سکتا ہے اس میں کوئی قیمتی چیز ہو۔"

"قیمتی چیزیں تو اس پورے فلیٹ میں ہیں۔" عبید نے کہا۔ "لاؤنج کا ایل ای ڈی دیکھو، سر نے جو راڈو واچ پہنی ہے۔ ان کا آئی فون سب بہت قیمتی ہے۔"

"ممکن ہے اس سے بھی زیادہ کوئی قیمتی چیز ہو۔" ماریہ بولی۔ "ہو سکتا ہے سر یہاں اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ رکھتے ہوں۔"

"اس کے لیے کمرا لاک کرنا ضروری نہیں ہے، یہ تو مضبوط لاکر میں رکھنا بھی کافی ہوں گے۔"

"تب کیا ہو سکتا ہے؟" ماریہ بھی متجسس ہو گئی۔ اس نے اپنے دکھ پر قابو پا لیا تھا۔ عبید نے جھجک کر کہا۔

"سر اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں تو کیا ہم نہ دیکھ لیں۔ دیکھو ہمارا مقصد برا نہیں ہوگا۔ ہم یہاں پر ایک چیز بھی نہیں چھیڑیں گے صرف دیکھیں گے اور بند کر دیں گے۔"

ماریہ نے سوچا اور سر ہلایا۔ "سر کے پاس چابیوں کا ایک خاصا بڑا گچھا ہوتا ہے، وہ ہمہ وقت اسے ساتھ رکھتے ہیں شاید اسی میں ہوگی اس تالے کی چابی۔"

عبید نے احسان شاہ کے گاؤن کی جیبیں ٹٹولیں اور ان سے چابیوں کا گچھا مل گیا۔ اس میں خاصی چابیاں تھیں۔ عبید نے اندازے سے ایک چابی منتخب کر کے تالے میں لگانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں لگی۔ ماریہ نے کہا۔ "یہ چائنا لاک ہے۔"

گچھے میں چائنا لاک کی ایک ہی چابی تھی اور وہ تالے میں لگ گئی۔ تالا کھولا اور پھر دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھولا اندر نیم تاریکی تھی اور درمیان میں ایک چیز کا ہیولہ تھا۔ عبید نے ٹٹول کر سوئچ بورڈ تلاش کیا اور یکے بعد دیگرے بٹن دبانے پر روشنیاں آن ہو گئیں، یہ خاصی تیز روشنیاں تھیں۔ کمرا جگمگا اٹھا۔ تب انہوں نے دیکھا کہ کمرے میں تین طرف دیوار کے ساتھ فولادی الماریاں رکھی تھیں اور درمیان میں موجود چیز ایک چھوٹی سی لیکن جدید ترین پریس مشین تھی۔ وہ اندر آئے۔ مشین نہ صرف پرنٹ کرتی تھی بلکہ پرنٹ کرنے کے بعد کاغذ کو مطلوبہ سائز میں کاٹتی یا اس میں پن سے سوراخ کرتی تھی۔ جرمنی کی بنی یہ مشین گھر کی بجلی پر آرام سے کام کرتی تھی۔ عبید اسے دیکھ رہا تھا کہ ماریہ نے چابیوں کا گچھا الماریوں پر آزمانا شروع کیا اور ایک الماری کھلی۔ مشین دیکھ کر عبید کے ذہن میں ایک خیال آیا مگر الماری میں موجود اسٹامپ پیپرز کے سادہ کاغذ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا۔ اس نے ماریہ سے کہا۔ "اب پتا چلا کہ احسان شاہ کی آمدنی کا ذریعہ کیا تھا۔"

ماریہ بھی جان گئی تھی اور خاصی ششدر تھی۔ "وہ... وہ جعلی اسٹامپ چھاپتے تھے۔"

پوری الماری سادہ کاغذ کی گڈیوں سے بھری ہوئی تھی اس کے نچلے حصے میں ڈاک ٹکٹ کی چھپائی میں کام آنے والا سفید سادہ کاغذ بھی تھا۔ دوسری الماریوں میں بھی اسی کام میں آنے والا سامان بھرا ہوا تھا۔ ان میں مختلف طرح کی سیاہیاں، کیمیکلز اور صفائی کا سامان تھا۔ ایک الماری میں تیار شدہ اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ بھرے ہوئے تھے اور ان کی مالیت تیس لاکھ سے اوپر کی تھی۔ ایک الماری میں پلیٹیں تھیں جن سے ان سب چیزوں کی چھپائی کی جاتی تھی۔ اس الماری کے ایک حصے میں سو، ہزار اور پانچ ہزار کے نوٹوں کی گڈیوں کی صورت میں کوئی ستر لاکھ روپے موجود تھے۔ احسان شاہ کا لائف اسٹائل پیسہ چاہتا تھا اور وہ کھلے دل اور کھلے ہاتھ کا شخص تھا۔ اس کے باوجود اس نے یہ رقم بھی جمع کر لی تھی۔ ماریہ نے عبید سے کہا۔ "ہمیں پولیس کو بتانا ہوگا۔"

"نہیں۔" عبید نے کہا اور اسے نیچے آفس میں لے آیا اس نے سب سے پہلے آفس کے باہر کلوز کی تختی لگا دی اور پھر دروازہ اندر سے لاک کر کے ماریہ سے کہا۔ "یہ آسان معاملہ نہیں ہے۔ تم جانتی ہو جعلی کرنسی کی طرح اسٹامپ اور ٹکٹ چھاپنا بھی سنگین جرم ہے۔ ہم نے پولیس کو

اطلاع کی تو لازمی ہم بھی پکڑیں جائیں گے۔"

ماریہ نے غور کیا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو تب ہم کیا کریں؟"

عبید ٹہلنے لگا پھر اس نے ماریہ سے کہا۔ "ہمیں یہ سب غائب کرنا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" اس نے کہا اور وہ اوپر آئے۔

عبید نے مشین کا جائزہ لیا اور بولا۔ "اسے کھولنا مشکل نہیں ہے، میں اسے آرام سے کھول کر ٹکڑوں میں لے جاؤں گا۔"

"اور یہ سب کچھ۔" اس نے الماریوں کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب کاغذ ہے اور تم یہ سب اوون میں جلا کر اس کی راکھ سنک میں بہاتی رہو اسی طرح انکس اور کیمیکلز بھی بہا دو۔"

"یہ سب بہت زیادہ ہے۔"

"جتنا کر سکتی ہو کرو، جب تک میں اپنا کام کرتا ہوں۔" عبید نے کہا اور اس نے سب سے پہلے لاش بیڈروم میں منتقل کر کے وہاں اے سی فل کر دیا۔ پھر خاص کمرے میں موجود ٹول کٹ سے اوزار نکالے اور مشین کے پیچ اور نٹ کھول کر اسے پرزے پرزے کرنے لگا۔ دو گھنٹے میں اس نے ساری مشین کھول لی۔ پھر وہ باہر گیا اور نزدیکی ایک بوریوں کی دکان سے خالی بوریاں لے آیا اور ایک کباڑیے کو بھی ساتھ لے آیا۔ اس نے کہا کہ وہ کچھ کباڑ فروخت کرے گا۔ پرزے بوریوں میں بھر کر تین چکروں میں اس نے نیچے پہنچائے اور کباڑیے سے کہا۔ "یہ لے جاؤ، ادائیگی کی ضرورت نہیں ہے۔"

کباڑیاں خوش ہو کر لے گیا۔ اس دوران میں ماریہ سادہ کاغذ جلا رہی تھی۔ اے سی کی وجہ سے اندر دھواں بھی نہیں بھر رہا تھا۔ جب تک عبید آیا، اس نے سارے سادہ کاغذ اسی طرح جلا کر راکھ بہا دی تھی۔ پھر انہوں نے تیار اسٹامپ پیپرز اور ٹکٹ جلا کر راکھ بہائی اور آخر میں سارے کیمیکلز اور روشنائیاں بہائیں۔ جب یہ سب نمٹ گیا تو انہوں نے مکمل صفائی کر کے تمام نشانات مٹا دیے۔ الماریاں اور کمرا ایسے ہی بند کر دیا۔ اچانک عبید کو خیال آیا، اس نے کہا۔ "اس رقم کا کیا کرنا ہے؟"

"اس پر ہمارا حق نہیں ہے۔" ماریہ بولی۔

"میں جانتا ہوں لیکن کسی نہ کسی کا تو ہوگا اور جب یہاں پولیس آئے گی تو تمہارے خیال میں یہ رقم باقی رہے گی؟"

ماریہ نے اس سے اتفاق کیا اور انہوں نے رقم اٹھا لی۔ اسے ماریہ نے اپنے بیگ میں ڈال لیا، اس کا بیگ خاصا بڑا تھا اور اس میں آرام سے رقم آگئی۔ پھر ماریہ کو خیال آیا۔ "ہمیں دیکھ لینا چاہیے کہ کہیں کوئی اور چیز نہ ہو جس سے پولیس کو پتا چل جائے کہ سر کیا کرتے تھے؟"

عبید اور ماریہ نے بیڈروم کی تلاشی لی اور انہیں بستر کے ساتھ والی دراز سے ایک چھوٹی ڈائری ملی اور اس سے پہلی بار انہیں احسان شاہ کے حالاتِ زندگی کا پتا چلا۔ اس کا تعلق اندرون صوبہ سے تھا اور اس نے بہت کم عمری میں وکالت کا امتحان پاس کر لیا تھا مگر اس کا رجحان پریکٹس کی طرف نہیں تھا۔ شہر آنے کے بعد اس کا واسطہ ایک دو نمبر وکیل سے پڑا اور اسی نے احسان شاہ کو اس لائن پر ڈالا تھا۔ پھر وہ خود حادثاتی طور پر مر گیا اور سب کچھ احسان شاہ کے ہاتھ آگیا۔ بُری علتوں میں وہ پہلے ہی پڑ چکا تھا، پیسہ ہاتھ آیا تو وہ کھل کر عیاشی کرنے لگا۔ اس نے اپنی بیوی کو شہر بلا لیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس زندگی سے خوش ہوگی مگر جب اسے پتا چلا کہ وہ کس طرح کماتا ہے تو اس کی بیوی اسے چھوڑ کر واپس گاؤں چلی گئی۔ یہ ڈائری احسان شاہ کے جرم کا واضح ثبوت تھا اس لیے وہ اسے بھی ساتھ لے گئے۔ انہوں نے طے کیا کہ اگلے دن وہ پولیس سے رابطہ کریں گے اور ان کا سارا بیان صرف لاش دریافت کرنے تک محدود رہے گا، اس سے آگے انہیں کچھ نہیں معلوم ہوگا۔

دو ہفتے میں سب نمٹ گیا تھا۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد احسان شاہ کی موت کو طبعی قرار دیا تھا۔ بہت زیادہ پینے سے اس کا جگر جواب دے گیا اور وہ مر گیا۔ اس کی بیوی اور تقریباً جوان ہو جانے والا بیٹا لاش وصول کرنے شہر آئے تھے اور ان کی حالت سے لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ اچھی زندگی نہیں گزار رہے تھے۔ عبید اور ماریہ نے طے کیا کہ وہ نقد رقم انہیں بعد میں پہنچا دیں گے۔ ابھی تو انہیں خاصی مالیت کا فلیٹ اور آفس مل گیا تھا۔ اس کی مالیت پچاس لاکھ سے زیادہ تھی۔ باقی ستر لاکھ مل جاتے تو وہ یقیناً آنے والی زندگی سکون سے گزارتے۔ بہ شرط کہ یہ دولت ان کے لیے آزمائش بن کر نہ آتی۔ انہوں نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ اس دولت سے وہ ایک پیسہ بھی نہیں لیں گے اور اپنے بل بوتے پر اپنی زندگی بنائیں گے۔ اگرچہ انہیں کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا مگر جب وہ تعلیم مکمل کر لیں گے تو پھر آگے ان کا مستقبل روشن ہی ہوگا۔

پرائی بیٹی

احمد اقبال

کہا جاتا ہے کہ آگ اگر بے وقوفوں کے ہاتھ لگ جائے تو اردگرد کی ہر چیز کو جلا کر راکھ کر سکتی ہے... یہ ذہانت ہی ہے جو اسے قابو میں رکھتی ہے... اور آگ ہی کو کیوں... ذہانت تو حُسن کو بھی اس طرح قابو میں کر لیتی ہے جس طرح کوئی ہوشیار شہسوار تُندخُو گھوڑے پر قابو پالیتا ہے... وہ ذہین تھی اور حسنِ بے مثال کی مالک بھی... اسے معلوم تھا کہ ذہانت کا استعمال کب کرنا ہے اور حسن کے لوازمات سے شکار پر کیا جادو کرنا ہے... مگر اس کی زندگی میں کوئی کمی تھی تو صرف ایک چاہنے والے کی تھی... جذبات و تغیرات نے ہر دفعہ اسے ایسے شخص سے ملا دیا جو اس کے لیے مخصوص نہ تھا... دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک وہ محبت کی تلاش میں سفر کرتی رہی... غم و اذیت کے پل اس سے دوستی نبھاتے رہے... دغاباز ملتے رہے... فریب کھاتے رہے... بالآخر ایک ویران و اجاڑ پلیٹ فارم پر اس کے بڑھتے قدموں نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا... اور پھر زندگی کی گاڑی تھم سی گئی...

واقعات در واقعات پر مبنی داستان کے ہزار رنگ... سرورق کے دیرپا رنگ...

دسمبر کی کہر آلود رات کی یخ بستگی ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اس کی ہڈیوں میں اترتی جارہی تھی اور اس کا وجود طوفان کی زد میں آئے خزاں رسیدہ پتے کی طرح لرزش میں تھا۔ وہ جاگتی آنکھوں کے خواب میں آتشدان کے لپکتے شعلوں، چٹختی لکڑیوں اور گیس ہیٹر کے نیلگوں شعلوں کے سوا کچھ نہیں دیکھ پا رہا تھا جو اس کے ٹھٹھرے کانپتے بدن میں راحت اور سکون کا احساس جگا سکتے تھے۔

یہ سب ان کو میسر تھا جو خواب گاہوں کے دروازے بند کیے اور دریچوں پر بھاری پردے ڈالے ریشمی رضائیوں میں اپنے وجود کی حرارت کو شیئر کر رہے تھے۔ بس وہ تھا جو صرف ایک سوتی قمیص اور جینز کی پتلون پہنے دونوں گھٹنوں میں سر دیے حوالات کے برف کی سل جیسے فرش پر کانپ رہا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ بے ہوش ہو کے گر جائے یا مر جائے تاکہ اس ناقابلِ برداشت عذاب اور زندگی سے منسوب ماضی، حال اور مستقبل کے سارے عذاب تمام ہوں۔ اس نے پھٹے بدبودار کمبلوں کے نیچے پڑے جسموں کو دیکھا جو حوالات کے سنگین فرش پر سردی کے ساتھ صبح تک نازل ہونے والے تفتیش کے جان لیوا عذاب کے خیال سے ہی کانپ رہے تھے۔

اس کو اپنے ساتھ لے جانے والوں میں سے ایک مکروہ چہرے اور بھاری بدن والا حوالدار گرم چائے پیتے ہوئے ہاتھوں کو ہیٹر کے سامنے گرم کر کے آپس میں رگڑ رہا تھا اور افسرانِ بالا کو گالیاں دے رہا تھا جو احکامات جاری کر کے لحافوں میں کسی سے لپٹے پڑے ہوں گے۔ اس کے دو ماتحت سر منہ لپیٹے ہوئے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں برف جیسی سرد ہتھکڑیاں تھیں۔ وہ سب خفا تھے کہ انہیں دن میں لے جانے کا کیوں نہیں کہا گیا۔

''اپنی تو ایسی ہی کتی نوکری ہے۔'' حوالدار ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''چل اوئے مجنوں دے مامے۔'' دو ماتحتوں نے

حوالات کا آہنی سلاخوں والا دروازہ کھول کے اسے باہر نکالا اور اس کے ہاتھوں کو الگ الگ ہتھکڑی لگا کے اس کا دوسرا سرا اپنی پیٹی کے ہک میں پھنسا دیا۔ وہ باہر کھڑی ٹیکسی تک آئے جس کا بیگار میں پکڑا جانے والا باریش ڈرائیور کمبل میں لپٹا ساکت بیٹھا تھا۔ وہ دونوں محافظوں کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ حوالدار اگلی سیٹ میں فٹ ہو گیا تو ڈرائیور نے چابی گھما کے انجن اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی۔ پہلی ناکامی کے بعد اس نے خدا سے دعا کی کہ رات کی کمائی جائے بھاڑ میں، کم سے کم وہ کسی کے پولیس مقابلے میں مارے جانے کا منظر نہ دیکھے۔

''اوئے... کیا ہے یہ؟'' حوالدار غرایا۔ ''گاڑی اسٹارٹ کیوں نہیں ہو رہی؟''

''سر جی، سردی بھی تو دیکھو، آج منفی چار ہے۔''

حوالدار غرایا۔ ''پتا ہے، پتا ہے ہم بھی اِدھر کے رہنے والے ہیں تو گاڑی اسٹارٹ کر۔''

''بس جناب... سردی میں ہوتا ہے کبھی کبھی مسئلہ... انجن خخ ہو جاتا ہے، دھکا لگانا پڑتا ہے۔''

''دھکا، تو ہم سے دھکا لگوائے گا؟'' اس کے منہ سے ایک گرم گرم گالی نکلی۔ کیونکہ یہ کام اسے ہی کرنا پڑتا۔ دو ماتحت تو مجرم کو پکڑے بیٹھے تھے۔ باہر ھُو کا عالم تھا، اس وقت دوسری ٹیکسی ملنا بھی محال تھا۔

اسی وقت ٹھٹھراتا ہوا انجن جاگ اٹھا۔ ٹیکسی گہری نیلگوں دھند والی سڑک پر آگئی۔ حدِ نظر سڑک بالکل سنسان تھی۔ راولپنڈی کے مکین سرِ شام ہی ٹھنڈ کو عصر کی اذان کے ساتھ اترتا محسوس کرتے تھے۔ مغرب کے بعد پارک اور بازار سب خالی نظر آتے تھے۔

مال روڈ کے سارے قمقمے دھند میں کانپتے محسوس ہوتے تھے۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ پی سی ہمیشہ کی طرح روشنیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ٹیکسی نے آخری موڑ کاٹا تو ڈرائیور نے سکون کا سانس لیا۔ وہ کسی کو مقابلے میں مارنے

نہیں ریلوے اسٹیشن لے جارہے تھے۔ آدھی رات کو جانے والی یہ ٹی گاڑی تھی جو لاہور تک رکے بغیر جاتی تھی اور صبح سورج کے طلوع ہونے سے بہت پہلے مسافروں کو لاہور میں اتار دیتی تھی۔

"پاگل دے پتر... آدھی رات کو بھی سفر کرتے ہیں۔" حوالدار بڑبڑایا۔

"سرجی، اِدھر تو جب سے پاکستان بنا خیبر میل دونوں طرف رات ڈھائی بجے ہی آتی ہے۔ کراچی والی بھی اور پشاور والی بھی... پچاس سال سے تو میں دیکھ رہا ہوں۔" ڈرائیور نے ٹیکسی کو بارونق نظر آنے والے اسٹیشن کے عین سامنے روک دیا۔

ریلوے کے منہ پر مفلر لپیٹے ٹکٹ چیکر نے جیب سے ہاتھ نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ ان کا ٹکٹ سے کیا تعلق... لمبے قد کے ایک فرنچ کٹ داڑھی والے نے جو بیوروکریٹ نظر آتا تھا، ان کو روک لیا۔ "ڈیم اِٹ... تم ملزم کو ایک شرٹ میں لے جارہے ہو؟ شکر کرو وہ ابھی تک سردی سے نہیں مرا۔" وہ خفگی سے بولا۔

"آپ کو بڑا ترس آرہا ہے تو اپنا سویٹر دے دو۔" حوالدار نے کہا۔

ستر سال سے اوپر کے بوڑھے نے چمڑے کی جیکٹ اتاری۔ اس کے نیچے سے سویٹر اتارا اور اسے دے دیا۔ "پہن لو اسے۔" وہ جیکٹ پہن کے بولا۔ اسی وقت ٹرین لگ گئی اور اسے کوئی نوجوان کھینچ کے لے گیا۔

حوالدار نے ٹرین میں بیٹھنے کے بعد لالچی نظروں سے سویٹر کو دیکھا۔ "ولایتی ہے۔"

"کیا بڈھا پاگل تھا۔" ایک ماتحت بولا اور سویٹر کو چھو کے دیکھا۔

حوالدار نے فوراً کہا۔ "لاہور پہنچ کے مجھے دے دینا۔ ورنہ کھال اتارلوں گا، آئی سمجھ؟"

ناصر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ پوری آستین والا گرم سویٹر اور ڈبے میں موجود جسموں کی حرارت کے زیر اثر اس پر غنودگی سی طاری ہورہی تھی۔ آدھی رات کا اعلان انجن کی ٹھٹھری ہوئی وسل نے کیا۔ مسافروں نے گھڑی دیکھی۔ تاریخ بدل چکی تھی۔ ٹرین نے حرکت شروع کی اور سرد رات کے کہر آلود اندھیرے میں نظر نہ آنے والی پٹری پر دوڑنے لگی۔ کچھ لوگوں نے سر پیچھے ٹکا کے آنکھیں بند کرلیں۔ ایک بوڑھی عورت نے تھرماس میں سے ابلتی چائے ایک پیپر کپ میں انڈیلی اور اس کے شانے پر تھپکی دے کر کہا۔ "لے پتر... پی لے۔"

آدھے گھنٹے میں یہ دوسری بے عزتی تھی جو حوالدار نے برداشت کی۔ ان سب کو یہ مجرم ہی قابلِ رحم لگتا ہے۔ ایک نے جرسی دے دی۔ دوسری یہ بڑھیا، ہم سے چائے کے لیے نہیں پوچھا اور یہ ماں کا خصم کیسے مزے سے پی رہا ہے۔

ٹرین اب سطح مرتفع پوٹھوہار کے اس بنجر علاقے سے گزر رہی تھی جہاں دونوں جانب کٹاؤ والی پہاڑیاں تھیں۔ اندھی کھائیاں تھیں اور ویران پہاڑیاں تھیں۔ کئی موڑ کاٹنے والی ٹرین ایک سرنگ سے بھی گزرتی تھی۔ ہر طرف منجمد اندھیرا تھا جس میں اس وقت کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا پھر روز کے جانے پہچانے والے راستے سے گزرنے والی ٹرین اچانک لڑکھڑائی، پھر ایک بے ہنگم شور کے ساتھ پٹری سے اتری اور نشیب کی جانب لڑھکنے لگی۔ اب اس کی بوگیاں سیکڑوں فٹ نیچے گہرائی کی طرف جارہی تھیں۔

☆☆☆

تکیے کو دونوں بازوؤں میں دبوچ کے وہ منہ کے بل بیڈ پر گرگئی اور پیروں کو جھٹک کے جوتے فرش پر گرادیے۔ آنکھیں بند کرکے اس نے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور چند لمبی گہری سانسوں کے بعد خود کو پُرسکون محسوس کرنے کی کوشش کی۔ مگر سکون کوئی جسمانی مسئلہ نہیں تھا، اس کے احساس کی بے چینی اور ناآسودگی وہی تھی اور اس کا سبب وہ جانتی تھی لیکن اب وہ کسی قیمت پر عشق جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ جانتے بوجھتے بے وقوف بننے اور صبر کے ساتھ امید نہ چھوڑنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔

محبت یا عشق میں دیوانگی کی بہترین پرفارمنس دینے والے سب مرد کتنی خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ وہ حد درجہ ذہین ہیں کہ اتنا عرصہ ایک لڑکی کامل اعتقاد کے ساتھ ان سے وابستہ رہی۔ اعتماد کے آئینے میں بال نہ آیا اور وہ برضا و رغبت ان کے استحصال کا شکار ہوتی رہی۔ کیونکہ طے شدہ طور پر عورت بے وقوف، ناقص العقل، جذباتی، احمق، خواب پرست اور اندھی ہوتی ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس رہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ نجم الدین گردیزی آخر خود فریبی میں کس انتہا تک جاسکتا ہے۔ الیکٹرک کیتلی کی سیٹی پر وہ کافی بنانے کے لیے اٹھ گئی۔

اِنف اِز اِنف مسٹر نجم، میں نے کہا تھا کہ میں نہیں آؤں گی، کبھی نہیں آؤں گی تو سو فیصد میرا یہی مطلب تھا۔ اس نے کافی بنا کے واپس آتے ہوئے خود سے کہا اور اپنے سب کپڑے بیڈ پر پھینک کے واش روم میں چلی گئی۔ ٹب

میں نیم دراز ہو کے اس نے گرم اور ٹھنڈے پانی کے نل کھولے۔ پانی کی مہرباں حرارت نے اس کے جسم کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس نے کنارے پر رکھا ہوا مہکتی کافی کا مگ اٹھایا اور خود کو پُرسکون محسوس کیا اور اس حد تک خوش قسمت بھی کہ وہ لندن جیسے مہنگے شہر میں اس اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کی بلاشرکت غیرے مالک ہے اور محفوظ بھی۔ ماضی نے اب اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا لیکن ایک نئی شکل کی صورت میں، مستقبل کا خیال اسے پریشان کرنے لگا تھا۔

اسے پھر نجم کا خیال آیا۔ اس وقت وہ اپنا بہترین لباس پہن کے اور اس کی پسندیدہ پرفیوم چھڑک کے نکلا ہوگا کہ ایک گھنٹے میں اسے ڈور اسٹیپ سے پک کرلے اور وہ ڈنر کے وقت سے پون گھنٹا پہلے ٹیمز کے ساحل پر کار پارک کر کے اس بہتے دریا کے ساحل پر منتظر اسٹیمر تک پہنچ جائیں جہاں ہمیشہ کی طرح تیرتے ریسٹورنٹ کا پاکستانی مالک ان کا استقبال ایک دوستانہ مسکراہٹ سے کرے اور کہے۔ ”آ گئی راج ہنس کی جوڑی“ اور ان کے ساتھ کنارے سے لگی میز تک جائے اور جب اسٹیمر اپنے وقت پر سبک رفتاری سے ٹیمز کے پانی پر پھسلنے لگے۔

اسے سخت کوفت ہوئی۔ آخر وہ کیوں نجم کے بارے میں سوچ کے اپنی کمزوری کا اعتراف کررہی ہے کہ وہ نجم کے خیال سے جان نہیں چھڑا سکتی۔ بھاڑ میں جائے نجم، آج اس کی ساری خوش فہمی دور ہو جائے گی کہ ہما کی ناراضی تو ریت کی دیوار ہے۔ کچھ ندامت کا اظہار، کچھ معافی نامہ، پھر ایسی اذیت نہ آنے کی یقین دہانی، سوویں بار اپنے بے پناہ عشق کے اظہار والے ڈائیلاگ اور ڈاکٹر ہما کی ساری ناراضی ساری مزاحمت سارے نخرے ختم... رہی سہی کسر ڈنر کا رومان پرور ماحول اور پورے چاند کی رات کا جادو پوری کرتا ہے۔

تو مسٹر نجم، اس بار آپ کو سخت مایوسی کا، شرمندگی اور ذلت کے احساس کا سامنا ہوگا۔ وہ خالی مگ کنارے پر رکھ کے باتھ ٹب سے نکل آئی۔ تم آؤ گے اور جھک مار کے جاؤ گے۔ موبائل فون بند ہے۔ سرہانے رکھے فون کا ریسیور ہک پر نہیں ہے۔ ٹی وی کی آواز نہیں ہے۔ اندر اندھیرا ہے... دروازہ مقفل ہے، ہما یقیناً گھر پر نہیں ہے اور وہ جھنجلائے گا۔ آخر وہ کہاں چلی گئی، اور کیوں؟ اسے معلوم تھا کہ میں ڈنر کے لیے لے جانے آرہا ہوں۔ مجھے بتائے بغیر... فون بھی بند کر کے بیٹھی ہے کہیں... اُلّو کی پٹھی... ابھی تک اکڑ میں ہے... اور واپس جاتے ہوئے مایوسی سے زیادہ وہ بے عزتی کے احساس سے مشتعل ہوگا۔

ایسا ہی ہونا چاہیے تھا اور بہت پہلے... ڈاکٹر نجم اب آپ اس انڈین ڈاکٹر سوشیلا کو لفٹ کرا سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں... یہ خیال بھی دل سے نکال دیں کہ اسے آپ کے ساتھ دیکھ کر میں جلوں گی... ٹو ہیل وِد یو اینڈ ہر... وہ کمبل میں گھس کے سو گئی۔ لیکن یہ نیند نہ تھی۔ بس وہ اندھیرے میں خیالوں کی پرچھائیوں سے الجھتی رہی۔ اس نے محسوس کیا کہ نجم دروازے تک آ کے لوٹ گیا ہے۔

اندھیرے میں گھڑی کے روشن ہندسوں کو پڑھ کے اس نے آل کلیئر کا سگنل دیا اور لائٹ جلا کے اٹھ بیٹھی۔ فی الحال کسی کے مخل ہونے کا کوئی اندیشہ نہ تھا چنانچہ اس کا نائٹ گاؤن پہننا بھی ضروری نہیں تھا۔ اس کی نظر نے آئینے میں خود کو کئی طرح سے دیکھا۔ بہ حیثیت ایک ڈاکٹر، بہ حیثیت ایک بیوٹیشن، بہ حیثیت ایک جوان عورت... ہر زاویے سے وہ ابھی تک اپنی اصل عمر سے کم لگتی تھی اور اس کا بدن اپنے تمام نشیب و فراز اور قوس و خم کے ساتھ پوری کشش رکھتا تھا۔ وقت ابھی اس کی گرفت میں تھا۔

مختصر سے گوشے میں بنے ہوئے کچن میں اس نے اپنے لیے جو لنچ تیار کیا، وہ پرہیزی نہیں تھا۔ وہ آج کل کیلوری کا حساب نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ صرف دو ہفتے میں یہ خواب بھی بکھر گیا تھا کہ بالآخر ڈاکٹر نجم کی صورت میں اسے وہ شریکِ حیات مل گیا ہے جو مثالی تو خیر کبھی نہیں ہوتا مگر اس کے ساتھ زندگی گزاری جاسکتی تھی۔ اب تک جتنے ملے سب حد درجہ چالاک اور خودغرض مگر اچھے ایکٹر تھے۔ خوب چکر چلاتے تھے لو ایٹ فرسٹ سائٹ کا... پہلی نظر کے عشق کے ڈرامے کا ایک اسٹینڈرڈ اسکرپٹ تھا۔ بلاشبہ وہ اپنی کسی مردانہ دلکشی سے متاثر کرتے تھے۔ بڑی سنجیدگی سے قائل کرتے تھے کہ یہ ولایت کی سنگل لائف ہمارے خاندانی نظام سے میچ نہیں کرتی۔ خاندانی نظام تو ہماری گھٹی میں پڑا ہے اور خون میں شامل ہے اور ہم جلاوطن نہ ہوتے تو اب تک دو چار بچوں کے باپ ہوتے مگر یہاں کون ہے ہماری فکر کرنے والا... جو کرو خود کرو اور اس جیسی مردم گزیدہ لڑکیاں پھر امید کا دامن ان سے باندھ لیتی تھیں اور انہیں اپنا گھر اپنے خوابوں کی تعبیر اپنی دسترس میں محسوس ہونے لگتی تھی۔ استحصالی محبت کے ماہر مرد جب دیکھتے تھے کہ اب لڑکی اڑ گئی ہے کہ یا تو ”قبول ہے“ کہو ورنہ بھاڑ میں جاؤ تم اور تمہاری محبت... تو پہلے سے خطرہ محسوس کر کے نئی محبت کو سابقہ تجربات کی روشنی میں پروان چڑھانے میں مصروف

ہوجاتے تھے کہ اچانک لاوارث ہونے کی نوبت نہ آئے۔
اس جیسی تمام انڈین، پاکستانی لڑکیاں بلاشبہ ناقص العقل ہوتی ہیں جو ایک گھر کے خواب پر خود کو قربان کرنے کا رسک مول لیتی ہیں جو کامیاب ہوجائیں وہ اپنی تمام توانائی اس رشتے کو برقرار رکھنے میں صرف کرتی ہیں اور آٹھ دس سال گزر جائیں تو محفوظ بھی ہوجاتی ہیں۔ باقی دو چار بار عشق کی قربان گاہ پر اپنی بھینٹ چڑھا کے بالآخر ماں باپ کی مرضی سے پیا گھر سدھار جاتی ہیں۔
لندن کا معاملہ بہرحال مختلف تھا۔ ابتدا سے اسے مکمل آزادی حاصل رہی، اسکول میں بھی اسے ہر قسم کے گورے کالے پیلے بوائے فرینڈز ملے اور اس ماحول میں جس قسم کے مراسم لڑکے لڑکیوں کے رہتے تھے، وہ ہما کے بھی رہے۔ ان تجربات پر قدغن کسی کی طرف سے نہ تھی چنانچہ ہما اپنے تمام مسائل و معاملات کی ذمے دار خود ہی رہی جو خوشگوار بھی تھے اور ناخوشگوار بھی... وہ اسکول کالج سے ہوتی ڈاکٹر بن کے اس اسپتال تک پہنچ گئی۔ خرابی کہیں نہیں تھی۔ وہ برطانوی نژاد تھی۔ خوب صورت تھی اور انڈین کا لیبل بس برائے نام رہ گیا تھا۔ اس کا لباس، اندازِ گفتگو، رہن سہن، رویّہ، سب اصلی و نسلی گوری لڑکیوں جیسا تھا۔ اس کا معمولی سا براؤن رنگ ہما کے ایشین ہونے کی چغلی کھاتا تھا مگر ایک پلس پوائنٹ تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ انگریز لڑکیاں اپنی سفید جلد میں یہ ملاحت لانے کے لیے ہر جتن کرتی تھیں۔ ہما کے براؤن شیڈ والے گورے رنگ کو وہ کتنے رشک سے دیکھتی تھیں اور نوجوان اس پر کیسے متوجہ ہوتے تھے۔ عام قسم کی دوستی بارہا معاشقوں میں بدلی کیونکہ عمر کا تقاضا تھا لیکن عام انڈین پاکستانی لڑکیوں کی طرح اس کا ٹارگٹ ہمیشہ گھر بسانا رہا۔ تین بار معاملہ اس کے یقین کی حد تک پہنچا کہ بالآخر وہ بھی گھر والی بن جائے گی لیکن انجام یہی ہوا کہ جو آج نجم کے معاملے کا ہوا تھا۔ ہر قربانی یا رشوت دینے کے باوجود...
اپنے احساسِ زیاں اور کسی حد تک غیر متوقع شکست کے خیال سے نجات پانا اتنا آسان نہ تھا۔ وہ خود کو یقین دلا کے سکون سے نہیں سوسکتی تھی جیسے گزشتہ رات سوتی رہی تھی کہ نہ اسے دکھ ہے نہ صدمہ... اس نے ٹی وی دیکھنے کی کوشش کی اور ایک کے بعد ایک چینل بدلنے کے بعد اسے بند کرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس وقت یہ ممکن نہ تھا کہ وہ کسی فرینڈ سے رابطہ کرے۔ کوئی فارغ نہیں ہوگا۔ کوئی کتاب پڑھنا زیادہ مشکل ہوتا، اس کا دماغ منتشر تھا۔ اس نے ماں سے بات کرنے کا سوچا... آخری بار ان کا رابطہ کب ہوا تھا۔ ہاں، کرسمس پر اس نے اپنی ماں کے دوسرے شوہر کو وش کیا تھا اور اس نے مدہوش آواز میں پوچھا تھا کہ ''ہما؟ کون ڈاکٹر ہما... اچھا اچھا... تھینک یو...'' اور فون بند کردیا تھا۔ اس وقت وہ بیمار تھا۔
کیوں نا وہ اس کی خیریت معلوم کرلے۔ آخر وہ ڈاکٹر ہے۔ مدد کی پیشکش تو کرسکتی ہے۔ اس نے نمبر ملاتے ہوئے سوچا۔ دوسری طرف گھنٹی تین بار بجی پھر اس کی ماں نے ''ہیلو'' کہا۔
''ماں، میں ہما بول رہی ہوں... آپ کی بیٹی۔''
''ہاں، میں نے آواز پہچان لی تھی۔ فون کیوں کیا؟'' ماں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
''ان کی حالت کیسی ہے... آپ کے شوہر کی؟''
''تم کیوں پوچھ رہی ہو... جانتی ہو کہ وہ سخت بیمار ہے۔''
''میں... دیکھیے... شاید میں کچھ مدد کرسکتی... یہاں کے ڈاکٹرز... میرا مطلب تھا بڑے ڈاکٹر...''
ماں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جہنم میں گئے سب بڑے ڈاکٹر... اب کوئی کچھ نہیں کرسکتا... وہ بتا چکے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ماہ اور جیے گا... برین ٹیومر کے مریض زندہ نہیں رہتے۔''
فون بند ہوگیا۔ وہ ہاتھ میں ریسیور پکڑے احساسِ ذلت سے دوچار بیٹھی رہ گئی۔ شاید ابھی ابھی اس کا یہ واحد خونی رشتہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ ابھی وہ ملنے پر راضی نہیں تو بیوہ ہو جانے کے بعد بیٹی سے کہاں ملے گی۔ ماں جو بیٹی کی سب سے اچھی دوست سمجھی جاتی ہے، اس کی صورت دیکھنے کی روادار نہ رہی تھی۔ اسے دنیا میں بالکل تنہا ہونے کا احساس ہوتا رہا۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اپنے اس عذاب سے چھٹکارا پانے کے لیے خواب آور گولیوں کا سہارا لے... جو اس کے پاس تھیں... نہ جانے کب سے...
اس نے شیشی نکال کے اس پر تاریخ دیکھی۔ یہ دو سال قبل کی تھی مگر خواب آور گولیاں پانچ سال مؤثر رہتی ہیں۔
پانی سے گولیاں نگل لینے کے بعد اسے یاد آیا کہ نجم سے پہلے... دو سال پہلے جب لندن یونیورسٹی میں معاشیات کے طالب علم چارلس گراہم نے آخری وقت میں اپنا فیصلہ بدل دیا تھا کہ ایم ایس کرنے کے بعد میں شادی نہیں فار ایسٹ میں ورلڈ بینک کی ایک ٹیم کے ساتھ بینکاک جاؤں گا تین سال کے لیے... تو اس نے خودکشی کرنے کی

نیت سے یہ شیشی لی تھی۔ ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے یہ اس کے لیے مشکل نہ تھا۔

☆☆☆

داڑھی اور سر کے بالوں کی سفیدی کو مہندی کے رنگ سے دبانے والا پستہ قد ہیڈ ماسٹر غصے میں تھر تھر کانپنے کی کوشش کر رہا تھا مگر صرف اس کے حلق سے نکلنے والی نیم مردانہ نیم زنانہ آواز کانپ رہی تھی۔ گاموکا اندازہ کمرے میں قدم رنجہ فرماتے ہی درست ہو گیا تھا جب اس نے اپنے ولی عہد کو اسی کمرے کے ایک کونے میں مرغا بنا دیکھا۔ اس کی کمر پر دو اینٹیں بھی رکھ دی گئی تھیں۔

''گامو... ملاحظہ کرو اس ولدالحرام نے کیا حرکت فرمائی ہے۔'' اس نے مرغے کے عقبی حصے پر ایک بید رسید کی جو نیچا ہو کے ایڑھی کی طرف جھک رہا تھا۔ ''یہ پشت آخر کشش ثقل سے اتنی متاثر کیوں ہو رہی ہے۔''

ہیڈ ماسٹر نے پہلے والی جگہ پر دوسرا وار کیا۔ ''کیا؟ خبیث الزماں... کہتا ہے مر گیا ہیڈ ماسٹر... یعنی ہم...''

گامو نے بہ مشکل ہنسی کو روکا۔ ''معاف کرنا ہیڈ ماسٹر صاحب... اس نے مرنے والی بات اپنے لیے کی تھی، آپ نے کیوں بلایا تھا مجھے...''

گامو کے دانستہ انجان بننے پر فارسی پڑھانے والے ہیڈ ماسٹر نے کرسی پر بیٹھ کے بید کو میز پر بجایا۔ ''اور کے طلب کرتے... بادی النظر میں اور زبان خلق کے مطابق اس خبیث کی تخلیق اور اس کا نام شریف الدین رکھنے کے قصوروار تم ہو...''

گامو کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''آج اس نے ہمارا تمسخر اڑایا۔ کلاس کے سامنے... ملاحظہ کرو اسباب شرانگیزی بطور ثبوت...''

''کیا کروں؟'' گامو نے سر کھجا کے میز پر رکھے تازہ فصل کے گچھوں میں سے نکلنے والے سنہرے بالوں کے ڈھیر کو دیکھا۔

''ساری کلاس کے سامنے اس نے یہ چہرے اور سر پر لگا کے ہمارا حلیہ بنایا اور ہماری نقل اتاری۔'' ہیڈ ماسٹر نے پانی پی کر غصے کی آگ کچھ سرد کی۔

گامو نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔ ''حضور، آپ سے میں معافی مانگتا ہوں۔ آج گھر لے جا کے اس کی کھال اتارتا ہوں اور اس کے جوتے بنوا کے پیش کرتا ہوں کہ اس کے سر پر مار مار کے اسے گنجا کر دیں۔''

ہیڈ ماسٹر نے مزید پانی پیا۔ ''نہیں گامو، ہم بخوبی

سردارنامہ

''شادی''

''سردار جی کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود شادی نہیں ہو رہی تھی۔ انہوں نے مندر میں جا کر گڑگڑا کر اپنی شادی کی دعائیں مانگیں۔ آخر کار ان کی دعائیں رنگ لائیں اور شادی ہو گئی۔

شادی کے تیسرے ہی دن سے وہ دوبارہ باقاعدگی سے مندر جانے لگے۔ لوگوں نے سنا کہ وہ رو رو کر گڑگڑا کر اپنی غلطی کی معافیاں مانگ رہے تھے۔

''مصیبت''

سردار جی عبادت سے گھر لوٹے اور بیوی کو گلے لگا کر خوب جھومنے اور ناچنے لگے۔ بیوی گھبرائی کہ پتی جی کو کہیں بھوت پریت نہ چمٹ گیا ہو۔

''نیک بخت! مہنت بتا رہے تھے کہ جو بھی مصیبت کو ہنستے کھیلتے گلے لگائے گا، وہ سیدھا سرگ میں جائے گا۔ تجھے گلے لگا کر میں جنت میں اپنا گھر بنا رہا ہوں!'' بیوی کے استفسار پر سردار جی نے وضاحت کی۔

''بے بے''

امرتسر کے خالصہ ہائی اسکول میں استاد نے میٹرک کے ایک باریش طالب علم سے پوچھا ''بتاؤ چاند پر پہلا قدم کس نے رکھا؟''

''نیل آرم اسٹرانگ نے!'' جواب ملا۔

''اور دوسرا قدم؟'' اگلا سوال کیا گیا۔

طالب علم زور سے ہنسا اور بولا ''ماسٹر جی! وہ میری یا آپ کی بے بے نے تو نہیں رکھا ہوگا۔ آرم اسٹرانگ لنگڑا نہیں تھا۔ دوسرا قدم بھی اسی نے رکھا ہوگا۔''

''حساب''

''ایک عورت ایک گھنٹے میں تیس روٹیاں پکاتی ہے۔ چار عورتیں مل کر ایک گھنٹے میں کتنی روٹیاں پکائیں گی؟''

''ایک بھی نہیں!''

''باتوں میں لگ جائیں گی۔ روٹی پکانے کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔''

زاہد صادق۔ لاہور

واقف ہیں کہ یہ تمہاری ہی تربیت ہے اور یہ ہمارا نہیں تمہارا ہونہار شاگرد ثابت ہورہا ہے۔ یہ زبان درازی اور تمسخر اُڑانے کی تربیت خود تم دیتے ہو۔ ہم اسے اپنے مکتب سے خارج کرتے ہیں۔ تم بناؤ اسے اپنے جیسا۔''

گامو کے کچھ سمجھنے اور کہنے سے پہلے شرفو سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اس کی کمر کا بوجھ پیچھے فرش پر گرا۔ ''ہیڈ ماسٹر صاحب، جو کہنا ہے مجھے کہیں... میرے والد نے کچھ نہیں کیا اور میں نے آپ کا مذاق بالکل نہیں اُڑایا۔ میں ملک صاحب کی بیٹی نوراں کی نقل اتار رہا تھا۔ اس کے ایسے ہی بال ہیں۔'' شرفو نے میز پر پڑے سنہرے ریشوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''آپ پوچھ لیں سب سے...''

''بدبخت، نانجار، زبان درازی کرتا ہے ہم سے...'' ہیڈ ماسٹر صاحب پھر بید سے حملہ آور ہوئے۔

شرفو نے بید پکڑ لی۔ ''آپ مجھے اسکول سے نکال چکے ہیں۔ اب میں آپ کا شاگرد نہیں ہوں کہ مار کھاؤں۔'' اس نے بید کو گھٹنے پر مار کے دو ٹکڑے کر دیے۔ ''میں دوسرے اسکول میں بھی جا سکتا ہوں اور کسی اسکول میں جائے بغیر بھی میٹرک کا امتحان دے سکتا ہوں... پرائیویٹ... چلو ابا۔''

وہ ہکا بکا کھڑے ہیڈ ماسٹر کی طرف دیکھے بغیر باپ کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ دونوں باپ بیٹا خاموشی سے گھر کی طرف چلتے رہے۔ خلافِ توقع گامو نے اپنے بیٹے کو برا بھلا نہیں کہا۔ جب بیٹے نے ہیڈ ماسٹر کے سامنے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا کہ میرے والد نے کچھ نہیں کیا... تو گامو کو اچھا لگا تھا۔ ابا کے بجائے والد صاحب کہلانا بھی اور ہیڈ ماسٹر کو بےعزتی کرنے سے روکنا بھی... اس کا بیٹا جوان ہوگیا تھا۔ ہیڈ ماسٹر تو خیر تھا ہی پانچ فٹ کا ڈھانچا... جو پتا نہیں کون سی زبان بولتا تھا۔ لیکن شرفو اس کے ساتھ چل رہا تھا تو قد میں اس سے دو انچ زیادہ ہی تھا۔ بید کی چوٹ کمر کی ہڈی پر لگے تو بڑا درد ہوتا ہے۔ گامو جانتا تھا۔

گھر جا کے وہ چارپائی پر گر گیا۔ ''پانی دے مجھے۔'' اس نے شرفو کی ماں سے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

ماں نے یہ احکامات شرفو کو پاس آن کیا۔ شرفو نے اسے مٹی کے گھڑے سے پانی ایک پیالے میں انڈیل کر دیا۔

گامو نے پانی پی کے کہا۔ ''تو بھی باز نہیں آتا مستی سے... نام میرا بدنام ہوتا ہے... اب کیا کرے گا؟''

شرفو نے پیالہ واپس گھڑے پر اوندھا رکھ دیا۔

''دسویں پاس کروں گا پھر بارھویں... چودھویں...''

''ایویں خواب نہ دیکھا کر کھوتے... شکر کر اتنا بھی پڑھ گیا... جب کام یہی کرنا ہے...''

''میں نے کتنی بار کہا ہے کہ مجھے نہیں کرنا یہ کام۔''

''پتر شرفو... یہ ہمارا خاندانی پیشہ ہے۔ میں اور تیرا چاچا یہ کام کرتے ہیں۔ اس سے پہلے میرا باپ اور چاچا بھی کرتے رہے۔'' وہ چارپائی پر ہاتھ کو سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گیا۔

شرفو نے غصے سے کہا۔ ''مگر میں نہیں کروں گا۔''

''مگر کیوں؟ تو کر سکتا ہے... زیادہ اچھا کر سکتا ہے۔ یہ جو تو نے آج اسکول میں کیا۔ اس سے میرا خیال پکا ہوگیا ہے کہ تو ہم سے زیادہ مذاقیہ ہے۔ اچھا تماشا لگا سکتا ہے۔ اتنا فائدہ تو ہوا پڑھنے کا... اور کیا چاہیے؟''

لیکن اس کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ شرفو اس کی بات سننے کے لیے موجود نہیں۔ وہ تو اس کی بیوی نے چلّا کے کہا کہ ''کس سے کہہ رہے ہو... شرفو تو گیا۔'' تو اسے پتا چلا کہ وہ خود سے باتیں کر رہا تھا۔

گامو اور اس کا بھائی جامو اس علاقے کے پرانے جگت باز اور بھانڈ تھے۔ جامو کا اصل نام تو نظام تھا مگر غلام محمد جب گامو بنا تو نظام دین خود بخود جامو ہوگیا۔ گامو جامو آس پاس کے دیہات میں ایک ہی نام مشہور ہوگیا تھا۔ جو چار پیسے شادی بیاہ میں خرچ کر سکتا تھا، ان کو تفریح کے لیے طلب کر لیتا تھا۔ اوقات ان کی نائی اور میراثی سے بھی کم تر ہی تھی۔ نائی گھر گھر ناوے بلاوے پہنچاتے تھے اور نمکین یا میٹھے چاول کی دیگ پکاتے تھے تو میراثی گا بجا کے رونق لگاتے تھے۔ گامو جامو آخر میں ہنسنے ہنسانے کے لیے بلائے جاتے تھے تو وہ ہاتھوں میں چھتر... چمڑے کے سول جیسے لمبے لمبے ٹکڑے... اٹھائے مہمانوں کے وسط میں آجاتے تھے۔

یہ کام ان کے باپ دادا کے زمانے سے ایسے ہی چل رہا تھا اور گویا نوشتۂ تقدیر بن گیا تھا۔ گامو کو پوری امید تھی کہ اس کا بڑا بیٹا جو حد سے زیادہ شرارتی اور مسخرہ تھا، تھوڑا بہت پڑھ لکھ گیا تو زیادہ زبان دراز اور بات سے بات پیدا کرنے والا بنے گا۔ اور اپنے بھائی رحمت کے ساتھ مل کے اس روایتی کامیڈی شو سے زیادہ کما سکے گا۔ چنانچہ اس نے دونوں کو مقامی اسکول بھیج دیا۔ رحمت ایک رات ان چوروں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا جو اُن کے صحن میں بندھی گائے کھول کے لے جانا چاہتے تھے۔ گائے نے شاید ایک چور کے لات رسید کی تو اس نے گالی بکی جو رحمت نے سن لی۔ اس نے انہیں للکارا تو ایک نے رحمت کو چاقو مار دیا۔

اور گائے لے گئے۔ اگلے دن رحمت بھی نہ رہا تو گاموں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ پھر بھی یہ ہو سکتا تھا کہ وہ جاموں کے بیٹے کو ساتھ ملا کے خاندانی بزنس چلا لے۔ تیسری اولاد راجو یعنی رضیہ بی بی تھی جو گیارہ سال میں ہی لوگوں کو کھرا مال نظر آنے لگی تھی۔ مایوس خود شرفو کے رویے نے کیا جو اس کام کو باعثِ ذلت سمجھتا تھا اور کہتا پھرتا تھا کہ وہ پڑھ لکھ کے ڈپٹی کمشنر بلکہ پٹواری بنے گا۔

شرفو کی ماں نے ساری بات سنی تو پریشان ہو گئی۔ ''شرفو نے کہا کہ وہ چوہدری کی چھوٹی بیٹی نوراں کی نقل اتار رہا تھا۔''

''ہاں، وہ ہیڈ ماسٹر جو بھونکے جا رہا تھا کہ میرا مذاق اڑایا ہے۔''

اس نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''ہائے ربا، یہ بات تو اب تک اس نے چوہدری کے کانوں میں ڈال دی ہوگی۔''

لقمہ گاموں کے حلق میں اٹک گیا۔ ''یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ہیڈ ماسٹر کی بڑی بے عزتی کی تھی شرفو نے...''

اس رات عشا کی نماز کے بعد باپ بیٹا کو چوہدری نے طلب کیا۔ اس کی بیٹھک میں پوری عدالت لگی ہوئی تھی جس میں معززین میں شمار ہونے والے ہیڈ ماسٹر اور مولوی صاحب اس کے دائیں بائیں مؤدب بیٹھے تھے۔ چوہدری صاحب کی دخترِ نیک اختر کی اسکول میں سرِعام نقل اتارنے کا جرم ناقابلِ معافی تھا۔ جب ہیڈ ماسٹر نے اپنی قابلیت والی اردو میں ملزم کا اعترافِ جرم پڑھ کے سنایا اور خود ملزم مذکور کے والد نے بطور چشم دید گواہ قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ دیا کہ بلاشبہ یہ جرم اس کے ناہنجار بیٹے سے سرزد ہوا تھا تو شرع کے ماہر قاضی بن کے مولوی صاحب نے سزا سنادی۔

''باپ بیٹا کو ننگا کر کے درمیان میں لٹایا گیا۔ مقامی پولیس چوکی سے چھترول کے دو ماہرین باہر اپنی کارکردگی دکھانے اور انعام لینے کے انتظار میں تھے۔ ملزم کو دونوں طرف سے چوہدری کے پہلوان ٹائپ نمک خواروں نے دبوچ لیا اور تھانے والوں نے اصلی تیرہ نمبر کے چھتر سے ان کی خاطر تواضع شروع کی۔ آواز بالکل ویسی ہی آتی تھی جیسی گاموں جاموں کی جوڑی اپنی فنکاری دکھاتے وقت پیدا کرتی تھی مگر یہ تماشا نہ تھا۔ گاموں اپنی آنکھیں تو بند کر سکتا تھا، کان کیسے بند کر سکتا تھا جن میں شرفو کے تکلیف سے بلبلانے کی آوازیں پگھلے سیسے کی طرح اتر رہی تھیں۔ باری آنے پر خود اس نے بھی ویسا ہی شور کیا۔ شاید زیادہ... حاضرین و ناظرین کے لطف لینے والے تبصروں سے ایسا ہی لگتا تھا۔

اگلا پورا ہفتہ باپ بیٹا اپنے کچے کوٹھے کے فرش پر الٹے پڑے رہے اور ایک ہی عورت جو بیک وقت ماں بھی تھی اور بیوی بھی ان کی پھٹی کھال پر ہلدی والا مرہم لگاتی رہی جو گاؤں کا پرچون فروش فراہم کرتا تھا۔ وہ ایک حکیم بھی تھا جیسے مولوی صاحب ایک عامل بھی تھے۔ گاموں نے صرف ایک بار پہلے یہ سزا بھگتی تھی مگر وہ اتنی سخت نہیں تھی۔ اسی چوہدری کے بیاہ میں اس کی دوسری بیوی کا ابا بھی مہمانوں میں شامل تھا اور سب کی طرح تمسخر کا نشانہ بنا۔ نئی نویلی دلہن نے اسی رات اپنے پیار جتانے والے سیکنڈ ہینڈ دولہا کی آتشِ شوق کو ایکسپلائٹ کیا اور اس وقت تک روٹھی رہی جب تک اس نے وعدہ نہیں کر لیا کہ اس کے باپ کی بے عزتی خراب کرنے والوں کو صبح ایسی سزا دے گا کہ سسر محترم کی صاحب زادی کا دل خوش ہو جائے گا۔ وہ تو دلہن ہی کمزور دل تھی کہ گاموں جاموں نے ذبح ہونے والے بکروں جیسی آوازیں نکالیں تو اس کا دل خراب ہو گیا اور اس نے کہہ دیا کہ دفع کریں انہیں... اتنی سزا کافی ہے۔

گاموں کے خیالوں کا تسلسل شرفو نے توڑ دیا۔ ''ابا، مجھے اب یہاں نہیں رہنا۔ تو بے شک رہ...''

وہ چونکا۔ ''یہاں نہیں رہے گا تو کہاں رہے گا؟''

''خدا کی اتنی بڑی زمین ہے۔ کہیں بھی چلا جاؤں گا۔ کراچی، لاہور، پشاور...''

''اور وہاں جا کے کیا کرے گا۔ کہاں سے کھائے گا؟''

''جو میرا دل کرے گا۔ لیکن یہاں رہ کے جوتے نہیں کھاؤں گا۔ کوئی بھی کام کر لوں گا۔''

گاموں اس بات پر غور کر ہی رہا تھا کہ راجو نے کہا۔ ''میں بھی جاؤں گی بھائی کے ساتھ۔''

راجو کی ماں نے بیٹی کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ ''شرفو ٹھیک کہتا ہے۔ اب ہمیں یہاں نہیں رہنا چاہیے۔''

راجو کے بعد اس کی ماں کا بیان ایک پس منظر رکھتا تھا جس کا گاموں کو علم نہ تھا۔ راجو ہر شام قرآن پڑھنے مولوی صاحب کے پاس جاتی تھی۔ چند دن قبل راجو نے ان کی دست درازی اور پیار بھری گفتگو کا اصل مفہوم پا لیا تھا اور اس نے خاصے غصے میں نوٹس دے دیا تھا کہ آخری سپارہ پڑھنے کے لیے وہ ان کے پاس نہیں آئے گی۔ آگے وہ خود بھی پڑھ سکتی ہے۔ ممکن ہے اس نے مولوی صاحب کو زیادہ برا بھلا کہا ہو کیونکہ شرمندہ ہونے کے بجائے انہوں نے راجو سے کہہ دیا تھا کہ آخر وہ کب تک نہیں آئے گی۔ عقد

ثانی کے لیے وہ گامو سے اس کا ہاتھ مانگیں گے اور دیکھیں
گے کہ وہ انکار کیسے کرتا ہے۔ راجو نے اس کا ذکر ماں سے کیا
تو ماں کے ردِعمل نے راجو کو حیران کر دیا۔ اس کی آنکھیں
خوشی سے چمکنے لگیں اور اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کے
کہا کہ شکر ہے ربا سچیا... ہمارے بھی نصیب جاگے... ہم
بھی عزت دار کہلائیں گے۔"

گامو نے سب کے فیصلے کو تسلیم کیا۔ بے شک اس نے
ابھی دس جماعتیں پاس نہیں کی تھیں مگر پڑھی ضرور تھیں
چنانچہ اب بیٹا زیادہ عقل رکھتا تھا اور گامو نے خود بھی محسوس
کیا کہ واقعی اس کی بات میں وزن ہے۔ لوگ سات سمندر
پار ولایت پہنچ گئے تو وہ لاہور کیوں نہیں جا سکتے جو اتنا بڑا شہر
ہے کہ وہاں انہیں تلاش کرنا بھوسے کے ڈھیر سے سوئی تلاش
کرنے سے زیادہ مشکل ہوگا۔ ایک رات یہ فیملی یوں غائب
ہوئی کہ اگلے دن گامو کا بھائی مرتے دم تک جوتا کاری کے
باوجود ایک ہی جملہ دہراتا رہا۔ "مجھے نہیں معلوم... گامو
نے مجھے نہیں بتایا۔"

☆☆☆

اس نے فیس بک پر اپنی پروفائل فوٹو کو اور پھر وینیٹی
بیگ کے چھوٹے سے مرر میں خود کو دائیں بائیں سر گھما کے
دیکھا۔ اپنا عکس اسے تصویر سے زیادہ پرکشش لگا۔ اس نے
اپنی فوٹوز کو کلک کیا۔ اس میں درجنوں تصاویر تھیں جو گزشتہ
ایک سال میں مختلف مواقع پر لی گئی تھیں۔ اس کی نظر مہینہ
بھر پرانی ایک تصویر پر ٹھہر گئی۔ اس میں بال آدھے
چہرے پر تھے لیکن اس کی مسکراہٹ کی ساری شوخی اور
شرارت کی عکاسی کرنے والی آنکھ بالوں کی چلمن سے
بھی... صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں... کی
طرح نظر آتی تھی۔

اس نے اسی کو اپنی پروفائل پکچر بنا دیا۔ ہمیشہ کی
طرح دس منٹ میں کمنٹس آنے لگے۔ کچھ واجبی حد تک رسمی
حد تک۔ کچھ پیشہ ورانہ انداز میں شوخ... کچھ بے ہودہ...
کچھ فحش... یہ کھیل یونہی چلتا تھا۔ نہ جانے کون اصلی تھا کون
نقلی... کس کی حقیقت کیا تھی۔

ابھی تک اس کے کمنٹس نہیں آئے تھے۔ ہما نے
گھڑی کی طرف دیکھا۔ عام حالات میں وہ دس بجے تک
گھر آ جاتا تھا۔ اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ وہ
رہتا اسلام آباد میں تھا مگر کاروبار کے سلسلے میں اسے لاہور،
کراچی یا دبئی بھی جانا پڑتا تھا۔ اس کی فرینڈز لسٹ میں
بہت سے پاکستانی لڑکے اور لڑکیاں تھے۔ کسی کے بارے
میں بھی وہ یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اپنے بارے
میں کتنا سچ بتاتا ہے۔ ایسا ہر جگہ تھا۔ فیس بک والے لکھے کو سچ
مان لیتے تھے۔ تصدیق تفتیش کے چکر میں نہیں پڑتے تھے۔
اس کے باوجود وقت گزرنے کے ساتھ سچ میں سے جھوٹ
الگ ہوتا جاتا تھا اور سب کا اصل روپ اور کردار واضح ہوتا
جاتا تھا۔

محمد شریف کی فرینڈشپ ریکوسٹ اسے دو ماہ قبل
موصول ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں وہ ہما کو اچھا لگا تھا۔ باقی
تفصیلات سے وہ تعلیم یافتہ بزنس مین ثابت ہوتا تھا۔ ہما کا
ان معاملات سے تعلق نہیں تھا۔ وہ تو یہ بھی یقین سے نہیں کہہ
سکتی تھی کہ تصویر اس کی اپنی تھی یا کسی پاکستانی فلم، ٹی وی
ایکٹر کی مگر بعد میں اس نے دیگر تصاویر پوسٹ کیں تو
صورت شباہت کے بارے میں شک نہ رہا۔ اس نے
پاکستان کے قابلِ دید مقامات کی سیر کے مناظر ڈالے۔ ان
میں کاغان کے برف پوش علاقے کی بلندی پر جھیل سیف
الملوک اور مری میں ایوبیہ اسے بہت اچھے لگے تھے۔ اس
نے اپنے گھر کی ایک خوب صورت تصویر کو پروفائل پکچر بنا
رکھا تھا... یہ خاصا بڑا اور خوب صورت گھر ایسا ہی تھا جیسے
برطانیہ میں دولت مندوں کے مینشن ہوتے ہیں۔ جدید وضع
کا یہ گھر اسلام آباد میں تھا۔ پس منظر میں گھنے جنگل جیسا
علاقہ اور سرسبز پہاڑ تھے۔ اس کے پاس دو کاریں تھیں۔
جیسا کہ تصویروں میں بھی نظر آتا تھا اور اس نے خود بھی بتایا
تھا۔ دونوں جاپانی کاریں تھیں۔ بڑی وہ سیر و تفریح یا لمبے
سفر میں استعمال کرتا تھا۔ ٹریفک کے رش میں دفتر آنے
جانے اور پارکنگ میں چھوٹی کار استعمال کرنا سہولت کا
باعث تھا۔

محمد شریف جسے اب دو ماہ بعد وہ شیری کہنے لگی تھی عام
سا بے ضرر نوجوان تھا جو کوئی فضول بات نہیں کرتا تھا اور ہما
کی خواہش پر اسے پاکستان کے بارے میں زیادہ بتاتا
تھا۔ تین سال کی عمر کے بعد پاکستان نہ جانے سے اس کو
اپنے آبائی وطن شہر یا گھر کے بارے میں صرف وہی معلوم
تھا جو اس کو ماں باپ نے بتایا تھا مگر ان کے پاس بھی پرانی
تصاویر انفارمیشن تھی۔ آج کے پاکستان کو وہ شیری کی
تصویروں میں اور اس کی پوسٹ میں دیکھ رہی تھی۔ خود اس
کا اپنا نام محمودہ انصاری تھا جسے اس نے مختصر کر کے ہما بنانا
بہتر سمجھا تھا۔

شیری کی پوسٹ اچانک لیپ ٹاپ کے اسکرین پر
نمودار ہوئی۔ "یہ تم ہی ہو نا ہما؟"

اس نے لکھا۔ ''تمہیں شک کیوں ہے؟''

''تمہاری یہ پروفائل پکچر... یہ بہت مختلف ہے۔ کسی پروفیشنل فیشن فوٹوگرافرز نے بنائی ہے۔''

''میں اپنا سوال دہراؤں گی... یہ شک کیوں ہوا تمہیں؟''

''وہ... دراصل... تم پاگل کرنے والی حد تک حسین لگ رہی ہو... کسی ماڈل سے بھی زیادہ...''

وہ ہنسی۔ ''ایڈیٹ... یہ میری ایک فرینڈ نے چار ماہ قبل میری برتھ ڈے پر لی تھی۔ میرے ہی کیمرے سے... اور ایک ریسٹورنٹ میں... مجھے اس دن میک اپ کیا ڈریس بدلنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ ہم اسپتال سے چلے گئے تھے۔''

''مائی گاڈ، مجھے یقین نہیں آتا کہ... خیر اب اگر تم برا نا مانو تو میں اس کی ہارڈ کاپی بنوا کے انلارج کرا لوں۔ اور فریم کروا کے سامنے والی دیوار پر لگا دوں۔ جہاں میں سوتا ہوں۔ اپنے والدین کی تصویر کے نیچے۔''

وہ خوشی کو دبا کے بولی۔ ''میں کیوں برا مانوں گی اور برا ماننے سے ہوگا بھی کیا۔ تم سو تصویریں بنوا کے ہر جگہ لگا دو۔''

''اس وقت تم کہاں ہو؟ میں تو گھر میں ہوں۔'' وہ خود پر نظر ڈال کے کچھ گھبرائی۔

''میں بھی گھر میں ہوں۔ اگر تم اس ایک کمرے کے ڈربے کو گھر مانو... تمہارا تو محل جیسا مینشن ہے۔''

''کیا یہ ہوسکتا ہے کہ تم اسکائپ پر آ جاؤ۔ دراصل میں نے اسکائپ یوز کرنا آج ہی سیکھا ہے۔'' وہ ہنسا۔

''یہ کیا مسئلہ ہے۔ تم مجھے اپنا پورا گھر اندر باہر سے دکھاؤ گے۔'' اس نے بیڈ پر پڑے لباس کو دیکھا اور پھر وارڈ روب میں سے دوسرا نکال لیا۔

''کیوں نہیں، بس ایک منٹ۔''

ہما نے وہی کپڑے پہن لیے تھے جو اس کی پروفائل پکچر میں تھے۔ تھوڑا سا میک اپ کر کے اس نے بالوں پر برش پھیرا اور پھر انہیں ایک جھٹکے سے چہرے پر پھیلایا۔ تصویر کے مطابق ایک طرف کے بال پھسل کر بار بار آگے آتے رہے۔ مطمئن ہو کے اس نے اسکائپ آن کیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ شیری کا پورا مسکراتا چہرہ دیکھ رہی تھی۔ ایک دوسرے کو لائیو دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا۔

''تم نے ٹھیک کہا تھا تم فطری طور پر اتنی حسین ہو۔ میں کیسے یقین کرلوں کہ راہ چلتے تم پر لوگ فریفتہ نہیں ہوتے۔''

وہ مسکرائی۔ ''میں کسی کو دیکھتی نہیں اور روک بھی نہیں سکتی اگر دیکھوں... جیسے تمہیں نہیں منع کرسکتی کہ گھور کیوں رہے ہو۔''

''میں لندن میں ہوتا تو میری تمہاری لو اسٹوری رومیو جیولیٹ سے زیادہ مشہور ہوتی، تم میرے جیسے معمولی آدمی کو قبول نہ کرتیں اور پھر مجھے لازمی خودکشی کرنا پڑتی۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''تمہاری ایسی باتیں سن کے جو لڑکی یقین کر لیتی ہوگی وہ فوراً تمہارے قابو میں آجاتی ہوگی۔''

''میں نے یقین کیا تم پر... تو تم بھی مان لو کہ ایسی بات میں نے پہلے کسی سے نہیں کہی... یہاں کا ماحول مختلف ہے... لڑکیاں بہت ریزرو... اور ماں باپ کیا پورے خاندان اور محلے کی نگرانی میں رہتی ہیں... لیکن... جو کہانیاں بچپن میں سنائی جاتی ہیں، ان میں ایسا ہوتا ہے کہ کسی نے خواب میں شہزادی کو دیکھا یا کسی کے حسن کی شہرت سنی... کبھی وہ پری بھی ہوتی تھی تو اس پر فریفتہ ہوگیا اور اس کی تلاش میں نکل گیا۔''

''ہاں، مگر اب زمانہ بدل گیا ہے تو کہانیاں بھی بدل گئی ہیں...''

''بس، بس محبت نہیں بدلی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی کسی پری کے خیال میں نکل جاؤں... لندن پہنچ جاؤں۔''

''چھوڑو یہ کہانیوں کی بات، اپنا گھر دکھاؤ مجھے... تصویر میں تو بہت خوب صورت ہے بلکہ تمہاری تصویروں میں تو پاکستان اتنا خوب صورت لگتا ہے کہ مجھے ان ہولناک خبروں پر... تصویریں دیکھنے کے باوجود یقین نہیں آتا... پاکستان میرا ملک بھی تو ہے۔''

''یہ ہوسکتا ہے کہ تم خود آکے دیکھ لو۔''

''مجھے کچھ یاد نہیں کہ میرا گھر کہاں تھا اور وہاں میرا ہے کون؟''

اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''کیوں؟ میں ہوں نا... یا میں تمہارا نہیں ہوں؟''

ہما کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہے۔ ''ہاں، تم تو ہو... مگر...''

''ہما... میں اس بات کو زیادہ دن ٹالنا نہیں چاہتا، اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کہ اب تک میں نے یہ بات نہیں کہی، دراصل... ہم ذرا شرمیلے لوگ ہیں ایسے کھل کے بات نہیں کرتے... اور فوراً بے تکلف نہیں ہوتے۔''

ہما نے جھنجلا کے کہا۔ ''یار کہتے کیوں نہیں وہ بات جو

کہی تھی۔"

"آئی لو یو... مجھ سے شادی کرو گی؟" اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

وہ دم بخود رہ گئی۔ اس کے خواب وخیال میں نہیں تھا کہ ایک دم وہ ایسا فیصلہ کن صورتِ حال پیدا کردے گا۔

"یہ... یہ میں نے کبھی سوچا نہیں... تو فوراً جواب کیسے دے سکتی ہوں۔ میں تو پاکستان آنے کی بات کررہی تھی۔"

"تو آجاؤ... یہاں مجھ سے مل کے فیصلہ کرلو، ماں باپ نہ میرے نہ تمہارے۔"

"آل رائٹ... لیکن ابھی بتا نہیں سکتی کہ کب آؤں گی۔ نہ یہ کہ میرا فیصلہ کیا ہوگا۔" اس نے نروس لہجے میں کہا۔ "مجھے اپنے بارے میں بتاؤ، وہ جو میں نہیں جانتی۔"

"سب کچھ تو بتا چکا ہوں میں... سوائے اس بات کے جو تم نے ابھی کہی... میں جدی پشتی اس ملک کا رہنے والا ہوں۔ میرے ماں باپ غریب آدمی تھے مگر انہوں نے مجھے پڑھایا اور میں نے بزنس کیا۔ دن رات محنت کی۔ قسمت نے میری مدد کی اور آج تم دیکھ سکتی ہو کہ میں خوش حال ہوں۔ چلو میں تم کو اپنا گھر دکھاؤں۔"

وہ اسکائپ لے کر سارے گھر میں پھرتا رہا۔ یہ تین کشادہ بیڈروم والا گھر تھا۔ خوب صورتی سے سجا ہوا۔ صاف ستھرا قالین، پردے اور بیش قیمت فرنیچر والا... اس کے لاؤنج اور ڈرائنگ روم میں فانوس آویزاں تھے۔ باہر مختصر مگر بہت خوب صورت لان اور پھولوں والا باغ تھا جس کے وسط میں فوارہ تھا اور ایک کنارے پر پتھروں سے بہتے پانی والا مصنوعی آبشار... اس کی دونوں گاڑیاں پورچ میں کھڑی تھیں۔ آس پاس کے گھر بھی ایسے ہی تھے۔

"مائی گڈنس... تم تو بادشاہوں کی طرح رہتے ہو۔" ہما نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "ہما ڈارلنگ، اس علاقے میں میری کوئی حیثیت نہیں... ابھی گھر گرہستی نہیں ہے تو میرے صرف چار ملازم ہیں۔"

"چار ملازم... وہ کیا کرتے ہیں؟"

"ایک شیف ہے کھانا پکاتا ہے۔ ایک شوفر... مجھے کہیں بھی لانے لے جانے کے لیے... ایک مالی ہے ورنہ یہ باغ ایسے نہیں رہ سکتا تھا اور ایک گیٹ کیپر ہے، گن مین فار سیکیورٹی۔"

"اور وہ جن کو تم بڑے لوگ کہتے ہو..."

"ہمارے حاکم، صنعت کار، بزنس مین، ان کے گھر چار گنا یا دس گنا بڑے بھی ہیں اور ملازم بھی دس بارہ... بیک وقت چار چھ گاڑیاں... اب مجھے بھی تو بتاؤ کہ تم لندن کب گئیں اور ڈاکٹر کیسے بن گئیں۔ وہاں تو سنا ہے ڈاکٹر اور وکیل بہت کماتے ہیں۔"

ہما کا تجسس اور اشتیاق بڑھ گیا تھا۔ شبہے کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ ہما پر غائبانہ عاشق ہوگیا تھا۔ یہ الیکٹرانک دور کا عشق ایسا ہی تھا۔ خود ہما اسے پسند کرتی تھی اور آج یہ پسند اچانک ایک خواہش میں بدل گئی تھی کہ وہ جاکر اس سے ملے۔ وہ سب دیکھے جو خواب جیسا تھا مگر اس کی تعبیر ہما کی دسترس میں تھی۔ اسے فقط ایک ہی لفظ تو بولنا تھا... یس... مگر وہ جلد بازی میں فیصلہ کرکے پچھتانے کا قصہ چوتھی بار دہرانا نہیں چاہتی تھی۔

لندن میں پیدا ہوکے پرورش پانے اور پھر تعلیم پاکے ڈاکٹر بن جانے والی ہما کے لیے اکیلے رہنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے اسکول سے میڈیکل کالج تک درجنوں دوست تھے اور سب اس سے مخلص ہونے کے دعویدار بھی تھے مگر جب اسے ساتھ رکھنے کا مسئلہ آیا تو سب نے معذرت کرلی۔ ان میں سے بیشتر بہت عرصہ قبل ہی والدین کے گھر چھوڑ چکے تھے یا شادیاں کرچکے تھے۔ باقی فی الحال شادی کرکے گھر بسانے کے خیال کو اتنا اہم نہیں سمجھتے تھے جتنا اپنے جاب یا بزنس میں ترقی کرنے کو۔

اس کی خوش قسمتی تھی کہ ایک بہت نامور اسپتال میں ڈاکٹرز کی جوڑی پاکستانی نکل آئی۔ وہ میاں بیوی لاولد تھے۔ انہوں نے ہما کو اسپتال میں ملازمت تلاش نہ کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ وہاں کام کے اوقات بہت زیادہ اور ڈیوٹی بہت سخت تھی۔ اس کی تنخواہ بمشکل تمام اس کے اخراجات کی کفالت کرتی۔ وہ خود ریٹائرمنٹ لینے والے تھے اور ان کا ارادہ خود اپنا اسپتال قائم کرنے کا تھا۔ ہما وہاں ان کی معاونت کرسکتی تھی۔

صرف ایک سال بعد وہ ان میاں بیوی کے اسپتال میں دن رات ایک کررہی تھی۔ اس کی آمدنی پبلک اسپتال میں ملازمت کرنے والوں سے دوگنا زیادہ تھی اور مستقبل میں اس کی اپنی پرائیویٹ پریکٹس سے آمدنی کئی گنا بڑھ جانے کے امکانات بہت روشن تھے۔ بریڈ فورڈ کے اس اسپتال میں انڈین، پاکستانی مریضوں کا رش رہتا تھا۔ اس کے دونوں محسن اسپیشلسٹ تھے اور بہت زیادہ فیس وصول کرتے تھے۔ ان کے لیے اسپتال بیک وقت مصروفیت کا ذریعہ بھی تھا اور آمدنی کا بھی۔ تیس سال تک دن رات کام

کرنے کے بعد وہ فارغ نہیں بیٹھ سکتے تھے اور ان کے دل میں یہ احساس بھی تھا کہ جب وہ انسانوں کے دکھ اور بیماریاں دور کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو ان کو اپنا وقت سیر و سیاحت میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔

عام کیس ہما کے پاس آتے تھے اور اسے صبح سے شام یا رات تک سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی تھی۔ یہ اس کے ہمدردانہ رویے کا نتیجہ تھا یا اس کے ہاتھ میں خدا نے شفا رکھی تھی کہ مریضوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ اس تعداد کو کچھ کم کرنے کے لیے فیس بڑھا کے دگنی کرنے سے بھی زیادہ فرق نہیں پڑا۔ صرف تین سال میں وہ اس قابل ہو گئی کہ ہوسٹل سے اپنے ایک بیڈ روم والے اسٹوڈیو اپارٹمنٹ میں منتقل ہو جائے۔

ایک بار پھر اس کے پرستاروں کی نئی کھیپ سامنے آئی۔ یہ نسبتاً سنجیدہ عمر کے لوگ تھے۔ پہلا ایک ہندو ڈاکٹر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ہما سے شادی کے بعد اپنا پرائیویٹ کلینک قائم کرے۔ پیدائش سے اب تک لندن میں رہنے کے باوجود ہما پاکستانی اور مسلمان تھی۔ کشور کمار کی دولت کما کے لکھ پتی ہو جانے کی اسکیم میں اخلاقی یا غیر اخلاقی کچھ نہیں تھا۔ وہ جائز اور ناجائز ابارشن کو آمدنی کا سب سے بڑا وسیلہ سمجھتا تھا جس کی ضرورت جوان ہوتی نسل کو سب سے زیادہ محسوس ہوتی تھی۔ اب اپنے ملک کی طرح مختلف ضروریات کے لیے میڈیکل سرٹیفکیٹ جاری کرنا دوسرا منافع بخش کام تھا۔ ہما اس کے خلاف تھی لیکن کشور کمار نے اس کا ایک حل نکال لیا۔ ”اوکے... تم اپنی نارمل پریکٹس جاری رکھنا، عام میڈیکل کیس تم لو گی۔ باقی سب کام میرے۔“

ہما نے کہا۔ ”میں تمہاری مدد بھی نہیں کروں گی اور نہ اس قسم کی آمدنی میں سے میرا حصہ ہو گا لیکن ہمارے درمیان مذہب کی دیوار ہے۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا، یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے۔“

”نہیں، میرے مذہب میں کسی غیر مسلم سے شادی کی اجازت نہیں۔“ ہما نے کہا۔

”واٹ نان سنس... تمہارے شاہ رخ خاں کی بیوی ہندو ہے اور کشور کمار کی بیوی مدھوبالا مسلمان تھی۔“

”ان کو جانے دو۔ یہاں لوگ شادی کے بغیر ساتھ رہتے ہیں کئی بچے ہو جانے کے بعد شادی کر لیتے ہیں یا ایسے ہی زندگی گزار دیتے ہیں۔ حرام حلال کا کوئی چکر نہیں۔ مگر مجھ سے شادی کے لیے تم کو مسلمان ہونا پڑے گا۔“

”ناممکن... گوٹو ہیل۔“

دوسرا موقع ایک ترک ماہر تعمیرات سے معاشقے کے بعد آیا تھا۔ وہ واقعی ہما کو دیوانگی کی حد تک چاہتا تھا مگر شادی کے امور پر اتفاق ہو جانے کے بعد ایک رات اس پر اندھے پن کا دورہ پڑا اور اسے برین ٹیومر تشخیص ہوا۔ چار ماہ بعد وہ مر گیا۔

تیسری بار وہ نجم کے چکر میں آ گئی تھی جو بے حد چالاک، لالچی اور موقع پرست آدمی تھا۔ وہ بال بال بچ گئی تھی۔

☆☆☆

ان کے حق میں یہ ایک اچھا اتفاق ثابت ہوا کہ فیصل آباد سے آنے والی لاری راوی کے پل سے پہلے خراب ہو گئی۔ دیگر مسافروں کی طرح وہ بھی اتر گئے۔ سڑک کے کنارے بیٹھے رہنا لاحاصل تھا۔ وہ نیچے اتر گئے۔ راوی جو پہلے بیچ بیچ دریا تھا اب دو تین گندے پانی کے نالوں جیسا ہو گیا تھا۔ بارش اور سیلاب کے موسم میں پانی ضرور بڑھ جاتا تھا ورنہ اس کے دونوں کناروں پر بھینسوں کے باڑے تھے۔ سیکڑوں بھینسیں اس وقت بھی گردن تک پانی میں ڈوبی نظر آ رہی تھیں۔ وہیں گوالوں کے کچے پکے گھر تھے اور یہ اچھی خاصی آبادی تھی جو لاہور شاہدرہ کے درمیان پھیلتی جا رہی تھی۔

گامو کے پاس چند سو روپے تھے اور تھوڑا سا بیوی کا زیور جو وہ راجو کو بیاہ پر چڑھا دیتی۔ اس کو آنے والے وقت میں پہلا مسئلہ رہائش کا تھا اور پھر معاش کا... وہ لاہور میں یہ رات بیوی، بیٹی کے ساتھ کھلے آسمان کے نیچے نہیں گزار سکتا تھا۔ وہ ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھے تھے کہ شرفو کسی تندور ہوٹل سے گرم روٹی کے ساتھ دال لے آیا اور اس نے پھر ثابت کر دیا کہ وہ گامو کے مقابلے میں معاملات کا حل تلاش کرنے کی بہتر صلاحیت رکھتا ہے۔

”ایک بندے نے کہا ہے کہ میری خالی جھونپڑی میں آ جاؤ۔ بھینسوں کی دیکھ بھال کرو۔ ان کو چارا ڈالنا، نہلانا اور دودھ نکالنا... سارے کام ہیں۔“ شرفو نے بتایا۔

”یہ کام تو ہم کر لیں گے۔“ گامو سوچتے ہوئے بولا۔

”صبر کرو، بتاتا ہوں، اس نے کہا ہے کہ ہزار روپے مہینے کے دے گا، رہنے کی جگہ ہے... دودھ جتنا چاہیے۔“

”لکھ شکر اے تیرا ربا۔“ راجو کی ماں نے عادت کے مطابق سر اٹھا کے کہا۔

راجو ندیدوں کی طرح کھا رہی تھی۔ ”بھائی، یہ شہر والے کیسے مزے کی دال بناتے ہیں۔“

شرفو مسکرایا۔ ”کسی دن گوشت بھی لاؤں گا۔ ادھر

اس کو کڑا ہی بولتے ہیں۔ اتنے مزے کی ہوتی ہے مگر ذرا پیسے آجائیں ہاتھ میں۔''

وہ اپنے کام سے بھی مطمئن تھے اور معاوضے سے بھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں کا آسیب دور ہو رہا تھا۔ دوبارہ وہ شہر بھی گھوم آئے تھے۔ گامو نے سب کے ساتھ داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دی تھی۔ اس کی بیوی نے منت مانی کہ پیسے ملیں گے تو وہ مزار پر چادر چڑھائے گی۔ شرفو باہر تقسیم ہونے والی دیگوں سے پلاؤ، زردہ لانے میں کامیاب رہا حالانکہ بھیڑ میں یہ کام مشکل تھا پھر وہ بادشاہی مسجد گئے اور مینارِ پاکستان والے میدان میں بیٹھے رہے۔ ان سب کو زندگی کی ایک انوکھی خوشی نے سرشار کر دیا تھا۔ وہ شہری ہو گئے تھے۔

شرفو کا عزم اپنی جگہ تھا کہ اس کو پڑھنا ہے لیکن ابھی حالات موافق نہ تھے۔ ایک دن اچانک باڑے کا مالک آگیا جو گھر گھر دودھ پہنچاتا تھا۔ دکانوں پر دودھ لے جانے کا کام اس کے بھائی کرتے تھے۔ شیدا گجر پرانا وضع دار شخص تھا۔

''اوئے گامو، اِدھر ایک گھر میں کام ہے تیری بیوی بیٹی کے لیے۔''

''یہ عورتیں کیا کام کریں گی جی...''

''وہی جو عورتیں کرتی ہیں... گھر کا کام، ایک بڈھا ہے اور اس کی بڈھی۔ خیال رکھنے والا کوئی نہیں۔ میں دودھ دیتا ہوں اُدھر... اس کے پاس ایک نوکر تھی۔ وہ مر گئی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ کوئی ہو اعتبار کے قابل تو بتانا، گھر صاف کرنا، دونوں کا اور اپنا کھانا بنانا، برتن کپڑے دھونا، یہی کام ہیں۔ صبح جا کے شام کو واپس... ویسے رہنا ہو تو جگہ اُدھر بھی ہے... عورتوں کے لیے۔''

عین ممکن تھا کہ گامو انکار پر قائم رہتا مگر شرفو نے کہا کہ دیکھ کر اور مل کے فیصلہ کریں گے اور اگلے دن وہ ماں کو ساتھ لے کر گیا تو اسے فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی۔ بڈھا بڈھیا بہت ضعیف تھے اور خود کوئی کام نہیں کر سکتے تھے۔ ان کا گھر دس مرلے پر پکا بنا ہوا کسی کوٹھی جیسا تھا۔ راجو اور اس کی ماں کا صبح سات بجے سے شام سات بجے تک کام کا معاوضہ دو ہزار تھا۔ صبح کا کام ان کو ناشتا دینے سے شروع ہوتا تھا۔ رات کو کھانا پکا کے سامنے رکھنے کے بعد وہ گھر جا سکتی تھیں۔ ان دونوں ماں بیٹی کا کھانا پینا وہیں تھا اور وہی جو مالک مالکن کھاتے تھے۔ سب کچھ اچھا تھا مگر عورتوں کو ہمت شرفو نے دلائی۔ کس بس میں بیٹھ کے جانا ہے اور کہاں اترنا ہے پھر واپسی میں بھی وہی بس ہوگی۔

یوں راجو اور اس کی ماں کی زندگی ایک انقلاب سے دوچار ہوئی۔ راجو نے شہر دیکھا، کوٹھی دیکھی اس کی آرائش دیکھی، قیمتی برتن دیکھے، کار دیکھی جو کھڑی رہتی تھی اور سب سے بڑھ کر ٹی وی دیکھا۔ اترن سہی مگر وہ رنگین ریشمی کپڑے پہنے جو گاؤں میں چوہدری کے گھر کی عورتوں کو نصیب تھے۔ گھر میں سلائی کی مشین پر خود مالکن نے ان کو راجو کے لیے فٹ کیا۔ یہ کپڑے پہن کے راجو نے خود کو آئینے میں دیکھا تو بس دیکھتی رہی، جب تک ماں نے نہیں بلایا۔ ان سب کی صحت میں نمایاں فرق پڑا تھا۔ یہاں کھانے کو وہ مل رہا تھا جو گاؤں میں چوہدریوں کی شادی میں بھی نہیں ملتا تھا۔ دودھ پینے پر پابندی نہ تھی۔ وہ بے خوفی سے سوتے تھے۔ اس فراغت اور خوشی میں جوانی راجو پر ٹوٹ کے کیسے نہ آتی۔

انہوں نے کبھی پوچھا نہیں تھا کہ ملک خدا بخش اور اس کی بیوی اکیلے کیوں تھے۔ پھر ایک دن فون پر کسی سے بات کرنے کے بعد مالکن رونے لگی تو راجو کی ماں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''بیگم صاحب، خیریت ہے ناں... کیا کوئی مر گیا ہے؟''

مالکن نے سر اٹھایا اور بولی۔ ''نہیں، کوئی نہیں مرا، ہم مر گئے ہیں۔''

اس نے جی ہلکا کرنے کے لیے ہی سب بتا دیا۔ ''اب چھپانے کا بھی کیا فائدہ... ملک صاحب ڈی ایس پی تھے۔ پولیس کا بہت بڑا افسر ہوتا ہے۔ دو بیٹے تھے۔ ان کو اچھا پڑھایا پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیج دیا۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے۔ انہوں نے وہاں شادی کر لی۔ ان کے بچے بھی ہو گئے۔ ہر مہینے پیسے بھیجتے تھے۔ ہم نے منع کر دیا۔ ہم رہنے کے لیے اُن کے پاس جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے منع کر دیا۔ کئی سال ہو گئے عید بقرعید پر فون آتا تھا۔ اب پتا نہیں کہاں ہیں ہم خود چلے جاتے... منع کرنے کے باوجود، پوتوں کو دیکھ لیتے اور واپس آ جاتے... پیسا ہے ہمارے پاس، ان پر بار نہ بنتے مگر ابھی چھوٹے بیٹے نے بھی کہہ دیا ہے کہ یہاں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ تم بھی مت آنا ہمارے مرنے پر۔'' وہ پھر زار و قطار رونے لگی۔

اگلے چند دن میں راجو اور اس کی ماں پر یہ حقیقت عیاں ہو گئی کہ جتنے دکھی اور بے بس وہ اپنے گاؤں میں تھے اتنے ہی اس شہر میں زندگی کی ہر آسائش رکھنے والے بھی تھے۔ ملک خدا بخش جب بہت بڑا پولیس افسر تھا تو اس کے آگے پیچھے پھرنے اور سلام کرنے والے بہت تھے مگر

اب یہ حال تھا کہ خود ان کی اولاد انہیں بھول چکی تھی۔ زمانے کو کیا الزام دینا... شاید وہ بھی اتنا ہی بے عزت محسوس کرتا ہو جتنا کم ذات گاموا پنے گاؤں میں کرتا تھا۔
ملک خدا بخش اپنی بیوی کو تسلی اور حوصلہ دیتا رہتا تھا کہ چلو بچے خوش رہیں، ہماری خوشی تو اسی میں ہے۔ زندگی اچھی گزری۔ اب بھی کیا کمی ہے ہمیں۔'' لیکن راجو کی ماں کو بھی لگتا تھا کہ یہ جھوٹ بولنا اس کی مجبوری ہے۔

دو ہفتے کی ملازمت میں ماں بیٹی نے اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا۔ وہ صبح سے شام تک گھر کو اپنے گھر کی طرح سنبھالتی تھیں اور اس کے عوض انہیں مکمل آزادی اور اعتماد حاصل تھا۔ دو ہفتے بعد ملک صاحب نے ان سے کہا۔ ''دیکھو، اوپر کے دو کمرے خالی ہیں۔ تم وہاں رہ سکتی ہو۔''
''نہیں جی، میرا دن رات رہنا مشکل ہے۔ راجو کا باپ ہے اور ایک بھائی ہے۔''
''کیا وہ یہاں نہیں رہ سکتے؟ دراصل میری بیوی کو چوبیس گھنٹے کی دیکھ بھال چاہیے۔''
''وہ اپنا کام چھوڑ کے کیسے آسکتے ہیں جی۔''
''جیسے تم آتی ہو، وہ مرد ہیں۔ اچھا تم یوں کرو کل ان کو ساتھ لے کر آؤ۔ میں خود ان سے بات کروں گا۔''
راجو تو خود دل سے یہی چاہتی تھی۔ بھینسوں کے درمیان آدھی کچی پکی جھونپڑی سے اس ''کوٹھی'' میں رہنا تو اس کے لیے محلوں کے خواب کی تعبیر ملنے جیسا تھا۔ گامو کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ مگر اس سے پہلے شرفو نے ملک صاحب کا ایسے شکریہ ادا کیا کہ وہ شرفو کی تعریف کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ''بھئی تمہارا بیٹا تو ماشاء اللہ بہت مہذب اور پڑھا لکھا لگتا ہے۔''
''لگتا ہے کیا ملک صاحب، میرے بھائی نے دسویں کا امتحان دینا تھا۔'' راجو بول پڑی۔
''پھر؟ دیا کیوں نہیں؟'' ملک صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔
سب کی خاموشی دیکھ کے ملک صاحب نے راجو سے ہی کہا۔ ''ہاں بتاؤ مجھے، کیوں امتحان نہیں دیا تھا؟''
اس وقت راجو نے جو کہا اس پر خود شرفو کا سر اونچا ہو گیا۔ آخر تھی وہ کس کی بہن... اب وہ ایک خوب صورت شہری لڑکی کا اعتماد رکھتی تھی۔ اس نے الف سے ی تک ساری بات ملک صاحب کو بتادی کہ وہ گاؤں سے کیوں فرار ہوئے تھے۔
خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا پھر ملک صاحب نے کہا۔

''رضیہ بیٹی، سچ ایک بار بولنا پڑتا ہے مگر اس کے بعد بہت سارے جھوٹ نہیں بولنے پڑتے۔ اب میری بات سنو غلام محمد، تم آج ہی یہاں آجاؤ گے اور اوپر رہو گے۔''
''مگر جناب، ہم جو کام کرتے ہیں؟''
''ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ رضیہ اور اس کی ماں پہلے ہی یہاں کام کرتی ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ باہر کا سارا کام... سودا سلف لانا، چوکیداری، گاڑی چلانا۔''
غلام محمد کہنے پر گامو کا منہ کھل گیا تھا۔ ''سرکار، میں نے تو کبھی تانگا نہیں چلایا۔''
ملک صاحب مسکرائے۔ ''پندرہ دن میں گاڑی چلانا آجاتا ہے۔ تم سیکھ جاؤ گے اور اس کام کے تمہیں دو ہزار ملیں گے۔''
اب شرفو کے لیے خاموش تماشائی بنے رہنا مشکل ہو گیا۔ ''ملک صاحب گاڑی میں چلاؤں گا آپ کی۔''
ملک صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں تمہارا اپنا کام ہے۔ تم کو دسویں کا امتحان پاس کرنا ہے۔ پہلی بار میں، سمجھے۔''
وہ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رات تھی۔
گامو اور اس کی بیوی یوں روتے رہے کہ ان کے پاس خدا کا شکر ادا کرنے کے لیے آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہ خواب تو نہیں تھا لیکن غلام محمد کی محدود عقل اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قاصر تھی کہ آخر کسی وجہ کے بغیر وہ سوہنا رب اس پر مہربان ہے تو کیوں؟ نہ اس نے کبھی پنج وقتہ نماز پڑھی تھی۔ نہ کبھی روزے رکھے تھے۔ قرآن کے اس نے اپنے بچپن میں چند سپارے پڑھے تھے پھر مسجد سے بھاگ گیا تھا۔ جس کے نصیب میں باپ دادا کے زمانے سے ہی جوتے کھانا اور ذلت اٹھانا تھا وہ غلام محمد کیسے ہو گیا تھا۔ لاہور شہر کی اس کوٹھی کے اوپر والے ایک کمرے کی چھت پر لیٹا وہ گاؤں میں اپنے کچے کوٹھے کو یاد کرتا رہا جو شاید چوہدری کے بندوں نے غصے میں گرا کے برابر کردیا ہوگا۔
اس کی بیوی اپنی خوش نصیبی سے زیادہ ملک صاحب جیسے فرشتہ سیرت آدمی اور اس کی بیوی کی بدنصیبی پر روتی رہی۔ آخر خدا نے سارے عذاب، بیماری اور دکھ انہی کے مقدر کے کھاتے میں کیوں ڈال دیے جو مجسم نیکی تھے، ایسی شرافت اس نے نہ دیکھی تھی نہ سنی تھی۔
ملک اپنی بیمار بیوی کا سر تھپکتا رہا اور اعتراف کرتے ہوئے روتا رہا کہ پولیس کی نوکری میں اس نے بہت ظلم کیے تھے۔ بہت ناانصافی کی تھی۔ بے گناہوں کی سزا سے ان کے قتل تک اس کے نامۂ اعمال میں کیا نہیں تھا۔'' کیا

میری یہ نیکی میری ساری عمر کے گناہ دھو سکتی ہے؟ سزا تو مجھے اس دنیا میں ہی ملنا شروع ہو گئی ہے۔ آخرت کا عذاب باقی ہے۔''

اس کی روتی ہوئی بیوی نے کہا۔ ''خدا کی رحمت سے مایوس کیوں ہوتے ہو۔ وہ بڑا غفور الرحیم ہے۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ ان کو گھر میں رکھ لیا۔ اب نہ ہم اکیلے ہیں نہ وہ۔''

راجو میں غرور جاگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے کہ وہ اس خبیث باپ کی عمر کے مولوی کی دوسری بیوی بننے سے بچ گئی اور اب وہ خود کو ان کپڑوں میں اور تھوڑا سا میک اپ کر کے شیشے میں دیکھتی ہے تو کسی بھانڈ کی بیٹی نہیں، پرستان کی شہزادی لگتی ہے۔ کیا اب اس کے لیے پرستان کا کوئی شہزادہ کسی دن اچانک آ جائے گا؟ سب کچھ اچانک ہی تو ہو رہا تھا۔ کسی دن واقعی وہ یوں پوں کرتی گاڑی میں گھومے گی؟

شرفو کا اعتماد راتوں رات ہمالیہ پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی سے بھی اونچا ہو گیا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ وہ چوٹی پر کھڑا ہے اور کامیابی کے سب ستارے اس کی دسترس میں ہیں۔ وہ جسے چاہے توڑ کے اپنی کامیابی کے تاج میں لگا لے۔

تقدیر کا کھیل شروع ہو چکا تھا اور گاموں کے غلام محمد بن جانے کے بعد بھی جاری رہا۔ ملک صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ایک دن کچھ لوگ اسے گاڑی میں بٹھا کے لے گئے اور ہر روز لے جاتے رہے۔ پندرہ دن بعد خود اس کو یقین کرنا مشکل ہوا جب وہ اس گاڑی میں لاہور کے مال روڈ سے گزرا، بڑے ڈاک خانے سے مڑ کے لکشمی چوک تک گیا اور ایبٹ روڈ کی طرف سے پھر مال کے چیئرنگ کراس پہنچا، اس کا کسی جگہ نہ چالان ہوا نہ اس نے کسی گاڑی کو چھوا۔ ڈر جو اس کے دل میں پہلے دن سے تھا نہ جانے کیسے غائب ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ملک صاحب کی گاڑی چلانے لگا۔ ان کو اور بیگم صاحبہ کو بازار اور اسپتال لے جانے لگا۔ اس کا کھانا پینا وہی تھا جو ملک صاحب کا تھا۔

شرفو نے میٹرک کیا تو ملک صاحب نے اسے کالج میں داخل کرا دیا۔ ملک صاحب کی بیوی کی حالت ہر قسم کے علاج معالجے کے باوجود روز بروز خراب ہو رہی تھی۔ اچانک اسے راجو کی ماں سے زیادہ اس کے بیاہ کی فکر لاحق ہو گئی جو اب سترہ سال میں بیس کی لگتی تھی اور پرائیویٹ دسویں جماعت کے امتحان پاس کر چکی تھی۔ وہ کالج جانا چاہتی تھی لیکن خلافِ امید باپ کے علاوہ بھائی اور خود ملک صاحب نے اس کی اجازت نہیں دی۔ پھر غیب سے اکبری منڈی کے ایک آڑھتی کے بیٹے کا رشتہ آیا جس نے مزنگ کی طرف بجلی کے سامان کی کوئی دکان کھولی تھی۔ رضیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ سب کو اسے رخصت کرنے کی کیا افراتفری تھی۔ رشتہ آنے کے ایک ماہ بعد وہ اندرون بھاٹی گیٹ دوسری منزل پر اپنے گھر میں بیٹھی تھی۔ اس پرانے آبائی مکان کے نچلے حصے میں اس کے ساس سسر تھے اور دوسری منزل دو بیٹوں کے قبضے میں تھی جن میں سے بڑے کی شادی دو سال پہلے ہو چکی تھی۔

رضیہ کی رخصتی کے ٹھیک ایک ماہ بعد ملک صاحب کی بیوی نے دنیا کو خیر باد کہا۔ اس موقع پر بھی ان کے کسی بیٹے نے آنا تو دور کی بات ہے فون پر باپ سے بات نہیں کی۔ ان کو اس حادثے کی خبر ہوتی تو شاید وہ ٹیلی فون پر باپ سے تعزیت کر لیتے۔ اسی سال جب شریف عرف شرفو نے بی اے پاس کیا تو ملک صاحب نے اپنی زندگی کی آخری ذمے داری پوری کی۔ اب اکیلے رہ جانے کے بعد ایسا لگتا تھا کہ ان کا بھی دنیا سے دل اٹھ گیا ہے۔ وہ کہیں آتے جاتے نہیں تھے اور پتا نہیں کمرے میں بند پڑے کیا سوچتے رہتے تھے۔ پھر ایک دن صبح کے وقت وہ کمرے میں بے ہوش ملے۔ ان کو فوری طور پر خود غلام محمد اسپتال لے گیا۔ ملک صاحب پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ دو ہفتے بعد وہ گھر آئے تو انہوں نے غلام محمد اور محمد شریف دونوں کو سامنے بٹھا کے کہا کہ یہ دل کا روگ ناقابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ اس سے پہلے کہ کسی روز اچانک دل رک جائے وہ زندگی کے باقی معاملات نمٹانا چاہتے ہیں۔

''اس مکان کا وارث تو کوئی ہے نہیں اور نہ آئے گا کبھی۔ میرے بعد قانونی مسئلہ بن جائے گا تمہارے لیے، اس لیے یہ بتاؤ کہ اس مکان کو کس کے نام کروں؟ غلام محمد کے یا محمد شریف کے؟''

مسٹر غلام محمد کیا جواب دیتے جو اُلوؤں کی طرح ایسے آنکھیں جھپکا رہے تھے جیسے مالک صاحب نے ان سے مسئلہ فیثا غورث پوچھ لیا ہو۔ شریف نے کہا۔ ''ملک صاحب، ایسی باتیں نہ کریں۔ خدا آپ کا سایہ سلامت رکھے۔''

ملک صاحب مسکرائے۔ ''بھئی وہ تو رکھے گا جب تک وقت ہے۔ اس کے بعد تمہارے لیے مسئلے کھڑے ہوں گے۔ کوئی بھی سوال کرے کہ تم کون ہو، کیوں مکان پر قبضہ کیے بیٹھے ہو تو کیا جواب دو گے۔ بڑی مشکل میں پڑ جاؤ

گے۔ آدمی کو کام وقت پر کر لینا چاہیے، میرا خیال ہے محمد شریف، تم یہ مکان مجھ سے خرید لو۔"

شریف نے بوکھلا کے ان کی طرف دیکھا اور اس کے والد صاحب کو یقین آ گیا کہ دل کے بعد ملک صاحب کا دماغ بھی گیا۔

"میرے پاس تو جو ہے آپ کا دیا ہوا ہے سر، میری یہ اوقات کہاں؟"

"اچھا اب میری بات سنو، یہ مکان میں تمہارے نام کروں، ہبہ کروں، یعنی تحفے میں دوں تو کل یہ ناممکن نہیں کہ اصل وارث آ جائیں۔ پتا تو انہیں چل ہی جائے گا کہ مالک مالکن تو گئے۔ مکان کی مالیت کا بھی اندازہ وہ کر لیں گے۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ وارث بن کے آ جائیں اور کورٹ میں کیس کر دیں کہ ابا کا تو دماغ چل گیا تھا ورنہ وہ ایسا نہ کرتے۔ تم خواہ مخواہ پھنس جاؤ، برا مت ماننا غلام محمد ہم سب کی زندگی کے دن لکھے ہوئے ہیں۔ کس کے کتنے ہیں یہ نہیں معلوم، مگر دیکھنے میں جیسے میرے پورے ہوئے تمہارے بھی پورے ہو رہے ہیں۔ مکان تم کو دوں تو ایک وارث یہاں بیٹھی ہے رضیہ بھی، تمہارے بعد یہ مکان دو کو ملے گا اور ظاہر ہے کیک کی طرح کاٹا نہیں جا سکتا۔ دو حصے شریف کے ہوں گے، ایک رضیہ کا۔ اسے قطعی ضرورت نہیں۔ بہت پیسے والا ہے اس کا میاں، مگر بھائی لالچ بری بلا ہے۔ لاکھوں کون چھوڑتا ہے اس لیے..."

وہ دم لینے رکے اور پھر بولے۔ "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک روپے میں یہ مکان شرفو کو بیچ دوں۔"

غلام محمد نے افسوس سے سر ہلایا۔ بڑھاپا، بیوی سے جدائی کا صدمہ، ملک صاحب پاگل ہو گئے۔

ملک صاحب ہنسے۔ "تم سمجھ رہے ہو کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔ نہیں، میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن جو میں کروں گا خود تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔"

چنانچہ وہ صرف تعمیل حکم کرتے رہے اور بطور خریدار محمد شریف نے وہ مکان ملک صاحب سے خرید لیا۔ شریف نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ اسٹامپ پیپرز میں قیمت کیا درج ہے۔ وہ ایک وکیل کے کہنے پر دستخط کرتا گیا اور ایک ماہ بعد اسے معلوم ہوا کہ قانونی طور پر اب وہ اس "کوٹھی" کا مالک ہے۔ ملک صاحب جہاندیدہ آدمی تھے اور پولیس کی نوکری میں انہوں نے جائداد کے جھگڑے بھی بہت دیکھے تھے۔ انہوں نے زندگی میں ہی یہ جھگڑا خوش اسلوبی سے نمٹا دیا۔ شاید کہیں اس کے پیچھے ایک لاشعوری خواہش ہو کہ خدا کی نظر میں یہ نیکی ان کے زندگی بھر کے گناہوں کا کفارہ بن جائے۔

وجہ کچھ بھی ہو۔ وہ دنیادار اور دوراندیش آدمی تھے۔ ایک دن ان پر دل کا دوسرا دورہ پڑا۔ وہ آئی سی یو میں تھے جب انہوں نے شریف کو طلب کیا اور اسے دستخط شدہ ایک چیک دیا۔ "بینک جا کے یہ رقم نکالو اور حفاظت سے گھر لے جا کے رکھو۔ اگر میں واپس نہ گیا..."

"کیسی بات کرتے ہیں آپ سر۔" شریف گھبرا کے بولا۔

"تو اس رقم کو اپنے حساب میں جمع کرا دینا... میری بات سن رہے ہو نا؟"

شریف کی نظروں میں چیک پر لکھے اعداد کے صفر ناچنے لگے۔ یہ لاکھوں کی رقم تھی۔

"دراصل کوئی اکاؤنٹ ہولڈر نہ رہے تو بینک اکاؤنٹ کو منجمد کر دیتا ہے۔ فریز کر دیتا ہے۔ یعنی جب تک عدالت کسی کو وارث قرار نہ دے اور ہر وارث کا حصہ مقرر نہ کرے رقم بینک میں پڑی رہتی ہے... یہ پیسا کسی کو بھی نہیں مل سکتا تھا... امریکا سے میرے بیٹے تو آنے سے رہے... یہ کم سے کم تمہارے کام تو آئے گا... اب جاؤ فوراً جو میں نے کہا ہے، وہ کرو۔"

اس رات ملک صاحب کی زندگی کو روشن برقی اعداد و شمار میں ظاہر کرنے والی ہر مشین آف کر دی گئی اور سانس یا دل کو رواں رکھنے والی ہر مشین ہٹا لی گئی اور ان کی زندگی بحال کرنے کی ہر کوشش ترک کرنے کے بعد ڈیڈ باڈی کولڈ اسٹوریج میں رکھ دی گئی۔

اس گھر کے دیوار و در کامل بے حسی سے گھر کے سابق مالک کا جنازہ جاتا دیکھتے رہے۔ جاتا تو وہ پہلے بھی تھا مگر اپنی کار میں لیکن واپس بھی آ جاتا تھا۔ اب اس کو واپس نہیں آنا تھا۔ وہ جو آج خود کو نیا مالک سمجھ سکتے ہیں ان دیواروں سے زیادہ زندگی نہیں رکھتے تھے اور خود سابق شرفو اور اس کے جگت باز بھانڈ باپ غلام محمد کی سمجھ میں آج کی دنیا بھی اسی طرح نہیں آتی تھی جیسے گزرے ہوئے کل کی دنیا۔ ایک کل میں عزت نہ ہونا بدبختی تھی۔ اب عزت دار بن جانا انہیں بدبختی لگتا تھا۔ وہ تب بھی روئے تھے اب بھی رو رہے تھے۔

چہلم تک ہر شام غلام محمد ہر روز تازہ پھول اور اگربتیاں لے کر ملک صاحب کی قبر پر جاتا رہا۔ اس نے شرفو سے کہہ کے قبر کو سنگ مرمر سے بنوایا اور اس کے گرد سنگ مرمر کی جالی کا احاطہ بنوایا اور ملک صاحب کے سرہانے کی

طرف شاندار کتبہ لکھوایا جس پر بہت کچھ لکھا گیا تھا پھر وہ ہر جمعرات کو جانے لگا۔ سوم، چہلم کی تقریبات کے بعد برسی کو ایک سال بعد آنا تھا۔ بی اے پاس شرفو اکیلا کمرے میں بند سوچتا رہتا تھا کہ اب وہ کیا کرے؟ ملک صاحب نے تو اس کے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں چھوڑا تھا۔ وہ جو دسویں، بارھویں اور چودھویں کے بعد دولت مند بننے کے خوابوں کا ذکر کرتا تھا تو لوگ اس پر ہنستے تھے اور وہ لوگوں کے ہنسنے سے اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے ارادوں کو مزید مستحکم دیکھتا تھا۔ یکلخت بے کار ہو گیا تھا۔ تقدیر نے ایک ہی دفعہ میں سارے خوابوں کی تعبیر اس کی جھولی میں ڈال دی تھی۔

وقت ہمیشہ کی طرح اپنی رفتار سے آگے بڑھتے ہوئے تمام معاملات سے لاتعلق رہا۔ وہ باری باری گاموکی بیوی اور پھر گاموکو بھی لے جانے لگا لیکن گاموتو اب غلام محمد ہے۔

صرف چھ ماہ بعد جب وہ ایک معزز شہری بن چکا تھا، وہ لٹھے کی کلف لگی شلوار کے ساتھ دو گھوڑ بوسکی کا کرتہ اور سر پر کلف سے سیدھے کھڑے طرّے والی دستار کے ساتھ کالی واسکٹ اور ملتانی کھسے پہن کر شیشے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا اور پھر بیوی سے پوچھتا تھا۔ ''نیک بخت، اپنے ایمان سے بتا... نمبردار اور اس... چوہدری کی کیا اوقات ہے میرے آگے۔''

اور بیمار بیوی شرفو کے سامنے تشویش سے کہتی تھی۔ ''تیرا ابا پاگل ہو گیا ہے شرفو۔''

اچانک ایک دن سابق گامو جگت باز نے شرفو سے کہا۔ ''پتر... میں پنڈ جانا اے۔''

شریف نے کہا۔ ''کون سے پنڈ ابا؟''

وہ چلّانے لگا۔ ''کھوتے دا پتر... اسی پنڈ جہاں تو نے بھی چوہدری سے جوتے کھائے تھے اور میں نے بھی... گاڑی نکال۔''

اسے سمجھانا ناممکن تھا کہ وہ گزر جانے والے وقت سے درگزر کرے۔ اور ایک دن ایسا ہوا کہ محمد شریف نے اور اس کی ماں نے بھی محسوس کیا کہ اس بے عزتی کو بے بسی سے معاف کیوں کیا جائے۔ حساب برابر کیوں نہ کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ بھی اپنے بہترین شہری لباس میں غلام محمد کے ساتھ گئے اور شرفو نے چوہدری کی حویلی کے باہر ہارن دیا تو دروازہ کھولنے والے نے انہیں سیلیوٹ کے انداز میں ہاتھ سر تک اٹھا کے سلام کیا اور جب گاڑی نئی تعمیر شدہ حویلی کے برآمدے کے سامنے رکی تو اندر سے خود چوہدری ان معزز مہمانوں کو لینے باہر آیا۔

اور ان کو ڈرائنگ روم میں عزت سے بٹھا کے چوہدری نے پوچھا۔ ''جناب کی تعریف۔'' خاطر تواضع کے لیے ٹھنڈے گرم کا پوچھنے یا حکم دینے کی اسے ضرورت نہ تھی۔ ملازم جانتے تھے کہ ایسے معزز مہمانوں کے سامنے کیا رکھا جاتا ہے۔

''تعریف کو چھوڑ چوہدری... جامو کہاں ہے، یہ بتا؟'' گامو نے پوچھا۔

چوہدری کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ ''جامو؟ کون جامو؟''

''گاموکا جگت باز بھائی... گامو تو یاد ہے نا؟''

اس وقت محمد شریف نے ضروری سمجھا کہ چوہدری کو چار سو چالیس وولٹ کا ایک جھٹکا اور دیا جائے۔ ''میں گاموکا بیٹا شرفو ہوں۔ ڈی ایس پی کرائمز برانچ محمد شریف۔''

چوہدری کا کوکا کولا کی طرح ابلنے والے غصے کا جھاگ پل بھر میں بیٹھ گیا۔ وہ نو واردوں کی صورتوں میں پرانے گامو اور شرفو کو پہچان چکا تھا جنہوں نے اس کی بیٹی نوراں کا تمسخر اڑانے کے جرم میں اس کے سامنے ننگا لیٹ کر جوتے کھائے تھے اور پھر راتوں رات بھاگ گئے تھے۔ گاموکا بھائی مرتے دم تک یہی کہتا رہا کہ ''مجھے نہیں معلوم'' اور تھانے والوں نے ہی اسے کہیں دفنا دیا تھا۔

''میں نے پوچھا تھا جامو کہاں ہے؟''

''مجھے کیا معلوم؟'' چوہدری نے اپنی خودی کو بلند کرتے ہوئے درشتی سے کہا۔

''اچھا، پھر ہم چلتے ہیں۔'' محمد شریف کھڑا ہو گیا۔ ''چلو ابا، چوہدری صاحب ایسے نہیں بتائیں گے۔ ان کو سرکاری مہمان بنا کے پوچھیں گے۔'' مگر یہ دھمکی محض تذلیل کے لیے تھی۔

چوہدری اندر سے کسی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا مگر مصلحت آڑے آ گئی۔ وہ ان کل کے کمینوں کو گالیاں دے کر نکالتا تو کچھ پتا نہیں کل صورت حال بد سے بدتر ہو جاتی۔ وہ ان کے پیچھے آیا۔ ''آپ میری بات تو سنو جناب، مجھے واقعی علم نہیں لیکن میں معلوم کر کے بتاؤں گا۔ آپ کے بعد وہ بھی چلا گیا تھا۔ آپ کا ایسے جانا مناسب نہیں۔ کچھ کھائے پیے بغیر...''

گاڑی گھوم کے دروازے کی طرف بڑھی اور غائب ہو گئی۔

واپس شہر کی طرف جاتے ہوئے غلام محمد ہنسنے لگا۔ اس کی گھر والی نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ اور زیادہ ہنسا۔ اتنا ہنسا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''تو نے دیکھا نہیں کیا ہوا؟ کیسا جوتا مارا ہے میں نے چوہدری کے منہ پر۔۔۔ سو سنار کی ایک لوہار کی۔ ہماری تو نسلیں گزر گئی تھیں ان چوہدریوں کے جوتے کھاتے۔۔۔ مگر ان کے منہ پر آج تک کسی نے ایک جوتی مارنے کا سوچا بھی تھا؟ کیسی شکل ہوگئی تھی اس کی۔'' وہ پھر ہنسنے لگا۔

گاڑی چلاتے ہوئے محمد شریف مسکراتا رہا۔

☆☆☆

ہوش میں آنے کے بعد ناصر کا پہلا خیال یہ تھا کہ وہ مر چکا ہے اور یہ کنکر پتھر اور مٹی کی قبر ہے جس میں سردی کے ساتھ رات کا اندھیرا شامل ہو کے اسے کاٹ رہا ہے لیکن دوسرے لمحے زندگی کا احساس لوٹ آیا۔ وہ زندہ نہ ہوتا تو یہ سب کیسے دیکھ سکتا تھا جو اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔

گھپ اندھیرے میں اس کے گرد ویرانی تھی مگر سنسان پہاڑی نشیب پر وہ دیکھ سکتا تھا کہ ٹرین کے ڈبے آڑے ترچھے اور الٹے پڑے ہیں اور اس کے کان وہ آہ و بکا اور چیخ پکار بھی سن سکتے تھے جو زخمی، موت کے بے رحم جبڑوں میں تڑپنے والے، مر جانے والوں کے لواحقین، روتے پیٹتے، اللہ سے رحم اور مدد کی فریاد کرتے لوگ نکال رہے تھے۔

راولپنڈی سے لاہور جانے والی نان اسٹاپ ٹرین جہلم سے پہلے سطح مرتفع پوٹھوہار کی کسی پہاڑی کے گرد گھوم کے آنے والی ریلوے لائن پر سے پھسل کر نیچے پتھریلی گہرائیوں میں اتر گئی تھی جہاں کٹاؤ سے نمودار ہونے والی سیکڑوں اونچی نیچی کھائیوں اور خشک کانٹے دار جھاڑیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ساری بوگیاں انجن سے اور آپس میں ایسے منسلک تھیں کہ جب انجن نے سیدھ پٹری چھوڑ کے گہرائی کا رخ کیا تو زنجیر کی کڑیوں کی طرح پیچھے پیچھے دوڑنے والی بوگیاں بھی نشیب میں اتر گئیں۔ چند سیکنڈ میں الگ ہو کے یہ بوگیاں زمین پر گریں اور کچھ وہیں ساکت ہو گئیں تو کچھ لڑھکتی ہوئی مزید گہرائی میں جا کے ٹھہریں۔

ان بوگیوں کے اندر مسافروں کو بمشکل تمام کلمہ پڑھنے کی مہلت ملی۔ اس وقت وہ نیم خوابیدہ تھے یا آنکھیں بند کیے کسی خیال میں غرق تھے یا باہر کی تاریکی کو کچھ نظر نہ آنے کے بعد گھور رہے تھے اور اونگھتے بچوں یا نیند میں بے سدھ ہو کے ان پر گرتی بیوی کو سنبھال رہے تھے۔ ان کے وہم و گمان کی آخری سرحد تک کہیں موت کا خیال نہ تھا جس نے اچانک انہیں آلیا تھا اور وہ چند سیکنڈ میں ایسے لڑھکتے رہے تھے جیسے وہ ٹرین کے مسافر نہیں کنکریٹ مکسر کے ڈرم میں اپنے سامان سمیت گھمائے جانے والا اکیچر ہیں۔

ناصر نے اپنی کلائی میں لپٹی فولادی ہتھکڑی کو دیکھا جو اب بھی الٹے پڑے سنتری کی پیٹی سے جڑی ہوئی تھی۔ ہاتھ پیر ہلا کے اس نے یقین حاصل کیا کہ اس کی ہڈیاں اور جوڑ سلامت ہیں اور جسم کے کسی حصے سے خون بھی خارج نہیں ہو رہا ہے۔ وہ ستر سالہ بوڑھا تو اس وقت آرام سے گرم بیڈ کی حرارت میں لپٹا سو رہا ہوگا جس نے اتنا قیمتی اونی سویٹر اسے یوں دے دیا تھا جیسے کوئی پیٹ بھرا کسی بھوکے کو ایک روٹی دے دے۔ اسے کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ شاید اس کے دیے ہوئے سویٹر نے ہی ایک قانون کے مجرم کو اس ناگہانی موت سے بچالیا تھا جس کا شکار قانون کے رکھوالے ہوئے تھے۔ یہ سب حیلے حوالے ہیں۔ ساری کہانی تو یہ ہے کہ جس کی آگئی تھی وہ گیا اور جن کو ٹوٹا پھوٹا معذور یا زمین کا بوجھ بن کے زندہ رہنا تھا، وہ سسک رہے تھے۔

ناصر نے ہمت کر کے کانسٹیبل کو سیدھا کیا۔ وہ مر چکا تھا۔ اس کی گردن یوں ٹوٹ گئی تھی جیسے پھانسی پانے والے کی ٹوٹتی ہے اور اس کا سر مضحکہ خیز طریقے سے لڑھکنے لگا تھا۔ دہشت کی سنسنی ناصر کے وجود میں اتر گئی جس میں آدھی رات کے بعد کی سردی ہر طرف سے کانٹے چبھو رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کو منہ کے پھونک ماری اور کانسٹیبل کی جیکٹ کی تلاشی لینے لگا۔ ہتھکڑی کی چابی اسے اوپر والی جیب میں سے ملی۔ دور دور بکھرے لوگ اپنی اپنی جگہ جو کر سکتے تھے، کر رہے تھے۔ اس کے قریب بھی بہت سے چیخ پکار کرنے والے موجود تھے لیکن کوئی کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ ناصر نے ایک ہاتھ سے ہتھکڑی میں چابی لگا کے گھمائی، تھوڑی سی کوشش کے بعد ہتھکڑی کے جوڑ کھل گئے اور اس کے دونوں ہاتھ آزاد ہو گئے۔ اس نے چابی کو پھینک دیا اور کھڑا ہو گیا۔

اب اس کا دماغ کام کر رہا تھا تو وہ اپنی شناخت بھی بدلنا چاہتا تھا۔ جیکٹ تو ضروری تھی مگر ابھی دیکھنے والا کوئی نہ تھا تو اس نے جوتے کپڑے تبدیل کرنے کا سوچا۔ کبھی اس کی تلاش ہوئی تو یہ بتایا جائے گا کہ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یہ بھی تو ہوسکتا تھا کہ اسے مردہ قرار دے دیا جائے۔ پولیس کب چاہتی ہے کہ مجرموں کی فائل کھلی رہے اور تفتیش چلے۔ ناصر نے ایک بے حس پڑے شخص کی کلائی پر سے گھڑی اتار کے وقت دیکھا۔ رات کے ساڑھے تین

بجے تھے۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے ٹھوکریں کھاتا چلتا گیا۔

انتہائی خود غرضانہ بے حسی اس وقت اس کی ضرورت تھی۔ اس وقت وہ رحم دلی کے جذبات سے مغلوب ہو کے مصیبت زدوں کی مدد کے لیے نہیں رک سکتا تھا۔ پہلی ترجیح اس کی اپنی زندگی اور سلامتی تھی۔

اس کے سامنے ٹوٹ کر دو حصوں میں بٹ جانے والا ٹین کا صندوق آگیا۔ اس میں سے کپڑے نکل کے باہر بکھر گئے تھے۔ اس نے لپک کر چند کپڑوں کو اٹھایا۔ اندھیرے کے باوجود اس کی آنکھوں نے اپنے سائز کے شلوار قمیص کو منتخب کر لیا یہ ملیشیا کا کم قیمت شلوار قمیص تھا۔ مگر موٹا کپڑا سردی میں اچھا تھا۔ کچھ سوچ کے اس نے اپنے کپڑے بدلنے کا خیال ترک کر دیا اور ملیشیا کا سوٹ اس کے اوپر ہی چڑھا لیا۔

اب فرار ہونے کا ارادہ راسخ ہو چکا تھا تو اسے پیسوں کا خیال آیا۔ وہ ایک ابھری ہوئی چٹان کے پیچھے بیٹھ گیا اور حوالدار کا بٹوا کھول کے رقم دیکھنے لگا۔ فضول کے کاغذات زیادہ تھے لیکن نوٹوں سے انگلیاں مس ہوئیں۔ اس نے تمام نوٹ جیکٹ کی جیب میں شفٹ کیے۔ وہ بٹوے کو اچھالنے ہی والا تھا کہ کچھ سوچ کے رک گیا۔ خود اس کا شناختی کارڈ اور دوسرے کاغذات بھی تو اس میں ہو سکتے تھے۔

وہ دو قدم ہی چلا تھا کہ اسے ٹھوکر لگی۔ اس کی راہ میں ایک بریف کیس آگیا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا جو بوگیاں اوپر سے گری تھیں، مختلف سمتوں میں لڑھکتی گئی تھیں۔ کچھ درمیان میں رک گئی تھیں تو کچھ پہاڑیوں کی انتہائی گہرائی میں پڑی تھیں۔ لوگ سیاہ متحرک نقطوں کی طرح بدحواس اور چیختے چلاتے نظر آتے تھے۔ شاید وہ پہلے ہی جھٹکے میں باہر آ گرا ہوگا۔ بوگی مزید گہرائی میں چلی گئی تھی، نیچے جھک کے اس نے بریف کیس اٹھالیا۔ ذرا سی دیر کے لیے اس کے ضمیر نے فریاد کی لیکن زندگی کے تجربات نے اس کے لیے ان آوازوں کو نامانوس کر دیا تھا جو حق کا بول بالا ہونے کی وکالت کرتی تھیں۔ اس نے نیچے بیٹھ کر بریف کیس کو کھولنا چاہا مگر اس کے لاک نمبر والے تھے۔

وہیں رک کے اس نے سڑک کی سمت کا اندازہ کیا جو عموماً ریلوے لائن سے زیادہ دور نہیں ہوتی تھی۔ چڑھائی زیادہ نہیں تھی۔ اتنا گھپ اندھیرا نہ ہوتا تو آدھے پونے گھنٹے میں وہ اوپر پہنچ سکتا تھا لیکن اس وقت بھی احتیاط سے چل کے زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کی مسافت تھی۔ وہ نروس تھا چنانچہ اپنے سامنے کسی کو متحرک دیکھ کے چونکا۔ اس کا پہلا خیال یہ تھا کہ شاید یہ گیدڑ کی نسل کا کوئی جانور ہوگا جسے خون کی بو اِدھر کھینچ لائی ہے لیکن وہ کوئی عورت تھی جو گھٹنوں کے بل جھکی اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھی اور کراہنے کے انداز میں کچھ بول رہی تھی۔

دبے پاؤں مزید قریب جانے پر اس کے کانوں نے انگریزی کے بے ربط الفاظ سنے۔ ”اوگاڈ... اب میرا کیا ہوگا... اوہ اتنی سردی ہے اور اندھیرا، میرا بیگ گرا ہوگا تو کہاں؟“

”کیا تھا اس بیگ میں، میک اپ کا سامان۔“

”کیا فضول بات ہے۔ اس میں نقد رقم تھی، پاسپورٹ تھا۔ ضروری کاغذات تھے۔“ وہ خوف کے ہسٹریا میں مبتلا تھی۔

”کیا بیگ یہیں گرا تھا۔ کہیں آس پاس؟“

”یہ... یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ میں کیسے دیکھ سکتی تھی۔ میں اُڑتی ہوئی باہر آگئی تھی۔ میں دروازے کے پاس کھڑی تھی۔“

”آدھی رات کے وقت دروازے کے پاس...؟“

”وہ... دراصل... مجھے واش روم جانا تھا۔ اندر کوئی تھا۔ میں منتظر تھی کہ وہ نکلے۔“

”دیکھو، اس وقت تو بیگ کا ملنا مشکل بلکہ ناممکن ہے مگر گھبراؤ نہیں...“

”کیسے نہ گھبراؤں۔“ اس نے ناصر کی بات کاٹ دی۔ ”میں کیا کروں گی، واپس لندن کیسے جاؤں گی؟“

”میرا مطلب تھا صبح اجالا ہونے تک انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔ اس کے بعد بھی امید کم ہے جو لوگ مدد کے لیے آئیں گے وہ لوٹ مار شروع کر دیں گے۔ بیگ کسی کو نظر آیا تو لے کے بھاگ جائے گا۔“

وہ بیٹھ گئی۔ ”اوگاڈ، یہ بھی ہوتا ہے یہاں...“

وہ اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ ”میں نے سنا ہے لیکن ایسا سب نہیں بہت کم لوگ کرتے ہیں۔ تم اکیلی کیوں آئی ہو لندن سے؟“

وہ جھلا کے بولی۔ ”اور کیا کرتی، کس کو ساتھ لاتی؟“

ناصر کے دماغ کو جھٹکا لگا۔ ”تم اردو بول سکتی ہو۔ انڈین ہو یا پاکستانی؟“

”میں سو فیصد پاکستانی ہوں۔ میرا نام ہما ہے۔ ڈاکٹر ہما... اور تم؟“

"میں ناصر ہوں۔ یہاں تم کس کے پاس آئی تھیں؟" ناصر نے بریف کیس کو قریب کرلیا۔

"میں جس سے ملنے اسلام آباد گئی تھی، وہ مجھے نہیں ملا۔ وہ لاہور گیا ہوا تھا۔"

"نو پرابلم، میں آپ کو پہنچادوں گا۔" ناصر نے ایک ہاتھ بریف کیس پر رکھا۔

"تم کیسے پہنچادو گے۔ میرے پاس اس کا ایڈریس، فون نمبر کچھ نہیں ہے۔ سب نوٹ بک میں تھا جو بیگ میں تھی۔"

ناصر نے سوچ کے کہا۔ "پھر تمہیں اسلام آباد واپس جانا چاہیے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہو۔ مجھے اسلام آباد کا پتا بھی معلوم نہیں۔ نوٹ بک میں تھا۔"

"لیکن ابھی تم نے کہا کہ تم اس کے گھر گئی تھیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "اوکے، میں اس کو بتائے بغیر لندن سے اسلام آباد پہنچ گئی تھی۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتی تھی۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو پتا بتایا تو اس نے مجھے اسلام آباد میں گھر کے دروازے پر اتار دیا۔ ڈرائیور شریف آدمی تھا کہ کھڑا رہا۔ بار بار کال بیل بجانے پر کوئی نہیں نکلا تو میں نے اوپر والے فلور کا بٹن دبایا۔ کسی نے ٹیرس میں آکے کہا کہ نیچے والے شریف صاحب شاید لاہور گئے ہیں۔ میں نے ٹیکسی والے سے کہا کہ پانچ منٹ ٹھہرے اور اوپر جاکے فون کیا۔ شریف نے کہا کہ میں تو لاہور میں ہوں۔ اس نے جو ایڈریس بتایا وہ بھی میں نے نوٹ بک میں لکھ لیا۔ ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا تو اس نے کہا کہ مجھے ایک ٹرین مل سکتی ہے۔"

"لاہور میں اسے فون کس نمبر پر کیا تھا؟"

"پھر وہی فضول سوال... مجھے زبانی کچھ یاد نہیں۔ سب نوٹ بک میں لکھا ہوا تھا۔ اب پتا نہیں نوٹ بک ملے گی یا نہیں۔"

ناصر نے کچھ دیر بعد کہا۔ "آپ کے یہ شریف صاحب کرتے کیا ہیں؟"

"اس کا بزنس ہے۔ کراچی اور لاہور میں بھی..." وہ بولی۔

"ڈاکٹر صاحبہ، تم نے واقعی سخت بےوقوفی کی۔ ایسے کوئی بیرونِ ملک سے اکیلی لڑکی پاکستان آتی ہے۔ تمہارے رشتے دار ہیں کسی شہر میں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہوں گے، مجھے نہیں معلوم۔ میں تین سال کی تھی جب آخری بار آئی تھی۔ میں کسی کو نہیں جانتی۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ "ویسے یہ ہے تمہارا ذاتی معاملہ مگر شریف سے تمہارا کیا تعلق ہے، کاروباری؟"

"نہیں، ہم اچھے دوست ہیں۔" وہ کچھ سنبھل کے بولی۔

"کتنے اچھے، کچھ اندازہ تو مجھے ہو رہا ہے کہ ایک اچھا دوست لاہور میں مزے سے بیٹھا ہے اور اسے دوسرے اچھے دوست کا پتا ہی نہیں کہ وہ پاکستان میں ہے اور کس حال میں ہے۔"

وہ بولی۔ "اب تو چھ مہینے ہو گئے ہماری دوستی کو۔"

ناصر نے مشکوک ہو کے پوچھا۔ "یہ دوستی تھی... یا محبت..."

"میں بتانے میں کوئی حرج بھی نہیں سمجھتی۔ ہم بہت محبت کرتے ہیں ایک دوسرے سے۔"

"اور شادی کرنے کا فیصلہ بھی کرلیا ہے۔" وہ تلخی سے بولا۔ "کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا۔"

"لگتا ہے تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔"

"معاف کرنا ڈاکٹر ہما، بےوقوف وہ نہیں' تم ہو، انتہائی بےوقوف۔" ناصر نے کہا۔

"شٹ اپ۔" وہ مشتعل ہوگئی۔ "تم کون ہوتے ہو میرے ذاتی معاملات میں اپنی رائے دینے والے۔ مجھے بےوقوف کہنے والے؟"

"آف کورس تم بےوقوف ہو اور اسی لیے خوار ہو رہی ہو یہاں... وہ ایسا ہی محبت کرنے والا ہوتا تو سر کے بل لندن آتا اور گھٹنوں کے بل جھک کر تم سے شادی کی درخواست کرتا... مگر وہ مزے سے کہیں گرم بستر میں سو رہا ہے..." وہ کہتے کہتے رک گیا کہ... کسی کے ساتھ۔

"چلو میں اپنی غلطی مان لیتی ہوں۔"

"تم نے خود کو بےوقعت کیا ڈاکٹر ہما، لیکن میں مزید خوار نہیں ہوسکتا۔" وہ بریف کیس اٹھا کے کھڑا ہوگیا۔

بڑی اضطراری اور بےتکلفی سے ہما نے ناصر کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "او کے، آئی ایم سوری... لیکن دیکھو، میں واقعی مصیبت میں ہوں اور یہاں میری مدد کرنے والا کوئی نہیں... تم شریف آدمی لگتے ہو مجھے... اگر صبح تک رک سکتے ہو تو رک جاؤ، پلیز..."

"نہیں ڈاکٹر ہما، صبح کا اجالا ہونے سے پہلے مجھے جانا ہوگا۔ میں تمہاری مدد کرنے کے لیے نہیں رک سکتا۔" اس

نے ہاتھ چھڑا لیا۔

وہ ہسٹریائی طریقے سے چلائی۔ ''تم اس طرح مجھے چھوڑ کے کیسے جا سکتے ہو؟''

''کوئی نہ کوئی تمہاری مدد کرنے والا آ جائے گا۔ یہ ایک حادثاتی ملاقات تھی۔ اس سے میرے تمہارے درمیان کوئی استحقاق کا رشتہ قائم نہیں ہوا۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''ناصر، میں درخواست کرتی ہوں، پلیز ہیلپ می۔''

وہ رو پڑی۔

ناصر رک گیا۔ ''اگر تم چاہو تو میں تمہیں لاہور لے جا سکتا ہوں لیکن ابھی چلو میرے ساتھ... میں صبح کا انتظار نہیں کر سکتا۔''

''ایسا کیا ضروری کام ہے؟''

وہ ترشی سے بولا۔ ''تمہیں یہ بتانا ضروری نہیں... لیکن ایک بات سمجھ لو میری... تم کو اپنا بیگ اب نہیں ملے گا۔ صبح تک ہر طرف سے لوگ آ جائیں گے۔ گاؤں دیہات کے۔ پولیس یا ریلوے کے مددگار، ان میں ایسے بے ضمیر بھی ہوں گے جو اس قسم کے حادثات میں بھی لوٹ مار کرتے ہیں۔ لاشیں اٹھانے والے عورتوں کے زیورات اتار لیتے ہیں۔ سامان لے جاتے ہیں۔''

''او مائی گاڈ، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟'' وہ دہشت زدہ ہو گئی۔

''ایسا ہو چکا ہے پہلے... مجھے یقین ہے کہ تمہارا بیگ جسے ملے گا، اٹھا کے بھاگ جائے گا۔ معلوم نہیں وہ کہاں پڑا ہو گا۔''

''شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔'' وہ بے بسی سے بولی۔ ''آخر میں کیا کروں؟''

وہ پھر بیٹھ گیا۔ ''ڈاکٹر ہما، میری مجبوری یہ ہے کہ صبح کا اجالا ہونے سے پہلے نکل جاؤں۔ مجھ پر بھروسا کرتی ہو تو ابھی چلو میرے ساتھ۔ لاہور میں تم کو مسٹر شریف کے حوالے کر کے میں چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد تم شادی کر کے یہاں رہو یا اسے اپنے ساتھ لے جاؤ، یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن ہر صورت میں تم کو برطانوی سفارت خانے جانا پڑے گا۔ میں تم کو سوچنے کے لیے پانچ منٹ دیتا ہوں۔''

اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ناصر کے ہاتھ پر رکھا۔ اندھیرے میں اس کے اجلے دانتوں کی چمک سے ناصر نے اندازہ کیا کہ شاید وہ مسکرائی ہے۔ ''میں نے سوچ لیا ہے۔ میں ابھی تمہارے ساتھ چل رہی ہوں۔''

ناصر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تم نے صحیح فیصلہ کیا۔ آؤ میرے ساتھ، میرا ہاتھ پکڑ لو۔''

وہ آہستہ آہستہ ساتھ چلتے ہوئے ایک روشنی کی جانب بڑھنے لگے جو ادھر انتہائی بلندی پر تھی۔ یہ سرچ لائٹ تھی جس کا رخ نیچے کی طرف تھا۔ ڈاکٹر ہما اس کے کندھے تک آتی تھی یعنی پانچ فٹ سات انچ تھی۔ اس کے نرم ہاتھ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ درمیانے وزن کی تھی۔ لندن سے آئی تھی تو گوری ہی ہو گی، ناصر نے سوچا یا سانولی کالی ہوتی تو چہرہ بھی نظر نہ آتا۔ کبھی اس کا پیر کسی پتھر سے ٹھوکر کھاتا تھا یا لڑکھڑاتا تھا تو ناصر اسے سنبھال لیتا تھا۔ وہ خود بھی ہانپ رہا تھا مگر اسے ہما کو کھینچ کر اوپر لے جانا اچھا لگ رہا تھا۔ ایک بار وہ دونوں گرے وہ ہما کے اوپر رہا اور سہارا دینے کے لیے کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے اٹھایا۔ ''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' ناصر نے اسے کھڑا کر کے پوچھا۔

''نہیں، آئی ایم فائن... معمولی خراشوں کی کوئی بات نہیں۔'' وہ پھر اوپر کی طرف چلنے لگے۔ کانٹے دار جھاڑیوں سے بچتے ہوئے۔ یہ کنکر پتھر والی بھربھری مٹی تھی جس پر پیر پھسلتے تھے۔ ایک جگہ وہ تھک کے بیٹھ گئی۔ ناصر کچھ فاصلے پر سیدھا لیٹ گیا کیونکہ یہ جگہ نسبتاً صاف اور ہموار تھی۔

کچھ دیر ستانے کے بعد وہ پھر ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ ''مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔''

''کیوں؟ اور یہ چند گھنٹوں کا ساتھ ہے۔ دوپہر سے پہلے میں تمہیں تمہارے محبوب کے سپرد کر کے اجازت لوں گا اور ہم کبھی دوبارہ نہیں ملیں گے۔ لیکن جانے سے پہلے میں اس اُلو کے پٹھے عاشق کی دم کو کھری کھری سناؤں گا۔''

''نہیں، تم ایسا نہیں کرو گے۔'' ہما نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے نرمی سے حکم دیا۔ ''اور ایسا بھی نہیں ہو گا کہ میں تمہیں بھول جاؤں... تم کسی فرشتے کی طرح نمودار ہوئے اور میری مدد کی... میں تمہیں اپنا فون نمبر دوں گی۔ پاکستان میں میرے واحد دوست تم ہو۔''

اب رات کی سیاہی کم ہو رہی تھی اور دھند لکے میں وہ ڈاکٹر ہما کے چہرے کے نقوش واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ بھرے بھرے بدن والی قبول صورت بلکہ حسین عورت تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے اور کندھوں تک تھے۔ کچھ دیر بعد ناصر کو اندازہ ہوا کہ اس کی ناک چھوٹی مگر آنکھیں تیکھی لمبی... بالکل ریکھا جیسی تھیں۔ جن کا رنگ کچھ دیر بعد پتا چلا کہ براؤن ہیں۔ اس وقت وہ ریلوے لائن پر تھے اور

سورج ان کے پیچھے سنہرے تھال کی طرح اٹھا تھا۔ سڑک کچھ فاصلے پر گہرائی میں نظر آ رہی تھی۔ ہما کا پاؤں ایک جگہ پھسلا تو ناصر نے اسے پکڑ لیا۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اترنے لگے۔

یہ کسی قصبے کے مضافات تھے۔ بس میں سوار ہونے سے پہلے وہ ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ یہ ڈرائیور ہوٹل تھا۔ ایک پندرہ سولہ سال کے لڑکے نے ان کے سامنے دودھ پتی سے چھلکتے کپ رکھ دیے اور ایک چنگیر میں گرم گرم پراٹھے کے ساتھ آلو اور چنوں کا سالن... بان کی ڈھیلی میلی چارپائیوں پر بیٹھے بہت سے ٹرک ڈرائیور بھی ناشتا کر رہے تھے۔ وہ سب ان کو گھور رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ نہ وہ کسی بس سے اترے تھے نہ کار سے آئے تھے۔

''مجھے تو بہت بھوک لگی ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''تم کو یہاں اور کچھ نہیں مل سکتا۔ سلائس یا مکھن یا انڈے۔''

''میں کوشش کرتی ہوں۔ میں نے بھی رات سے کچھ نہیں کھایا۔'' وہ بولی۔

خلافِ توقع اس نے پراٹھے کا ایک لقمہ سالن کو چھو کے کھایا اور سر ہلایا۔ ''اِٹ اِز گڈ۔''

وہ مسکرایا۔ ''بھوک میں جوتے کھانا بھی اچھا لگتا ہو گا۔'' اس نے مذاق میں کہا اور پھر چپ ہو گیا۔ اسے اپنی بات احمقانہ لگی کیونکہ وہ خود اس تجربے سے گزر چکا تھا۔

وہ کھاتی رہی۔ صرف چائے پر اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''واٹ اِز دِس... یہ کوئی گرم مشروب ہے۔ اگر دودھ میں ہر چیز ڈال دی جائے۔ اوولٹین، ہارلکس، بہت ساری چینی، لندن میں تو دودھ بھی نہیں ڈالتے۔''

ناصر اٹھ کے ڈھابے کے مالک کے پاس گیا۔ ان کے پاس ٹی بیگ تھے جو اب عام استعمال ہوتے تھے۔ اس نے ایک مگ میں دو ٹی بیگ اور ابلتا پانی ڈال کے چینی بھیج دی۔ ہما خوش ہو گئی۔ یہ اس کے مطلب کی چائے تھی مگر مسئلہ بعد میں پیدا ہوا۔ وہاں کوئی باتھ روم نہیں تھا۔ ناصر معذرت کر کے ریسٹورنٹ کے پیچھے گیا جہاں جھاڑیوں کے درمیان اسے مناسب جگہ مل گئی۔ وہاں اس نے نقد رقم شمار کی جو حوالدار کی جیب سے ملی تھی۔ وہ بیس ہزار سے کچھ کم رقم تھی۔ یہ سوچنا لاحاصل تھا کہ ایک حوالدار کی جیب میں اتنی رقم کیسے آئی۔

وہ واپس آیا تو ہما نے کہا۔ ''مجھے باتھ روم جانا ہے۔''

''باتھ روم... یہاں تو مشکل ہے۔ مرد اوپن ایئر استعمال کر لیتے ہیں۔''

''کیوں... کیا مسافروں کو ضرورت محسوس نہیں ہوتی؟'' وہ حیرانی اور خفگی سے بولی۔ ''بتاؤ میں کیا کروں؟''

''دیکھو، کچھ فاصلے پر کھاریاں ہے۔ وہاں روڈ سائڈ پر اچھے ریسٹورنٹ ہیں مگر ہم جائیں گے کیسے؟'' یہ آخری بات اس نے خود سے کہی۔ ناصر نے پھر ہوٹل کے مالک سے رجوع کیا جو ایک میلے سے کاؤنٹر پر یوں بیٹھا تھا جیسے کرسیِ صدارت پر براجمان ہو۔

ناصر نے اس کو کم سے کم الفاظ میں ساری بات سمجھائی۔ ''دیکھو، ہم اسی ٹرین میں تھے جو کل رات حادثے کا شکار ہوئی۔''

اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''اچھا جی، کتنے لوگ مرے؟ مجھے ابھی پتا چلا... کیسا ظالم حادثہ ہے۔''

ناصر نے کہا۔ ''میرے ساتھ جو خاتون ہے، یہ لندن سے آئی ہے اور ایک ڈاکٹر ہے۔ اب ہمارے دو مسئلے ہیں ایک تو لاہور پہنچنا ہے۔'' پھر اس نے دوسرا مسئلہ بیان کیا۔ مالک غور سے سنتا اور سر ہلاتا رہا۔ حادثے کا سن کر وہ ناصر کا ہمدرد بن گیا تھا۔

بات ختم ہونے کے بعد بھی مالک سوچتا رہا۔ ''ویسے تو ٹرک اور بس سب رکتے ہیں یہاں... آپ فکر نہ کرو۔ میں کچھ کرتا ہوں ڈاکٹر صاحبہ کے لیے۔''

اس نے ہوٹل کے اندر ایک مردانہ واش روم کھولا اور اس کو صاف کرایا۔ ایک پرانی کرسی تلاش کی جس کی بید کی بُنائی تقریباً ختم ہو چکی تھی اور اسے ڈبلیوسی کے اوپر جما دیا۔

''لو جی ڈاکٹر صاحب سے کہو کہ گزارا ہو جائے گا۔''

ہوٹل کے مالک نے ہی ناصر سے کہا کہ وہ سڑک پر کھڑے ہو کے لاہور جانے والی کاروں کو ہاتھ دیں۔ ویسے تو آپ جس ٹرک میں بولو میں بٹھا دیتا ہوں، ڈاکٹر صاحبہ آگے بیٹھ جائیں۔''

''کوئی بس یہاں نہیں رکے گی؟''

''لاہور جانے والی تو سیدھی نکل جاتی ہیں اور ان میں جگہ بھی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر صاحبہ آپ کے ساتھ کھڑی ہو کے جس گاڑی والے کو اشارہ کریں گی وہ رک جائے گا۔ یہ پاکستان ہے سر جی۔'' اس نے ایک آنکھ دبا کے کہا۔

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ ہما جب اس کے ساتھ آ کے کھڑی ہوئی تو ہر گزرتی کار کے مسافروں نے اسے بڑی دلچسپی سے دیکھا لیکن ان میں جگہ نہیں تھی۔ پہلی خالی کار ان کے پاس آ رکی۔ اسے ایک پینتیس چالیس سال کا معقول صورت آدمی چلا رہا تھا۔

بات ناصر نے کی۔ ''دیکھیے، اگر آپ لاہور جارہے ہیں تو ہمیں بھی لے چلیں۔''

اس نے سوالیہ اور حیران نظروں سے ہما کو دیکھا۔ ''میں لاہور ہی جارہا ہوں لیکن یہاں آپ آئے کیسے تھے؟''

ناصر نے پیچھے والا دروازہ کھول کے ہما کو بٹھایا۔ پھر دوسری طرف سے گھوم کے ہما کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''ہم اس منحوس ٹرین سے آئے تھے جو موڑ کاٹتے ہوئے نیچے گر گئی۔ قسمت اچھی تھی کہ زندہ رہے۔''

اس نے چونک کے پیچھے دیکھا۔ ''اچھا اچھا... میں نے سنا تھا خبروں میں... پیچھے کافی رش تھا۔ گاڑیاں اور ایمبولینس دیکھی تھیں میں نے۔''

''ہاں، اب امدادی کام شروع ہوا ہے۔ پتا نہیں کتنے لوگ مرے ہیں، کتنے زخمی ہیں، ہم نے انتظار نہیں کیا صبح کا۔''

''سامان بھی نہیں تھا آپ کے ساتھ، بچے بھی نہیں تھے؟''

ناصر سمجھ گیا کہ کار والے نے سوال کیے بغیر انہیں میاں بیوی سمجھ لیا ہے۔ ''نہیں ابھی شادی کو زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ سامان میں بس کپڑوں کا ایک سوٹ کیس تھا، وہ کہاں ملے گا۔''

باقی راستہ وہ حادثے کی تفصیلات پوچھتا رہا۔ ''یہ تو بہت ہی خوفناک حادثہ ہے۔ رات سردی بھی قیامت کی تھی۔ نہ جانے کتنے سردی سے اکڑ کے مر گئے ہوں گے۔'' اس نے حادثے کے علاوہ ٹرینوں کی بدحالی اور بدانتظامی پر بھی تبصرہ جاری رکھا۔

ناصر اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ اب لاہور کے مضافات شروع ہوگئے تھے۔ شاہدرہ کے آگے راوی کا پل پار کرنے کے بعد ناصر نے پوچھا۔ ''آپ کو کدھر جانا ہے؟''

''جانا تو مجھے سمن آباد ہے لیکن میں آپ کو گھر پہنچا دوں گا۔''

''نہیں، آپ ہمیں داتا صاحبؒ کے پاس اتار دیں۔ میں نے گھر فون کر دیا تھا۔ بھائی آگیا ہوگا گاڑی لے کر۔'' ناصر بولا۔

ان کو لفٹ دینے والا ٹریفک کے اس ہجوم میں گم ہوگیا جو رینگتا ہوا کچہری روڈ کی طرف جارہا تھا۔ اگر وہ پولیس کے ساتھ آتا تب بھی اسی سمت میں جاتا۔ ناصر نے سوچا۔ ہما فٹ پاتھ پر کھڑی نیاز کی دیگ کو تقسیم ہوتا دیکھ رہی تھی جو کوئی سوزوکی پک اپ میں رکھ کے لایا تھا۔ کچھ دیر میں ہی دیگ خالی ہوگئی پھر دوسری دیگ آگئی۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' ہما نے دلچسپی، افسوس اور رحم دلی کے جذبات کے ساتھ کہا۔ ''یہ سب بھوکے ہیں؟''

''کچھ نہیں، تم چلو۔ یہ تو سارا دن ہوتا رہے گا۔ یہاں لوگوں کا عقیدہ ہے کہ داتا کی نگری میں کوئی بھوکا نہیں سوتا۔''

ہما نے کہا۔ ''کیا مطلب؟ پہلے سفید چاول تھے۔ اب پیلے ہیں۔ لوگ سارا دن یہی کھاتے ہیں؟''

''پہلے نمکین چاول تھے۔ یہ میٹھے ہیں۔ جو منت مانگتا ہے وہ چڑھاتا ہے دیگ یا چادر۔''

وہ کنفیوز ہوگئی۔ ''منت؟ وہ کیا چیز ہے۔ کس سے مانگتا ہے؟''

''دیکھو، اگر کسی کی کوئی خواہش پوری نہ ہو رہی ہو۔ مثلاً نوکری نہ مل رہی ہو۔ بیٹی کا رشتہ نہ آرہا ہو، کسی کی بیماری کو شفا نہ ہو۔ اولاد نہ ہو یا کوئی چاہتا ہو کہ اس کی بیوی کے بیٹا ہو، پہلے سب بیٹیاں ہوں تو وہ کہتا ہے کہ میری یہ خواہش پوری ہوگئی تو میں داتا صاحبؒ کے مزار پر چادر ڈالوں گا یا غریبوں میں چاول کی دیگ تقسیم کروں گا۔''

''کس سے کہتا ہے اور یہ سارے کام ایک جگہ ہو جاتے ہیں... کیسے؟''

''ہما، تم نہیں سمجھو گی۔ مانگتے وہ خدا سے ہیں۔ کسی پیر کے وسیلے سے... یہ عقیدے کی بات ہے تم خاموشی سے آگے چلو۔''

''ہم کہاں جارہے ہیں؟'' وہ اس کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلتی رہی۔

''یہ میں کیا بتاؤں جب تمہیں ہی محمد شریف کا پتا معلوم ہے نہ فون نمبر... چلو پہلے کہیں کھانا کھائیں گے۔ ٹھہرنے کے لیے بھی جگہ چاہیے۔ کیوں نہ ہم کسی ہوٹل چلیں۔''

''چلو، مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''کون مانگ رہا ہے پیسے تم سے۔ میرے پاس بہت ہیں۔ تم فکر مت کرو لیکن ایک مسئلہ ہے ہوٹل میں ٹھہرنے کا۔'' ناصر نے سوچتے ہوئے کہا۔

''وہ کیا؟''

ناصر نے ہما کی طرف دیکھا۔ ''اگر میں اکیلا جا کے کمرا لوں تو مل جائے گا مگر تمہیں نہیں ملے گا۔''

''وہ کیوں؟ کرایہ تم دو گے نا؟''

"کرائے کی بات نہیں۔ یہاں اکیلی عورت ہوٹل میں کمرا لے کر نہیں رہ سکتی... اب یہ مت پوچھنا کہ کیوں... ہم الگ الگ کمرے لیں گے تو شک پیدا ہو گا... ہمیں جھوٹ بولنا ہوگا کہ... ہم میاں بیوی ہیں۔"

ہما نے اسے عجیب سی نظر سے دیکھا۔ وہ سخت الجھن میں تھی۔ "اگر تم سمجھتے ہو کہ یہ جھوٹ ضروری ہے تو کہہ دینا۔"

ناصر نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہارے لیے یہ سب سمجھنا مشکل ہوگا۔ میں بھی کسی اجنبی ملک کے دستور نہیں جانتا... اور پاکستانی ہونے کے باوجود تم اجنبی ہوا بھی... ایک کمرے میں رہنا مشکل ہوگا تمہارے لیے۔"

وہ حیرانی سے ناصر کو دیکھنے لگی۔ "کیوں مشکل ہو گا؟"

"دیکھو نا، وہاں ایک بیڈ ہوگا جس پر ہم دونوں کو سونا پڑے گا۔"

وہ جھنجلا گئی۔ "کیا اتنا چھوٹا ہوتا ہے ہوٹلوں کے ڈبل روم کا بیڈ۔"

"لاحول ولاقوۃ... بیڈ تو بہت بڑا ہوتا ہے... تم کو ڈر نہیں لگے گا مجھ سے؟"

"ناصر، ناصر... تم پاگل کر دو گے مجھے... کس سے ڈر لگے گا تم سے... ڈرتی تو تمہارے ساتھ کیوں آتی... ابھی تو میں اتنا تھک گئی ہوں کہ گر جاؤں گی کہیں چلتے چلتے۔"

"پرابلم یہ ہے کہ لاہور میں سڑک پر ٹیکسی نظر نہیں آتی یا رکشا ہیں یا یہ گھوڑے والی سواری تانگا۔"

"اس بغیر بریک والی گھوڑے کی سواری پر تو میں ہر گز نہیں بیٹھوں گی۔ یہ شور سے کان پھاڑنے والی سواری بھی خطرناک لگتی ہے مجھے... آخر کیوں نہیں ہے اتنے بڑے شہر میں ٹیکسی..."

"کرائے کی کار ملتی ہے۔ اسے فون کر کے بلانا پڑتا ہے۔ ہم یوں کرتے ہیں پہلے کپڑے بدل لیں۔ یہ جو بازار ہے یہ انارکلی کہلاتا ہے۔ اس میں ریڈی میڈ کپڑے اچھے ملتے ہیں۔"

"کیوں؟" "کیا خرابی ہے اس ڈریس میں؟"

"دیکھو، یہ مغربی لباس ہے۔ لوگ گھورتے ہیں تمہیں... اور پھر یہ کپڑے خراب ہو گئے ہیں۔ کسی اچھے ہوٹل میں جانے والے معزز لوگ ایسے ڈریس میں نہیں ہوتے۔ بس چند منٹ لگیں گے۔"

وہ خاموشی سے ناصر کے ساتھ ہولی۔ اس نے ناصر کے مشورے سے دو شلوار قمیص سوٹ خریدے۔ ان میں سے ایک اس نے دکان میں ہی ٹرائل کرتے ہوئے پہن لیا اور پرانا ڈریس وہیں چھوڑ دیا۔ خود ناصر نے ڈارک کلر کا کوٹ پتلون والا سوٹ خریدا اور ان کے ساتھ میچ کرتی ہوئی دو میں سے ایک ٹائی باندھ لی۔ سیلز مین نے ان دونوں کے اتارے ہوئے کپڑے ایک شاپنگ بیگ میں ڈال کے دیے تو ناصر نے ایک شانِ استغنا کے ساتھ کہا۔ "یہ کسی غریب کو دے دینا۔" انہوں نے ایک ایک اونی جرسی بھی لی تھی۔

"میں کیسی لگ رہی ہوں اس لباس میں؟" ہما نے باہر آتے ہی سوال کیا۔

"کیا تمہیں لوگوں کی ستائشی نظروں سے اندازہ نہیں ہو رہا؟ یو آر لکنگ بیوٹی فل۔" ناصر مسکرایا۔

"تم بھی بہت ہینڈسم لگ رہے ہو۔ تمہیں یہی استعمال کرنا چاہیے۔ وہ شلوار قمیص نہیں۔"

"میرے بریف کیس کو کھولنے والی چابی کہیں گر گئی ہے۔ میں کسی قفل ساز سے اسے کھلوا لوں... دو منٹ کا کام ہے۔"

"تھکن کے علاوہ اب میں بھوک سے بھی مر سکتی ہوں۔" وہ مسکرائی۔ "یہ انارکلی بازار ہے نا؟"

☆☆☆

ناصر کی آنکھ صبح پانچ بجے پھر کھل گئی۔ اس سے پہلے وہ کھانا کھا کے بیڈ پر گرے تھے تو شام ہو رہی تھی۔ وہ ہما سے خاصے فاصلے پر رہا۔ وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر سوتی رہی۔ ایک بار نیند میں کروٹ لے کر وہ ناصر سے آ لگی تھی۔ اس نے ہما کو بڑی مشکل سے دھکیل کر دور کیا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ یہ سردیوں کی آدھی رات تھی لیکن ناصر کو یقین تھا کہ ہوٹل کے کچن سے کھانا نہ ملا تو سینڈوچ اور کافی مل جائیں گے۔ اس نے ہما کو جگانے کی کوشش کی اور اس سے پوچھا کہ کچھ کھاؤ گی؟ تو اس نے نیند میں ہی انکار کر دیا تھا کہ مجھے سونے دو۔

خود ناصر نے بھی محسوس کیا کہ اسے کچھ کھانے کی خواہش نہیں ہے۔ وہ کچھ دیر اس عجیب و غریب صورتِ حال پر غور کرتا رہا پھر اسے بھی نیند نے آ لیا۔ کئی دن بعد اسے آرام دہ بستر نصیب ہوا تھا وہ کوٹ پتلون کے ساتھ سوتا رہا۔ اسے خیال آیا کہ اسے ایک شلوار قمیص بطور نائٹ سوٹ بھی لینا چاہیے تھا۔

سردی کے باوجود اس نے کوٹ اتار کے باہر رکھا اور غسل کے لیے واش روم میں گھس گیا۔ گرم پانی نے اسے

بالکل تازہ دم کر دیا۔ اس نے باہر آکے پھر کوٹ پہنا اور طے کیا کہ آج موقع ملا تو وہ ہما سے نجات پا کے اپنے لیے کچھ سوچے گا۔ ابھی تک اس نے خود کو ہما کی نظر میں مشتبہ نہ بنانے کے لیے اپنا رویّہ ایک خوش حال تعلیم یافتہ شخص جیسا رکھا تھا۔ اس نے بریف کیس کھلواتے وقت دیکھ لیا تھا کہ اس میں بھی کافی رقم ہے مگر اس نے یوں ظاہر کیا تھا جیسے بریف کیس اس کا ہے تو اسے معلوم ہے کہ اندر کیا ہے۔

اب اس نے صوفے پر بیٹھ کے بریف کیس کھولنے سے پہلے ہما کو دیکھا۔ وہ لندن کے وقت کی عادی تھی جہاں اس وقت رات کا ایک بجا تھا۔ شاید وہ مزید دو گھنٹے سوتی رہے گی اور وہاں کے حساب سے چھ سات بجے اٹھی تو گیارہ بارہ بجے اٹھے گی ورنہ اسے آٹھ بجے جگایا جا سکتا ہے۔ اس کی نگاہ گھڑی پر گئی جس میں چھ بجے تھے۔ اس نے روم سروس سے فون پر بات کی تو اسے خوشی ہوئی۔ کچن ساری رات کھلا رہتا تھا۔ اسے کافی مل سکتی تھی۔

بریف کیس میں پچاس ہزار کے نوٹ الگ تھے۔ ہزار کے نوٹوں کی ایک گڈی کا مطلب تھا کہ ایک لاکھ... اس کے مقابلے میں حوالدار کے پرس سے ملنے والے تیس ہزار کچھ بھی نہیں تھے۔ بیس ہزار وہ رئیسوں کی طرح اُڑا چکا تھا۔ ساری رقم ایک جگہ کر کے اس نے پرس میں سے اپنے کاغذات کے سوا باقی سب الگ کر دیا۔ مقدمے کی فائل نہ جانے کہاں تھی۔ اس کا اصل شناختی کارڈ حوالدار کی تحویل میں تھا۔ وہ بھی اسے کسی نہ کسی طرح بدلوانا تھا۔ ہما کو اس کے عاشق کے حوالے کرنے کے بعد اسے بہت کچھ کرنا تھا۔

روم سروس کے ویٹر نے آہستہ سے ناک کیا اور کافی اس کے سامنے رکھ گیا۔ ناصر کا دماغ کافی کے پہلے گرم گھونٹ کے ساتھ مشین کی طرح چل پڑا۔ اس کے سامنے دو اہم سوال تھے۔ ابھی تک محمد شریف کا سراغ لگانے کی امید بہت کم تھی۔ ہما سے تفتیش کے بعد بھی اس کا پتا نہ چلا تو ضروری ہوگا کہ وہ ہما کو کسی بس میں بیٹھا دے جو اسے اسلام آباد لے جائے اور برٹش ایمبیسی پہنچا دے۔ شاید وہ اصرار کرے کہ ساتھ چلو۔ اس کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ وہ لوٹ کے اسلام آباد میں شریف کے گھر بھی جا سکتی تھی۔ دوسرے سوال کا تعلق اس کے اپنے مستقبل سے تھا جو غیر یقینی کی گہری دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس پر وہ بعد میں غور کر کے کوئی محفوظ لائحہ عمل بنا سکتا تھا، جو ایک محفوظ مستقبل کا ضامن ہو۔ لیکن اس وقت جب ہما اس کے ساتھ نہ ہو۔ ابھی تک خود اسے اتنے بڑے شہر میں صرف نام کی مدد سے محمد شریف کو تلاش کرنا بالکل ناممکن لگتا تھا۔

ابھی تک اس نے ہما کو بڑے اعتماد سے ٹالا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ ہما کو سچ بتائے۔ یہ کہے کہ وہ ایک مفرور مجرم ہے جس پر قتل کا الزام ہے اور پولیس اسے لاہور کی عدالت میں ریمانڈ کے لیے پیش کرنے لے جا رہی تھی۔ لاہور کی پولیس کے حوالے کرنے کے بعد گرفتار کرنے والی پولیس کی ذمے داری پوری ہو جاتی۔ عدالت کسی اعتراض کے بغیر اسے تفتیش کے لیے چودہ دن کے ریمانڈ پر لاہور کی پولیس کے حوالے کر دیتی۔ وہ ریمانڈ کی میعاد کے ختم ہونے سے بہت پہلے اس سے اعتراف جرم حاصل کر لیتے۔ آلۂ قتل برآمد کر لیتے... یہ سب اس کے دشمنوں کی مرضی پر منحصر تھا کہ وہ اسے طویل انتظار کے بعد پھانسی کے پھندے پر جھولتا دیکھنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پولیس اسے مار دے... بعد میں وہ کیا کہتے ہیں۔ یہ پولیس کی مرضی... اگر بات پھیلی تو چند لوگ چند دن کے لیے معطل ہوں گے اور پھر بحال ہو جائیں گے۔

وہ گزر جانے والا وقت اس کی نظروں اور خیالوں میں یوں ٹھہر گیا جیسے ٹی وی پر چلنے والے کسی ڈرامے یا فلم کا کوئی منظر کسی فنی خرابی کے باعث رک جائے... منجمد ہو جائے اور اس ایک منظر سے ہی ساری کہانی سمٹ گئی ہو... ہیرو، ہیروئن، ولن، لڑکی کا باپ اپنی پگڑی قدموں میں ڈالتا... اور ولن کا باپ کلف دار... دستار اور مونچھوں پر تاؤ دیتا... اور محبت کی رسوائی کا تماشائے عبرت دیکھتا ظالم زمانہ... سب ایک فریم میں...

ایک شکست نے اسے اتنا بدل دیا تھا کہ اس نے وہ گھر وہ محلہ اور وہ شہر ہی چھوڑ دیا تھا جہاں اسے ہر قدم پر صرف یادوں کے مزار ملتے تھے۔ وہ کراچی سے بھاگ کے لاہور آ گیا تھا۔ اس نے اچھی بھلی ملازمت بھی چھوڑ دی تھی۔ اس کے بڑے بھائی نے کہا تھا کہ ناصر یہ کیا پاگل پن ہے۔ چھوٹے بھائی نے کہا کہ بھیا آپ تو کبھی اتنے کم ہمت نہ تھے۔ اکلوتی بہن سب سے چھوٹی اور سب کی لاڈلی اس کے سامنے رو پڑی۔ بھائی جان قصور ثریا کا اور آپ سزا ہمیں دے رہے ہیں۔

وہ کسی کی بات کا جواب دے سکتا تھا اور نہ دینا چاہتا تھا۔ وجہ سب جانتے تھے لیکن جس کرب سے وہ گزر رہا تھا، اس کا علاج صرف وقت کے پاس تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ وہ یہاں رہے گا تو یادوں کے زخم کبھی نہیں بھریں گے۔ یہ بدمزاجی نہیں تھی۔ ثریا کے بغیر زندہ رہنے کی جدوجہد تھی۔ وہ

خود کو ایک بالکل اجنبی دنیا میں گم کر دینا چاہتا تھا۔ اس وقت تک کے لیے جب تک کہ ثریا کے دیے ہوئے زخم مندمل نہیں ہو جاتے۔

کالج کے پرنسپل کے لیے بھی جہاں وہ پڑھاتا تھا، اس کا استعفیٰ انتہائی غیر متوقع تھا۔ ''تم باہر جارہے ہو؟ ٹھیک ہے یہ تمہارے مستقبل کا سوال ہے لیکن تم نے کبھی اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔''

''میں باہر نہیں جارہا ہوں سر... لاہور جارہا ہوں۔''

''لاہور؟ کس کالج میں؟ یقیناً اُن کی آفر اچھی ہوگی۔ آج کل سب یہی دیکھتے ہیں مگر تم مجھے بتاتے تو سہی... شاید انتظامیہ تمہیں روکنے کے لیے کچھ کرتی، اب دیکھو کتنا نقصان ہوگا ہمارا...''

''اس کے لیے آئی ایم سوری... لیکن ابھی تک مجھے کوئی آفر نہیں... میرے بہت پرسنل ریزن ہیں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا اور پرنسپل کے کمرے سے نکل آیا۔ برآمدے میں کسی طالب علم کے فون کی رنگ ٹون پر وہ تڑپ کے پلٹا۔ وہ اب موبائل فون اپنے کان سے لگا کے کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کا ایک زخم رسنے لگا۔ یہی رنگ ٹون اس نے خاص طور پر ثریا کی کال کے لیے مخصوص کر رکھی تھی۔ رنگ کے ساتھ ہی اس کا چہرہ اپنی ساحر آنکھوں اور دل میں چراغاں کرنے والی مسکراہٹ کے ساتھ اسکرین پر آجاتا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے خود کو روکا ورنہ وہ اس طالب علم سے لڑ پڑتا کہ یہ رنگ ٹون تم کیسے استعمال کر رہے ہو۔ یہ اندیشہ بے بنیاد نہیں تھا کہ وہ یہاں رہا تو پاگل ہو جائے گا۔

ثریا سے اس کی محبت بھی پاگل پن ہی تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ یہ فلمی اور غیر فلمی محبت کی کہانیاں اور عشق کی ساری داستانیں کتنی سطحی ہوتی ہیں۔ زندگی میں جذبات کی وسعت اور گہرائی تو کسی سمندر جیسی ہوتی ہے اور دیکھنے دکھانے والا عشق ایک ساکت جھیل جیسا... شاید یہ اس کے اپنے دماغ کا خلل تھا ورنہ اس کے آس پاس محبت کی اَن گنت حقیقی زندگی کی کہانیاں تو ایسا ہی معمولی حادثہ تھیں جیسے کوئی چلتے چلتے ٹھوکر کھا کے گرے اور اٹھ کے پھر چل پڑے۔ نہ جانے کتنے عاشقانِ صادق نے جدائی کا صدمہ جھیلا۔ کسی نے چار آنسو بہا کے تو کسی نے محض صبر کر کے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔

ثریا نے تو اسے سنبھلنے کی مہلت بھی نہیں دی تھی۔ ایک سال تک وہ ہر جگہ اس کے ساتھ رہی، دن میں جہاں اس نے بلایا اور رات کو اس کے خوابوں میں جہاں خود چاہا... یہ ان کے درمیان طے تھا کہ وہ ایم اے کر لے تو وہ زندگی بھر کی رفاقت کے سفر کا آغاز کریں۔ وہ ثریا کو اپنے بہن بھائیوں سے ملوا چکا تھا اور اس کی پسند کو سب نے فوراً پسندیدگی کی سند بھی دے دی تھی۔ ثریا کے لیے یہ ممکن نہ تھا مگر اس نے یقین دلایا تھا کہ ماں باپ کی اکلوتی ہونے کی وجہ سے اس کی بات کوئی ٹال ہی نہیں سکتا۔

وہ ثریا کے گھر گیا تو وہاں تالا نہیں تھا۔ پورا گھر کھلا پڑا تھا۔ اندر باہر بہت سے لوگ شاندار حویلی کی تزئین نو کر رہے تھے جس میں مرمت، رنگ و روغن اور آرائشی تبدیلی سب کچھ شامل تھا۔ اس کا دماغ کھٹکا، یہ سب تو اسی وقت ہوتا ہے جب پرانے گھر کا نیا مالک اسے بھی نئی نویلی دلہن جیسا دیکھنا چاہتا ہے۔ شریکِ حیات، گھر، کار، ان سب میں خوب صورتی کون نہیں چاہتا علاوہ دیگر صفات کے... پوچھنے پر ناصر کے خدشات درست ثابت ہوئے۔ پرانے مالک حویلی بیچ کے کہیں چلے گئے تھے۔ کہاں چلے گئے تھے یہ مزدور، کاریگر کیا جانیں۔ نیا مالک کون ہے؟ پتا نہیں، آتا ہے کبھی کبھی کام کی پیش رفت دیکھنے اور مزید ہدایات دینے۔

ناصر نے دونوں طرف کے ہمسایوں سے پوچھا تو ایک صرف یہ بتا سکا کہ فیملی کہیں بیرونِ ملک سیٹل ہو گئی ہے۔ امریکا، کینیڈا، برطانیہ، آسٹریلیا یہ تو نہیں معلوم... ان کے رشتے دار کون ہیں، کہاں ہیں جو یہ بتا سکیں؟ فیملی بزنس کیا تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ، کہاں تھا؟ پتا نہیں... ناصر دیوانہ وار اِدھر سے اُدھر ٹک ٹوئیاں مارتا پھرا، جنونِ عشق کو ضد ہے کہ تیرا عہدِ وفا... شکست کھا کے بھی تقدیس کھو نہیں سکتا... مگر محبت کے عہد و پیمان کی تقدیس کا لاشہ بے جان اور بے گور و کفن پڑا رہا۔ اس کو سوالات کے گدھ نوچتے رہے۔ ثریا نے ایسا کیوں کیا؟ کیا اس کے ساتھ زبردستی ہوئی؟ کیا اسے نقل مکانی کا علم نہ تھا؟ اتنا بڑا کام راتوں رات تو نہیں ہو سکتا۔ پوری فیملی کے باہر جا کے سیٹل ہونے میں وقت لگتا ہے۔ اس کے لیے اپلائی کیا جاتا ہے پھر پاسپورٹ ویزے کے مرحلے آتے ہیں۔ روانگی کی تاریخ طے ہوتی ہے۔ بکنگ کرائی جاتی ہے اور اسی طرح پراپرٹی کا ڈسپوزل کھڑے کھڑے نہیں ہو جاتا۔ اس قانونی عمل میں بھی ایک مہینہ تو لازمی لگتا ہے۔

وہ سوچ سوچ کے پاگل ہو گیا۔ رات دن سوتے جاگتے اس کا دماغ ایک ہی سوال کی دیوار سے سر ٹکراتا رہتا تھا۔ ثریا نے ایسا کیوں کیا؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کے سارے عہد و پیمان جھوٹ ہوں۔ اس کی محبت فلمی ڈراما ہو... وہ جلاد تو نہیں تھی کہ تلوار کے ایک وار سے کسی کا سر

الگ کر دے اور پھر کھانا کھا کے سکون سے سو جائے۔ گزر جانے والے وقت کو یوں ذہن سے خارج کر دے جیسے ربر سے کاغذ پر پنسل کی ڈرائنگ کو مٹا دیا جائے اور کورے کاغذ پر دوسرے نقش کو ابھارا جائے۔ ایک بار بھی اس نے اشارے کنائے میں یہ ظاہر نہیں کیا کہ اس کی سب باتیں بے معنی ہیں اور وہ کیا کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے۔ ایسا پُرفریب ڈراما، ایسی محبت کی اداکاری، ناممکن، بالکل ناممکن... ضرور اس کے ساتھ زبردستی ہوئی۔ اسے بے خبر رکھا گیا۔ اچانک اسے یہاں سے اٹھا کے ہزاروں میل دور کسی نامعلوم جگہ پر رکھ دیا گیا۔ یہ بھی ناممکن... وہ ایک فون کر سکتی تھی، کسی کے ذریعے پیغام دے سکتی تھی۔

اگر وہ کراچی سے بھاگ جانے کا فیصلہ نہ کرتا تو ضرور پاگل ہو جاتا۔ بس ایک رات جیسے کسی دستِ غیب نے اس کو یقین کی راہ دکھا دی اور اس نے بھی ثریا کو اس سے منسوب ہر بات... ہر یاد کو کھرچ کے مٹا دینے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بھی دیوانگی تھی۔ جنون کی دوسری سمت... منفی سو جمع سو مساوی زیرو... زندگی کو زیرو میٹر گاڑی کی طرح شروع کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ وہ لاہور پہنچ گیا اور یہ اس پر قدرت کے دستِ عنایت کا سلسلہ تھا جو ہنوز جاری تھا کہ ایک بالکل بدلے ہوئے ماحول میں اس کے ذہن کو مصروفیت مل گئی۔ خالی دماغ شیطان کا گھر نہیں رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ سابقہ تجربے کے حوالے سے کسی کالج میں جاتا، اسے ایک رسالے میں جگہ مل گئی اور اسے اندازہ ہوا کہ یہ کام پڑھانے سے زیادہ دلچسپ ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیت کے لیے نیا چیلنج۔

مالی مسئلہ کوئی نہ تھا۔ اس لیے رہائش کے لیے ''بیچلرز ہوسٹل'' جیسی ایک عمارت میں کمرا لے لیا۔ ہوسٹل کی مالک ایک باہمت ساٹھ سال میں پچاس سے کم کی نظر آنے والی تنہا عورت تھی۔ وہ جتنا ہوسٹل کی اور رہنے والوں کی دیکھ بھال کا خیال رکھتی تھی، اس سے زیادہ اپنا رکھتی تھی۔ وہ بالکل فٹ اور چاق و چوبند تھی لباس بھی نوجوانوں جیسے پہنتی تھی خود بھی خوش رہتی تھی اور سب کو خوش رکھتی تھی۔

ایک دوپہر وہ بے مقصد وقت گزاری کے لیے میوزیم سے نکلا تو دوپہر گزر چکی تھی۔ وہ ٹالنٹن مارکیٹ کے پاس سے گزر کے مال کی دوسری طرف فٹ پاتھ پر ہولیا۔ سیدھا چلتا وہ چیئرنگ کراس تک پہنچ گیا تو اسے بھوک کا احساس ہوا۔ مرغن کھانے سے وہ لنچ میں پرہیز کرتا تھا۔ گرمی میں شدت آگئی تھی۔ وہ ایک ائرکنڈیشنڈ ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا اور اپنے لیے کلب سینڈوچ کے ساتھ کافی منگوالی پھر ایک جوڑے پر اس کی نگاہ ٹھہر گئی۔ مرد فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اس کی بیوی میں ثریا کی حد درجہ مشابہت تھی۔ ناصر کی نظر اس پر جم کے رہ گئی۔ عورت یقیناً ناصر کے گھورنے سے بے خبر نہیں رہی... اور وجہ کچھ بھی ہو، اس کا رسپانس ناراضی کا نہیں تھا۔ وہ بھی بھی اس کی طرف دیکھ کے مسکرانے لگتی۔

اس وقت ناصر کا یہ غیر ارادی 'بے خبری کا کھیل اچانک ختم ہو گیا جب کسی نے کہا۔ ''اگر آپ برا نہ مانیں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں۔''

ناصر نے چونک کر دیکھا۔ ایک ماڈل ٹائپ لڑکی اخلاقاً اس کی اجازت کی منتظر کھڑی تھی۔ وہ پوچھے بغیر ہی بیٹھ جاتی تو ناصر کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ لنچ کا وقت ہونے کی وجہ سے میزیں خالی نہ تھیں اور وہ چار کی ٹیبل پر اکیلا تھا۔

''پلیز، بیٹھیے۔'' ناصر نے تھوڑا سا اٹھ کے کہا۔

لڑکی نے بیٹھ کے شولڈر بیگ ایک سائڈ پر رکھا اور ناصر کے سامنے رکھے کلب سینڈوچ اور کافی کے مگ کو سوالیہ نظر سے دیکھا۔ ویٹر کو آرڈر دینے سے پہلے اس نے متانت سے پوچھا۔ ''اگر یہ آپ کو نہیں کھانے تو میں لے لوں۔''

ناصر نے خفت سے کہا۔ ''وہ دراصل، میں کچھ اپنے خیالات میں محو تھا۔''

''میرا خیال ہے آپ کہیں اور دیکھ رہے تھے۔'' اس نے زیرِ لب مسکراہٹ اور قدرے شوخ لہجے میں کہا۔ ''پلیز ڈونٹ مائنڈ۔'' اسی وقت ویٹر نمودار ہوا۔ اس نے ناصر والا آرڈر لڑکی سے بھی لیا اور کافی کو گرم کرنے کے لیے اٹھا لے گیا۔

''مائنڈ کرنے کی کیا بات ہے؟''

''وہ دراصل، آپ اپنی کسی پریشانی میں گم تھے۔ میں نے ڈسٹرب کیا۔'' اس نے معذرت کی۔ ''مالی... یا گھریلو...''

''مجھے کوئی مالی پریشانی نہیں۔ میرا گھر ہی نہیں تو گھریلو پریشانی کا کیا سوال؟'' ناصر نے کہا۔

''اچھا؟ تو پھر آپ کی صورت پر یہ وحشت... اور آنکھوں میں ویرانی کیوں ہے۔ آپ آئے تھے بھوک مٹانے مگر کھانا بھول کے خلا میں گھور رہے تھے۔''

''رئیلی؟'' ناصر نے طنز سے کہا۔ ''آپ کیا ہیں آخر؟ ڈاکٹر، سائیکاٹرسٹ...''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ان میں سے کچھ بھی نہیں، بس پھر تھنڈی نہ ہو جائے۔''

ویٹر اس کا لنچ بھی رکھ گیا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے

کھاتے رہے۔ ناصر نے غور کیا تو وہ پُراعتماد لڑکی اسے اپنی عمر سے کچھ ہی کم لگی۔ اس کے تراشے ہوئے براؤن رنگے ہوئے بال ریشم جیسے تھے اور مسلسل اس کے چہرے کے گرد جھولتے پھیلتے رہتے تھے... وہ جینز پر زرد رنگ کا کرتہ پہنے ہوئے تھی۔ کانوں میں صرف ٹاپس تھے جو ہیروں کے ہو سکتے تھے کیونکہ اس کی گداز کلائی سے لپٹی گھڑی بھی جیولری کا شاہکار تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش اور انداز و اطوار میں دلکشی تھی۔

''میں ایک فیشن میگزین نکالتی ہوں۔'' اس نے کھانا روک کے کہا۔ ''CHARISMA۔''

ناصر نے سر ہلایا۔ ''دیکھا ہے... پڑھا کبھی نہیں... میں کراچی میں تھا تو انگلش لٹریچر پڑھاتا تھا۔ میرا نام ناصر ہے۔''

''میں عینی ہوں، عندلیب احمد۔'' اس نے عادت کے مطابق اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ نازک اور نرم تھا۔ ''یہاں آپ کیا کرتے ہیں؟''

''ابھی تک کچھ نہیں۔ بس سوچ رہا ہوں کہ کچھ کرنا چاہیے۔''

''کراچی کیوں چھوڑا آپ نے؟ بدامنی اور دن رات کی لوٹ مار کی وجہ سے... سیاسی مسئلہ تھا کوئی؟''

''اوہ نو... میرا کیا تعلق ان معاملات سے... اور دو کروڑ لوگ ہیں وہاں... میرے بہن بھائی ہیں، اس کا سبب کچھ اور تھا میں اس شہر سے نکلنا چاہتا تھا... وہاں رہتا تو ضرور پاگل ہو جاتا۔''

عینی کی آنکھوں میں ہمدردی اور شبہے کے جذبات اتر آئے۔ ''آئی سی... اچھا کیا آپ نے... ماحول بدل جائے تو ذہن پر دباؤ کم ہو جاتا ہے۔ اب یہ پھر نفسیاتی معالجوں والی بات کی میں نے...''

ناصر مسکرایا۔ ''میں کہہ سکتا ہوں کہ آپ ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں لیکن مشاہدہ بہت اچھا ہے آپ کا۔''

عینی نے اس طرف دیکھا جہاں ثریا کی ہم شکل عورت اب ناصر سے خفا ہو کے پھر ساری محبت اپنے شوہر پر نچھاور کر رہی تھی۔ ''میں بہت جلد بے تکلف ہو جاتی ہوں، یہ خامی ہے میری... لیکن نقصان کوئی نہیں ہوا اس عادت سے... اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ میرا ادارہ جوائن کر لیں۔''

''میں؟ انگریزی ادب پڑھانے کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے لکھنا آتا ہے۔'' ناصر حیران ہو کے بولا۔

''مسٹر ناصر... یہ سب ڈرائنگ روم میگزین تین چوتھائی تو فیشن، فلم اور اشتہارات والی ماڈلز کی رنگین تصویروں سے بھرے ہوتے ہیں۔ آرٹ پیپر اور کلر پرنٹنگ کا شاہکار ہوتے ہیں جو تھوڑا بہت میٹر ہوتا ہے وہ لٹریچر نہیں ہوتا، آپ اس کی نوک پلک تو سنوار سکتے ہو، یہ ایڈیٹنگ کہلاتی ہے۔''

''آپ زبردستی مجھے ایڈیٹنگ میں کیوں فٹ کرنا چاہتی ہیں؟''

''دراصل ایک اچھا بندہ تھا مگر اس کی شادی ہوئی تو وہ واقعی بیوی کا غلام ہو گیا۔ اس کی فیملی بزنس میں چلا گیا تو یہ سب مجھے کرنا پڑ رہا ہے اور ایمانداری کی بات ہے کہ میں بس مالک ہوں۔ ڈیڈی نے میرے شوق کی خاطر یہ رسالہ نکالا تھا۔ میں تو باہر سے گریجویشن کرنے گئی تھی۔ سائیکالوجی میرا ایک مضمون تھا۔ آپ نے صحیح اندازہ کیا تھا۔ ماحولیات بھی پڑھتی رہی۔ پھر واپس آ گئی، اب یہ کام اچھا ہے۔ سوشل سرکل بن گیا ہے۔ بولیں آپ میری مدد کریں گے؟''

''کچھ وقت گزارنے کے بعد پتا چلے گا کہ میں یہ کام کر سکوں گا یا نہیں۔''

وہ مسکرائی۔ ''نہیں کر پاؤ گے تو میں نکال باہر کروں گی... لیکن ابھی تم کیا لو گے؟'' وہ آپ سے تم پر آ گئی۔

''میری قدر و قیمت بھی تم ہی مقرر کر سکتی ہو۔ لیکچرر تھا تو تیس ہزار ملتے تھے، باقی ٹیوشن...''

''اوکے، پچاس ہزار سے کم میں گزارا بھی نہیں ہوتا۔ پچاس فیصد اور سیونٹی فائیو ٹھیک ہیں۔''

''نہیں، بہت زیادہ ہیں، تم پچھتاؤ گی۔''

کھڑے ہوتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری جج منٹ اتنی غلط کبھی نہیں ہوتی۔''

وہ عینی کے فیشن میگزین میں ہی نہیں، اگلے چھ ماہ میں اس کے دل میں بھی فٹ ہو گیا۔ اسے بھی بھی شک ہوتا تھا کہ وہ ہمدردی میں ایک حد سے آگے نکل آئی ہے۔ ناصر نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کراچی سے کیوں فرار ہوا تھا۔ ان کی بے تکلفی اور دوستی آفس میں بڑھی، پھر باہر تک پہنچی لیکن شک کسی کو نہیں ہوا کیونکہ عینی پر کسی قسم کی روک ٹوک نہیں تھی۔ جب وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے گئی تھی تو ہوسٹل میں رہی تھی اور مکمل طور پر خود مختار تھی۔ اس کا باپ بھی تعلیم یافتہ اور ایک سیاسی بیوروکریٹ تھا۔

ناصر کئی بار کراچی چکر لگا چکا تھا اور میگزین کی اعزازی کاپی اب اس کے بہن بھائیوں کو باقاعدگی سے مل رہی تھی جس پر وہ پہلے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر تھا اور اب ایڈیٹر... عینی

کا درجہ ڈرا او پر ایگزیکٹو ایڈیٹر کا ہو گیا تھا۔ اسے اب ایک لاکھ ماہانہ مل رہے تھے اور میگزین کی طرف سے اسے ایک ہنڈا سوک بھی ملی ہوئی تھی۔ ظاہر ہے یہ سب عینی کی نظرِ عنایت تھی۔ اسے حیرانی ہوتی تھی کہ اب اسے ثریا کا خیال بھولے سے بھی نہیں آتا تھا۔ کراچی سے لاہور آنا اس کے لیے ایک نئی زیادہ خوب صورت زندگی کا نقطۂ آغاز تھا۔

پھر ایک دن عینی کا باپ اسلم پرویز بھٹی اس کے کمرے میں آ بیٹھا جب وہ فارغ تھا۔ وہ ہفتے میں ایک بار تو ضرور عینی کے آفس آتا تھا اور بے حد سیاسی شائستگی سے سب کا حال چال پوچھتا تھا۔ ''ہاں عینی کیسا چل رہا ہے کام... سب فٹ فاٹ؟ کوئی مسئلہ تو نہیں... موجاں ای موجاں؟'' اور عینی کے پاس کچھ دیر اس کے کمرے میں بیٹھ کے چلا جاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ عینی اپنی کسی مصروفیت کے باعث آج آفس نہیں آئے گی پھر اس نے ناصر کو باہر کہیں لنچ کرنے کی دعوت دی۔ لنچ کے دوران میں اس نے ناصر سے اس کی فیملی کے بارے میں کچھ سوالات کیے اور اس کے کام کی تعریف کی۔

''میرا خیال ہے کہ اب تمہیں شادی بھی کر لینی چاہیے۔ تم ایک ذہین آدمی ہو، لیکچرر سے ایڈیٹر بن گئے۔ اب دیر کیوں... ہمارے زمانے میں تو لڑکا ادھر اپنے پیروں پر کھڑا ہوا... ادھر ماں باپ نے اس کا گھر بسانے کی فکر کی... کوئی لڑکی تو ہوگی نظر میں تمہاری...''

ناصر بوکھلا گیا۔ ''جی... جی ابھی کچھ پتا نہیں... میرا مطلب ہے سوچا نہیں شادی کا...''

''یار ہم نے تو اس لیے پوچھا کہ ہو تو ہمیں بتا دو... ہم کوشش کریں... والدین تو ہیں نہیں تمہارے۔''

''جی... مگر بڑے بھائی ہیں، والد کی جگہ...''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہمارا مسئلہ تو یہ ہے کہ اپنی ذات برادری کے باہر شادی نہیں ہوتی۔ ورنہ میرے اپنے خاندان میں ہیں لڑکیاں... خیر چھوڑو، میں آیا تھا کچھ اور بات کرنے... تم کو معلوم تو ہوگا کہ آنے والے انتخابات میں صوبائی اسمبلی کے لیے میری نامزدگی یقینی ہے۔ اس کی تیاری ابھی سے ہوگی، ایک تو میرا خیال ہے کہ اپنا کوئی اخبار ہونا چاہیے اور ٹی وی چینل... کچھ اخبار اور چینل جو زیادہ دیکھے جاتے ہیں پیسا منہ پھاڑ کے مانگتے ہیں۔ نہ دیکھے جانے والے چینلز پر پیسا ضائع ہوتا ہے، تم کیا کہتے ہو؟''

وہ پھر چونکا۔ ''جی... میں کیا کہوں... مجھے کوئی تجربہ نہیں۔''

''تجربہ کام کرنے سے آتا ہے ناصر... میں سوچتا ہوں تم کو اپنا پی آر او بنا لوں... پھر تم ہی سب کنویسنگ کی نگرانی کرو... یہ جو مضامین وغیرہ شائع ہوں گے، وہ لکھوائے جائیں گے اور تم صرف دیکھو گے... لکھنے والے اسی آفس میں بیٹھ سکتے ہیں۔ میں تم کو ان لوگوں سے ملوا دوں گا۔ یہ جو ایڈیٹر اور کالم لکھنے والے ہیں تاکہ پریس کانفرنس وغیرہ ہو تو تم بندوبست کر سکو۔''

ناصر نے اس کام کے لیے کسی رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ ایسے بات کر رہا تھا جیسے اس نے یہ شاندار آفر قبول کر لی ہے جس میں پیسا تو کسی شمار میں نہ تھا۔ اقتدار اور اختیار کے روشن مستقبل کے تمام راستے کھلتے تھے جو دولت مندی اور شہرت کی طرف لے جاتے تھے۔ ایسا مستقبل ہر نوجوان کا خواب ہوتا ہے مگر اسے تو تعبیر مل گئی تھی۔ فوراً انکار کرنا مصلحت نہ تھی۔ وہ خاموش رہا اور اس کے جانے کے بعد آفس پہنچ کے سوچتا رہا کہ اس فراخدلانہ پیشکش کو کیا سمجھے؟ رشوت یا عینی سے دستبرداری کی قیمت... کیونکہ باقی سب باتیں زیبِ داستاں کے لیے تھیں۔ آیا وہ صرف ایک جملہ بولنے کے ارادے سے تھا ہم خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے۔

عینی اگلے دن آئی تو ناصر نے اسے محترم اباجی کے ساتھ لنچ پر ہونے والی گفتگو اور ان کی پیشکش کا احوال سنایا تو وہ بہت حیران ہوئی۔ ''مجھ سے تو انہوں نے کبھی اس موضوع پر بات نہیں کی۔''

''جو تم سے کہنا ضروری تھا، وہ مجھے بتا دیا اور معلوم ہو گیا تمہیں...''

عینی نے اسے بکواس کہنے کے انداز میں ٹال دیا۔ ''تم چھوڑو ان کی بات... زندگی میری ہے تو فیصلہ بھی میرا ہوگا اور انہوں نے آج تک میری بات نہیں ٹالی۔''

وہ حسبِ سابق ملتے اور ہر جگہ ساتھ نظر آتے رہے۔ بھٹی صاحب کے جاسوس ان کو پل پل کی خبر پہنچاتے رہے۔ وہ جہاں دیدہ شخص پرانا بیوروکریٹ اور اب سیاست کی بساط کا شاطر تھا۔ بیٹی کی بغاوت سے ہونے والی جگ ہنسائی اس کے لیے چیلنج بنی تو اس نے بڑی آسانی سے ناصر کا پتا کاٹ دیا۔ وہ ٹی وی دیکھتا ہی نہیں تھا۔ ایک رات آٹھ بجے بھٹی صاحب کی اصل سیاسی حریف نے بھٹی صاحب کی بدعوانیوں کے بارے میں بڑے سنسنی خیز انکشافات کیے اور کچھ دستاویزی ثبوت بھی پیش کیے، یہ سب صبح کے ایک اخبار میں زیادہ تفصیل کے ساتھ شائع ہوا۔

عینی آئی تو سخت چراغ پا تھی۔ اس نے اخبارات ناصر کے سامنے میز پر پٹخ دیے۔ ''یہ کیا ہے؟''

ناصر نے حیرانی سے کہا۔ ''کیا ہے؟''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس حد تک گر سکتے ہو پیسے کے لیے۔'' وہ برہمی سے بولی۔ ''کتنا پیسا ملا تمہیں اباجی کے خلاف یہ مواد فراہم کرنے کا... پانچ لاکھ... دس لاکھ... بیس لاکھ...''

اس کا چہرہ گرم ہوگیا۔ ''یہ کیا فضول بات ہے عینی... کیا میں ایسا ہوں؟''

وہ چیخ کے بولی۔ ''ہاں، ایسے ہی ہو تم... دھوکا میری نظر کو ہوا... تم بے ضمیر احسان فراموش آدمی ہو... جس تھالی میں کھاتے رہے اسی میں چھید کیا... گھر کے بھیدی بن کے دشمنوں کو سب بتادیا۔''

ناصر کی سمجھ میں یہ بات تب آئی جب اس نے اخبار دیکھا۔ اس میں ٹی وی پروگرام کے حوالے سے بہت سے انکشافات حقیقت پر مبنی تھے تو کچھ سفید جھوٹ بھی بھٹی صاحب سے منسوب کیے گئے تھے اور ان کے حریف کا کہنا تھا کہ یہ انفارمیشن ان کو مستند ذرائع سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کا نام نہیں تھا مگر فیشن میگزین کے ادارتی عملے میں شامل ایک معتمدِ خاص کا تھا۔

ناصر نے اخبارات اٹھا کے نیچے پھینک دیے۔ ''تم سمجھتی ہو یہ میں نے کیا؟ یقین کرتی ہو اس جھوٹ اور بکواس پر...''

اس نے ایک گلاس پانی پیا۔ ''دیکھو ناصر، اس سے میرے والد کی گڈول خراب ہوگی... مگر ان کے سیاسی کیریئر کو نقصان نہیں ہوگا... اور میں ایسی بیٹی نہیں ہوں کہ باپ کے کسی دشمن کا وجود برداشت کروں۔''

''بند کرواپنی یہ بکواس... کیا ثبوت ہے کہ یہ سب میں نے بتایا تھا؟''

''ثبوت، میں دکھاتی ہوں تمہیں...'' اس نے ناصر کا کمپیوٹر آن کیا اور کچھ تلاش کرتی رہی۔ ''یہ دیکھو... پڑھو... یہ تمہارا کمپیوٹر کوئی اور تو استعمال نہیں کرتا نا... اس کا پاس ورڈ صرف تم جانتے ہو... یہ حوالے ہماری فائلوں کے ہیں... ان اعداد و شمار کا علم باہر کے آدمی کو نہیں ہوسکتا... ان کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا... بے شک ہم نے ٹیکس بچایا... سب بچاتے ہیں... غلط گوشوارے دیے... سب دیتے ہیں مگر وہ حساب جو ہمارے پاس ہے ہمارے بینک اکاؤنٹس کی تفصیل... امپورٹ کی جانے والی کار تم استعمال کررہے ہو... مگر ڈیوٹی بچانے کا گھپلا بھی تم نے ہی بتایا... آفرین ہے تم پر ناصر... مجھ پر بھی ڈورے اسی لیے ڈالے تھے تم نے کہ بھٹی صاحب کی عزت کو رسوائی کا تماشا بنادو...''

ناصر سمجھ گیا تھا کہ یہ سب کس نے کیسے کیا اور کیوں کیا... بھٹی صاحب کی ایک ترپ چال نے محبت کی جیتی ہوئی بازی کو اس کی ہار میں بدل دیا تھا۔ اب عینی کو قائل کرنا مشکل تھا بلکہ ناممکن تھا۔ اس کی محبت راتوں رات نفرت میں تبدیل ہوچکی تھی۔ اب اس کا عینی کے لیے کام کرنے کا سوال ہی نہ تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ چارج دے کر اپنا استعفیٰ لکھتا... پولیس اسے گرفتار کرنے آگئی۔ بھٹی صاحب نے اس پر دفتری راز چوری کرنے اور اہم دستاویزات فروخت کرنے کا الزام لگایا تھا۔ الزام وہ کوئی نہ لگاتے تب بھی پولیس کے لیے ان کا ایک اشارہ کافی تھا۔ باقی الزامات کا اضافہ خود پولیس کرسکتی تھی۔ ثبوتِ شہادت اقبالِ جرم عدالت میں پیش کردینا بھی کوئی مسئلہ نہ ہوتا اور سزا دلوانا بھی... تھانے میں اس کے ساتھ وہی سلوک ہوا جو اخلاقی مجرموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس پر دوسرا مقدمہ ایک لڑکی نے کھڑا کردیا کہ ناصر نے اسے ریپ کیا اس کی ویڈیو بنائی اور اب تک اسے بلیک میل کررہا ہے... وہ لڑکی اب راولپنڈی میں تھی چنانچہ اسے راولپنڈی لے جایا گیا۔ وہ ہزاروں خود فروش لڑکیوں میں سے کوئی بھی ہوسکتی تھی۔ نہ ناصر کو ویڈیو دکھائی گئی نہ لڑکی... اس کے خلاف دوسرا مقدمہ وہاں درج ہوا۔ زندہ وہ اس لیے رہا کہ لیکچرر تھا اور اس کے بہن بھائی ہائی کورٹ پہنچ گئے تھے۔ وہ پنڈی میں ہی تھا کہ لاہور میں کئی لوگ سامنے آگئے جو کہتے تھے کہ ناصر نے ریکروٹنگ ایجنٹ بن کے انہیں سعودی عرب میں ملازمت دلانے کے ایک ایک لاکھ لیے تھے۔ ان تمام مقدمات کا مرکزی نکتہ اسے پیسے کا بھوکا اور لالچ میں ہر غلط کام کا عادی مجرم ثابت کرنا تھا۔ یہی اس نے بھٹی صاحب کے ساتھ کیا تھا۔ ولایت کی پڑھی اور نازوں کی پلی عینی ان سب چکروں کو خاک سمجھتی... اس کا یقین پختہ ہوگیا کہ ناصر نے محبت نہیں کی تھی... ایک دولت مند کی بیٹی سمجھ کے پھنسایا تھا۔

وہ اس رات بھر کی شناسائی میں ڈاکٹر ہما کی مدد تو کرسکتا تھا لیکن یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ اسے پولیس ہتھکڑیاں ڈال کے لاہور کیوں لارہی تھی۔ ابھی تو نہ جانے کہاں کہاں اس پر اور کتنے کیس ہوں گے۔ اگر کسی کے قتل کی فائل بھی اسے مجرم ثابت کرنے سے بند ہوتی ہے تو کیا فرق پڑتا ہے کہ اسے پھانسی لٹکا دیا جائے۔

☆☆☆

ڈاکٹر ہما نے اسے خیالوں میں غرق صوفے پر کسی بے جان مجسمے کی طرح بیٹھا دیکھا تھا بالکل بے حس و حرکت اور گرد و پیش سے بے خبر... اس کی نظریں کہیں بھی نہیں تھیں۔ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ ساڑھے آٹھ بجے اٹھی تو واش روم چلی گئی تھی اور آدھے گھنٹے بعد فریش ہو کے نکلی تو اسے سخت بھوک لگی ہوئی تھی۔ ناصر اس وقت بھی اسی پوز میں منجمد تھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ ڈری کہ خدانخواستہ وہ بیٹھے بیٹھے گزر تو نہیں گیا۔ ہارٹ فیل کسی کا بھی ہو سکتا ہے پھر اس نے اپنے بیہودہ منحوس خیال پر خود کو ملامت کی اور ناصر کے سامنے جا کے چٹکی بجائی۔

''ہیلو...''

وہ بری طرح چونکا اور ہما کو یوں دیکھتا رہا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو مگر یہ ایک بہت ہی مختصر لمحہ تھا پھر جیسے وہ زندہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جاگ اٹھیں۔ لبوں پر مسکراہٹ آ گئی اور چہرے پر وہی مہرباں اعتماد دینے والی مانوسیت... ''اٹھ گئیں تم... میں سوچ رہا تھا کہ تمہیں جگاؤں یا اکیلا ہی ناشتا کر لوں۔''

وہ ناصر کے سامنے بھی بیٹھ سکتی تھی مگر اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''نہیں، تم کچھ اور سوچ رہے تھے جو تم بتاؤ گے نہیں تو میں پوچھوں گی نہیں۔''

ناصر کو اس کے بھیگے بدن کی مہک اور ٹائلٹ سوپ یا واش روم میں رکھے گئے شیمپو کی ملی جلی خوشبو بے خود کرنے لگی۔ اس کی اجلی اور دھلی ہوئی جلد یوں لگتی تھی جیسے صبح شبنم میں بھیگی گلاب کے پھول کی پتی... روم سروس کو فون کرنے کے بہانے وہ نہ اٹھتا تو جدید وضع کی قمیص کے خاصا کشادہ گلے میں اس کی نظر نہ جانے کہاں تک بھٹکتی کیونکہ ہما نے کمرے میں دوپٹے کو اتار پھینکا تھا۔

وہ ناشتے کا آرڈر دے کر مڑا۔ ''نیند کیسی آئی؟''

''مدہوشی کی۔ تم کو میری وجہ سے کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی نا؟''

ناصر نے جھوٹ بولا۔ ''نہیں، میری بات کا غلط مطلب نہ نکالنا... کوئی پاکستانی ماحول کی پروردہ لڑکی ہوٹل میں کسی اجنبی کے ساتھ ایک بیڈ پر نہیں سوئے گی۔ خواہ اسے ساری رات جاگنا پڑے۔''

وہ ہنسی۔ ''میری مرضی کے بغیر تم مجھے کس کرنا چاہتے تو شاید میں برداشت کرتی... کیونکہ تم نے میری مدد کی تھی ہر طرح سے... یہ کپڑے بھی تمہارے دیے ہوئے ہیں... کھانا پینا...''

''پلیز ہما... یہ کیا گھٹیا بات ہے... مجھے بتاؤ آج تم اپنے محمد شریف کو کہاں تلاش کرو گی اور کیسے؟''

''میری سمجھ میں کیا آئے گا، تم بتاؤ۔''

''اچھا... میں اگر مان لوں کہ تمہیں اس کا فون نمبر یاد نہیں... اور اگر وہ تم سے رابطہ کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا اور تم ایک کے بعد دوسری بے وقوفی کرتی جا رہی ہو۔''

''یہ ٹھیک ہے۔ مجھے بتا کے آنا چاہیے تھا۔''

''نہیں، اس کے بعد جب اس کے گھر کی اوپر والی منزل پر رہنے والے ایک شخص نے بتایا کہ وہ لاہور چلا گیا ہے تو تم نے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ مطلب یہ کہ رشتے دار بھائی، مالک مکان یا کرائے دار؟''

ہما نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مجھے پوچھنا چاہیے تھا۔''

''اس کے بعد... تمہاری لاہور میں اس سے بات ہوئی اور اس نے اپنا پتا بتایا۔ وہ تم نے نوٹ بک میں لکھا۔ اس کا لاہور والا نمبر بھی اس گم شدہ نوٹ بک میں تھا۔ اب تمہیں کچھ یاد نہیں۔''

''ہاں۔'' وہ نظر چرا کے بولی۔

''تمہاری یادداشت اتنی کمزور ہے... تو کسی دوا کا نام تمہیں کیسے یاد آ جاتا ہے مرض کی علامات دیکھتے ہی...''

''وہ تو میں رٹ چکی ہوں۔ میموری میں ہیں۔'' ویٹر نے ناک کیا اور ناشتا لے آیا۔

ناشتے کے دوران میں وہ بالکل خاموش رہے۔ ہما کے چہرے سے بشاشت غائب ہو چکی تھی لیکن ناصر کے خیال میں اس کا سبب کچھ اور تھا۔ بیس منٹ بعد ناصر نے پھر سوالات کا سلسلہ شروع کیا۔

''یہ محمد شریف، جس کا تین شہروں میں بزنس ہے اتنا غیر معروف نہیں ہو سکتا۔ تم نے کہا کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے ہم آج سارا دن پھر کے سب امپورٹرز ایکسپورٹرز سے پوچھیں... محمد شریف کتنے ہوں گے آخر...''

''ہاں ایسا کر سکتے ہیں ہم...''

''ٹیلی فون انکوائری بھی ایک طریقہ ہے۔ محمد شریف امپورٹر ایکسپورٹر... فرض کرو لاہور میں سو ملتے ہیں تو سو کالیں کی جا سکتی ہیں۔''

ہما نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''ہاں۔''

''دراصل تم اس سے ملے بغیر واپس جانا نہیں چاہتیں... ورنہ تو ہم سیدھے جاتے اسلام آباد اور برٹش

ایمبیسی خود تمہیں لندن پہنچانے کی پابند ہوتی۔"
"میرے خیال میں اب یہی بہتر ہے۔"
"مگر ہما... اسلام آباد جا کے تم پھر اس کے گھر پہنچ جاؤ تو وہ شخص جو اوپر رہتا ہے وہ تمہاری پھر شریف سے بات کرا دے گا۔ اس کے پاس نمبر ہے فون کا۔"
"یہ بھی ہو سکتا ہے۔"
ناصر ایک دم پلٹ کے دہاڑا۔ "اسٹاپ دس نان سنس ہما... بند کرو جھوٹ کا یہ سلسلہ... کہاں تک جھوٹ بولو گی آخر تم مجھ سے۔ میں تو مدد کر رہا ہوں تمہاری... اور تم مجھے مسلسل بے وقوف بنا رہی ہو... کیوں؟ مجھے تو اب شک ہو رہا ہے کہ تم لندن سے آئی ہو یا نہیں... اور ڈاکٹر ہما ہو یا کوئی... عام لڑکی..."
وہ ہسٹریائی انداز میں چلائی۔ "شٹ اپ... میں ڈاکٹر ہما ہوں... اور لندن سے آئی ہوں..." وہ ایک دم اٹھی اور بیڈ پر الٹی گر کے ہچکیوں سے رونے لگی۔ "مگر جھوٹ ضرور بولا ہے میں نے تم سے..."
ناصر نے قریب بیٹھ کے آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سہلایا۔ "کوئی بات نہیں ہما... میں اب بھی تمہارے ساتھ ہوں، تم مجھے سچ بتا دو... یہاں کیوں آئی تھیں تم..."
آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ پھسلتا ہوا ہما کی ریشمی کمر پر آ گیا۔ سانچے میں ڈھلی ہوئی دونوں جانب سے خم کھا کے تنگی اور پھیلتی قوسوں کا تناسب... ایک دم سر کو جھٹک کے اس نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "کم آن ہما... میں تمہارے ساتھ ہوں... تمہیں کوئی مشکل نہیں ہونے دوں گا... اٹھو... بی اے گڈ گرل۔"
ہما اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر دو گھونٹ حلق سے اتارے اور گلاس پھر اسے پکڑا کے اپنے بالوں کو پیچھے کیا۔ "میں نے بہت برا کیا تم سے جھوٹ بول کر... اصل بات یہ ہے کہ... میں اس سے ملی تھی۔"
ناصر بھونچکا رہ گیا۔ "تم شریف سے ملی تھیں؟"
اس نے اقرار میں سر ہلایا تو آنکھوں میں آ جانے والے آنسو پھر بہہ نکلے۔ "دی باسٹرڈ... اس نے دھوکا دیا مجھے... اتنا عرصہ وہ جھوٹ بولتا رہا بڑی بے شرمی سے... اور اگر میں نہ آتی تو اس کے جھوٹ کا بھرم کیسے کھلتا... ایک سال پہلے اس سے جان پہچان ہوئی تھی اور چھ مہینے سے وہ محبت جتا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم وہ یقین دلانے والے ڈائیلاگ کہاں سے لاتا تھا۔ کسی سے لکھواتا تھا یا فلموں کے... مجھ جیسی بے وقوف لڑکیاں بار بار دھوکا کھاتی ہیں

پھر انہی بیٹھی اور پھر بے وقوف بننے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔ وہ واقعی کسی کو اپنا بنانا چاہتی ہیں۔ کسی کی ہو جانا چاہتی ہیں۔"
"اس سے پہلے بھی..."
"چھوڑو ان کا اب کیا ذکر... مرد صرف غرض سے محبت جتاتے ہیں۔ ان کا پیار صرف جال ہوتا ہے ہوس کا۔"
وہ نفرت سے بولی۔
"تم کہہ سکتی ہو کہ یہ تمہارا تجربہ تھا۔ میرا تجربہ اس کے برعکس ہے۔ مگر تم بتاؤ کیا اس نے شادی کی بات کی تھی؟"
"ہاں، کئی بار... وہ کہتا تھا کہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ لندن آ جاؤں، اپنا بزنس یہاں سے ختم کر دوں اور وہاں کروں۔ پھر ہم شادی کر لیں اور زندگی سنور جائے... اس وقت مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ وہ برٹش نیشنل ہونے کے لیے مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ میں سمجھتی رہی کہ بزنس کو جو تین شہروں میں پھیلا ہوا ہے وائنڈ اپ کرنا اتنا آسان نہیں۔ اسی لیے وہ آ نہیں پا رہا اور نہ تو ویزا لے اور آ جائے... بس اس کے بعد میں نے سوچا کہ خود جاؤں اور اگر شادی سے مسئلہ حل ہونے میں مدد ملتی ہے تو وہاں شادی آسان ہے اور رسک والی بات بھی ہے۔ یہاں تو کھڑے کھڑے مرد ایک کو چھوڑے دوسری کو پکڑ لے... تین لفظ ادھر تین دوسری طرف... برطانیہ میں یہ ممکن تو ہے مگر بڑی قیمت دینی پڑتی ہے بیوی کو چھوڑنے کی... خیر، ایک دن میں نے اس سے بات کی تو وہ گھبرا گیا۔ کہنے لگا کہ ایسے اچانک آنے سے کام نہ خراب ہو جائے۔ میں ذرا اپنے والدین کو بھی راضی کر لوں... میں نے کہا کہ ابھی تک تم نے ان کو بتایا بھی نہیں؟ تو وہ بولا کہ ہما یہ پاکستان ہے تم رہتی ہو لندن میں... اور تمہارے ماں باپ ہوتے تب بھی تمہاری راہ میں حائل نہیں ہو سکتے تھے۔ نہ جانے کیوں میرے دماغ میں شک کا کیڑا کلبلایا۔ کہاں اس کی بے قراری اور کہاں یہ بیزاری... بس میں نے سوچ لیا کہ ایک بار اچانک پہنچ کے سب دیکھ لوں۔" وہ چپ ہو گئی۔
"اور جو تم نے دیکھا وہ اس کے برعکس تھا جو تم نے سوچا تھا؟"
اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "اس نے گھر کی جو تصویریں دکھائی تھیں وہ اپنی جگہ تھا... مگر اس کا نہیں تھا۔ وہ ایک بیچلرز ہوسٹل ٹائپ جگہ تھی جسے مالک گیسٹ ہاؤس کہتا تھا۔ وہ خود اوپر کی منزل پر تھا۔ نیچے چھ افراد تین بیڈ روم شیئرز کرتے تھے۔ میں دن کے وقت پہنچی تو نیچے کوئی نہیں تھا۔ سب ڈیوٹی پر گئے ہوئے تھے۔ لینڈ لارڈ نیچے آیا تو میں

نے شریف کا پوچھا۔ وہ بولا کہ اس وقت وہ کہاں ملتا ہے۔ رات کو آتا ہے۔ جب دوسرے آتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ وہ بولا کہ میں مالک مکان ہوں اور تم کون؟ میں نے بتایا کہ میں لندن سے آئی ہوں تو وہ شک میں پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ اس کا کمرا کھول کے تمہیں بٹھانا تو مشکل ہے کیونکہ اس کے ساتھ دوسرا شخص بھی رہتا ہے۔ اس نے مجھے محمد شریف کے آفس کا پتا اور فون نمبر دے دیا کہ تم چاہو تو اس سے مل لو۔ میں پتا تلاش کرتی ٹیکسی میں اس کے آفس پہنچی۔ وہ کسی کنسٹرکشن کمپنی کا آفس تھا۔ شاندار ذاتی گھر کا جھوٹ سامنے آ گیا تھا۔ مجھے اس کی ذاتی کار آفس کے باہر کھڑی نظر آ گئی۔ پہلے ایک پھر دوسری... ان میں سے اس کی مرسی اور کاغان والی تصویریں میرے پاس تھیں... مجھے شک ہوا کہ یہ آفس کی نہ ہوں۔ میں نے شریف کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا۔ یہ ضروری تھا کہ میں استقبالیہ پہ اپنا نام درج کراؤں۔ وہاں ایک عمر رسیدہ شخص ظہر کی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں نے انتظار کیا اور پھر اسے اپنے بارے میں بتایا کہ میں ڈاکٹر ہما ہوں۔ میرے لیے شریف کا پیغام آیا تھا۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ وہ یہاں کیا کرتا ہے اور کتنی تنخواہ لیتا ہے۔ اس آدمی کی صورت پر بارہ بج گئے۔ اس نے کہا کہ وہ آپ سے دوسری شادی کر رہا ہے؟ مجھے سخت شاک لگا۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ شادی شدہ ہے تو اس نے بتایا کہ اس کی بیوی لاہور میں ہے اور اس کے دو بچے ہیں جو اسکول میں پڑھتے ہیں۔ وہ انجینئر نہیں اوورسیئر ہے... تنخواہ اسے ساٹھ ہزار ملتی ہے اور وہ ہر جمعے کی شام لاہور چلا جاتا ہے۔ اس روز جمعہ ہی تھا۔ میں نے پوچھا کہ وہ کس ٹرین سے جاتا ہے تو انہوں نے یہ بھی بتا دیا۔ میں نے درخواست کی کہ شریف کو میری آمد کے بارے میں کچھ نہ بتائیں... ان سے میں نے کہا کہ میں واپس لندن چلی جاؤں گی مگر میں ریلوے اسٹیشن پہنچ گئی۔ میرا ارادہ اس کے پیچھے پیچھے گھر تک جانے کا تھا۔''

ان کے درمیان خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہما فرش کو دیکھتی رہی اور وہ ہما کے پشیمان اور پریشان چہرے پر اداسی کے تاثر کو دیکھتا رہا۔ جو فصل گل میں صحنِ چمن پر اترنے والی اداس شام جیسا تھا۔ ''تم نے اسے ٹرین میں سوار ہوتا دیکھا تھا؟''

ہما نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''وہ اگلی بوگی میں تھا۔ اب نہیں معلوم... اور میں معلوم کر کے بھی کیا کروں گی؟''

ناصر نے اس کے گلابی ہاتھ پر تھپکی دی۔ ''اچھا ہے اگر تم اپنی زندگی کی طرف لوٹ جاؤ، اور یہ سب بھول جاؤ۔''

''یوں ناصر... میں ہمیشہ سراب کے پیچھے دوڑتی رہی۔ مجھے ایک مکمل اور خوشیوں سے معمور اپنے گھر کی تمنا تھی۔ میری ماں زندہ ہے... اس نے دوسری شادی کر لی تھی... ایک انگریز سے... اور اس نے مجھے بھی بھلا دیا تھا میں نے جب اس سے ملنا چاہا اس نے انکار کر دیا۔ حالانکہ میں اس کی ایک ہی اولاد تھی۔ اب اس کا شوہر بستر مرگ پر ہے۔ اس کے بعد وہ اکیلی رہ جائے گی۔ کیسی ماں ہے وہ... اور میرا باپ... اس نے پھر شادی نہیں کی... وہ کہتا تھا کہ یہ روگ پالنے کی کیا ضرورت ہے... وہ شراب بھی بہت پیتا تھا اور فاحشہ عورتوں کو گھر میں لے آتا تھا... اسے ذرا شرم نہیں آتی تھی۔ گھر میں جوان بیٹی ہے... کیا باپ ایسے ہوتے ہیں... میں نے لندن میں بھی ایسے گھرانے دیکھے ہیں جہاں دادا، دادی، ماں باپ اور بچے سب مل کے رہتے ہیں۔ بچوں کے چچا اور ماموں... خالہ اور پھوپی... سب ملتے ہیں۔ مجھے تو ماں باپ بھی نہیں ملے... نہ بہن بھائی... میں ایسا ایک گھر بنا سکتی تھی جہاں یہ سب رشتے ہوں... مجھ میں خواہش بھی اور صلاحیت... لیکن لگتا ہے میرے نصیب میں محرومی کے ساتھ جینا اور اکیلے رہنا لکھا ہے۔''

''اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ دھوکے تو میں نے بھی کھائے ہیں۔ لیکن میں اکیلا نہیں ہوں۔ میرے ماں باپ تھوڑے وقفے کے ساتھ دنیا میں آئے تھے... تھوڑے سے وقفے کے ساتھ چلے گئے۔ لیکن میرا بڑا بھائی ہے، ایک چھوٹا بھائی اور ایک چھوٹی بہن جو مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ بڑے بھائی کے بچے مجھے چاچو کہتے ہیں۔ چھوٹی بہن کے چندا ماما... یہ میری بہن نے سکھایا ان کو...'' وہ ہنسا۔ ''کیا تم ان سے ملو گی؟ وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے۔''

''یہ تم ابھی سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''کیونکہ مجھ سے بہتر ان کو تم نہیں جانتیں... اور اگر تمہیں واپس جانے کی جلدی نہ ہو تو میرے ساتھ کراچی چلو، تمہارا ویزا تو چھ مہینے کا ہوگا کم سے کم... اور کراچی میں برٹش قونصلیٹ بھی تمہارے گم شدہ پاسپورٹ کا مسئلہ حل کر دے گا۔ لندن کی فلائٹ تمہیں کراچی سے بھی مل سکتی ہے۔''

وہ ہنس پڑی اور ناصر کو یہ بڑا عجیب لگا کیونکہ ابھی چند منٹ قبل وہ رو رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں ابھی آنسوؤں کی نمی باقی تھی۔ ناصر کو اس دھوپ کا خیال آیا جو بارش کی پھوار میں بادلوں سے گھرے آسمان کی کسی درز سے جھانکتی

ہے۔ ”تم نے تو میرا سارا پروگرام مرتب کردیا۔ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

وہ جھینپ کے چونکا۔ ”دیکھ تو تمہیں ہی رہا تھا۔ روتے روتے تمہارا یوں ہنسنا اچھا لگا۔ بولو چلو گی میرے ساتھ؟“

اس نے مسکرا کے اقرار میں سر ہلایا۔ ”ضرور چلوں گی... تم کیا بتاؤ گے انہیں میرے بارے میں کہ کون ہوں؟“

”بس اتنا کہ تم اچھی دوست ہو... ڈاکٹر ہما ہو اور لندن سے آئی ہو۔ اب آج کا دن میں تم کو لاہور دکھاؤں گا۔“

وہ بچوں کی طرح خوش ہوگئی۔ ”ہاں میرے باپ نے بتایا، اپنے باپ کے بارے میں... وہ کہتا تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ کیسی عجیب بات ہے۔ کیا پتا پھر آنا ہو نہ ہو۔ بس آج تم مجھے لاہور پھرا دو۔“

”آئی ایم سوری ہما۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”کاش میں ایسا کرسکتا۔“

وہ کچھ حیران ہوئی۔ ”تم ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟“

”اس لیے... کہ میں پولیس کی حراست سے بھاگا ہوا ایک مفرور مجرم ہوں... وہ مجھے پھر نہ پکڑ لیں۔“

وہ کنفیوز نظر آنے لگی۔ ”تم مذاق کررہے ہو نا... ایسا نہیں ہوسکتا... تم کوئی جرم کیسے کرسکتے ہو؟“

وہ مسکرایا۔ ”مائی ڈیئر ایک جرم ضرور کیا تھا میں نے... میں نے محبت کی تھی۔“

”اس جرم پر پولیس نے پکڑ لیا تمہیں؟“ وہ کھلکھلا کے ہنسی۔ ”ناؤ کم آن۔“

اس نے ہما کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”اس بار شاید وہ مجھے گرفتار کرنے کے بعد پولیس مقابلے میں ماردیں گے۔ تم کو کوئی اندازہ نہیں کہ میرے خلاف کیسے سنگین الزامات ہیں، سنوگی تو یقین نہیں کروگی۔“

☆☆☆

کراچی کے انٹرنیشنل ائرپورٹ کے ڈپارچر لاؤنج کے سامنے بہت رش تھا۔ جو لوگ اپنے پیاروں کو چھوڑنے آئے تھے، وہ لاؤنج کے دروازے کی سرحد عبور کرنے سے پہلے جدائی کے آخری لمحات سے گزر رہے تھے۔ سوائے ان کے جن کے لیے آنا جانا روز کی بات تھی وہ اداس تھے۔ کچھ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ غم کے بھی خوشی کے بھی۔ وہ یوں مل رہے تھے جیسے آخری بار مل رہے ہوں۔ ڈپارچر لاؤنج کے شفاف شیشے کے دروازے پر مستعد کھڑے اے ایس ایف کے محافظ اس بات کو یقینی بناتے تھے کہ اندر وہی جائے جو اس کی اہلیت کا ثبوت رکھتا ہو۔ اس سرحد سے گزر جانے والے مڑمڑ کر دیکھتے ہوئے آگے بڑھتے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ آگے مسافروں کے ہجوم میں گم ہوجاتے تھے۔ پیچھے رہ جانے والے پھر بھی کھڑے رہتے تھے کہ شاید ان کی ایک جھلک اور دکھائی دے جائے جو کچھ دیر میں سات سمندر پار جانے کے لیے اُڑ جائیں گے۔

ناصر نے اپنے بڑے بھائی کو دیکھا۔ وہ ہما کو بڑی شفقت سے کچھ سمجھا رہے تھے۔ ”دلہن! پریشان مت ہونا اور دیکھو فون ضرور کرنا روز... اور اپنا خیال رکھنا...“ ہما آنکھوں میں آنسو لیے سر ہلاتی رہی۔

پھر اس کا چھوٹا بھائی آگے بڑھا۔ ”بھابی... فکر مت کرنا۔ میں ناصر بھائی کی پوری خفیہ رپورٹ آپ کو روز دوں گا۔ بس ذرا لگام کھینچ کے رکھنا، سنا ہے یہ میمیں بڑی جادوگر ہوتی ہیں۔ بھیا تو بالکل وہ ہیں... گونگلو... گونگلو... سمجھتی ہیں آپ؟“

وہ مسکرائی۔ ”لگام کھینچ کے رکھنے کی ضرورت اب تمہیں ہے۔ کہو تو تمہارے لیے دیکھوں کوئی میم... گونگلو...“

وہ رازداری سے بولا۔ ”ارے اللہ خوش رکھے بھابی... ایک کے دو دے... بس ہو تم جیسی...“

ابھی وہ سب ہنس رہے تھے پھر روتی ہوئی ناصر کی چھوٹی بہن آگے آئی اور ہما کے بازو پر امام ضامن باندھنے لگی۔ ”اللہ اپنی امان میں رکھیں... جلدی منہ دکھایئے...“ اس نے کچھ پڑھ کے ہما پر پھونکا، ہما پھر رونے لگی۔

”اچھا، میں چلتی ہوں۔“ ہما نے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہمت کرکے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

کوئی اور جگہ ہوتی کوئی اور وقت ہوتا تو وہ لندن میں پیدا ہوکے مغرب کی آزاد فضاؤں میں پلی بڑھی لڑکی کسی تکلف یا شرم کے بغیر مجمع عام میں اس سے چمٹ کراسے یوں کس کرتی کہ لب چپک کے رہ جاتے اور کوئی نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھتا مگر اچانک کسی جادوئی عمل سے وہ ایک روایتی مشرقی لڑکی اور ایک خاندانی بہو بن گئی تھی۔

ناصر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”خداحافظ۔“ وہ اس سے زیادہ نہ کہہ سکا۔ اسے احساس تھا کہ چھوٹے بڑے سب دیکھ رہے ہیں۔ اس نے آہستہ سے اس مہندی لگے ہاتھ کو دبایا اور چھوڑ دیا۔ وہ ٹرالی بیگ کھینچتی آہستہ آہستہ گیٹ کی طرف بڑھی اور مڑمڑ کے دیکھتی ان کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

جب ان کی کار پارکنگ ایریا سے نکل کے شاہراہ فیصل کی سڑک پر رواں تھی تو امارات کا ایک جہاز اوپر سے گزرا۔ اور ناصر کی چھوٹی بہن نے کہا۔ ''بھگی بھابی۔'' اور منہ اٹھا کے جہاز کو دیکھتی رہی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے ناصر نے بھی نظر اٹھا کے جہاز کو دیکھا اور اس خیال سے اداس ہوا کہ اب سے دو یا چار ہفتے بعد جب اسے برطانیہ جانے کا ویزا مل جائے گا تو اس کار میں واپس جاتے ہوئے ایک سیٹ اور خالی ہوگی۔ یہ سارا سین پھر دہرایا جائے گا۔ اب وہ بھی ان میں شامل ہو چکا ہے جو کامل اعتقاد سے کہتے ہیں کہ جوڑے آسمان پر بنتے ہیں۔ جس سفاک رات نے نہ جانے ایک ٹرین کے حادثے میں کتنے گھروں کی روشنی چھین لی تھی۔ اس نے کس طرح زندگی کے دو متضاد راستوں سے بھٹکتے ہوئے آنے والے ناصر اور ڈاکٹر ہما آف لندن کو یکجا کر دیا تھا۔ کتنی محبتوں کے قریب کھا کے مشرق اور مغرب سے آکے وہ اور ہما مل گئے تھے۔ سلسلۂ روز و شب نقش گر حادثات... زندگی بھی کیا طرفہ تماشا ہے۔

ہما کی جادوگری کا وہ قائل ہو گیا تھا۔ اس نے ناصر کو ہی نہیں اپنایا تھا۔ وہ کام کیے تھے جو ممکن ہی نہیں لگتے تھے۔ اس نے ناصر کے گھر کو اپنا گھر بنالیا تھا۔ وہی اور ویسا ہی گھر جیسا اس کی خواہشوں کا محور تھا۔ اس نے سب گھر والوں کو اپنا لیا تھا۔ ایسے کہ وہ ناصر کی قسمت پر رشک کرنے لگے تھے۔

اور جب اسے شادی کے ہنگاموں سے فرصت ملی تو وہ ناصر کو ہاتھ پکڑ کے لاہور لے گئی۔ کچھ کام وہ پہلے ہی کر چکی تھی۔ اس نے وہ ریوالور نہ جانے کہاں اور کب کسی گٹر میں ڈال دیا تھا۔ اس نے کسی نامعلوم مسافر کا بریف کیس اس کے کاغذات میں سے پتا تلاش کر کے پوری رقم کے ساتھ فیملی کو ڈیلیور کرا دیا تھا۔ یہ کام ٹی سی ایس والوں نے کیا تھا۔ بریف کیس وہ لے گئے تھے رقم اس اکاؤنٹ میں چلی گئی تھی جو انہیں ایک چیک بک پر ملا تھا۔ یہ وہ کیسے جان سکتے تھے کہ بریف کیس کو خود مالک نے وصول کیا تھا یا اس کے لواحقین نے... نہ وہ جان سکتے تھے کہ یہ امانت لوٹانے والا کون تھا... بھیجنے والے کا نام پتا فون نمبر سب فرضی تھے۔

لاہور میں وہ ناصر کو بھٹی صاحب کے سامنے پیش کرنے لے گئی تھی۔

ان کے درمیان کیا بات ہوئی اور کیسے... یہ ناصر کو ہما نے بعد میں بتایا... اس وقت تو وہ ایک فرمانبردار زن مرید شوہر کی طرح ہما کی ڈانٹ کھا کے باہر گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ جیسے جیسے انتظار کا وقت طویل ہوتا گیا، ناصر کا اضطراب اور خوف بڑھتا گیا۔ کہیں بھٹی صاحب نے ہما کو یرغمال تو نہیں بنالیا کہ اب ناصر کہاں جائے گا کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے... بے وقوف لڑکی... ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا انجام اور کیا ہوگا... اسے کیا معلوم کہ پاکستان میں کیا ہو سکتا ہے جو اور کہیں نہیں ہو سکتا۔

اسی وقت ہما مسکراتی ہوئی بھٹی صاحب کے ساتھ نکلی۔ وہ سیدھے کار کی طرف آئے۔ ناصر باہر نکلا، ہما کی مسکراہٹ کا پیغام واضح تھا۔ اس نے بھٹی صاحب کو بھی جیت لیا تھا۔ بھٹی صاحب کا ہاتھ آگے بڑھا، ناصر نے اسے تھام لیا۔

''آؤ... اندر آؤ... شادی کے بعد پہلی مرتبہ آنے والے دولھا دلہن ایسے کیسے جا سکتے ہیں؟''

دوپہر کے کھانے کے بعد جب وہ تحائف کے ساتھ واپس آرہے تھے تو میں نے کہا کہ اس نے بھٹی صاحب سے کیا کہا۔ ''میں نے کہا، یہ آپ کا مجرم تب تھا۔ اب یہ میرا شوہر ہے۔ میں آپ سے اس کی سلامتی مانگنے آئی ہوں۔ آپ کی بیٹی عینی بھی اب تو پیا گھر سدھار گئی۔ مجھے بھی عینی سمجھ لیں۔ مجھے میرا سہاگ چاہیے۔'' اس نے ایک دم بھٹی صاحب کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سر پر رکھ لیا۔ ''آپ کی کوئی بدنامی نہیں ہوئی... آپ انتخاب بھی جیت چکے... میری جیت کو ہار میں کیسے بدل سکتے ہیں آپ... میں آپ کی دوسری بیٹی ہوں۔''

اور بھٹی صاحب جیسا بے رحم چالاک جہاں دیدہ سیاست داں ایک لڑکی سے ہار گیا جو پرائی بیٹی ہونے کے باوجود اس کی بیٹی بن گئی تھی اور بیٹیاں تو سب کی سانجھی ہوتی ہیں۔ پھول کی پتی سے کٹ جاتا ہے ہیرے کا جگر... اور ہما نے یہ کام کر دکھایا تھا۔

گاڑی کو پورچ میں موڑتے ہوئے ناصر نے سوچا۔ ہما اس وقت کہاں ہوگی... بادلوں سے بھی اوپر... اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کس کے بارے میں سوچ رہی ہوگی؟ میرے بارے میں یا اس بچے کے بارے میں جس کی وہ چھ سات مہینے میں ماں بننے والی تھی؟ سنا ہے بیٹے اپنی ماں کی ساری محبت لے لیتے ہیں۔ اور بچی کی محبت شوہر کے حصے میں آجاتی ہے... اس نے انجن بند کیا اور گاڑی سے اتر آیا۔

بے داغ منصوبہ

کاشف زبیر

جب عقل باطن کی گہرائیوں سے ہم کلام ہوتی ہے تو انسان خواہشات سے بالاتر ہو جاتا ہے... کیونکہ عقل باتدبیر... باوفا رہنما اور دانش مند مشیر بھی ہے... عقل کی راہنمائی کے بغیر محبت... انصاف اور نیکی بے معنی چیز بن کر رہ جاتے ہیں... وہ محبت کی دیوی تھی... مگر جب عقل کی راہوں پر چلی تو ہر چیز صاف اور شفاف نظر آنے لگی... جذبات و محبت کی دبیز دھند آہستہ آہستہ چھٹنے لگی... اوراس کے عقب سے فریب... ریاکاری اور بداعتمادی کے بگولے اڑنے لگے...

نیک وبد... بے وفا اور وفاداروں کے ملاپ سے جنم لینے والی کہانی کے پیچ وخم

ہما عنصر بڑے سے گھر کے چھوٹے گیٹ سے اندر آئی۔ وہ بڑی آنکھوں، ستواں ناک ‘..... گداز ہونٹ، سرخ و سفید رنگت والی جاذبِ نظر لڑکی تھی۔ قد دراز اور نسوانیت لیے ہوئے جسم صحت مند تھا۔ گھر کے چھوٹے سے لان میں پروفیسر نعیم احمد موجود تھا۔ اس کے ساتھ فرحان بیٹھا تھا۔ ہما اُن کی طرف آئی اور ماربل ٹاپ میز کے گرد رکھی دھاتی کرسیوں میں سے ایک کھینچ کر بیٹھ گئی۔ ”کیا حال ہیں؟“

پروفیسر نے صرف سر ہلایا البتہ فرحان نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، تم سناؤ، آج کئی دن بعد آنا ہوا؟“

ہما تھکی سی مسکرائی۔ ”غمِ جاناں سے بھی بڑھ کر غم ہیں روزگار کے۔“

”جنید بھی نہیں آیا کئی دن سے۔“

اس بار ہما بتا تھکی کے مسکرائی۔ ”اس کی وجہ بھی وہی غم روزگار ہے۔ ہم دونوں اتفاق سے ایک ہی جگہ جاب پر لگے ہیں بلکہ جنید نے ہی مجھے اس جاب پر لگوایا ہے۔“

فرحان چھوٹے قد کا لڑکا سا نظر آنے والا آدمی تھا۔ ان کے گروپ میں وہ سب سے کم عمر لگتا تھا جبکہ سب سے زیادہ عمر اسی کی تھی۔ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”مبارک ہو۔ یہاں پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔“

پروفیسر حسبِ معمول خود میں کھویا ہوا تھا اور اس کے سامنے رکھی چائے ٹھنڈی ہو گئی۔ وہ تقریباً چالیس برس کا بے ترتیب حلیے اور بکھرے بالوں والا آدمی تھا۔ بہ قول فرحان کے صورت اور حلیے سے ہی پروفیسر نظر آتا تھا۔ گندمی چہرہ بے داغ تھا اور عمر کا پتا بالوں کی سفیدی سے چلتا تھا۔ اس کے بال کن پٹی سے سفید ہو چلے تھے۔ مناسب جسامت تھی مگر وہ ہمیشہ اپنے سائز سے بڑے سوٹ میں ہوتا تھا اس لیے دبلا لگتا۔ اس وقت بھی اس کا کوٹ شانوں سے جھول رہا تھا اور پتلون بیلٹ کی وجہ سے زیادہ پھولی پھولی لگ رہی تھی۔ ہما نے اپنے ہینڈ بیگ سے ایک چھوٹا خاکی

لفافہ نکالا اور پروفیسر کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے لفافہ لیا اور بے نیازی سے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا، اسے کھولنے اور دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔ حد یہ کہ اس نے ہما سے کچھ پوچھا بھی نہیں اور اپنی ٹھنڈی ہوجانے والی چائے کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ہما نے کچھ دیر بعد خود ہی کہا۔

''پبلشر کو ناول پسند آیا ہے۔''

''اسے ناول پسند آنا ہی تھا۔'' پروفیسر نے خشک لہجے میں کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ مجھے اس کا دیا ہوا معاوضہ پسند آتا ہے یا نہیں۔''

فرحان اور ہما بیک وقت مسکرانے لگے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے اپنے انداز کے برعکس پروفیسر روپے پیسے کے معاملے میں کتنا بے پروا تھا۔ اس نے آج تک کسی پبلشر سے معاوضے پر بحث نہیں کی تھی۔ اسے جو معاوضہ دیا جاتا، وہ خاموشی سے لے لیتا تھا۔ ادب کی دنیا میں اس کا نام تھا اور صرف ادبی ذوق رکھنے والے ہی نہیں عام قاری بھی اس کے ناول اور کہانیاں شوق سے پڑھتے تھے۔ حالانکہ وہ زیادہ تر فکشن لکھتا تھا جسے مخصوص ادبی طبقہ سرے سے ادب ہی تصور نہیں کرتا ہے لیکن مغرب میں چھپنے والے فکشن ناول شوق سے پڑھتا بھی ہے اور اسے ادب بھی تسلیم کرتا ہے۔ تعلیمی قابلیت اتنی نہیں تھی کہ پروفیسر کہلاتا۔ یہ خطاب اسے حلیے کی وجہ سے ملا تھا۔ جس وقت ہما، فرحان اور جنید پہلے سمسٹر میں تھے تو پروفیسر نے کچھ عرصے انہیں اکنامکس پڑھائی تھی۔ وہ کسی لیکچرر کی جگہ عارضی آیا تھا اور فوراً ہی طالب علموں میں مقبول ہوگیا۔ اس کے پڑھانے کا انداز منفرد تھا۔ وہ صرف انہیں معاشیات کے خشک اصول نہیں پڑھاتا بلکہ ان اصولوں کے گرد گھومنے والی دنیا کی ایسی حقیقتیں بھی بیان کرتا کہ وہ دنگ رہ جاتے تھے۔ چند مہینے بعد یونیورسٹی نے اسے اس بنا پر فارغ کردیا کہ وہ طلبا کو نان ایشوز میں الجھاتا ہے۔

ہما، جنید، فرحان اور ہانیہ کا چھوٹا سا گروپ پروفیسر

کے حلقۂ احباب میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کی لیکچرر شپ کے دوران میں وہ اس کے گھر جانے لگے تھے۔ اولڈ سٹی میں تقریباً چار سو گز پر پھیلا یہ پرانے طرز کا گھر تقریباً کھنڈر بن چکا تھا۔ اس کے چاروں طرف سبزے کی بہتات تھی کیونکہ پروفیسر کو پودے لگانے کا جنون تھا اور اس نے کوئی ایسی جگہ نہیں چھوڑی تھی جہاں ...... کچھ نہ کچھ لگا ہوا نہ ہو۔ حد یہ کہ دیواروں پر بھی نصف گملے نصب کر کے ان میں چھوٹے پودے اور بیلیں لگائی ہوئی تھیں۔ مکان پر برسوں سے رنگ نہیں ہوا تھا اور اب سبزہ ہی اس کا رنگ تھا۔ البتہ اندر سے حالت کسی قدر بہتر تھی۔ ایک نشست گاہ تھی جس میں بہت پرانے انداز کے صوفے تھے۔ فرش پر پڑا قالین کبھی دبیز تھا مگر اب بالکل گھس گیا تھا۔ بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا مگر صفائی نہ ہونے کی وجہ سے کباڑ لگتی تھیں۔

چھ کمروں کے اس گھر میں تین بیڈ روم، ایک نشست گاہ، ایک طعام گاہ اور ایک مطالعہ گاہ تھی۔ لیکن عملاً پورا گھر لائبریری بنا ہوا تھا۔ کتابیں اتنی تھیں کہ انہیں رکھنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ بہت سی جگہوں پر یہ مٹی کی تہوں تلے بنڈل کی صورت میں پڑی تھیں اور جب پروفیسر کو کسی خاص کتاب کی تلاش ہوتی تو اس دن وہ خود مٹی کا بھوت بن جاتا تھا۔ جب وہ پہلی بار اس کے گھر آئے تو انہیں علم ہوا کہ وہ معروف مصنف پروفیسر ہے۔ اس کی کتابوں پر اس کا نام پروفیسر آتا تھا اور تصویر کی جگہ ایک بے چہرہ شخص کا اسکیچ ہوتا تھا۔ ہما اس کے ناولوں کی دیوانی تھی اور اس کے پاس اس کے سارے ناول تھے۔ وہ خوشی سے پاگل ہو گئی اور اس نے پروفیسر کو پکڑ کر چکر دے ڈالا۔ وہ بوکھلا گیا تھا۔ ''ارے... ارے لڑکی کیا کر رہی ہو... پاگل ہو گئی ہو... ابھی گر جاؤں گا۔''

''اللہ میں کتنی خوش ہوں، میری کتنی خواہش تھی کہ کبھی آپ سے ملوں۔ میں نے تو آپ سے رابطے کے لیے پبلشروں کے دفتروں کے کتنے ہی چکر لگا لیے۔ اپنے جوتے گھس لیے اور منتیں کر کر کے تھک گئی۔ مگر کسی اللہ کے بندے نے کچھ پھوٹ کر نہیں دیا۔ اب آپ خود مل گئے۔ اللہ آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا۔''

''احمقانہ بات۔'' پروفیسر نے زیر لب کہا۔

پروفیسر کے ناول ان چاروں کو پسند تھے مگر ہما کا انداز الگ ہوتا تھا۔ اس کی خوشی بچکانا سی تھی۔ بہت بے ساختہ اور بہت واضح۔ وہ اکثر تعجب سے پروفیسر سے کہتی تھی کہ وہ ایسے پلاٹ کیسے سوچ لیتا تھا اور پھر ایسی انوکھی کہانیاں لکھ لیتا۔ پروفیسر جواب میں صرف مسکرا کر رہ جاتا۔

جب پروفیسر کو یونیورسٹی سے نکالا تو وہ اس کے گھر آنے لگے۔ پروفیسر سے ملنے کے لیے اور بھی کچھ لوگ آتے تھے۔ مگر وہ اس کی خاموش زندگی کا ایک ایسا جزو بن گئے کہ جب وہ کچھ دن نہ آپاتے تو پروفیسر بے چین ہو جاتا تھا۔ مگر اس نے اپنی بے چینی کبھی زبان سے ظاہر نہیں کی۔ ہاں ان کے آنے پر اس کے انداز میں جو چمک آتی اس سے انہیں پتا چل جاتا کہ پروفیسر خوش ہے اور ان کا منتظر تھا۔ ان چاروں کا تعلق متوسط گھرانوں سے تھا۔ ہما اپنی اکیلی ماں کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی ماں نے بہت مشقتوں سے اسے پالا اور پڑھایا تھا۔ جنید ایک ایمان دار سرکاری افسر کا بیٹا تھا اس لیے اس نے اپنی تعلیم کا زیادہ حصہ ٹیوشن پڑھا کر مکمل کیا تھا۔ اس کی تین بہنیں تھیں اور باپ کی زندگی کا مقصد ان کو ان کے گھر کا کرنا تھا اس لیے جنید کے کیریئر کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ باپ نے جنید کو میٹرک کے بعد بتا دیا تھا کہ اب اسے آگے پڑھنا ہے تو اپنے بل بوتے پر پڑھنا ہے۔

فرحان ایک محنت کش کا بیٹا تھا اور شروع سے اس نے تعلیم میں اعلیٰ معیار رکھا تھا۔ اسکول، کالج اور پھر یونیورسٹی میں اس نے اسکالرشپ پر اپنی تعلیم مکمل کی تھی۔ مگر ان دنوں بیروزگار تھا۔ ہانیہ نسبتاً بہتر گھرانے سے تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد اس کے بڑے بھائی نے مڈل ایسٹ میں ملازمت کر کے اپنے بہن بھائیوں کو تعلیم دلائی اور اپنا گھر بنایا تھا۔ ہانیہ سب سے چھوٹی تھی اور وہی لیے اسے ذرا چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ پڑھنے میں اتنا تیز نہیں تھی مگر ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوتی تھی۔ ماسٹر کے بعد سب سے پہلے اسی کی نوکری لگی تھی۔ اس کا ایک بھائی موبائل کمپنی میں اعلیٰ افسر تھا اسی نے ہانیہ کو بھی وہاں نوکری دلوا دی۔ وہ سب قسمت کی ستم ظریفی پر بہت ہنسے تھے کہ جسے ملازمت کی سب سے کم ضرورت تھی، اسے ہی سب سے پہلے ملازمت مل گئی اور اس کے بعد ہما اور جنید کو بھی ایک کیمیکل کمپنی میں ملازمت مل گئی۔ جسے سب سے زیادہ ضرورت تھی۔ فرحان ابھی تک نوکری تلاش کر رہا تھا۔ جب وہ یونیورسٹی میں ملے اور ایک گروپ بنے تو غیر محسوس انداز میں ہما جنید اور ہانیہ، فرحان سے منسلک ہوتی چلی گئی۔

جب تک ان کی جاب نہیں ہوئی تھی۔ ہر دوسرے دن پروفیسر کے گھر بیٹھک جمتی تھی۔ پھر جاب ہو گئی تو ہفتے

میں ایک دن جانا ہوگیا۔ ہما پورے ایک ہفتے بعد آئی تھی۔ آج بھی اسے بہت سے کام تھے اگر اس نے پروفیسر کا یہ کام اپنے ذمے نہ لے رکھا ہوتا تو شاید وہ آج بھی نہ آتی۔ یونیورسٹی میں ماسٹر کے دوران ہما نے اخبارات اور رسائل میں مضامین لکھنا شروع کردیے تھے اس کی پبلشرز سے جان پہچان ہوگئی تھی۔ اس نے پروفیسر سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے تازہ ناول کے لیے پبلشر وہ تلاش کرے گی اور معاوضہ بھی وہی طے کرائے گی۔ پروفیسر نے ناول کا مسودہ اس کے حوالے کردیا تھا۔ ہما نے خاصی مغزماری کی مگر بالآخر وہ پبلشر سے اپنی مرضی کا معاوضہ لینے میں کامیاب رہی۔ لفافے میں ڈھائی لاکھ کا چیک تھا۔ جو پبلشر نے پروفیسر کے نام لکھا تھا۔ پروفیسر اور فرحان چائے پی چکے تھے۔ ہما نے اندر جاکر اپنے لیے چائے بنائی اور باہر آگئی۔ سرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ شام کے وقت موسم خنک ہو جاتا تھا۔ اس نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''جنید کی طبیعت کچھ دن سے ٹھیک نہیں ہے۔''

پہلے جنید اس کمپنی میں لگا تھا اور اس کا کام انوینٹری کا تھا، وہ گودام پر ہوتا تھا۔ جبکہ ہما اکاؤنٹس میں آئی تھی۔ اس کی جاب کو ابھی ایک ہفتہ ہوا تھا اور جنید ایک مہینے پہلے لگا تھا۔ پروفیسر نے چونک کر کہا۔ ''کیا ہوا جنید کو؟''

''پتا نہیں، کہہ رہا تھا کہ کئی دن سے تھکی والی کیفیت ہو رہی ہے اور کل طبیعت اتنی خراب تھی کہ وہ جاب پر نہیں آیا تھا۔''

فرحان نے کہا۔ ''میں اور ہانیہ اسے دیکھنے جائیں گے۔''

''تمہاری والدہ کیسی ہیں؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''ٹھیک ہیں آپ کو سلام دعا کہہ رہی تھیں۔''

ہما کچھ دیر بیٹھ کر جانے کے لیے اٹھنے لگی تو پروفیسر نے اسے کچھ کتابیں دیں۔ ''ان کو دیکھنا، یہ اچھی کتابیں ہیں۔ تم لکھنے کی کوشش کرو۔ تم میں صلاحیت ہے۔''

پروفیسر کچھ عرصے سے ہما پر زور دے رہا تھا کہ وہ لکھئے اس میں لکھنے کی صلاحیت تھی۔ اس نے ایک انگریزی ادبی ناول کا ترجمہ کیا تھا جو پروفیسر کو بہت پسند آیا مگر ہما نے اسے شائع کرانے یا چھپوانے سے انکار کردیا تھا۔ اس کے خیال میں وہ ابھی اتنی پختہ کار نہیں ہوئی تھی کہ اس کی تحریر شائع ہوتی یا کتابی صورت میں آتی۔ پروفیسر نے اس سے ترجمہ لے لیا تھا۔ ہما گھر آئی تو تاریکی چھا چکی تھی اور آمنہ انتظار کر رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''بہت دیر کردی، میں پریشان ہوگئی تھی۔''

''امی اب آپ عادی ہو جائیں کیونکہ میں جاب کرنے لگی ہوں۔''

''مجھے تمہاری کمائی نہیں کھانی ہے۔ میں چاہتی ہوں تم جلد از جلد اپنے گھر کی ہو جاؤ۔'' آمنہ نے تیز لہجے میں کہا۔ ''آخر یہ جنید کے گھر والے کب آئیں گے؟''

''آئیں گے۔'' ہما کا لہجہ مدھم پڑ گیا۔ ''میں نے بتایا تا کہ اس کی ایک بہن ابھی گھر بیٹھی ہے اور ماں باپ کی شرط یہی ہے کہ جب وہ اپنے گھر کی ہو جائے گی تب وہ جنید کی شادی کریں گے۔''

''عجیب دستور ہے ان کا، لوگ تو اکلوتے بیٹے کی جلد از جلد شادی کرنا چاہتے ہیں اور یہ ہیں کہ دیر کیے جا رہے ہیں۔''

ہما کا باپ عنصر احمد..... ٹھیکیدار تھا اور اس نے جو کمایا تھا، وہ دو فلیٹوں کی صورت میں ان ماں بیٹی کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ چھوٹے فلیٹ میں وہ خود رہتی تھیں اور بڑا فلیٹ کرائے پر دے دیا تھا۔ شوہر کے مرنے کے بعد آمنہ نے محکمہ تعلیم میں ملازمت کے لیے درخواست دی اور خوش قسمتی سے اسے ملازمت مل گئی۔ کیونکہ اس نے کوئی ٹیچنگ کورس نہیں کیا تھا اس لیے اسے ایک سرکاری اسکول میں ایڈمن کی جاب ملی تھی۔ ہما نے ابتدائی تعلیم اسی اسکول میں حاصل کی وہ ماں کے ساتھ جاتی اور واپس آتی تھی پھر چھٹی کلاس سے وہ ایک اچھے اسکول میں چلی گئی۔ میٹرک اس نے یہیں سے کیا تھا۔ جب ہما نے ماسٹر مکمل کیا تو آمنہ نے طبیعت خرابی کی وجہ سے استعفا دے دیا۔ اسے سانس کی تکلیف رہنے لگی تھی۔ ملازمت سے جو رقم ملی، وہ اس نے ہما کی شادی کے لیے سنبھال کر رکھ دی تھی۔ اب وہ بے تابی سے اسے اپنے گھر کا دیکھنا چاہتی تھی۔ ملازمت چھوڑنے کے بعد اس کی طبیعت بہتر ہوئی تھی لیکن اب بھی اسے دھڑکا لگا رہتا تھا۔

ان کا فلیٹ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم اور لاؤنج تھا اس کے ساتھ ہی اوپن کچن تھا۔ دوسرا فلیٹ جو تھری بیڈز کا تھا۔ اسے کرائے پر دیا ہوا تھا اور اس سے اچھا خاصا کرایہ آتا تھا۔ دونوں فلیٹ شہر کے وسط میں ایک اچھے علاقے اور اچھے پروجیکٹ میں تھے اور ان کی اچھی ویلیو تھی۔ ہما نے اگرچہ بہت زیادہ مالی خوشحالی نہیں دیکھی تھی مگر انہیں کوئی مالی مسئلہ بھی نہیں تھا اور ان کے پاس ضرورت کی ہر چیز تھی۔ جنید سے اس کی پہلی ملاقات ماسٹر کے پہلے سمسٹر میں ہوئی تھی اور ابتدائی چند ملاقاتوں

کے بعد وہ ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ جنید نے ماں باپ سے ذکر کیا اور انہوں نے اس رشتے کو پسند بھی کیا مگر ساتھ ہی شرط لگا دی کہ جب وہ ساری بیٹیاں بیاہ دیں گے تب اس کی باری آئے گی۔ پھر جنید کی جاب بھی نہیں لگی تھی۔ وہ اب تک پڑھ رہا تھا۔

گریجویشن کے بعد اس نے ماسٹر کے لیے دو سال تک ایک کوچنگ میں پڑھا کر رقم جمع کی تھی اور پھر ماسٹر میں داخلہ لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کسی قدر تاخیر سے ماسٹر کیا۔ یعنی چوبیس سال کی عمر میں، جبکہ ہما نے اس کے ساتھ ہی بائیس سال کی عمر میں ماسٹر کرلیا تھا۔ ہما آتے ہوئے گھر کے لیے بھی سامان لائی تھی۔ وہ کچن میں رکھنے لگی۔ آمنہ اس کے پیچھے آئی۔ چائے کا پوچھا، اس نے منع کر دیا۔ ”پروفیسر کے ہاں پی لی تھی۔“

”پروفیسر کیسے ہیں؟“

”ٹھیک ہیں، آپ کا پوچھ رہے تھے۔“ ہما نے کہا۔ ”جنید کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ کل بھی جاب پر نہیں گیا تھا۔“

آمنہ فکرمند ہوگئی۔ ”کیا ہوا ہے اس لڑکے کو جب سے نوکری پر لگا ہے، بیمار ہی چلا آرہا ہے۔“

ہما بھی پریشان تھی۔ ”میں نے اس سے کہا ہے کہ ڈاکٹر کو چیک کرائے۔ یوں بیمار ہونا اچھی بات نہیں ہے۔“

رات کے کھانے کے بعد آمنہ عشا کی نماز کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ اب سونے تک اس کی نماز اور وظائف جاری رہتے۔ ہما نے ٹی وی لگایا مگر بوریت ہوئی تو کمرے میں آکر پروفیسر کی دی ہوئی کتابوں کا شاپر کھولا۔ اس میں پروفیسر کا ایک پرانا ناول بھی تھا۔ پروفیسر نعیم دولت مند باپ کی اولاد تھا۔ وہ سب سے چھوٹا تھا اور بڑھاپے کی اولاد تھا۔ اس کے سامنے بہن بھائی ایک ایک کر کے بیرون ملک چلے گئے اور وہ سال کے سال چکر لگاتے تھے۔ ماں باپ کی دیکھ بھال پروفیسر نے اپنے ذمے لے لی۔ اس نے اکنامکس میں ماسٹر کر کے پھر ایم فل بھی کیا تھا۔ اس کا ارادہ آگے پی ایچ ڈی کرنے کا تھا مگر ان ہی دنوں ماں باپ دونوں بیک وقت بیمار پڑ گئے۔ وہ ان میں لگ گیا اور جب تین سال بعد وہ اس دنیا سے گزرے تو پروفیسر کا دل آگے پڑھنے سے اچاٹ ہو چکا تھا۔ اسے مطالعے کا جنون تھا اور اس نے ساری دنیا کا ادب پڑھ ڈالا تھا۔ خاص طور سے فکشن میں کچھ نہیں چھوڑا تھا۔

ماں باپ کے مرنے کے بعد اس کے بہن بھائی آئے اور دولت و جائداد کا بٹوارا ہونے لگا تو پروفیسر کے حصے میں یہ گھر آیا تھا۔ ماں باپ کے بعد تنہا ہوا تو اسے مصروفیت درکار ہوئی۔ نوکری اس کے بس کی بات نہیں تھی اس لیے اس نے ناول لکھنا شروع کر دیے۔ بینک اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم تھی، اسے فوری ضرورت نہیں تھی۔ اس نے پہلا ناول مکمل کیا اور ایک پبلشر کو بھیج دیا۔ اسے ناول پسند آیا اور اس نے شائع بھی کیا مگر پروفیسر کو کچھ نہیں ملا۔ اسے پروا بھی نہیں تھی، وہ وقت گزاری کے لیے ناول لکھ رہا تھا۔ بعض اخبارات میں آنے والے تبصروں سے اسے پتا چلا کہ اس کا ناول بڑے پیمانے پر پسند کیا گیا ہے۔

دوسرا ناول بھی ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اس کے بعد سال میں اس کے دو تین ناول آتے تھے۔ اس نے کچھ چھوٹی کہانیوں کے مجموعے بھی شائع کرائے۔ اب تک اس کی پچاس سے زیادہ کتابیں مارکیٹ میں آچکی تھیں اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوئی تھیں مگر اسے بہت کم ملا تھا۔ مالی لحاظ سے بھی اور شہرت کے لحاظ سے بھی۔ وہ خود بھی شہرت سے بھاگتا تھا۔ اس کی کتاب پر اس کا نام صرف پروفیسر آتا تھا اور تصویر کی جگہ خاکہ بنا ہوتا تھا۔ اس کا حلقۂ احباب محدود تھا۔ ادبی کانفرنس، میٹنگ، ڈنر، سیمنار اور ادبی نشستیں اس کی زندگی میں کبھی آئی ہی نہیں تھیں۔ اس کی اصل دنیا کتابیں تھیں۔ وہ کتابیں پڑھتا اور جب پڑھ پڑھ کر تھک جاتا تو لکھنے بیٹھ جاتا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے لکھنے سے تھک کر کچھ پڑھا ہو۔ ذاتی زندگی میں بھی وہ تنہائی پسند تھا اور اسے لگتا تھا کہ کوئی عورت اس کے ساتھ نباہ نہیں کر سکے گی اس لیے اس نے شادی کا رسک نہیں لیا۔ مروجہ شادی کے بارے میں اس کا کہنا تھا۔

”یہ ایسا فیصلہ ہے جو بہت سے لوگ مل کر کرتے ہیں مگر اس میں زندگیاں صرف دو تباہ ہوتی ہیں۔“

ایک بار ہما نے شرارت سے پوچھا۔ ”اور محبت کی شادی؟“

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ”بہتر ہے کہ دونوں متاثر ہونے والے فریق اس کا فیصلہ خود کرلیں تاکہ وہ بعد میں کسی کو الزام نہ دے سکیں۔“

ہما پروفیسر کے بارے میں سوچتے ہوئے اس کا ناول پڑھنے لگی۔ پروفیسر کے تقریباً تمام ہی ناول فکشن تھے۔ اس نے بہت کم دوسرے موضوعات پر طبع آزمائی کی تھی۔ یہ ناول بھی فکشن تھا اور ایک انوکھی طرز کی بینک ڈکیتی کے گرد گھومتا تھا۔ جس میں ڈاکو بنا کسی اسلحے کے بینک لوٹتا ہے۔

اس کے بعد بھی وہ فرار نہیں ہوتا اور بینک والے اس کے خلاف ڈکیتی کا کیس بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ موضوع اتنا دلچسپ اور پلاٹ اتنا جاندار تھا کہ ہما نے ایک بار ناول شروع کیا تو وقت کا پتا ہی نہیں چلا اور جب اس نے ناول ختم کیا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ وہ سوچ کر کمرے میں آئی تھی کہ جنید کو کال کر کے اس کی طبیعت پوچھے گی مگر یہ بھی ذہن سے نکل گیا۔ اب وقت نہیں رہا تھا۔ اس نے کل جنید کو کال کرنے کا سوچا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

صبح وہ بوجھل ذہن کے ساتھ اٹھی۔ گرم پانی سے شاور لے کر ذہن ہلکا ہوا مگر اس کا ناشتا کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ صرف ایک کپ چائے لے کر وہ دفتر کے لیے نکل گئی۔ ہما کا دفتر نزدیک ہی شہر کی سب سے اہم شاہراہ پر تھا۔ ایم ایم کیمیکلز کا شمار ملک کی بڑی کیمیکلز کمپنیوں میں ہوتا تھا۔ یہ کیمیکل بناتی، بیچتی اور امپورٹ ایکسپورٹ بھی کرتی تھی۔ اربوں روپے کا کاروبار تھا۔ اس کا گودام اور فیکٹری نزدیک ہی واقع انڈسٹریل ایریا میں تھی۔ جنید وہاں کام کرتا تھا۔ دفتر آ کر ابتدائی مصروفیت سے فراغت ملی تو ہما کو جنید کا خیال آیا اور اس نے اسے کال کی۔ وہ سوتے سے اٹھا تھا۔ ہما کا دل دھڑک اٹھا۔ ”کیا ہوا آج بھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہوئی؟“

”نہیں۔“ جنید نے نحیف آواز میں کہا۔ ”متلی والی کیفیت پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔“

”ڈاکٹر کے پاس گئے تھے؟“

”ہاں اس نے کچھ دوائیں دی تھیں اور کہا تھا کہ ان سے اثر نہ پڑے تو کسی لیور اسپیشلسٹ کو دکھاؤں۔ یہ جگر کا مسئلہ لگ رہا ہے۔ کئی دن سے دوا لے رہا ہوں اور کوئی فرق نہیں پڑا ہے۔ پاپا نے ایک اسپیشلسٹ سے وقت لیا ہے، آج شام دکھاؤں گا۔“

”پلیز پھر مجھے ضرور بتانا اور اپنا خیال رکھنا۔“ ہما روہانسی ہونے لگی۔

”تم فکر مت کرو اور ہاں میں نے شہباز صاحب کو میڈیکل لیو بھجوادی تھی ذرا اس کا پوچھ لینا۔“

شہباز صاحب کمپنی میں ایچ آر ڈائریکٹر تھے۔ ہما نے ان کو کال کی تو انہوں نے ہما کو تسلی دی۔ ”آپ فکر مت کریں۔ آج میں خود جنید سے بات کرلوں گا۔ بیماری اور حادثے تو زندگی کے ساتھ ہیں۔ اگرچہ وہ فی الحال ہمارے مستقل ایمپلائیز میں نہیں ہے مگر کمپنی ممکن حد تک اس کا خیال رکھے گی۔“

”تھینک یو شہباز صاحب۔“ ہما نے گہرا سانس لیا۔ ”اس کی نئی نئی جاب ہے اس لیے وہ پریشان بھی ہے۔“

”میں ابھی اسے کال کرتا ہوں۔“

شہباز صاحب سے بات کر کے ہما اپنے کاموں میں لگ گئی۔ اس نے سوچا کہ شام کو جنید کے گھر جا کر اس کی طبیعت کا پوچھے۔ وہ کئی بار اس کے گھر جا چکی تھی مگر ہر بار اسے عجیب سی جھجک محسوس ہوئی تھی۔ یہ جھجک فطری شرم وحیا کی وجہ سے نہیں تھی مگر جنید کے ماں باپ اور بہن کا رویہ اس سے کچھ الگ سا ہوتا تھا۔ بہ ظاہر وہ اس سے اچھی طرح ملتے تھے مگر ان کے انداز سے کہیں کہیں جھلکتا تھا کہ اس کے بارے میں ان کی سوچ وہ نہیں ہے جس کا وہ سامنے اظہار کرتے ہیں اسی لیے اب اسے وہاں جاتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ مگر جنید کی خاطر اسے جانا تو تھا۔ دوپہر میں اس نے پھر کال کی تو اسے پتا چلا کہ جنید کی شام چھ بجے کی اپائنٹ منٹ ہے۔ اس لحاظ سے اس کی واپسی میں دیر ہوسکتی تھی۔ ہما کی چھٹی بھی چھ بجے ہوتی تھی اور وہ بیس منٹ میں گھر واپس پہنچ جاتی تھی۔ جنید کا گھر ذرا دور تھا اگر اسے وہاں دیر ہوتی تو آمنہ پریشان ہو جاتی اس لیے اس نے اگلے روز جانے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

ہما نے کال بیل بجائی۔ جنید کی چھوٹی بہن کوثر نے دروازہ کھولا اور اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر وہی تاثر آیا جس سے ہما چڑتی تھی۔ مگر اگلے ہی لمحے اس نے اس تاثر پر مسکراہٹ کا لیپ کرلیا اور چہک کر بولی۔ ”ہما باجی اللہ کتنے دنوں بعد آئی ہیں؟“

”جاب کی مصروفیت۔“ اس نے اندر آتے ہوئے کہا۔ ”جنید کو دیکھنے آئی ہوں۔“

جنید کے ذکر پر کوثر سنجیدہ ہوگئی۔ ”بھائی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ لکھ کر دیے ہیں۔ بھائی آج کرا کے آئے ہیں۔ اب رات تک رپورٹ ملے گی تو جا کر اسی ڈاکٹر کو دکھانا ہے۔“

وہ کوثر سے بات کرتی ہوئی اندر آئی تو جنید کے باپ حماد احمد سے سامنا ہوا۔ اس سے سلام دعا اور وہی تاثر لیے وہ اندر آئی تو جنید کی ماں رضیہ ملی اور اس نے بھی اسی خول کے ساتھ بہ ظاہر خوش اخلاقی سے بات کی اور آمنہ کے بارے میں پوچھا۔ ہما جواب دے کر کوثر کے ساتھ جنید کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ اسے چند لمحے کے لیے اس رویے کا سامنا کرنا ہو تو اسے کتنی کوفت

ہوتی ہے جب اسے ساری عمر کے لیے اسی رویّے کا سامنا کرنا پڑے گا تب وہ کیا کرے گی۔ کیسے برداشت کرے گی۔ جنید آنکھیں بند کر کے نڈھال سا لیٹا ہوا تھا۔ وہ کسی قدر موٹے نقوش اور سانولی رنگت والا لیکن پُرکشش نوجوان تھا۔ بیماری نے اس کا چہرہ زرد کر دیا تھا۔ آہٹ پر اس نے آنکھ کھولی اور ہما کو دیکھ کر اٹھ گیا۔ ''ارے تم کب آئیں اور بتایا نہیں۔''

''باجی نے سوچا ہوگا کہ سرپرائز دیں گی۔'' کوثر نے طنزیہ انداز میں کہا اور چائے لانے کا کہہ کر کمرے سے چلی گئی۔ ہما کرسی پاس کر کے بیٹھ گئی۔

''اب کیسے ہو تم اور ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟''

''طبیعت تو ویسی ہی ہے۔ ڈاکٹر نے جگر کا مسئلہ بتایا ہے۔ آج تین ٹیسٹ ہوئے ہیں، رپورٹ آئے گی تو ڈاکٹر کے پاس دوبارہ جانا ہے۔''

''اللہ خیر کرے گا۔'' ہما نے کہا اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

''پاگل، روتی کیوں ہو، میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔''

''نہیں رو تو نہیں رہی۔'' اس نے جلدی سے دوپٹے سے آنکھیں صاف کیں۔ اسے معلوم تھا کہ اگر یہاں دوسروں نے اسے روتے دیکھ لیا تو اس پر بھی کوئی نہ کوئی بات بنا لیں گے۔ جنید نے شرارت سے اسے دیکھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ جلد وہ وقت آئے جب تمہاری آنکھ میں آنسو آئیں تو میں انہیں صاف کروں۔''

ہما جھینپ گئی۔ ''بس تم جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔''

''شہباز صاحب کی کال آئی تھی، مجھے تسلی دے رہے تھے کہ میں فکر نہ کروں اور آرام سے اپنا علاج کراؤں۔''

''وہ اچھے آدمی ہیں مجھ سے بھی یہی کہا تھا۔ وہ تو کہہ رہے تھے کہ کمپنی جس حد تک ممکن ہوا، تمہارا فیور کرے گی۔''

''ہاں ایک فیور تو یہ کیا ہے کہ میری بیماری کے دنوں کی تنخواہ نہیں کٹے گی اور علاج پر جو اخراجات ہوں گے، ان کی تفصیل بھی منگوائی ہے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ اس مد میں بھی کچھ نہ کچھ ہوگا۔''

''یہ اچھی بات ہے۔''

''تمہاری جاب کیسی چل رہی ہے؟''

''فی الحال کام زیادہ نہیں ہے مگر میں سیٹ ہو گئی ہوں۔''

''پروفیسر کا کیا حال ہے۔ کل فرحان اور ہانیہ آئے تھے۔''

''پروفیسر بھی ٹھیک ہیں۔ شاید وہ بھی آئیں تمہیں دیکھنے۔''

''ان کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اس میں زحمت کہاں سے آگئی۔'' پروفیسر کی آواز آئی۔ وہ دروازے پر کھڑا تھا۔ ''معذرت، میں براہِ راست یہاں آگیا۔''

''کوئی بات نہیں پروفیسر۔'' ہما نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''آئیں۔''

''تم بیٹھو۔'' پروفیسر نے بیڈ کے کنارے ٹکتے ہوئے کہا اور جنید سے پوچھا۔ ''اب طبیعت کیسی ہے؟''

''بہتر ہوں۔'' اس نے آہستہ سے کہا تو نہ جانے کیوں ہما کو لگا کہ اس نے اس وقت اپنے گھر والوں کی طرح کوئی نقاب چڑھا لی ہو۔ شاید اسے اس وقت پروفیسر کا آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اسی وقت کوثر چائے لے کر آگئی۔ اس نے چائے دی اور جانے لگی تو ہما بھی اس کے ساتھ اٹھ کر آگئی۔ کوثر اسے ڈرائنگ روم میں لے آئی اور تجسس سے پوچھا۔

''یہ وہی پروفیسر ہیں نا جن کے ہاں آپ جاتی ہیں؟''

''ہاں وہی ہیں اور صرف میں نہیں بلکہ جنید بھی جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے ہمارے استاد ہیں۔''

''دیکھنے میں تو عجیب سے لگتے ہیں۔'' کوثر نے منہ بنایا۔ ''خود ہی بے تکلفی سے اندر چلے آئے۔''

''وہ ایسے ہی ہیں مگر دل کے بہت اچھے ہیں۔''

کوثر نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''آپ کو ان کے دل کا کیا پتا؟''

ہما کو غصہ آیا مگر اس نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے بتایا نا کہ وہ ہمارے استاد ہیں اور استاد شاگرد کا رشتہ باپ اور اولاد جیسا ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کو اندر تک سے جانتے ہیں۔''

کوثر نے یوں شانے اچکائے جیسے بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ کچھ دیر میں رضیہ بھی آگئی اور وہ اس سے اپنی باتیں کرنے لگی۔ ہما خاموشی سے سنتی رہی۔ رضیہ کو فخر تھا کہ اس کی بیٹیاں بہت سلیقہ مند اور ہنروالی ہیں۔ ساتھ ہی وہ دوسروں سے ان کا موازنہ بھی کر رہی تھی۔ دبے لفظوں میں وہ اسے بھی جتا رہی تھی کہ اس کی بیٹیوں سے کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ہما کو ایسی باتوں سے الجھن ہوتی تھی۔ اس کے خیال میں انسان کی کوئی بھی خوبی یا خامی سب سے پہلے اس کے اپنے لیے ہوتی ہے۔ دوسروں کو اس کے بارے میں بتانا اور جتانا بیکار سی بات تھی۔ اس نے چائے کا کپ خالی

کر کے رکھا اور بولی۔ ''آنٹی اب میں چلوں گی۔''

''ارے بیٹھو کھانا کھا کر جانا۔ کوثر نے کڑاہی بنائی ہے۔ کھاؤ گی تو پتا چلے گا کہ کڑاہی کسے کہتے ہیں۔''

''شکریہ آنٹی، آج امی نے بھی کڑاہی بنائی ہے اور میں نے آج تک امی کے ہاتھ جیسی کڑائی کہیں نہیں کھائی۔'' ہما نے جواب دیا اور بیگ اٹھالیا۔ وہ الوداعی کلمات کہنے جنید کے کمرے تک آئی تو پروفیسر نے اس سے پوچھا۔

''تم کیسے جاؤ گی؟''

''میں رکشا کرلوں گی۔''

''میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''رات بہت ہوگئی ہے اور حالات کا کچھ پتا نہیں ہے، کب خراب ہوجائیں۔''

ہما نے محسوس کیا کہ جنید کے تاثرات عجیب سے ہو گئے تھے اس نے انکار کیا مگر پروفیسر نے اس کا انکار مسترد کر دیا۔ راستے میں اس نے ہما سے کہا۔ ''شاید جنید کو یہ بات پسند نہیں آئی کہ میں تمہیں ڈراپ کروں۔''

''آپ نے محسوس کیا؟''

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''صرف جنید نہیں، اس کے گھر والوں کا رویہ بھی عجیب سا ہے۔''

''آپ نے پہلی ملاقات میں جان لیا۔''

''ہاں انسان کی اصلیت تو ایک منٹ میں سامنے آجاتی ہے۔ آج کل انسان کو جاننا کوئی مسئلہ نہیں رہا ہے کیونکہ وہ اپنا باطن لازمی دکھاتا ہے۔''

ہما کچھ دیر خاموش رہی پھر اس نے کہا۔ ''مجھے جنید کی فکر ہے۔''

''اب مجھے بھی اس کی فکر ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''اس کا کہنا ہے کہ اس کی طبیعت کی خرابی اس وقت شروع ہوئی جب گودام میں باہر سے کیمیکلز کی ایک شپ منٹ آئی اور اسے اس کا ایک ایک ڈرم جا کر چیک کرنا پڑا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ ڈرم پر خطرے کا نشان بنا ہوا تھا اور وہ بے احتیاطی سے عام کیمیکلز کے ساتھ رکھے تھے۔''

ہما بھی فکر مند ہو گئی۔ ''یہ تو بہت خطرناک بات ہے۔''

☆☆☆

پروفیسر، ہما، فرحان اور ہانیہ گھر کے لان میں موجود تھے۔ خزاں کی آمد کے ساتھ پت جھڑ شروع ہو گیا تھا اور لان اور پورچ والا حصہ پتوں سے بھرا ہوا تھا۔ شام کے وقت ہوا میں خنکی آگئی تھی۔ میز کے وسط میں پیپر ویٹ تلے کچھ کاغذات دبے ہوئے تھے اور وہ چاروں خاموش تھے۔ ہما کا چہرہ ستا ہوا تھا اور آنکھیں مسلسل رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اس کا کوئی تو علاج ہو گا۔''

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''ہے لیکن اس پر خرچ بہت زیادہ ہے۔ اسے لیور ٹرانسپلانٹ کرانا ہوگا۔ سنگاپور میں اس پر خرچ ڈھائی سے تین کروڑ روپے ہے۔ انڈیا میں ڈیڑھ کروڑ میں کام ہوسکتا ہے مگر انڈیا میں ٹرانسپلانٹ فیل ہونے کی شرح زیادہ ہے۔''

''ڈھائی کروڑ روپے۔'' ہما کا دل رک سا گیا۔ ''اتنے تو اس کے پاس نہیں ہیں۔ اس کے باپ کے پاس بس ایک یہی مکان ہے جس کی مالیت تیس چالیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ باقی سب وہ بیٹیوں کی شادی پر لگا چکا ہے۔''

''ہمیں جنید کی کمپنی سے بات کرنی چاہیے۔'' فرحان نے کہا۔

''ہاں دیکھا جائے تو جنید کی بیماری میں ان کا ہاتھ ہے انہوں نے اتنا خطرناک کیمیکل باہر سے منگوایا اور جنید کو بغیر کسی حفاظت کے اس کے پاس بھیج دیا۔'' ہانیہ نے فرحان کی تائید کی۔ وہ گوری چٹی، ہلکے براؤن بالوں، براؤن آنکھوں اور دلکش نقوش کی حامل تھی۔ اس کی عمر بائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ ہما نے کہا۔

''میں بات کروں گی۔''

پروفیسر نے تعجب سے اسے دیکھا۔ ''تم اتنا پڑھ لکھ کر بھی ایسی بات کر رہی ہو۔ ہمارے ملک کا سرمایہ دار اور کاروباری طبقہ صرف اپنے نفع سے غرض رکھتا ہے۔ اس کے ملازمین کے ساتھ کیا ہورہا ہے، یہ اس کا ذمہ نہیں ہے۔''

''کیوں ذمہ نہیں ہے۔ جنید کی بیماری کی وجہ وہی ہے۔'' ہما جذباتی ہوگئی۔

''تم بات کر کے دیکھ لو۔ وہ شاید کیمیکل کی موجودگی سے بھی انکار کر دیں گے۔''

''جنید کا کہنا ہے کہ نو دن پہلے جب وہ آخری بار گودام گیا تھا تو یہ کیمیکل وہاں موجود تھا۔''

پروفیسر نے کہا۔ ''میں نے اس کے بارے ریسرچ کی ہے۔ یہ اتنا خطرناک ہے کہ صرف چھونے سے بھی جسم میں سرایت کر جاتا ہے اور کیونکہ زہر کو ناکارہ بنانے کا کام جگر کرتا ہے اس لیے جب وہ اسے ناکارہ کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ کیمیکل الٹا اسے ہی ناکارہ کر دیتا ہے۔''

میز پر جنید کے ٹیسٹ کی رپورٹس تھیں۔ ان کے مطابق اس کا جگر تقریباً ناکارہ ہو گیا تھا اور نوے فیصد کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ صرف دس فیصد کام کر رہا تھا مگر جلد ہی یہ بھی جواب دے جاتا اور تب موت جنید کا مقدر بن جاتی۔ جگر کے سارے ٹیسٹ دو دو بار ہوئے تھے اور ہر بار نتیجہ ایک ہی آیا تھا۔ اس ایک ہفتے میں جنید اتنا کمزور پڑ گیا تھا کہ اب بستر سے اٹھ کر واش روم تک جاتا تو ہانپنے لگتا۔ اس کی خوراک برائے نام رہ گئی تھی۔ فرحان نے کہا۔ ''ہمیں کمپنی کے مالک سے بات کرنی چاہیے کہ وہ جنید کے علاج کا مکمل خرچ اٹھائے۔''

پروفیسر کے تاثرات سے لگ رہا تھا کہ وہ فرحان سے متفق نہیں ہے لیکن جب ہما نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو اس نے شانے اچکائے۔ ''یہ بھی کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ اگرچہ مجھے امید نہیں ہے کہ اس سے کام بنے گا۔''

☆☆☆

پروفیسر، میاں منیر الدین کے سامنے بیٹھا تھا۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کا سر سے مکمل گنجا اور کھرے مضبوط نقوش کا مالک تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص نوع کی بے حسی تھی۔ پروفیسر جانتا تھا کہ ایسے لوگ دوسروں کو ٹشو پیپر سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں کہ استعمال کیا اور پھینک دیا۔ میاں منیر ایم ایم کیمیکلز کا بانی اور کمپنی کا مالک تھا۔ بیس سال پہلے اس نے ایکسپورٹ سے اپنے بزنس کا آغاز کیا تھا۔ اب وہ اس مقام پر تھا کہ اس کے تیار کیے ہوئے کیمیکلز دنیا کے کئی ملکوں کو جاتے تھے۔ یہ مقام اس نے بہت محنت اور بہت سخت مقابلے کے بعد حاصل کیا تھا یہی سختی اس کے نقوش اور شخصیت میں رچ بس گئی تھی۔ وہ اس وقت پروفیسر کو بہت سرد نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے کوشش کر کے اس سے ملاقات کا وقت لیا تھا۔ اس نے پروفیسر کے سامنے بیٹھتے ہی کہا۔ ''مسٹر نعیم احمد میرا وقت بہت قیمتی ہے اس لیے بات مختصر اور جلدی کرو۔''

پروفیسر نے ہما کو منع کر دیا تھا کہ وہ میاں منیر سے بات نہ کرے کیونکہ وہ بھی اس کے پاس کام کرتی تھی اور اگر بات خراب ہوتی تو اس کی نوکری پر بھی بن آتی۔ اس نے خود بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ پروفیسر نے ایک فائل اس کے سامنے رکھی۔ ''اس میں آپ کے ایک ملازم جنید حماد کی رپورٹس ہیں۔ ان رپورٹس کے مطابق اس کا جگر اس حد تک خراب ہو گیا ہے کہ اب اس کا سوائے ٹرانسپلانٹ کے اور کوئی علاج نہیں ہے۔ جگر کی یہ خرابی ایک کیمیکل کی وجہ سے ہوئی جو آپ کے گودام میں بے پروائی سے موجود ہے۔''

''میرے گودام میں ایسا کوئی کیمیکل نہیں ہے۔'' میاں منیر نے کہا۔

''ہے اور آپ اس کی موجودگی سے انکار نہیں کر سکتے، بہت سی جگہوں پر اس کیمیکل کا اندراج ہو گا۔ جنید نے انوینٹری بنانے کے لیے بہت سا وقت اس کیمیکل کے ڈرمز کے پاس گزارا اور اسے قطعی علم نہیں تھا کہ یہ کیمیکل اتنا خطرناک ہے کہ صرف چھونے سے بھی جسم میں سرایت کر جاتا ہے۔ اسے نہ تو خبردار کیا گیا اور نہ ہی کوئی احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کو کہا۔ اس قسم کے خطرناک اور مضرِ صحت کیمیکلز کے بارے میں ایک سرکاری ایکٹ ہے جو ان کی ہینڈلنگ میں انسانی جان کی حفاظت کو یقینی بنانے کا کہتا ہے۔ مگر آپ نے ایسا نہیں کیا۔''

میاں منیر نے فائل کھولی اسے دیکھا اور بے پروائی سے بولا۔ ''ان رپورٹس سے کہیں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جنید کو یہ بیماری میرے گودام میں موجود کیمیکل کی وجہ سے لگی ہے۔'' اس نے کہتے ہوئے فائل بند کر کے واپس پروفیسر کی طرف سرکا دی۔ ''آپ کی آمد کا شکریہ، مجھے جنید کی بیماری کا علم ہے اور مجھے اس کا افسوس بھی ہے لیکن میں اس سلسلے میں کسی قسم کا کوئی الزام قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں نے اس کے گھر ایک لاکھ روپے بھیج دیے تھے۔''

''ایک لاکھ روپے؟'' پروفیسر کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آگئی۔ ''میاں صاحب وہ اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے اور ابھی اس کے مرنے کی عمر نہیں ہے۔ ڈھائی کروڑ میں اس کا علاج ممکن ہے۔''

میاں منیر نے کلائی پر بندھی بیش قیمت گھڑی میں اپنا قیمتی وقت دیکھا اور بولا۔ ''سوری اب مجھے ضروری کام ہے۔''

پروفیسر اس کا مطلب سمجھتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ اسے ایسی ہی توقع تھی مگر وہ ہما اور دوسرے لوگوں کی تسلی کے لیے یہاں تک چلا آیا تھا۔ ورنہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ منیر الدین کچھ کرنے سے انکار کر دے گا اور اپنے اوپر کوئی الزام بھی نہیں لے گا۔ نہ ہی اس کے ضمیر پر کوئی بوجھ آئے گا۔ وہ جانتا ہی نہیں تھا کہ ضمیر نام کی چیز بھی ہوتی ہے۔

☆☆☆

وہ چاروں خاموش بیٹھے تھے۔ میاں منیر سے ملاقات کی رُوداد پروفیسر نے ایک منٹ میں سنا دی تھی۔ فرحان اور ہانیہ فکرمند تھے لیکن ہما کا چہرہ سُتا ہوا تھا۔ وہ خود چند دنوں

میں بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ''یعنی کچھ نہیں ہو سکا، موت جنید کا مقدر بن گئی ہے۔''

''ہم اگر اپنا سب جمع کر لیں تب بھی نصف کروڑ جمع نہیں کر سکتے۔'' فرحان نے کہا۔ ''ڈھائی کروڑ تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''نہیں ایک راستہ ہے۔'' پروفیسر نے اپنے الجھے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ہما چونکی اور پھر اس نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کون سا راستہ؟''

''میں اپنا گھر فروخت کر دیتا ہوں۔ اگرچہ گھر تو کھنڈر ہے لیکن یہ جگہ بہت قیمتی ہے۔ اس کے تین کروڑ سے زیادہ ہی مل جائیں گے۔''

اس بار ہما کے ساتھ وہ دونوں بھی چونک گئے۔ جب انہوں نے پروفیسر سے ملنا اور اس کے گھر آنا جانا شروع کیا تو رفتہ رفتہ بہت سی باتیں ان کے علم میں آئی تھیں۔ پروفیسر نے ایک ایک کر کے اپنے اضافی پلاٹ فروخت کر دیے تھے۔ مگر اس نے ایک پلاٹ بھی اپنی ذاتی ضرورت کے لیے فروخت نہیں کیا تھا۔ اس کی ذاتی ضروریات بہت محدود تھیں۔ وہ سادہ کھاتا پیتا تھا۔ اس کے پاس چند سوٹ تھے۔ اسے تمباکو تک کا شوق نہیں تھا۔ گھومنا پھرنا اور ہوٹلنگ کرنا پسند نہیں تھا۔ اس کا صرف ایک شوق تھا اور وہ تھا پڑھنا۔ کتابوں سے حاصل ہونے والی آمدنی کا بڑا حصہ کتابوں کی خرید پر خرچ ہو جاتا تھا۔ ہما کے علم میں آیا کہ پروفیسر نے پلاٹ دوسروں کی مدد کے لیے فروخت کیے تھے۔ اگرچہ پوچھنے پر بھی اس نے کبھی کھل کر نہیں بتایا تھا مگر اس نے اعتراف ضرور کیا کہ جب کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا تھا تو اسے یہ اضافی زمین اپنے اوپر بوجھ لگنے لگتی تھی اور وہ اسے فروخت کر کے دوسروں کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ ہوتے ہوتے اب اس کے پاس چار سو گز کا یہ آخری پلاٹ بچا تھا۔ ہما نے جتنا بے ساختہ پوچھا تھا، اس نے اتنی ہی بے ساختگی سے نفی میں سر ہلایا۔

''بالکل بھی نہیں، آپ اس گھر کو فروخت کرنے کا سوچیں بھی نہیں۔''

پروفیسر نے آس پاس دیکھا۔ ''کیا ہے اس میں، کچھ زمین، ایک کھنڈر ہو جانے والا مکان اور بہت سے پودے۔ کیا یہ ایک انسانی جان سے بڑھ کر ہیں۔''

''نہیں لیکن یہ گھر صرف ان تین چیزوں پر مشتمل نہیں ہے۔ یہاں آپ کی ساری عمر ہے۔ آپ کا بچپن اور جوانی، آپ کے ماں باپ اور بہن بھائیوں کی یادیں، اس جگہ کی ہمارے لیے ایک جذباتی حیثیت ہے اور سب سے بڑھ کر آپ کے پاس بس کل یہی اثاثہ ہے۔ ہم کسی صورت اسے فروخت کرنے کی اجازت نہیں دیں گے۔'' ہما کہتے ہوئے جذباتی ہو گئی۔ اگرچہ پروفیسر سے ان کا قریبی تعلق قائم ہو گیا تھا مگر اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ جنید کے لیے اتنی بڑی قربانی دینے کو تیار ہو جائے گا۔

''تب کیا کیا جائے، جنید کو کیسے بچایا جائے اور بات صرف جنید کی زندگی کی نہیں ہے، اس کے ساتھ کچھ زندگیاں اور بھی جڑی ہیں۔'' پروفیسر نے کہا تو ہما کا رنگ سرخ ہو گیا۔ پروفیسر کا اشارہ اسی کی طرف تھا۔

''کچھ بھی ہو، یہ گھر نہیں فروخت ہو گا۔'' ہما کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔ ''آپ کوئی اور ترکیب سوچیں، آپ بہت ذہین ہیں، مجھے یقین ہے آپ کوئی ایسی ترکیب سوچ لیں گے جس سے جنید کا علاج ہو سکے۔''

پروفیسر ہنسا۔ ''پتا نہیں تم لوگ مجھے کیا سمجھتے ہو۔ میں ہر مسئلے کا حل نہیں نکال سکتا۔''

''لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ آپ ہر مسئلے کا حل نکال سکتے ہیں۔''

اس بار پروفیسر سنجیدہ ہو گیا۔ ''میں ہر مسئلے کا حل نہیں نکال سکتا لیکن میری پوری کوشش ہو گی کہ اس مسئلے کا حل نکال سکوں اور جنید زندہ رہے۔ اسے زندہ رہنا چاہیے۔''

ہما خوش ہو گئی۔ ''سچ میں؟''

پروفیسر نے اثبات میں سر ہلایا۔ فرحان اور ہانیہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جب وہ گھر سے نکلے تو راستے میں فرحان نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے کہ پروفیسر کے پاس جادو کی چھڑی ہے جو وہ کہیں سے ڈھائی کروڑ روپے کا انتظام کر لیں گے۔''

''یہ میں نہیں جانتی مگر ان کی ذہانت پر مجھے اندھا اعتماد ہے۔ اگر وہ کچھ کرنے کی ٹھان لیں تو اسے کرنے کا راستہ نکال لیتے ہیں۔''

''شاید تم ان کے ناولوں سے متاثر ہو کر یہ بات کہہ رہی ہو۔'' فرحان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے وہ ذہین ہیں اور مصنف ہیں تو ان کی باتیں بھی عام لوگوں سے مختلف ہوں گی مگر وہ ہر مشکل کا حل نہیں نکال سکتے۔''

ہما اس بحث سے چڑ گئی۔ ''تم لوگوں کی جو مرضی چاہے سوچو اور میں صرف ان کے ناولوں سے متاثر ہو کر ایسا نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں بھی جانتی ہوں کہ فکشن اور عام

زندگی میں فرق ہوتا ہے۔ مگر عام زندگی میں بہت سا ایسا بھی ہوتا ہے جو ہمیں فکشن میں نظر نہیں آتا ہے۔''

فرحان ہنسا۔ ''ایسا ہی پروفیسر بھی کر کے دکھائیں گے۔''

''ہاں وہ عملی زندگی کے چیلنج سے بھی نمٹ سکتے ہیں۔'' ہما نے یقین سے کہا۔ ''جو شخص کسی دوسرے کی خاطر اپنا قیمتی ترین اثاثہ بیچنے کو تیار ہو جائے، اس سے زیادہ پریکٹیکل کون ہوگا۔ ہم سوائے باتوں کے اور کیا کر سکتے ہیں؟''

فرحان اور ہانیہ جھینپ گئے۔ ''ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

''اور پروفیسر کے پاس بہت کچھ ہے۔'' ہما طنزیہ انداز میں ہنسی۔ ''تم لوگ مان کیوں نہیں لیتے کہ وہ بہت سے ایسے کام کر سکتے ہیں جو عام آدمی نہیں کر سکتا۔ جو شخص اپنی کروڑوں کی پراپرٹی دوسروں کی خاطر فروخت کر دے، وہ ہر کام کر سکتا ہے۔''

''اچھا بابا۔'' فرحان نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''میں نے مان لیا کہ پروفیسر سب کر سکتے ہیں۔''

ہانیہ ہنسی۔ ''سوائے محبت کے۔''

''یہاں بھی تمہارا اندازہ غلط ہے جیسی محبت پروفیسر کرتے ہیں ویسی کوئی دوسرا نہیں کر سکتا ہے۔''

''اتنا تو پروفیسر کی والدہ ان کے بارے میں نہیں جانتی ہوں گی، جتنا تم جان گئی ہو۔''

''ہاں میں نے پروفیسر کی شخصیت کو بہت گہرائی سے دیکھا ہے۔'' اس نے فخر سے کہا۔ اس پر فرحان اور ہانیہ نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا مگر کچھ کہا نہیں۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ اگلے دن ہما، جنید کو دیکھنے گئی۔ اس کا چہرہ زیادہ زرد ہو گیا تھا اور ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ جنید کی دوسرے نمبر کی شادی شدہ بہن اسے اپنا جگر... عطیہ دینے کے لیے تیار تھی مگر مسئلہ وہی تھا کہ ٹرانسپلانٹ کے لیے درکار اتنی بڑی رقم کہاں سے لائی جائے۔ ہما اسے پروفیسر کے بارے میں بتا رہی تھی کہ وہ اس کی خاطر اپنا گھر فروخت کرنے پر تیار ہو گیا تھا مگر ہما نے اسے منع کر دیا۔ ''جنید ہم ان سے اتنا بڑا ایثار نہیں لے سکتے۔''

جنید نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''ہاں تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہمیں ان کے احسان کی ضرورت نہیں ہے۔''

جنید کے لہجے پر ہما نے چونک کر اسے دیکھا۔ ''انہوں نے بہت خلوص سے یہ پیشکش کی تھی اور وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کسی کے لیے کچھ کر کے اس پر احسان جتائیں۔''

''ہاں وہ ایسے آدمی نہیں ہیں لیکن...''

''مگر جنید انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ تمہارے علاج کے لیے کوئی راستہ نکالیں گے۔''

''وہ کیا کر سکتے ہیں؟'' جنید مسکرایا۔ ''کیا وہ کہیں اور سے ڈھائی کروڑ روپے پیدا کر سکتے ہیں۔''

''یہ میں نہیں جانتی مگر وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔''

فرحان اور ہانیہ کی طرح جنید کو بھی یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے مایوسی سے کہا۔ ''مجھے نہیں لگ رہا ہے کہ وہ کچھ کر سکیں گے اور میں ٹھیک ہوں گا۔''

☆☆☆

پروفیسر کے لان میں آج صرف ہما تھی۔ پروفیسر نے اسے کال کر کے اکیلے آنے اور اس ملاقات کے بارے میں دوسروں کو بتانے سے منع کیا تھا۔ اس لیے ہما اکیلی آئی تھی۔ اس سے پہلے پروفیسر نے اسے کبھی اکیلے نہیں بلایا تھا۔ دوسری انوکھی بات یہ تھی کہ آج پروفیسر نے اس کے لیے چائے بنائی تھی۔ حالانکہ اس نے کبھی ان میں سے کسی کے لیے چائے نہیں بنائی تھی۔ جس کا دل چاہتا، وہ کچن میں جا کر خود اپنے لیے یا دوسروں کے لیے بھی چائے بنا لیتا تھا۔ عام طور سے دوسروں کے لیے یہ فریضہ ہما کو انجام دینا پڑتا تھا۔ اس نے پوچھ لیا۔ ''خیریت، آج آپ نے چائے بنائی ہے؟''

پروفیسر مسکرایا۔ ''بس مجھے خیال آیا کہ میں نے آج تک تمہارے لیے چائے نہیں بنائی ہے اس لیے آج بنا لی۔ ویسے جیسی چائے میں پیتا ہوں، وہ کم لوگوں کو پسند آتی ہے۔''

ہما نے سپ لے کر دیکھا۔ ''آپ نے بہت اچھی بنائی ہے۔''

''شکریہ۔'' پروفیسر نے کہا اور اصل موضوع کی طرف آ گیا۔ ''ہما تم نے مجھے مشکل میں ڈال دیا ہے۔ جو کام آسانی سے ہو سکتا ہے، تم اس کے لیے راضی نہیں ہو۔''

''گھر والی بات تو میں کسی صورت نہیں مانوں گی۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''اب ایک ہی صورت رہ جاتی ہے کہ یہ رقم میاں منیر سے نکلوائی جائے۔''

''وہ پہلے ہی انکار کر چکا ہے۔'' ہما مایوسی سے بولی۔ ''محال ہے کہ وہ ڈھائی کروڑ روپے دے دے۔''

''تم نے میرے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ لی نہیں جائے، نکلوائی جائے۔''

اس بار ہما چونکی۔ ''نکلوائی جائے... اسے کسی طرح مجبور کر کے۔''

''لازمی بات ہے۔'' پروفیسر بولا۔ ''شرافت سے دینے سے اس نے پہلے ہی انکار کر دیا ہے۔''

''مگر کیسے؟''

''کیسے کا سوال اس وقت پیدا ہوگا جب تم اس معاملے میں مجھ سے متفق ہو گی۔''

''میں آپ سے متفق ہوں۔''

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس طرح نہیں، اچھی طرح سوچو، یہ معاملہ کرمنل بھی ہو سکتا ہے اور ہمیں قانون کا خطرہ ہو سکتا ہے۔''

اس بار ہما سوچ میں پڑ گئی۔ ''یعنی ہم گرفتار بھی ہو سکتے ہیں؟''

''بالکل، اگر ہم سے غلطی ہوئی تو ہم قانون کی گرفت میں آ سکتے ہیں اور ہمیں سزا بھی ہو سکتی ہے۔''

''اور اگر غلطی نہ ہوئی تو؟''

''ڈھائی کروڑ روپے ہمارے پاس ہوں گے اور ہم جنید کو علاج کے لیے باہر بھیج سکیں گے۔''

ہما شش و پنج میں پڑ گئی۔ ایک طرف جنید کا معاملہ تھا اور دوسری طرف قانون کا خوف۔ اسے پروفیسر کی ذہانت پر اعتماد تھا مگر غلطی نہ کرنا انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ پروفیسر غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''تم اچھی طرح سوچ لو۔''

''فرض کریں، میں مان جاتی ہوں تو آپ فرحان اور ہانیہ کو بھی شامل کریں گے؟''

پروفیسر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں ان کی شمولیت رسک ہو گی۔ اول تو ان کی جنید سے جذباتی وابستگی نہیں ہے۔ دوسرے وہ اتنے پکے نہیں ہیں کہ اتنا بڑا کام کر کے اسے راز رکھ سکیں۔ اس لیے صرف میں اور تم ہی کام کریں گے۔ تمہیں بھی میں اس وجہ سے شامل کر رہا ہوں کہ شاید میں اکیلے یہ کام نہ کر سکوں۔''

''کیا ہم دو افراد کافی ہوں گے۔ جبکہ مجھے تو اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''اگر تم سمجھ رہی ہو کہ یہ مار دھاڑ والا کوئی عملی قدم ہوگا تو یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں بھی ایسے کاموں کا کوئی تجربہ نہیں رکھتا ہوں۔ ہم اپنی ذہانت آزمائیں گے۔''

پروفیسر نے اسے سوچنے کے لیے کہا تھا اور اس نے وقت کی شرط بھی نہیں رکھی تھی لیکن ہما جانتی تھی کہ وقت کم تھا۔ ڈاکٹرز نے جنید کو ایک مہینے کے اندر لیور ٹرانسپلانٹ کا کہا تھا۔ اسے جنید سے محبت تھی اور وہ اسے مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس رات وہ دیر تک جاگتی اور سوچتی رہی پھر اس نے پروفیسر کے موبائل پر کال کی اور اس نے نیند سے اٹھ کر کال ریسیو کی۔ ''ہما کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''میں تیار ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''گڈ، پہلا کام یہ کرو کہ کل آفس سے ایک مہینے کی چھٹی لے لو۔ چاہے کسی بھی طریقے سے لو مگر اس کا ذکر اپنی والدہ سے بھی نہیں کرو گی۔''

☆☆☆

ہما یونیورسٹی کے بعد پہلی بار پروفیسر سے گھر کے علاوہ کہیں ملی تھی۔ وہ ساحل سمندر کے ساتھ ایک ریستوران میں بیٹھے تھے۔ سرما کی آمد کے ساتھ ہی یہاں کاروبار ٹھنڈا ہو گیا تھا اور دن میں ویسے ہی رونق کم ہوتی تھی۔ وہ ایک کونے والی میز پر بیٹھے ہوئے تھے اور ہما کھڑکی کے پاس سمندر کی لہریں دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ وہ جنید کے ساتھ کبھی ایسی جگہ نہیں آئی۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ کبھی گھومنے نکلے ہی نہیں۔ جسے عرف عام میں ڈیٹ کہتے ہیں۔ ان کی ساری ملاقاتیں یونیورسٹی اور پھر پروفیسر کے گھر میں ہوتی رہی تھیں۔ پروفیسر خاموش تھا اور جب ویٹر ان کے سامنے چائے اور دوسرے لوازمات رکھ کر گیا تو اس نے کہا۔ ''میں نے منیرالدین کی جاسوسی کی ہے۔ رشتے داروں کے لحاظ سے وہ غریب آدمی ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی نزدیکی خونی رشتے دار ہے تو وہ اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ماں باپ اس وقت گزر گئے تھے جب وہ بیس سال کی عمر میں اس شہر میں وارد ہوا تھا۔ بہن بھائی کوئی نہیں ہے۔ اس نے ایک تاجر کی بیٹی سے شادی کی اور یہیں سے اس کی ترقی کا سفر شروع ہوا۔ انکم ٹیکس کے لحاظ سے وہ بہ مشکل کروڑ پتی ہے لیکن اپنے اثاثوں کے لحاظ سے وہ ارب پتی ہے۔ ایک فیکٹری اور گودام کے علاوہ ساحل کے نزدیک ایک پوش علاقے میں اس کا دو ہزار گز کا بنگلا ہے جس کی مالیت پچاس سے ساٹھ کروڑ روپے ہے۔''

ہما حیران ہوئی۔ وہ چائے بنا رہی تھی۔ ''اتنا امیر ہے یہ شخص؟''

''شاید ہمارے اندازے سے بھی زیادہ۔''

''تب یہ آسانی سے ڈھائی کروڑ دے سکتا ہے۔'' ہما

نے چائے ..... پروفیسر کے سامنے رکھی۔

''بالکل یہ ساری معلومات اسی مقصد کے لیے حاصل کی ہیں۔''

''لیکن اگر اس کے پاس اتنی یا اس سے کہیں زیادہ دولت ہے تب بھی وہ اس میں سے اپنی خوشی سے ایک روپیہ نہیں دے گا۔''

''خوشی سے نہیں، مجبوری سے دے گا۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''جب ہم یہاں سے نکلیں گے تو میں تمہیں اس کا بنگلا دکھاؤں گا۔''

''آپ کیسے اُسے مجبور کریں گے؟''

''میں نے بتایا نا کہ دنیا میں اس کا ایک ہی خون کا رشتہ ہے۔ اس کی بیٹی اٹھارہ سالہ تانیا۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور وہ منیرالدین کی مجبوری ہے۔ اپنی بیٹی کی خاطر وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔''

''آپ تانیا کی مدد سے اسے مجبور کریں گے مگر کیسے؟''

''جلد بازی نہیں۔'' پروفیسر نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''ہمیں سکون سے مرحلہ وار کام کرنا ہے تاکہ غلطی کی گنجائش نہ رہے۔ پہلا مرحلہ ہے مکمل معلومات حاصل کرنا۔ اس کے بعد دوسرا مرحلہ شروع ہوگا ایک قابلِ عمل پلان تیار کرنا اور تیسرا مرحلہ ہوگا اس پر عمل کرنا۔ سمجھ لو ابھی ہم پہلے مرحلے میں ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ہمیں کچھ کام اور کرنے ہیں اور میں نے اسی لیے تمہیں یہاں بلایا ہے۔''

ہما بے تاب تھی مگر پروفیسر کی بات نے اسے صبر کرنے پر مجبور کردیا۔ چائے اور ریفریشمنٹ سے نمٹ کر وہ ریستوران سے نکلے۔ کچھ دیر بعد وہ منیرالدین کے عالی شان بنگلے کے سامنے تھے جس کے گیٹ پر دو مسلح اور مستعد گارڈز موجود تھے۔ سامنے پارک تھا اور وہ پارک کے دوسری سمت رکے تھے۔ پروفیسر نے ہما کو بتایا کہ بنگلے والی سڑک پر کھمبوں پر پرائیویٹ سیکورٹی کیمرے لگے تھے جو وہاں سے گزرنے والی ہر گاڑی کا نمبر اور اس کے ڈرائیور کا چہرہ محفوظ کرسکتے تھے۔ اس لیے اس نے بنگلے والی سڑک پر جانے کی کوشش نہیں۔ ہما نے دیکھا کہ وہ جس سڑک پر کھڑے تھے، کیمرے وہاں بھی لگے تھے۔ اس نے نشان دہی کی تو پروفیسر نے بے پروائی سے کہا۔ ''ان سے ہمارا تعلق نہیں ہے لیکن منیرالدین سے ہونے والا ہے اس لیے ہمیں محتاط رہنا ہے۔''

بنگلے کے احاطے میں بڑے درخت لگے تھے جنہوں نے بنگلے کی اصل عمارت کو چھپالیا تھا۔ کچھ دیر بعد پروفیسر نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں ہما نے اس سے پوچھا۔ ''میں نے چھٹی لے لی اور امی کو نہیں بتایا ہے۔ اب مجھے روز صبح دفتر کے اوقات پر نکلنا اور شام واپس آنا ہوگا۔ میں ڈیوٹی والا وقت کہاں گزاروں گی؟''

''اس کا بندوبست بھی ہوجائے گا۔ آج تم شام تک میرے گھر پر رہوگی۔ تمہیں کچھ تیاری کرنی ہوگی۔''

''کیسی تیاری؟''

''یہ میں گھر چل کر بتاتا ہوں۔''

وہ گھر پہنچے اور اندر آئے تو پروفیسر اسے نشست گاہ میں لایا۔ اسے بٹھا کر وہ گیا اور واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک وگ تھی۔ گولڈن براؤن بالوں والی یہ وگ زنانہ تھی اور بالوں کی لمبائی خاصی تھی۔ ہما کے اصل بال اتنے لمبے نہیں تھے۔ وہ مشکل سے اس کی کمر کے خم تک آتے تھے۔ پروفیسر نے اسے تپائی پر بٹھا کر وگ اس کے بالوں کے اوپر فٹ کی اور ذرا سی دیر میں وہ یوں فٹ ہوئی کہ آئینے میں دیکھ ہما حیران رہ گئی تھی۔ اس کے بال سرخی مائل سرمئی تھے۔ بالوں کا رنگ اور سائز بدلا تو وہ خاصی مختلف نظر آنے لگی۔ اس نے پروفیسر سے پوچھا۔ ''یہ وگ کس لیے؟''

''ظاہر ہے تمہارا حلیہ بدلنے کے لیے ہے۔'' پروفیسر نے کہا اور اس کا جائزہ لیا۔ ''کچھ تبدیلی اور کرنا ہوگی۔ تمہاری جسامت لڑکیوں جیسی ہے، اسے عورتوں جیسی کرنا ہوگی۔''

پروفیسر کے یوں غور سے دیکھنے پر وہ جھینپ گئی۔

''وہ کیسے؟''

''کمر بڑھانے کے لیے بیلٹ باندھنا ہوگی۔ میرے پاس ہے۔'' پروفیسر جا کر چوڑی بیلٹ لے آیا اور اسے تھما کر واش روم جا کر پہن کر آنے کے لیے کہا۔ وہ واش روم میں قمیص تلے بیلٹ پہن کر آئی تو پروفیسر نے پھر اس کا جائزہ لیا۔ ''ہاں اب ٹھیک ہے۔ اب تمہاری رنگت بدلنا ہوگی۔''

پروفیسر نے ایک ٹیوب سے لوشن جیسی چیز نکال کر اسے چہرے، گردن اور ہاتھوں پر ملنے کو کہا۔ ''ڈرومٹ یہ عام اور بے ضرر چیز ہے اداکار عام استعمال کرتے ہیں اپنی رنگت بدلنے کے لیے۔''

ہما نے اسے لے کر چہرے، گردن اور ہاتھوں پر لگایا تو اس کی سرخ و سفید رنگت تیج سی ہوگئی۔ یہ سانولی نہیں تھی بلکہ سونے جیسی زردی مائل ہوگئی تھی اور بہت اچھی لگ رہی

تھی۔ اس حلیے کے ساتھ پروفیسر نے اس کی تصویریں لیں اور اس کے بعد اسے اصل حلیے میں آنے کو کہا۔ لوشن کا اثر ایک بار صابن سے منہ ہاتھ دھونے سے ہی ختم ہو گیا تھا۔ جب وہ اصل حلیے میں آئی تو پروفیسر نے پھر اس کی تصاویر لیں اور اسے لیپ ٹاپ پر دکھایا۔ ''غور کرو دونوں تصویروں میں تم میں کتنا فرق آرہا ہے؟''

ہما نے غور کیا اور تسلیم کیا۔ ''بہت زیادہ فرق آرہا ہے صرف وہی شخص دونوں حلیوں میں مجھے پہچان سکتا ہے جس نے مجھے دونوں حلیوں میں قریب سے دیکھا ہو۔''

''یعنی کہ میں۔'' پروفیسر مسکرایا۔ ''کل تم ایسا سوٹ پہن کر آؤ گی جو تمہیں کسی قدر ڈھیلا ہو۔ اس میں تمہاری جسامت اور تبدیل ہوگی۔''

وہ ہچکچائی۔ ''کیا یہ سب ضروری ہے؟''

''بہت ضروری ہے، سمجھ لو یہ ہماری فرسٹ سیکورٹی لائن ہوگی کہ کوئی ہمیں بہ حیثیت پروفیسر نعیم احمد اور ہما عضر کے شناخت نہ کر سکے۔''

''تب ٹھیک ہے۔'' ہما نے سر ہلایا۔

☆☆☆

اگلے دن وہ ذرا تاخیر سے پروفیسر کے گھر پہنچی تھی۔ پروفیسر نے ہی اسے دیر سے آنے کو کہا تھا۔ آمنہ سے اس نے بہانہ کیا کہ آج وہ دیر سے جائے گی کیونکہ اس کے سیکشن کا باس دیر سے آئے گا۔ وہ دس بجے گھر سے نکلی اور ساڑھے دس بجے تک پروفیسر کے یہاں پہنچی۔ گھر کا چھوٹا گیٹ ہمیشہ کھلا ہوتا تھا اور پروفیسر صرف رات سوتے وقت اسے بند کرتا تھا۔ دن میں یہ کھلا ہی رہتا تھا۔ وہ اندر آئی اور برآمدے کے ساتھ ستون پر لگی کال بیل بجائی۔ کچھ دیر بعد پروفیسر نے دروازہ کھولا تو وہ دنگ رہ گئی۔ اس کے سامنے مختصر کریو کٹ بالوں، ہلکی مونچھوں والا کلین شیو شخص کھڑا تھا، اس نے بہترین ڈریس پینٹ کے ساتھ اس سے میچ کرتی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ بالوں کا رنگ ڈارک گرے تھا اور یہ بالکل اصل لگ رہا تھا۔ اسے خاصی دیر بعد احساس ہوا کہ وہ پروفیسر ہی تھا مگر اس حلیے میں اپنی اصل شخصیت سے بالکل الگ لگ رہا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی۔

''میرے خدا... پروفیسر آپ بالکل الگ رہے ہیں۔ سو فیصد الگ۔''

''اگر تم یہ بات کہہ رہی ہو تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی اور مجھے ہرگز نہیں پہچان سکے گا۔''

''جب آپ نے مجھے حلیہ بدلنے کو کہا تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں کہ آپ بھی حلیہ بدلیں گے۔''

''یہ لازمی ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''تم بیٹھو پھر ہم چلیں گے۔''

''کہاں؟''

''ایک چھوٹا کرائے کا فلیٹ تلاش کرنے کے لیے جہاں ہم آنے والے ایک مہینے رہ سکیں۔''

ہما چونکی پھر اس نے جھجک کر کہا۔ ''مستقل؟''

''آس پاس والے یہی سمجھیں گے۔'' پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''لیکن دن میں زیادہ تر وقت تم اور رات میں، میں وہاں رہوں گا۔ اب تم بھی حلیہ بدل لو۔''

اس بار بھی پروفیسر نے وگ اس کے سر پر فٹ کی تھی۔ مگر یہ کام اس نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے کیا تھا۔ ''دو تین بار مجھے کرتے دیکھو تو تم خود سے بھی وگ پہن سکو گی اور یہ ضروری ہے۔''

آج وہ ڈھیلا سوٹ پہن کر آئی تھی اس لیے جب اس نے کمر پر بیلٹ پہنی تو وہ مناسب لگی۔ اس حلیے میں وہ خوب صورت لیکن اپنی اصل عمر سے چار پانچ سال بڑی اور شادی شدہ عورت لگ رہی تھی۔ وہ باہر نکلے تو ہما کا خیال تھا کہ وہ اپنی گاڑی میں جائیں گے مگر وہ کوٹھی سے باہر آئے اور پروفیسر نے یہاں گلی میں کھڑی ایک ذرا پرانے ماڈل کی مگر صاف ستھری سفید چھوٹی کار کا دروازہ کھولا۔ ''میں نے یہ کار خریدی ہے لیکن اس کی نمبر پلیٹ جعلی ہے۔ تمہیں ڈرائیونگ سیکھنا ہوگی۔''

''اتنی جلدی کیسے سیکھ سکتی ہوں۔''

''تمہیں لازمی سیکھنا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ضرورت پڑ جائے اور اس کے بغیر کام نہ بنے۔''

''ٹھیک ہے میں پوری کوشش کروں گی۔'' ہما نے سر ہلایا۔ ''کرائے پر کوئی بھی مکان یا فلیٹ لینے کے لیے شناختی کارڈ لازمی ہے تو آپ یہ مسئلہ کیسے حل کریں گے؟''

''تم دیکھ لو گی۔'' پروفیسر نے کہا۔ وہ ایک پوش علاقے میں پہنچے۔ یہ جگہ منیرالدین کے بنگلے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی بلکہ رہائشی اسکیم کے لحاظ سے یہ سارا علاقہ ایک ہی تھا۔ وہ ایک اسٹیٹ ایجنسی میں داخل ہوئے اور اندر جانے سے پہلے پروفیسر نے اسے آہستہ سے کہا۔ ''ہم دونوں مسٹر اینڈ مسز راحت خان ہیں اور دارالحکومت سے آئے ہیں۔ میں یہاں ایک نجی یونیورسٹی میں جاب کرتا ہوں۔''

ہما جھینپ گئی۔ اس نے سر ہلایا اور وہ دونوں اندر

آئے۔ ایک ملازم نے ان کا استقبال کیا اور اطلاع دی کہ اسٹیٹ کا مالک کچھ دیر میں وہاں آنے والا تھا۔ دس منٹ بعد ایک ادھیڑ عمر اور معقول نظر آنے والا شخص اندر آیا۔ وہ اسٹیٹ کا مالک ریاض علی تھا۔ پروفیسر نے اپنا اور ہما کا طے شدہ تعارف کرایا۔ تعارف کے بعد ریاض علی نے ان کے لیے چائے کا کہا اور بولا۔ ''فرمایئے میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟''

''اصل کام تو ہمیں ایک مہینے بعد ہوگا۔'' پروفیسر نے بے تکلفی سے کہا۔ ''اس وقت ہم ایک اور کام سے آئے ہیں۔ ہمیں ایک مہینے کے لیے ایک ٹھکانے کی تلاش ہے۔''

''ایک مہینے کے لیے، مگر کیوں؟''

''کیونکہ دارالحکومت سے یہاں آتے ہوئے ٹرین سے اترنے کے بعد بدقسمتی سے میری جیب کٹ گئی اور پرس میں رقم تو خاص نہیں تھی مگر شناختی کارڈ میرا اور میری بیوی دونوں کا چلا گیا۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ شناختی کارڈ کے بغیر انسان کتنی مشکل میں پڑ جاتا ہے۔''

''ریاض علی نے سر ہلایا۔ ''بالکل اس کے بغیر تو آپ کچھ نہیں لے سکتے۔''

''اس لیے ہمیں مکان بھی نہیں ملا ہے اور ہم ایک واقف کار کے ہاں مقیم ہیں۔ میں نے ایف آئی آر درج کرادی ہے اور دوسرے شناختی کارڈ بننے کے لیے درخواست بھی دے دی ہے۔ امید ہے کہ ایک مہینے میں شناختی کارڈ مل جائیں گے۔ تب تک ہمیں کوئی چھوٹی جگہ چاہیے جو آسانی سے مل سکے اور اسے چھوڑنا بھی آسان ہو۔ جب شناختی کارڈز آجائیں گے تو ہم اپنی حیثیت کے مطابق جگہ پرچیز کریں گے۔''

''شناختی کارڈ کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔'' ریاض علی نے نفی میں سر ہلایا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن میرے پاس ایف آئی آر کی کاپی اور شناختی کارڈز کی رسیدیں موجود ہیں۔'' پروفیسر نے دونوں چیزیں جیب سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیں۔ ''اگر اسے آپ انسانی نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہ ہمارے لیے ایک فیور ہوگا۔''

ریاض علی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کہا۔ ''خان صاحب آج کل سختی بہت ہو رہی ہے اور بغیر شناختی کارڈ کے جگہ کسی اجنبی کو کرائے پر دینے کا مطلب ہے کہ آپ ایجنسیوں کے رگڑے میں بھی آسکتے ہیں۔''

''میں سمجھتا ہوں مگر ہم میاں بیوی شریف لوگ ہیں۔ میرے سارے تعلیمی اور دوسرے ڈاکومنٹس یونیورسٹی میں جمع ہیں تصدیق کے لیے اور بغیر شناختی کارڈ کے میں وہ بھی وہاں سے نہیں نکلوا سکتا..... میں نے کہا نا صرف ایک مہینے کی بات ہے۔''

اس بار ریاض علی کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات آئے وہ اندر سے قائل ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ نے کہا کہ آپ کسی عزیز کے گھر ہیں تو ایک مہینا...''

ہما اب تک خاموش تھی اور اس نے محسوس کیا کہ اس کے بولنے کا وقت آگیا ہے، اس نے کسی قدر تلخ لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ عزیز تیار ہوتے تو ہمیں اس طرح کرائے کا مکان تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ دو دن سے اسٹیٹ والوں کے پاس دھکے کھا رہے ہیں۔''

ریاض علی نے ایک بار پھر ایف آئی آر کی نقل اور شناختی کارڈز کی رسیدوں کو دیکھا اور گہری سانس لے کر بولا۔ ''آپ نے انسانیت کی بات کی ہے تو میں آپ کو ایک فیور دے سکتا ہوں۔ نزدیک ہی میرا ایک چھوٹا فلیٹ ہے اور مکمل فرنش ہے۔ لیکن میں کوئی معاہدہ نہیں کروں گا اور کیش ایک لاکھ روپے لوں گا۔ کرایہ دس ہزار ہے ایک مہینے بعد میں آپ کو نوے ہزار روپے بل مائنس کر کے واپس کردوں گا اور اگر کوئی مسئلہ ہوا تو پہچاننے سے بھی انکار کردوں گا اور میرا بیان یہ ہوگا کہ میں آپ کو جانتا نہیں ہوں اور نہ یہ جانتا ہوں کہ میرے فلیٹ میں آپ کیسے گھسے۔''

''کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔'' پروفیسر نے اسے یقین دلایا۔ ''میں ایک لاکھ دوں گا۔ میں تو یہاں بڑا فلیٹ خرید بھی سکتا ہوں۔ یا کوئی چھوٹا لیکن مناسب مکان مل جائے۔''

''میرے ساتھ آیئے۔''

☆☆☆

''یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی، ہم آپ کے گھر سے بھی تو حلیہ بدل کر نکل سکتے تھے۔''

''ایک دن کی بات الگ ہے لیکن اگر روز میں اور تم بدلے حلیے میں یہاں سے نکلتے تو محلے والے اس بات کو نوٹ کرہی لیں گے۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''میں معمولی سا رسک بھی نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے الگ گاڑی اور الگ جگہ لی ہے۔''

''آپ نے ایف آئی آر کی کاپی اور شناختی کارڈ کی رسیدیں کیسے حاصل کیں؟''

پروفیسر مسکرایا۔ ''جعلسازی سے۔ یہ کام اتنا مشکل

نہیں ہے۔ کاغذ عام مل جاتا ہے اور پرنٹر سے پرنٹ نکال لیا۔ اصل جعلسازی کمپیوٹر پر کرلی تھی۔''

''اب ہم کیا کریں گے؟'' ہما نے پوچھا۔

''اب ہم تانیا کے بارے میں معلومات حاصل کریں گے کہ اس کے مشاغل کیا ہیں، وہ کن سے ملتی ہے اور کہاں جاتی ہے؟''

''یہ کام کب کرنا ہے؟'' ہما نے پوچھا۔ انہیں فلیٹ میں پہلا دن تھا۔ ریاض علی کو دکھانے کے لیے وہ اپنا سامان لائے تھے۔ پروفیسر نے اسے ایک لاکھ روپے نقد دیے تھے اور اس نے فلیٹ کی ایک چابی ان کے حوالے کی تھی۔ مگر یہ اصل نہیں بلکہ نقل تھی۔ وہ ایک لاکھ روپے لے کر اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ اب ایک مہینے بعد آئے گا۔ اس چکر میں شام ہوگئی اور اب ہما کو گھر جانا تھا۔ آج پروفیسر نے کار ڈرائیونگ کا پہلا سبق دیا تھا اور اس نے عملی طور پر کار چلائی تھی۔ پروفیسر نے کہا۔ ''یہ کام آج میں کروں گا اور ہوسکتا ہے کہ تمہاری ضرورت بھی پڑے لیکن اب تم گھر جاؤ۔''

ہما نے اپنا حلیہ بدلا اور عبایا و نقاب میں وہاں سے نکلی اور گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ اب تک جو پیش رفت ہوئی تھی، وہ درست تو لگ رہی تھی مگر وہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ پروفیسر منیر الدین سے ڈھائی کروڑ روپے کیسے نکلوائے گا۔ کیا وہ کوئی مجرمانہ کارروائی کرے گا یا اپنے ناولوں کی طرح کوئی حیرت انگیز منصوبہ بنائے گا۔ گھر آنے سے پہلے اس نے عبایا اور نقاب اتار کر پرس میں رکھ لیا تھا۔ کیونکہ وہ صرف چادر اور دوپٹے میں باہر جاتی تھی۔ اس کا ہینڈ بیگ اتنا بڑا تھا کہ اس میں آرام سے یہ دونوں چیزیں آگئی تھیں۔ وہ کیونکہ بہ ظاہر پروفیسر کے گھر نہیں جارہی تھی۔ اس لیے گزشتہ روز اسے فرحان کی کال آئی۔ اس نے پوچھا تو ہما نے جواب دیا کہ اس کا موڈ نہیں ہورہا ہے۔ جنید کی وجہ سے اس کا دل اب کہیں آنے جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف پروفیسر نے آج کے دن انہیں کال کرکے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک کام سے ایک مہینے کے لیے دوسرے شہر جارہا ہے اور اب انہیں کوٹھی میں نہیں ملے گا۔ جب پروفیسر یہ سب طے کررہا تھا تو ہما کو ہنسی آرہی تھی۔ اس نے پروفیسر سے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے جیسے ہم کسی جاسوسی کہانی کے کردار ہوں۔''

''حقیقی زندگی میں اس سے کہیں زیادہ جاسوسی ہوتی ہے جتنی افسانوں اور فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔ کیونکہ ہم میں ایک دوسرے کے بارے میں بہت زیادہ تجسس ہے۔

شاید تمہیں اسی دوران میں تجربہ بھی ہوجائے۔''

اگلے دن وہ گھر سے نکلی اور ایک سنسان گلی میں اس نے عبایا اور نقاب پہنا۔ پھر رکشا پکڑ کر فلیٹ کی طرف روانہ ہوگئی۔ فلیٹ اچھے تھے لیکن کیونکہ یہاں زیادہ تر متوسط طبقے کے لوگ رہتے تھے اس لیے سیکورٹی کا ایسا سسٹم بھی نہیں تھا کہ کسی کو بغیر چیک کیے اندر جانے ہی نہ دیا جائے۔ ہما آرام سے اندر آگئی اور دوسری منزل پر واقع فلیٹ میں پہنچ گئی۔ پروفیسر نے کہا تھا کہ وہ اندر آنے کے بعد اسے مس کال دیا کرے تو وہ دروازہ کھول دے گا اور وہ خاموشی سے بنا کال بیل دبائے یا دستک دیے اندر آجائے گی۔ پڑوسیوں کو بے خبر رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔ پروفیسر لاؤنج میں ناشتا کررہا تھا۔ اس کا بدلا حلیہ مستقل تھا۔ کیونکہ اسے کسی کو صورت نہیں دکھانی تھی۔ مشکل ہما کے لیے تھی جسے روز حلیہ دو بار بدلنا پڑتا تھا۔ دیکھا جائے تو کام مشکل نہیں تھا، الجھن والا تھا۔ پروفیسر سامان لے آیا تھا۔ ہما نے اپنے لیے چائے بنائی اور اس کے سامنے آبیٹھی۔

''کل آپ گئے تھے؟''

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''ہاں گیا تھا اور میں رات ایک بجے واپس آیا۔ بہت کام ہوا اور بہت سی معلومات ملیں۔ ناشتے کے بعد بتاتا ہوں اور دکھاتا ہوں۔''

ناشتے کے بعد پروفیسر اور وہ لاؤنج میں رکھے صوفے پر آبیٹھے۔ اس نے اپنا لیپ ٹاپ کھولا اور ہما سے کہا۔ ''کل میں نے سات بجے اس کا پیچھا شروع کیا جب وہ اپنے بنگلے سے نکلی اور وہ وہاں سے سمندر کے کنارے ایک فاسٹ فوڈ اسپاٹ تک گئی۔ یہ اس دوران کی تصویریں ہیں۔'' لیپ ٹاپ میں تصویریں بدل رہی تھیں۔ تانیا خوب صورت لڑکی تھی اور کیونکہ پروفیسر نے زوم لینس بھی استعمال کیا تھا اس لیے تصویریں بہت واضح تھیں۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ وہ دوسری گاڑیوں میں آئے تھے اور اپنے انداز اور حلیے سے اوپری طبقے کے لگ رہے تھے۔ ''یہاں سے یہ لوگ سمندر کے کنارے گئے اور وہاں یہ بیئر پیتے رہے۔ تانیا بھی الکوحل کی عادی ہے۔ دوسرے منشیات بھرے سگریٹ استعمال کررہے تھے لیکن تانیا نے ان کا استعمال نہیں کیا۔ جب یہ فاسٹ فوڈ اسپاٹ پر تھے تو تانیا گاڑی سے اتر کر گئی تھی اور میں نے اس دوران میں اس کی گاڑی میں مائیک لگا دیا۔ جب وہ وہاں سے نکلے تو ایک لڑکا اس کی گاڑی میں آگیا تھا میں نے ان کی گفتگو کی ریکارڈنگ کی ہے۔ وہ سنتا۔''

پروفیسر نے لیپ ٹاپ سے ہیڈ فون لگا کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ہما نے کانوں پر لگایا تو اس نے ایک فائل چلا دی۔ تانیا اور سلمان نامی لڑکا آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔

سلمان: ''پکنک کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

تانیا: ''وقت نہیں ہے اس ویک۔''

سلمان: ''نیکسٹ ویک؟''

تانیا: ''سوچوں گی۔''

سلمان: ''سوچومت چلو، آج کل موسم غضب کا ہے اور ہٹ کی چابی میرے پاس ہے پاپا کو یاد آگیا تو مجھ سے واپس لے لیں گے۔''

ان دونوں کی گفتگو سے لگ رہا تھا کہ سلمان اسے ساحل سمندر کے کنارے کسی ہٹ پر چلنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور تانیا اقرار آمیز انکار والے انداز میں منع کر رہی تھی۔ ہما نے اندازہ لگایا کہ وہ راضی ہے صرف اسے تنگ کر رہی ہے۔ آخر میں اس نے کہا تھا کہ وہ اسے ایک دو دن میں جواب دے گی۔ ریکارڈنگ مشکل سے دس منٹ کی تھی پھر وہ سمندر کے کنارے پہنچ گئے اور رات ساڑھے بارہ بجے تک وہیں رہے اور اس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔ پروفیسر نے تانیا کا اس کے گھر تک پیچھا کیا تھا۔ پروفیسر نے ساحل پر بھی ان لوگوں کی تصاویر لی تھیں اور یہ سب اس کے لیپ ٹاپ میں محفوظ تھیں۔ ہما نے پوچھا۔ ''آج کے لیے کیا پروگرام ہے؟''

''میں تمہیں یونیورسٹی لے جاؤں گا۔ وہاں تم تانیا کے آس پاس رہ کر اس کی نگرانی کرو گی اور زیادہ سے زیادہ جاننے کی کوشش کرو گی۔''

''اور آپ؟''

''میں باہر موجود رہوں گا۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''اب تم حلیہ بدل لو اور ہاں آج شام تمہیں جنید کے پاس جانا ہے۔''

ہما بھی سوچ رہی تھی مگر پروفیسر کے انداز سے لگا کہ وہ اسے کسی خاص کام سے بھیجنا چاہ رہے ہیں۔ ''کوئی خاص وجہ؟''

''ہاں تم اس سے کہو کہ وہ اپنے سارے ڈاکومنٹس تیار کر لے۔ پاسپورٹ کا پوچھنا اور اس سے کہنا کہ وہ سنگاپور کے اسپتال سے رابطہ کر کے اپنا اور اپنی بہن کا ٹشو میچ کرا لے۔ یہ ضروری ہے عام طور سے بہن بھائی یا ماں باپ کا جسمانی عضو لگ جاتا ہے مگر بعض اوقات جسم اسے مسترد

بھی کر دیتا ہے۔''

ہما غور سے سن رہی تھی' اس نے کہا۔ ''میں اس سے کہوں گی۔''

''یہ ضروری ہے ایسا نہ ہو کہ ہم رقم کا بندوبست کرلیں اور جنید کسی وجہ سے تاخیر کا شکار ہو۔''

ہما نے حلیہ بدلا اور وہ فلیٹ سے روانہ ہوئے۔ راستے میں پروفیسر نے ایک سنسان جگہ اسے ڈرائیونگ دی اور اس نے اعتماد سے کار چلائی۔ تانیا ایک اعلیٰ درجے کی اور انتہائی مہنگی یونیورسٹی میں بی بی اے آنرز کے پہلے سال میں تھی۔ اس کی سرگرمیوں سے ظاہر تھا کہ اسے تعلیم کی خاص فکر نہیں تھی لیکن کیونکہ اس کے پاس سب کچھ تھا اس لیے وہ کسی نہ کسی طرح ڈگری حاصل کر لیتی اور پھر اس کے باپ کا وسیع و عریض کاروبار اسی کا ہوتا۔ وہ نوجوانی کا یہ دور سیر و تفریح میں گزار رہی تھی۔ ہما بہ آسانی گیٹ سے اندر چلی گئی اور اسے تانیا کو تلاش کرنے میں دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ وہ ایک گروپ کے ساتھ کیفے ٹیریا میں تھی۔ ہما اس سے ذرا دور ایک خالی میز پر بیٹھ گئی۔ تانیا کے ساتھ یہاں تین لڑکے اور ایک لڑکی تھی۔ پانچوں نے انتہائی ماڈرن ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔ خاص طور سے تانیا نے اسکن فٹ جینز کے ساتھ چھوٹی سی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی جس کے بازو نہ ہونے کے برابر تھے اور گریبان کسی قدر کھلا ہوا تھا۔ مگر یہ کوئی متوجہ کرنے والا حلیہ نہیں تھا کیونکہ یہاں تقریباً ہر دوسری لڑکی کی ڈریسنگ ایسی ہی تھی۔ وہ آپس میں بات کر رہے تھے اور انگریزی کی ایسی گالیاں بھی چل رہی تھیں جن کا اردو ترجمہ شاید ان کے کان سرخ کر دیتا۔ ہما ان کی گفتگو پر کان مرکوز کیے ہوئے تھی۔ لڑکی تانیا سے کہہ رہی تھی۔

''سلمان فلرٹی ہے۔''

''یہ خود کون سی کم ہے۔'' ایک لڑکے نے قہقہہ مار کر کہا۔۔۔ ''تم سلمان سے شادی کرو گی؟''

''شٹ۔''

''مگر تم اس کے ساتھ گھوم پھر رہی ہو۔'' لڑکی نے کہا۔ وہ معمولی شکل صورت کی تھی اور بے تحاشا میک اور حلیے سے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ البتہ اس کا جسم متناسب تھا۔ ''جب تمہارا دل اس سے بھر جائے تو میرے حوالے کر دینا۔''

''ابھی لے لو۔'' تانیا بولی۔

''اس کا نمبر دو۔''

''میرا موبائل مسئلہ کر رہا ہے' بزنس کارڈ نہیں کر رہا۔'' تانیا بولی۔ ''تم ایسے ہی نوٹ کرلو۔''

ہما نے تیزی سے موبائل نکالا اور سلمان کا نمبر نوٹ کرنے لگی۔ ڈائل میں لکھ کر اس نے اسے محفوظ کر لیا۔ دوسرے لڑکے نے تانیا سے کہا۔ ''مجھے اپنا نمبر دو' میں نے نیا موبائل لیا ہے اور اب سب سے نمبر لیتا پھر رہا ہوں۔''

''اسٹوپڈ نیٹ کلاؤڈ کس لیے ہوتا ہے۔'' تانیا نے کہا مگر اپنا موبائل نمبر اسے بتا دیا اور ہما نے اسے بھی محفوظ کر لیا۔ وہ خوش تھی کہ اتنی اہم معلومات مل رہی تھی۔ تانیا نے کہا۔ ''لیکن فار گاڈ سیک آنے والے منڈے کو کوئی مجھے کال کر کے یونی نہ آنے کی وجہ نہ پوچھے۔''

''ہو ہو ہو۔'' نمبر لینے والے لڑکے نے شور مچایا۔ ''وجہ ہم اگلے روز خود تم سے پوچھیں گے۔''

تانیا ذرا بھی شرمائی یا جھینپی نہیں تھی بلکہ وہ معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ سب کلاسز کا کہہ کر وہاں سے اٹھ گئے۔ ہما نے ان کے جانے کے بعد پروفیسر کو کال کر کے اب تک کی رپورٹ دی۔ وہ خوش ہو گیا۔ ''تم نے بہت کام کی معلومات حاصل کی ہیں، ان کے نمبر مجھے بھیج دو اور ابھی تم اندر ہی رہو۔''

ہما نے نمبر پروفیسر کو بھیج دیے اور خود وقت گزاری کے لیے چائے اور سموسے منگوا لیے۔ ویسے اس نے صبح برائے نام ناشتا کیا تھا اور اب اسے بھوک لگ رہی تھی۔ کیفے ٹیریا کے سموسے اچھے تھے اور چٹنیوں کے ساتھ مزے کے لگ رہے تھے۔ یہاں فاسٹ فوڈ بھی تھا مگر ہما نے سموسوں کو ترجیح دی۔ وہ بارہ بجے یہاں آئی تھی اور دو بجے کلاسز آف ہونے کے بعد طلبہ یونیورسٹی سے نکلنے لگے تھے۔ ہما باہر آئی اور اس نے تانیا کو پارکنگ کی طرف جاتے دیکھا تو پروفیسر کو کال پر اس کی اطلاع دیتے ہوئے باہر آئی۔ پروفیسر گاڑی ایسی جگہ لے آیا تھا جہاں سے وہ یونیورسٹی کے گیٹ پر نظر رکھ سکتا تھا۔ ہما جیسے ہی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تانیا کی گاڑی اندر سے نکلی تھی۔ پروفیسر نے ایک ہیڈ فون ایف ایم ریڈیو نما آلہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ تانیا کی گاڑی میں لگے مائیک کا ریسیور ہے اور ریکارڈنگ بھی کرتا ہے۔ تم سنو ہوسکتا ہے کوئی اور کام کی بات معلوم ہو جائے۔''

ہما نے ہیڈ فون کانوں پر لگا لیا۔ اسے گاڑی کے انجن کا ہلکا سا شور سنائی دے رہا تھا۔ تانیا کے پاس مہنگی لگژری گاڑی تھی اور دن میں کیونکہ ہلکی سی گرمی ہوتی تھی اس لیے اس نے شیشے چڑھا کر اے سی آن کیا ہوا تھا۔ تانیا نے جو روٹ پکڑا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گھر کی طرف جا رہی ہے۔

کچھ دیر بعد اس کی آواز آئی۔ ''میں بات کر رہی ہوں۔'' یہ سنتے ہی ہما الرٹ ہوگئی۔ تانیا کسی سے کال پر بات کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''ہاں میں نے اسی لیے کال کی ہے۔ منڈے کا پروگرام ڈن ہے۔ مگر یاد رکھنا میں دو بجے سے زیادہ دیر تک نہیں رکوں گی... اور فارگا ڈیک کسی کو بتائے بغیر آنا، کوئی کال یا کوئی خود نہ آئے... او کے بائے۔''

اس نے کال کاٹ دی۔ ہما نے پروفیسر کو اس کے پروگرام کا بتایا تو اس نے کہا۔ ''ایسا لگ رہا ہے کہ قدرت ہماری مدد پر آمادہ ہے۔ ورنہ مجھے اتنی جلدی کامیابی کی امید نہیں تھی۔''

''کامیابی؟'' ہما نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں یہ ہماری کامیابی ہے۔''

اس دوران میں تانیا نے اپنے باپ کو کال کی اور اس سے گفتگو کرنے لگی۔ یہ عام سی گفتگو تھی جو ایک بیٹی باپ سے کرتی ہے۔ ہما نے جب اس کا بتایا تو پروفیسر مسکرایا۔ ''اب مجھے پکا یقین ہو گیا ہے کہ قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔ کیا گفتگو ہوئی ہے؟''

ہما نے اسے گفتگو کے بارے میں بتایا تو اس نے پُر خیال انداز میں کہا۔ ''اس سے شاید کام چل جائے۔''

''کیسا کام؟''

''بتاؤں گا۔ ابھی خود میرے ذہن میں واضح نہیں ہے۔''

تانیا اپنے بنگلے والی گلی میں داخل ہوئی تو وہ وہیں سے واپس مڑ گئے تھے۔ پروفیسر نے کار ایک ریستوران کے سامنے روکی۔ ہما کھا چکی تھی اس لیے اس نے صرف ایک سینڈوچ اور ملک شیک لیا تھا۔ پروفیسر نے مکمل لنچ کیا تھا۔ اس کے بعد ڈرائیونگ کلاس ہوئی اور وہ چار بجے کے قریب فلیٹ آئے اور ہما اپنا حلیہ بدل کر جنید کے گھر روانہ ہوگئی۔

☆☆☆

جنید اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ''کیا بات ہے، تم کچھ بدلی بدلی لگ رہی ہو؟''

ہما زبردستی مسکرائی۔ ''میں نہیں تم بدل گئے ہو۔ تمہاری صحت کتنی گر گئی ہے۔''

''شاید اس لیے کہ اب جینے کی آس باقی نہیں رہی ہے۔'' جنید مایوسی سے بولا تو وہ تڑپ گئی۔

''ایسا مت کہو، تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے اپنی رپورٹس سنگاپور بھجوائی تھیں؟''

''فائدہ؟'' وہ تلخی سے مسکرایا۔ ''نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔''

''تیل بھی ہو جائے گا اور رادھا بھی ناچے گی۔'' ہما نے یقین سے کہا۔ ''تم فوری اپنی رپورٹس بھیجو اور ہاں نبیلہ کا اور اپنا ٹشو میچ بھی کراؤ بعض اوقات سگے بہن بھائی کا باڈی پارٹ بھی میچ نہیں کرتا ہے اور جسم اسے رد کر دیتا ہے۔''

مگر جنید اس کی بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ ہما نے اس کے ماں باپ سے بات کی تو حماد بولا۔ ''کیا فائدہ اتنا خرچ کرنے کا جب آگے سے کوئی امید ہی نہیں ہے۔''

''پلیز انکل کرنے والی خدا کی ذات ہے۔ اگر سبب بن گیا تو جنید صرف اس وجہ سے جانے سے نہ رہ جائے کہ اس کے ڈاکومنٹس نہیں ہیں یا اس کی رپورٹس اسپتال نہیں بھیجی گئیں۔''

حماد کا منہ بن گیا مگر اس کی بیوی ہما کی تائید کرنے لگی۔ پھر کوثر نے بھی کہا تھا۔ جب ہما وہاں سے روانہ ہو رہی تھی تو یہ طے پا گیا تھا کہ دو دن کے اندر یہ سارے کام ہو جائیں گے۔ مشکل سے سہی لیکن یہ مرحلہ بھی حل ہو گیا تھا۔ مگر ہما نے ایک بات بہت شدت سے محسوس کی تھی کہ جنید اب پروفیسر کا ذکر پسند نہیں کرتا تھا۔

☆☆☆

ہما اور پروفیسر گاڑی میں ساحلِ سمندر کی طرف جا رہے تھے۔ یہ چٹانوں اور کہیں کہیں ریت والا ساحل تھا جہاں جا بہ جا تفریحی ہٹ موجود تھے۔ بیشتر ہٹ لوگوں کے ذاتی تھے اور کچھ کمرشل تھے جو وہاں تفریح کے لیے آنے والوں کو کرائے پر دیے جاتے تھے۔ ہما کے ہاتھ میں پروفیسر کا موبائل تھا اور اس کی اسکرین پر رہ رہ کر ایک نقطہ بلنک کر رہا تھا، یہ سلمان کا موبائل تھا۔ پروفیسر نے موبائل ٹریکنگ سروس لے رکھی تھی اور اس کی مدد سے وہ کسی بھی اسمارٹ فون کی لوکیشن کا سراغ لگا سکتا تھا۔ اگرچہ یہ سراغ بالکل پن پوائنٹ حد تک نہیں تھا لیکن یہ معلوم ہو جاتا کہ وہ چھ سو میٹر کے دائرے میں کہاں ہے۔ اصل لوکیشن اس موبائل ٹاور کی آرہی ہوتی تھی جس سے موبائل کے سگنل مل رہے ہوتے تھے۔ جب وہ سلمان کے پیچھے روانہ ہوئے تو ایک وقت پر سڑک پر بڑے ٹرالرز کی وجہ سے راستہ بند ہو گیا اور وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

تب پروفیسر نے ہما کو اپنا موبائل دیا کہ وہ اس پر سلمان کو دیکھتی رہے۔ کچھ دیر میں وہ ٹریفک جام سے نکلے تو ہما اسے گائیڈ کرنے لگی۔ سلمان آگے جا کر ایک ذیلی سڑک

پر گھوم گیا تھا اگر ان کے پاس ٹریکر نہ ہوتا تو وہ اس کا سراغ نہیں لگا سکتے تھے۔ وہ بھی اس ذیلی سڑک پر مڑے جو ساحل تک جا رہی تھی یہاں پروفیسر نے ڈرائیونگ ہما کے سپرد کر دی۔ یہاں بڑے بڑے ہٹ تھے اور صفائی ستھرائی کے ساتھ کسی قدر سبزہ بھی نظر آ رہا تھا جس سے باقی ساحل محروم تھا۔ ساحل کے ساتھ ہٹس کی دو قطاریں تھیں اور وہ ان میں سلمان کی گاڑی تلاش کرنے لگے۔ بالآخر وہ انہیں ایک ہٹ کے ساتھ کھڑی دکھائی دی۔ ہٹ کے عقبی حصے میں لان تھا اور اس کے پار چھوٹی سی عمارت تھی۔ ہما نے گاڑی اس سے کچھ فاصلے پر روک دی اور وہ دونوں نیچے اتر آئے۔ ہٹ کے ساتھ ایک چھوٹی سی گلی ساحل کی طرف جا رہی تھی۔ پروفیسر اور ہما اس سے گزرتے ہوئے ساحل تک پہنچے۔ اس طرف ہٹ کا ٹیرس تھا۔ تین طرف ریلنگ سے ڈھکا ہوا اور زمین سے خاصا اونچا ٹیرس تھا۔ اس کے سمندر کی طرف والے حصے سے سیڑھیاں نیچے ریتیلے ساحل تک آ رہی تھیں۔

''آپ کو یقین ہے کہ یہی ہٹ ہے؟'' ہما نے پوچھا۔

وہ ٹہلتے ہوئے ساحل تک چلے آئے تھے جہاں اس وقت پانی اترا ہوا تھا اور سمندر کی طرف سے خاصی خنک ہوا چل رہی تھی۔ سیزن نہیں تھا اس لیے ساحل تقریباً ویران تھا۔ بیشتر ہٹ بند تھے اور ان کے چوکیدار بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر غائب تھے۔ پروفیسر نے سر ہلایا۔

''خاصی حد تک یقین ہے۔ اگر نہ بھی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔ پرسوں ہم ان کے ساتھ ہی آئیں گے اور پتا چل جائے گا کہ ان کو یہاں آنا تھا یا کہیں اور جانا تھا۔''

''پروفیسر آپ کیا کریں گے؟''

''ابھی میرے ذہن میں ایک خاکہ ہے۔ آج میں اس بارے میں سوچوں گا اور پرسوں تمہیں بتاؤں گا۔ جب ہم ان کے پیچھے آئیں گے۔''

☆☆☆

جب ہما فلیٹ پہنچی تو پروفیسر تیار تھا، اس نے کہا۔ ''جلدی سے تیار ہو جاؤ، ہمیں سلمان کے پیچھے جانا ہے۔''

ہما نے سوالات سے گریز کیا اور اندر آ کر تیار ہونے لگی۔ جب وہ فلیٹ سے روانہ ہوئے، اس نے سوالات کیے تب پروفیسر نے بتایا کہ اس کی شام کی جاسوسی سے بھی خاصی کارآمد معلومات ملی تھیں۔ سلمان نے تانیا سے کہا تھا کہ آج وہ جا کر ہٹ کا معائنہ کرے گا کہ وہ ٹھیک حالت ہے میں یا نہیں اگر کوئی کام ہوا تو وہ کروا دے گا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہٹ کے گارڈ کی چھٹی کرنی تھی تا کہ وہ نہ جان سکے کہ سلمان کے ساتھ وہاں کون آیا تھا۔ سلمان صبح کے وقت ہٹ کا معائنہ کرنے جاتا۔ ہما نے پوچھا کہ اتنی دور سے اسے کیسے پتا چلے گا کہ سلمان کہاں ہے اور اس کا ہٹ کہاں ہے؟ ڈرائیو کے دوران میں پروفیسر وقفے وقفے سے اپنا موبائل دیکھ رہا تھا اور پھر وہ ایک جگہ رک گئے۔ کچھ دیر بعد سلمان کی گاڑی ان کے سامنے سے گزری اور وہ اس کے پیچھے روانہ ہو گئے۔ پروفیسر نے ہما کے اس سوال کا جواب نہیں دیا تھا مگر جب کچھ دیر بعد وہ ٹریفک جام میں پھنسے تو اسے خود معلوم ہو گیا کہ وہ کس طرح سلمان کا پیچھا کر رہے تھے۔

ساحل پر ٹہلتے ہوئے پروفیسر اپنے موبائل کیمرے سے ہٹ کے ٹیرس اور اس کے پیچھے موجود عمارت کی ویڈیو بنا رہا تھا۔ اسی اثنا میں سلمان ٹیرس میں نکل آیا، اس کے ساتھ ہٹ کا چوکیدار بھی تھا۔ وہ صفائی کر رہا تھا۔ سلمان چوکیدار سے بات کرتا رہا پھر وہاں سے چلا گیا۔ پروفیسر اور ہما بھی واپس آئے۔ شاید سلمان روانہ ہونے والا تھا۔ وہ گاڑی میں بیٹھے تو ہما نے کہا۔ ''ہم اس کے پیچھے جائیں گے؟''

''نہیں ہم یہیں رکیں گے۔''

سلمان کچھ دیر بعد نکلا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پروفیسر اور ہما گاڑی سے نکلے۔ ایک ہٹ سے نکلنے والے پانی نے کیچڑ سا بنا دیا تھا۔ پروفیسر کے کہنے پر ہما نے اس میں اپنا ایک پاؤں اس طرح ڈالا کہ کیچڑ سے اس کا سینڈل اور پاؤں بری طرح لتھڑ گئے اور پھر وہ سلمان والے ہٹ پر پہنچے۔ پروفیسر نے آہستہ سے ہما سے کہا۔ ''تمہارے پاؤں میں موچ بھی آئی ہے اور تم آسانی سے چل نہیں سکتی ہو۔''

کال بیل کے جواب میں کچھ دیر بعد چوکیدار نکلا اور سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔ پروفیسر نے کہا۔ ''میری بیوی کا پاؤں غلطی سے کیچڑ میں چلا گیا ہے اور گندہ ہو گیا ہے اسے چوٹ بھی آئی ہے۔ کیا پانی مل سکتا ہے کہ اس کا پاؤں دھل جائے۔''

چوکیدار شریف آدمی تھا اور ہمدرد بھی، اس نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ ''اندر آ جائیں جی۔ ادھر پانی کا نل ہے وہاں دھولیں۔''

سامنے چھوٹا سا لان تھا اور اسی میں ایک طرف پودوں کو پانی دینے کے لیے نل اور اس کے ساتھ پائپ لگا ہوا تھا۔ پروفیسر نے ہما کا ہاتھ تھام کر اسے سہارا دیا ہوا تھا۔

پروفیسر نے اسے لان میں رکھی کرسی پر بٹھایا اور چوکیدار نل سے لگا ہوا پائپ لے آیا۔ ''یہ پکڑیں جی' میں پانی کھولتا ہوں۔''

پروفیسر نے پائپ پکڑلیا۔ ''یہ تمہارا ہٹ ہے؟''
''نہیں جی میں تو یہاں چوکیدار ہوں۔ ہٹ تو اعظم صاحب کا ہے۔''

چوکیدار نے پانی کھول دیا۔ پروفیسر پانی ڈال رہا تھا اور ہما ہاتھ سے کیچڑ صاف کر رہی تھی۔ اس نے سینڈل اتار دی تھی۔ ''ہٹ خوب صورت ہے اور تم نے بہت صاف ستھرا رکھا ہوا ہے۔''

چوکیدار اپنی تعریف پر خوش ہوگیا۔ ''بس جی ایمان داری سے کام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔''
''ایک گلاس پینے کا پانی مل جائے گا؟'' پروفیسر نے کہا۔ ہما نے پاؤں اور سینڈل دھولیا تھا۔
''ابھی لایا جی۔'' چوکیدار نے نل بند کیا اور اندر چلا گیا۔

پروفیسر نے ہما سے کہا۔ ''ابھی یہ آئے تو تم واش روم کی بات کرنا ہمیں اندر سے ہٹ دیکھنا ہے۔''
ہما نے سر ہلایا اور چوکیدار پانی کی بوتل اور گلاس لے کر آیا تو ہما نے پانی پی کر کہا۔ ''د... مجھے واش روم جانا ہے۔''

پروفیسر نے چوکیدار کی طرف دیکھا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''یار مہربانی کرو۔''
''کیوں نہیں جی۔'' چوکیدار جلدی سے بولا۔ ''پر واش روم اندر ہے۔''
ہما کھڑی ہوئی اور بولی۔ ''میں خود سے نہیں چل سکتی مجھے سہارا دیں۔''

پروفیسر نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور وہ چوکیدار کی رہنمائی میں اندر آگئے۔ آغاز میں لاؤنج اور اس کے ساتھ ہی کچن تھا۔ لاؤنج میں بڑے سائز کا ایل سی ڈی ٹی وی اور دوسرے لوازمات تھے۔ اس کے بعد ایک چھوٹی راہداری میں دائیں بائیں دو بیڈ روم تھے اور ان کے ساتھ ہی اٹیچ باتھ تھے۔ چوکیدار نے دائیں طرف والے بیڈ روم کا دروازہ کھولا اور سامنے ہی نظر آنے والے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ باتھ روم ہے جی۔''
ہما اندر چلی گئی۔ پروفیسر اور چوکیدار راہداری میں کھڑے ہوئے تھے۔ وقت گزاری کے لیے پروفیسر چوکیدار سے سوال کرنے لگا۔ ساتھ ہی وہ عمارت کا جائزہ لے رہا تھا۔ بیڈ رومز کے بعد ایک بڑا سا لاؤنج تھا اور اس کے پار ٹیرس تھا۔ عمارت کی تمام کھڑکیوں پر فولادی گرل تھی۔ تحتی لاؤنج میں داخل ہونے والا دروازہ بھی لوہے کا تھا اور اس کے اندر لکڑی کا دروازہ تھا۔ گویا کسی سمت سے اندر داخل ہونا آسان نہیں تھا۔ کچھ دیر میں ہما اندر سے نکلی اور پروفیسر کا ہاتھ تھام کر باہر تک آگئی۔ باہر نکل کر پروفیسر نے چوکیدار سے ہاتھ ملایا اور اسے سو کا ایک نوٹ پیش کیا جو اس نے کسی قدر منع کرنے کے بعد لے لیا اور سلام کر کے اندر چلا گیا۔ اب دیکھنے والا کوئی نہیں تھا اس لیے ہما خود ہی چل کر گاڑی تک آئی۔ پروفیسر نے اسے چابی تھمادی اور اندر بیٹھنے کے بعد کہا۔ ''ہٹ خوب صورت ہے۔''
''ہاں لیکن اسے غلط کاموں کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔'' پروفیسر نے کہا تو ہما جھینپ گئی۔ اتنا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ تانیا، سلمان کے ساتھ یہاں کیوں آرہی تھی اور تنہائی میں کی جانے والی اس ملاقات کے دوران کیا ہوسکتا تھا۔ یہ اپر کلاس کی مادر پدر آزاد نوجوان نسل تھی جن کے نزدیک جسمانی تعلقات صرف ایک تفریح تھی۔ وہ واپس فلیٹ میں آئے۔ دوپہر کا وقت ہوگیا تھا۔ ویسے وہ روز ہی باہر لنچ کر رہے تھے اور پروفیسر ناشتا اور اپنے لیے ڈنر فلیٹ میں ہی تیار کرتا تھا مگر آج ہما نے پروفیسر سے کہہ دیا تھا کہ وہ لنچ بنائے گی اور اس نے سامان بھی بتادیا تھا جو پروفیسر لے آیا تھا۔ ہما نے بریانی بنائی۔ وہ بریانی اچھی بناتی تھی۔ پروفیسر کو پسند آئی۔ اگلے دن بھی چھٹی تھی اور ہما نے اتنی بریانی بنائی تھی جو اگلے دن بھی کام آتی۔ اس ایک ہفتے میں وہ اس معمول کی اتنی عادی ہوگئی تھی کہ اسے ابھی سے کل کی چھٹی کا سوچ کر عجیب سا لگ رہا تھا۔

تواتر سے ہونے والی ملاقاتوں نے انہیں ایک دوسرے سے قدرے بے تکلف کر دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہما اس کے اتنے نزدیک آئی اور اس کے ساتھ اتنا وقت گزار رہی تھی۔ اس کی عادات و اطوار دیکھ رہی تھی۔ اس کی پسند ناپسند سے آگاہ ہو رہی تھی، اس سے اتنی بے تکلف ہوگئی تھی کہ اس سے اس کے بارے میں سوالات کرسکتی تھی۔ لنچ کے دوران ہما نے اچانک ہی سوال کرلیا۔ ''ایک بات پوچھوں اگر آپ برا تو نہ منائیں تو؟''

پروفیسر نے ہاتھ روک کر سنجیدگی سے کہا۔ ''تم ان چند ہستیوں میں سے ہو جن کی کسی بات کا میں برا نہیں منا سکتا۔''

''آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟''

پروفیسر پھر کھانے لگا۔ ''تم دو سال سے مجھ سے مل رہی ہو آج اس سوال کا خیال کیسے آیا؟''

''اس لیے کہ اب تک میں نے آپ کو نزدیک سے نہیں دیکھا تھا کہ آپ کیسے آدمی ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ لڑکی خوش قسمت ہوتی جس سے آپ شادی کرتے۔''

''اچھا؟'' پروفیسر کے انداز میں حقیقی تعجب تھا۔ ''میرا تو خیال ہے کہ میں بالکل بھی اچھا شوہر نہیں بن سکوں گا۔''

''یہ بات کوئی آدمی نہیں کہہ سکتا ہے کہ وہ اچھا شوہر بن سکتا ہے یا نہیں۔ یہ بات اسے کوئی عورت ہی بتا سکتی ہے۔''

پروفیسر مسکرانے لگا۔ ''یعنی تمہارے خیال میں مجھ میں اچھا شوہر بننے کی صلاحیت ہے؟''

ہما نے سر ہلایا۔

جب وہ گھر آئی تو اسے یہ سوچ کر بے چینی ہونے لگی کہ کل وہ پروفیسر سے نہیں مل سکے گی۔ اس نے خود کو یاد دلایا کہ وہ صرف اس کام کی حد تک پروفیسر کے ساتھ ہے۔ اس کے بعد وہ پھر پہلے کی طرح ملیں گے اور یہ ملاقاتیں سب کے ساتھ ہوا کریں گی۔ وہ افسردہ ہونے لگی۔ آمنہ نے اس کا موڈ بھانپ لیا تھا۔ ''کیا ہوا ہما، کوئی مسئلہ ہوا ہے دفتر میں؟''

''نہیں امی۔'' اس نے انکار کیا۔

''اگر تو جنید کی طرف سے پریشان ہے تو فکر مت کر، اللہ نے چاہا تو وہ ٹھیک ہو جائے گا، لیکن ہما...'' آمنہ کہتے کہتے رک گئی۔

''لیکن کیا امی؟''

آمنہ نے ہچکچا کر کہا۔ ''اس کے گھر والے؟... وہ کچھ عجیب سے نہیں ہیں؟''

''ہاں امی کچھ نہیں خاصے عجیب ہیں۔'' ہما نے سرد آہ بھری۔

''میری بچی لڑکی کو صرف شوہر کے ساتھ ہی نہیں، اس کے گھر والوں کے ساتھ بھی زندگی گزارنی ہوتی ہے اور بہت کچھ دیکھنا اور سہنا پڑتا ہے۔''

''میں جانتی ہوں امی۔'' اس نے سرد آہ بھری۔

''اس لیے میں چاہتی ہوں تو ایک بار پھر اس پر سوچ لے۔'' آمنہ نے کہا۔ ''شادی عمر بھر کا سودا ہوتا ہے۔''

''امی ابھی میں کچھ نہیں سوچ سکتی۔'' ہما نے انکار کیا۔ ''آپ جانتی ہیں جنید کی حالت کیا ہے۔''

آمنہ سمجھ رہی تھی، اس نے سر ہلایا۔ ''اللہ اسے صحت عطا فرمائے۔''

☆☆☆

آج ہما جلدی گھر سے نکلی تھی کیونکہ پروفیسر نے اسے جلدی آنے کو کہا تھا۔ وہ ابھی بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھی کہ پروفیسر کی گاڑی آ کر اس کے پاس رکی اور اس نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا۔ ہما اندر بیٹھ گئی۔ اس نے سلام دعا کے بعد کہا۔ ''آپ خود آ گئے؟''

''ہاں کیونکہ وقت نہیں ہے۔ ہمیں ان دونوں سے پہلے وہاں پہنچنا ہے۔''

پروفیسر نے گاڑی کا رخ ساحلی علاقے کی طرف کر دیا تھا۔ رفتار اس نے معمول سے تیز رکھی تھی۔ عقبی سیٹ پر ایک درمیانے سائز کا شولڈر بیگ رکھا ہوا تھا۔ پون گھنٹے بعد وہ اس علاقے میں تھے۔ پروفیسر نے گاڑی ایسی جگہ روکی جہاں سے وہ سلمان کے ہٹ کو دیکھ سکتے تھے مگر انہیں دیکھنا آسان نہیں تھا۔ ہٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے انہوں نے دیکھا کہ فولادی گیٹ پر باہر تالا لگا ہوا ہے۔ یعنی چوکیدار وہاں سے جا چکا تھا اور ہٹ اس وقت خالی تھا۔ جیسے ہی پروفیسر نے گاڑی روکی ہما نے پوچھا۔ ''پلان کیا ہے؟''

''تانیا کو یرغمال بنانا ہے اور اس کے باپ سے تاوان لینا ہے۔''

ہما کا رنگ اُڑ گیا۔ ''پروفیسر یہ خطرناک کام ہے۔''

''اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔'' پروفیسر نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم ڈر رہی ہو؟''

''مجھے آپ کے ساتھ ڈر نہیں لگتا لیکن میں آپ کے لیے ڈر رہی ہوں۔''

''مجھے تمہاری فکر ہے۔'' پروفیسر نے نرمی سے کہا۔ ''مسئلہ یہ ہے کہ یہ ایک آدمی کا کام نہیں ہے ورنہ میں تمہیں اس میں شامل ہی نہ کرتا۔''

''میں آپ کو اکیلے یہ کام کرنے بھی نہیں دیتی۔'' ہما نے کہا۔ ''کیا ہم تانیا کو ساتھ لے کر جائیں گے؟''

''نہیں۔'' پروفیسر نے کہا اور عقبی سیٹ پر رکھا ہوا بیگ اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور اسے کھول کر اس نے اندر سے دو شفاف ربر پلاسٹک کے ہاتھوں پر کھال کی طرح منڈھ جانے والے دستانے نکالے۔ جیسا کہ عام طور سے سرجن اور ڈاکٹرز استعمال کرتے ہیں۔ ایک اس نے ہما کو تھمایا اور دوسرا خود پہننے لگا۔ ہما نے بھی دستانے پہن لیے تو پروفیسر نے بیگ سے دو عدد پستول نکالے۔ ہما کا رنگ ایک

بار پھر اُڑا۔ پروفیسر نے اسے تسلی دی۔ ''ڈرو مت نقلی ہیں لیکن بالکل اصل لگتے ہیں۔''

ہما نے ڈرتے ڈرتے پستول ہاتھ میں لیا تو اسے اندازہ ہوا کہ یہ دھات کا نہیں بلکہ فائبر کا بنا ہوا تھا مگر دیکھنے میں سو فیصد دھات کا لگ رہا تھا۔ پروفیسر نے اپنا پستول کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور ہما سے کہا۔ ''اسے یوں لے کر مت بیٹھو کسی نے دیکھ لیا تو ہم مشکل میں پڑ سکتے ہیں، کہیں چھپا لو۔''

ہما نے پستول دوپٹے تلے کر لیا۔ صبح کے نو بج رہے تھے۔ یونیورسٹی ٹائم آٹھ بجے کا تھا اور تانیا یقیناً گھر سے نکل چکی تھی۔ پروفیسر نے موبائل نکال کر ٹریکر آن کیا اور ان کے موبائل ٹریک کرنے لگا۔ موبائل ہائی وے کی اور ایک ہی لوکیشن پر تھے۔ ''وہ اس طرف آ رہے ہیں۔''

ہما نے جھک کر دیکھا اور بولی۔ ''انہیں آنے میں آدھا گھنٹا تو لگے گا۔''

ہما ابھی تک عبائے میں تھی البتہ اس نے نقاب ہٹا دیا تھا۔ پروفیسر مسلسل ٹریکر پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے بیگ سے ایک عدد نقلی مونچھ برآمد کی اور اسے اپنی ناک تلے فٹ کیا۔ اس کے بعد اس نے آئی لائنر نکال کر اپنی ہلکی سرمئی رنگ کی آنکھوں پر یوں لگایا کہ وہ سیاہ نظر آنے لگیں۔ ہما دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''آپ تو اور بھی بدل گئے ہیں۔''

''تم لڑکیوں کی کتنی آسانی ہے نقاب لیا اور شناخت غائب۔'' اس نے کہا۔ ''اب تم نقاب لے لو۔''

پروفیسر اور ہما گاڑی سے اترے اور ہما نے نقاب لگا لیا... پروفیسر نے کہا۔ ''جیسے ہی میں پستول نکالوں تم بھی نکال کر تانیا کے جسم سے لگا دینا اور کوشش کرنا کہ دور سے یہ نظر نہ آئے۔''

''ٹھیک ہے۔'' ہما نے سر ہلایا تھا کہ سامنے سے تانیا کی شاندار کار نمودار ہوئی۔ پروفیسر اس کے ساتھ ہٹ کی طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ میں ایک کاغذ تھاما ہوا تھا جیسے کوئی پتا تلاش کر رہا ہو۔ تانیا کی گاڑی رکی اور اس سے تانیا کے ساتھ سلمان اترا تھا۔ اس وقت پروفیسر اور ہما گیٹ کے بالکل سامنے تھے۔ پروفیسر سلمان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ایکسکیوزمی کیا بی ستاون یہی ہے؟''

''سوری یہ سی سکسٹی تو ہے۔'' سلمان نے رکھائی سے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے بی ستاون کہاں ہوگا؟''

''مجھے نہیں معلوم...'' سلمان کا باقی جملہ حلق میں رہ گیا کیونکہ اچانک پروفیسر نے کوٹ سے پستول نکال کر اس کی پسلی سے لگا دیا اور اسی لمحے ہما نے عقب سے تانیا کی کمر سے پستول لگا دیا تھا، وہ اس کے نزدیک کھڑی تھی اور پستول دونوں کے درمیان غائب تھا۔ سلمان اور تانیا کا رنگ اُڑ گیا۔ سلمان نے گھبرا کر کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''اسے پستول کہتے ہیں۔'' پروفیسر نے اطمینان سے کہا۔ ''تالا کھولو اور اندر چلو۔ دیر مت کرو ورنہ یہ چل جائے گا۔''

''تالا...؟ اس کی چابی میرے پاس نہیں ہے۔''

''لگتا ہے تم معمولی سی رقم کی خاطر جان دینا چاہتے ہو۔'' پروفیسر نے سفاک لہجے میں کہا تو سلمان نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر گیٹ کا تالا کھولا اور وہ اندر آئے۔ تانیا کی حالت خراب تھی اور وہ خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اندر آتے ہی اس نے گھگیانا شروع کر دیا۔

''پلیز میرے پاس صرف موبائل اور کچھ رقم ہے۔''

''اندر چلو۔'' پروفیسر نے اس کی بات نظر انداز کر کے حکم دیا۔ سلمان نے اندر والے لاک کھولے اور وہ ہٹ کی عمارت کے اندر آئے۔ پروفیسر نے اندر آتے ہی مطالبہ کیا۔ ''اپنے موبائل دو۔''

ان دونوں نے موبائل دیے تو پروفیسر نے ان پر سیکورٹی کوڈ ہٹا کر انہیں آف کر کے اپنی جیب میں رکھ لیا اور انہیں اگلا حکم دیا۔ ''اوندھے منہ قالین پر لیٹ جاؤ۔ دونوں ہاتھ سر پر رکھ لو۔''

''تم کیا چاہتے ہو جو لینا ہے لو اور یہاں سے جاؤ۔'' سلمان بولا تو پروفیسر نے پستول پھر اس کی پسلی سے لگا دیا۔

''تم لیٹ رہے ہو یا؟''

''اوکے اوکے۔'' سلمان جلدی سے بولا اور اوندھے منہ لیٹ گیا۔ تانیا بھی لیٹ گئی۔ پروفیسر نے کوٹ کی جیب سے دو عدد تیار سرنج نکالیں اور ایک سے کیپ ہٹاتے ہوئے اچانک اسے عقب سے سلمان کی گردن میں اتارتے ہوئے پسٹن دبا دیا۔ دوا اس کے جسم میں انجیکٹ ہوگئی۔ اس نے تڑپ کر اٹھنے کی کوشش کی تھی مگر پشت پر پروفیسر کا گھٹنا آنے سے وہ اٹھ نہیں سکا۔ تانیا نے اس کی کراہ سن لی تھی اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر ہما نے اسے دبا کر روک لیا۔ اس دوران میں پروفیسر نے جیب سے ایک چھوٹا سا وائس ریکارڈر نکال کر اسے تانیا کے منہ کے پاس کیا

اور بولا۔ ''اپنے باپ کے لیے پیغام دو۔ اس سے کہو وہ تمہیں بچائے۔''

''پاپا مجھے بچائیں۔'' تانیا سسکتے ہوئے بولی۔ پروفیسر نے ریکارڈر کے بٹن سے انگلی ہٹالی اور دوسری سرنج سے کیپ ہٹاتے ہوئے اسے تانیا کی گردن میں اتار دیا۔ اس وقت تک سلمان بے سدھ ہوگیا تھا اور تانیا کو بھی بے ہوش ہونے میں چند لمحے لگے تھے۔ پروفیسر نے انہیں سیدھا کیا اور ان کی آنکھیں کھول کر چیک کیں۔ اس نے مطمئن ہوکر سر ہلایا۔ ''دونوں کم سے کم دس گھنٹے کے لیے گئے۔''

''اب ان کا کیا کرنا ہے؟''

بیگ ہما کے شانے پر تھا۔ پروفیسر نے بیگ لے کر اس سے چوڑا مضبوط پلاسٹک ٹیپ نکالا اور پہلے سلمان کے دونوں ہاتھ پشت پر کرکے کلائیوں سے مضبوطی سے باندھے۔ اس کے بعد اس کے پاؤں ٹخنوں سے باندھے اور آخر میں اس کے منہ اور آنکھوں کے گرد بھی ٹیپ یوں لپیٹا کہ وہ کسی صورت اسے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس کے بعد اس نے تانیا کے ساتھ یہی سلوک کیا۔ ہما اب دلچسپی سے دیکھ رہی تھی اور اس کا ابتدائی خوف ختم ہوگیا تھا۔ اس کام سے نمٹ کر پروفیسر نے اس سے کہا۔ ''میرا ہاتھ بٹاؤ۔''

پروفیسر نے پہلے سلمان کو بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا اور ہما نے اس کے پاؤں پکڑے۔ وہ اسے ایک بیڈ روم میں لائے اور بیڈ کے ساتھ قالین پر ڈال کر پروفیسر نے پہلے اس کی مکمل تلاشی لی اور اس کے پاس سے ہر چیز نکال کر بیڈ پر ڈال دی اور آخر میں اسے بیڈ کے نیچے دھکیل دیا۔ اسے بیڈ کے بالکل وسط میں کرکے پروفیسر نے کمرے کی کھڑکیاں چیک کیں۔ پردے برابر کیے اور بیڈ سے اس کا سامان اٹھا کر باہر آکر دروازہ اندر سے لاک کرکے بند کردیا۔ تانیا کو دوسرے بیڈ روم میں بیڈ تلے اسی طرح ڈالا۔ ہما نے اس کی تلاشی لی مگر اس کے نام نہاد لباس میں کچھ نہیں تھا اس کی ساری چیزیں اس کے ہینڈ بیگ میں تھیں۔ پروفیسر نے تمام چیزیں ساتھ لائے بیگ میں ڈالیں۔ اس نے وہاں کچھ نہیں چھوڑا تھا حد یہ کہ استعمال شدہ سرنجیں تک اٹھالی تھیں۔ اس نے تالے بند کیے اور باہر آکر گیٹ پر بھی لاک لگا دیا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ ہٹ بند اور خالی ہے۔

''اب کیا کرنا ہے؟''

''تم میری گاڑی لے کر میرے پیچھے آؤ۔''

اب ہما سمجھی کہ پروفیسر اسے کیوں ڈرائیونگ سکھا رہا تھا۔ تانیا کی گاڑی کی چابی پروفیسر کے پاس تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ کر انجن اسٹارٹ کیا۔ ہما اس کے پیچھے تھی۔ ہما کو ساتھ رکھنے کی خاطر پروفیسر نے ہائی وے پر بھی رفتار سست رکھی تھی کہ ہما تیز ڈرائیو نہیں کرسکتی تھی۔ اس نے بہت تیزی سے سیکھا تھا اس کے باوجود مصروف سڑکوں پر ڈرائیونگ آسان نہیں ہوتی ہے۔ مرکزی شہر کے علاقے میں اس نے گاڑی ایک معروف شاپنگ پلازا کی پارکنگ میں روکی اور نیچے اتر کر اپنی کار کی طرف آیا۔ ہما نے سرک کر اس کے لیے ڈرائیونگ سیٹ خالی کی۔ پروفیسر نے گاڑی آگے بڑھائی اور کچھ دیر بعد اسے ایک پارک کے سامنے روک دیا۔ اس وقت وہاں ویرانی تھی اور پوری سروس روڈ خالی پڑی تھی۔ مین روڈ یہاں سے دور تھی اس لیے ٹریفک کا شور بھی نہیں تھا۔ پروفیسر نے تانیا کا موبائل نکالا تو ہما نے پوچھا۔ ''آپ کیا کرنے جارہے ہیں؟''

''منیرالدین کو کال۔''

☆☆☆

منیرالدین دفتر میں تھا اور اس وقت ایک اہم نوعیت کی میٹنگ میں تھا۔ اس نے گودام کے نگران کو طلب کیا ہوا تھا اور موضوع وہی خطرناک کیمیکل تھا جسے یوں بے پروائی سے گودام میں رکھا گیا تھا۔ منیرالدین کا کہنا تھا کہ یہ سنگین غفلت تھی اور اگر معاملہ پولیس یا ایف آئی اے تک چلا جائے تو وہ بہت مشکل میں پڑ جائے گا۔ اس وجہ سے یہ خطرناک لیکن قیمتی کیمیکل عجلت میں وہاں سے ہٹا کر ایک اور جگہ رکھا گیا تھا اور کمپنی کی دستاویزات سے اس کے بارے میں انٹریز ہٹائی گئی تھیں۔ لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کسٹم اور پورٹ کے حکام کے پاس موجود ریکارڈ کے مطابق یہ کیمیکل اسی کی کمپنی نے بیرونِ ملک سے منگوایا تھا۔ منیرالدین کے ایچ آر کے ڈائریکٹر نے اسے دبی زبان میں مشورہ دیا تھا کہ وہ جنید کا علاج اپنے ذمے لے لے ورنہ عین ممکن ہے معاملہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ مگر منیرالدین اتنی بڑی رقم خرچ کرنے کو تیار نہیں تھا۔ منیرالدین بات کررہا تھا کہ اس کے موبائل کی بیل بجی اور اس نے سامنے اسکرین پر دیکھا۔ تانیا کال کررہی تھی۔ اس نے کال کاٹ دی مگر چند سیکنڈ بعد بیل پھر بجی۔ اس کے ماتھے پر شکنیں آگئیں۔ تانیا ایک سے دو بار اسے کال نہیں کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ مصروف ہے اور فارغ ہوکر کال کرلے گا۔ شاید کوئی ایمرجنسی تھی۔ اس نے کال ریسیو کی۔

''ڈیئر میں اس وقت ایک اہم میٹنگ...''

''میری بات غور سے سنو۔'' دوسری طرف سے خلاف توقع ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ ''اگر تمہارے پاس کچھ لوگ ہیں تو فوری اکیلے ہوجاؤ کیونکہ معاملہ تمہاری بیٹی کی زندگی کا ہے۔ یہ بات جتنے کم لوگوں کے علم میں آئے گی، اس کی زندگی کا امکان اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ میں ایک منٹ بعد پھر کال کروں گا۔''

''ہیلو...'' منیر الدین نے کہنا چاہا مگر کال کٹ چکی تھی۔ وہ کچھ دیر ساکت بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن اس بات کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا اور اسی میں ایک منٹ گزر گیا۔ بیل بجی تو اس نے چونک کر اپنے آدمیوں کو دیکھا اور جلدی سے بولا۔ ''سوری جنٹل مین آج میٹنگ کینسل کی جاتی ہے۔''

عقل مند ملازم باس کا اشارہ سمجھ کر فوری وہاں سے اٹھ گئے۔ جیسے ہی آخری فرد دروازہ بند کر کے رخصت ہوا منیر الدین نے کال ریسیو کی اور دھیمی آواز میں بولا۔ ''کون ہو تم میری بیٹی کا موبائل تمہارے پاس کیسے آیا؟''

''صرف موبائل نہیں تمہاری بیٹی بھی میرے پاس ہے۔''

منیر الدین کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

''ایک ثبوت تو یہ موبائل ہے دوسرا ثبوت تمہاری بیٹی کی گاڑی ہے جو اس وقت... پلازا کی پارکنگ میں موجود ہے اور اس کی چابیاں اندر لگی ہیں۔ تیسرا ثبوت میں ابھی سناتا ہوں۔'' آدمی خاموش ہوا اور چند لمحے بعد تانیا کی ہذیانی سی آواز آئی۔ ''پاپا مجھے بچائیں۔''

منیر الدین نے تانیا کی آواز پہچان لی تھی پھر اسی شخص کی آواز آئی۔ ''مزید کوئی ثبوت چاہیے تو تمہاری اکلوتی بیٹی کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر بھیج سکتا ہوں۔''

''کیا... کیا چاہتے ہو؟'' منیر الدین ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

''یہ کی نا تم نے کام کی بات۔'' آدمی بولا، وہ مسلسل ایک مشینی سی آواز میں بول رہا تھا اور اب تک اس کے انداز میں کہیں جذبات کی آمیزش نہیں آئی تھی۔ ''اب غور سے سنو، تمہیں بہت مختصر ہے، ابھی وقت ہوا ہے دس بج کر بائیس منٹ۔ تانیا محفوظ ہے لیکن وہ جہاں موجود ہے وہاں ایک طاقتور ٹائم بم ہے جو ٹھیک آٹھ گھنٹے اور آٹھ منٹ کے بعد پھٹ جائے گا۔ اگر اس دوران میں تم میرا مطالبہ پورا کر دیتے ہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ شام ساڑھے چھ بجے تک تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں تانیا کی باقیات کہاں سے لینی ہیں۔''

منیر الدین کو ایسا لگ جیسے اس کے جسم کا کوئی ٹکڑا کٹ رہا ہو۔ تانیا اس کے وجود کا ایک حصہ ہی تو تھی اور دنیا میں وہی اس کے لیے سب کچھ تھی..... ''تمہارا مطالبہ کیا ہے؟''

''دس کروڑ روپے اپنے کسی ایسے اکاؤنٹ میں منتقل کرو جہاں سے فوری رقم کسی بھی دوسرے آن لائن اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہو سکے۔''

''دس کروڑ۔'' منیر الدین گھبرا کر بولا۔ ''یہ بہت بڑی رقم ہے۔''

''تم جس بنگلے میں رہتے ہو وہ کم سے کم پچاس کروڑ روپے مالیت کا ہے۔ تمہارا سالانہ ٹرن اوور اربوں میں ہے۔ تم جس بلٹ پروف کار میں سفر کرتے ہو اس کی مالیت سات کروڑ روپے ہے اور تم کہہ رہے ہو کہ دس کروڑ بڑی رقم ہے۔ کیا تمہاری بیٹی کی زندگی سے زیادہ بڑی ہے؟''

''لیکن...''

''منیر الدین تاجر نہ بنو باپ بنو۔ میں تین گھنٹے بعد کال کروں گا۔ تب تک تم چاہو تو تصدیق کر لو اور رقم کا بندوبست بھی۔'' آدمی نے اس کی بات کاٹ کر کہا اور پھر لائن کاٹ دی۔ منیر الدین نے پہلے ہیلو ہیلو کہا اور پھر خود نمبر ملایا تو اسے ریکارڈڈ آواز سنائی دی کہ اس کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔ اس نے موبائل میز پر پٹخ دیا۔ پھر اسے خیال آیا اور اس نے جلدی سے موبائل اٹھایا اور کسی کو کال کرنے لگا۔

☆☆☆

ہما غور سے سن رہی تھی۔ وہ دس کروڑ کا سن کر چونکی اور پھر اسے آن لائن ٹرانسفر والی بات بھی کھٹکی تھی۔ جب پروفیسر نے کال ختم کی تو اس نے پوچھ لیا۔ پروفیسر نے جواب دیا۔ ''دس کروڑ والی بات اس لیے کی ہے کہ وہ بارگیننگ کرے گا اور ہم تین کروڑ تک آجائیں گے۔ جہاں تک آن لائن ٹرانسفر والی بات ہے تو تم جلد دیکھ لوگی کہ میں اس معاملے کو کیسے ہینڈل کرتا ہوں۔''

''آپ کو یقین ہے کہ وہ مان جائے گا؟''

''ٹائم بم والی بات اسی لیے کی ہے کہ اسے احساس رہے کہ اس کی بیٹی کے پاس وقت کم ہے اور اس کا ذہن پولیس یا کسی اور طرف مدد کے لیے نہ جائے۔''

''کوشش تو وہ کرے گا۔'' ہما نے یقین سے کہا۔

''جہاں تک میں نے اسے جانا ہے، وہ بہت ہی ضدی شخص

ہے۔''

''ہاں مگر اولاد ایسی چیز ہے کہ آدمی کی ساری ضد اور اکڑ ختم ہو جاتی ہے۔'' پروفیسر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''اب ہمیں ناشتا کرنا ہے اور اس کے بعد کچھ کام کرنا ہے۔''

''میں نے ناشتا کر لیا ہے۔''

''ایک بار پھر کر لو ہو سکتا ہے کہ اس کے بعد جب تک یہ معاملہ نمٹ نہیں جاتا کچھ کھانے کو نصیب نہ ہو۔''

کچھ دیر بعد وہ ایک ریسٹوران میں تھے۔ ہما نے کھانے کے بجائے ملک شیک کا بڑا گلاس لے لیا۔ البتہ پروفیسر نے ڈٹ کر ناشتا کیا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ فلیٹ کی طرف روانہ ہوئے۔ جس وقت وہ ریسٹوران سے نکل رہے تھے، انہوں نے غور نہیں کیا تھا کہ ایک نسبتاً تاریک کونے میں ایک شخص بہت دیر سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے جاتے ہی وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ پروفیسر نے راستے میں ہما سے کہا۔ ''آج تمہیں صرف حلیہ نہیں بدلنا ہے بلکہ اپنے انداز سے اپر کلاس کی عورت نظر آنا ہے۔''

''اس کے لیے اپر کلاس لوازمات چاہئیں جو میرے پاس نہیں ہیں۔''

''ان کی تم فکر مت کرو۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''میں نے تمام چیزوں کا بندوبست کر لیا ہے۔''

وہ فلیٹ میں آئے تو پروفیسر نے اسے ایک شاپر دیا۔ ''اس میں سب کچھ ہے۔ تم آرام سے تیار ہو جب تک میں باہر سے ایک کام کر کے آتا ہوں۔''

پروفیسر چلا گیا تو ہما نے شاپر کھول کر دیکھا اس میں ایک اعلیٰ درجے کا سوٹ تھا۔ اس قسم کے سوٹ اوپری طبقے کی شادی شدہ عورتوں میں مقبول تھے اور یہ بوتیک برانڈ تھا۔ اس کے ساتھ میک اپ کا سامان، پرفیوم، نفیس قسم کی سینڈل، پرس، میچنگ کی جیولری، گھڑی اور سن گلاس تھے۔ ہما تیار ہوتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ پروفیسر نے اتنا خرچ اپنی جیب سے کیا تھا۔ ایک لاکھ تو اس نے صرف اس فلیٹ کے مالک کو دیے تھے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو جاتی اور انہیں بھاگنا پڑتا تو یہ ایک لاکھ بھی جاتے۔ اس کے علاوہ بھی وہ بہت خرچ کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے بعد اس نے تیار ہو کر خود کو آئینے میں دیکھا تو سحر زدہ سی رہ گئی... وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ اسے یقین نہیں آیا تھا۔ اس نے میک اپ درمیانہ رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد پروفیسر آیا تو اسے دیکھ کر وہ بھی کچھ دیر کے لیے ساکت رہ گیا۔ ہما اس کے یوں دیکھنے سے جھینپ گئی۔

''کیا ہوا کوئی کمی رہ گئی ہے؟''

''بہ خدا کوئی کمی نہیں ہے۔'' پروفیسر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''تم نے میری توقع سے بڑھ کر تیاری کی ہے اور میں ایسی ہی تیاری چاہتا تھا۔''

اب پروفیسر تیار ہونے بیڈ روم میں چلا گیا اور ہما لاؤنج میں انتظار کرنے لگی۔ پروفیسر آدھے گھنٹے میں آیا تو وہ بھی بہترین سوٹ، جوتوں اور ڈائمنڈ واچ کے ساتھ اوپری طبقے کا دولت مند فرد لگ رہا تھا۔ ہما سوچ رہی تھی کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ اس نے پوچھا تو پروفیسر نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''آج ہمارا شاپنگ کا موڈ ہو رہا ہے گولڈ اور ڈائمنڈ جیولری کی خریداری کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

ہما سمجھی کہ وہ مذاق کر رہا ہے، اس نے بھی ہنس کر کہا۔ ''کیوں نہیں۔''

''بس تو چلو۔'' پروفیسر نے فراغ دلی سے خود پر پرفیوم اسپرے کر کے کہا۔ وہ فلیٹ سے باہر آئے مگر جب پارکنگ میں آئے تو گاڑی کی طرف جانے کے بجائے پروفیسر نے باہر کا رخ کیا۔ ہما نے کہا۔

''کیا ٹیکسی میں جائیں گے؟''

''ٹیکسی میں کیوں جائیں گے۔ ہماری اپنی گاڑی مع ڈرائیور کے ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔ فلیٹ سے کچھ دور پیدل چلنے کے بعد اچانک وہ ایک چاندی جیسے رنگ والی مہنگی لگژری کار کے پاس رکا تو اندر موجود ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر ان کے لیے دروازہ کھولا اور وہ کار کی نشست پر آ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس نے پروفیسر سے نہیں پوچھا کہ انہیں کہاں جانا ہے۔ وہ انہیں ساحل کی ایک پوش آبادی کے ساتھ والی سڑک پر لے آیا اور اسی سڑک پر دھیمی رفتار سے کار چلانے لگا.... ایک ویران نظر آنے والی جگہ پر پروفیسر نے تانیا کا موبائل نکالا اور ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔ پھر اس نے ہما سے کہا۔ ''تم بیٹھو میں ابھی آتا ہوں۔''

باہر آ کر اور گاڑی سے کچھ دور جا کر وہ منیر الدین کو کال کرنے لگا۔

☆☆☆

منیر الدین بے چینی سے ٹہل رہا تھا اور ہر تھوڑی دیر بعد اس کی نظر موبائل کی طرف جاتی تھی۔ تین گھنٹے کا وقت پورا ہونے والا تھا اور اس نے تصدیق کرا لی تھی اس شخص کی کہی ہوئی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ تانیا کی گاڑی شاپنگ

پلازا کی پارکنگ میں تھی اور اس کی چابیاں اندر لگی ہوئی تھیں۔منیرالدین اتنا جانتا تھا کہ تانیا صبح یونیورسٹی کے لیے روانہ ہوئی تھی اور شاید اسی دوران میں اسے اغوا کیا گیا تھا۔ وہ ٹہلتے ہوئے بار بار موبائل دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس کے فون کی بیل بجی اور اس نے کال ریسیو کی۔ پہلے ہوا کا شور سنائی دیا اور دوسری طرف موجود شخص نے کہا۔''امید ہے تم نے اپنی تسلی اور بندوبست کرلیا ہوگا۔''

''ہاں لیکن میں اپنی بیٹی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔تم اس سے ایک ہی بار مل سکو گے۔وقت سے پہلے یا وقت گزرنے کے بعد۔اب یہ تم پر ہے۔''

''میں اپنی تسلی چاہتا ہوں کہ وہ زندہ ہے۔''

''اس تسلی میں دیر ہوسکتی ہے اور تاخیر تمہارے لیے ہی نقصان دہ ہے، فیصلہ کرلو۔ میں نے تمہاری بیٹی کو چہرہ دکھائے بغیر قابو میں کیا اور وہ اس وقت جہاں ہے بالکل اکیلی ہے۔ یہ بندوبست میں نے اسی لیے کیا ہے کہ اگر تم رقم دیتے ہو تو تانیا تمہیں سو فیصد صحیح سلامت واپس ملے۔ میں بلا وجہ کسی کی جان لینے کا قائل نہیں ہوں۔''

منیرالدین کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔''دس کروڑ بہت بڑی رقم ہے۔''

''تمہارے لیے معمولی ہے۔''

''تم نہیں سمجھ رہے ہو، ٹھیک ہے میرے پاس پچاس کروڑ کا بنگلا ہے اور اربوں کا بزنس ہے مگر میرے پاس کیش کی کمی ہے اور میرے پاس مشکل سے تین کروڑ روپے اس وقت کیش میں ہیں۔ میں آج کے دن اس سے زیادہ نہیں کر سکتا ..... تم نے مجھے بہت کم وقت دیا ہے۔''

''لگتا ہے تمہیں اپنی اکلوتی بیٹی سے زیادہ دولت سے پیار ہے۔''

''ایسا نہیں ہے۔'' منیرالدین گڑگڑانے لگا۔''میں قسم کھاتا ہوں کہ میں اس سے زیادہ نہیں کرسکتا ہاں اگر تم مہلت دو تو...''

''مہلت تمہاری بیٹی کے پاس نہیں ہے۔''

''پلیز... پلیز۔'' منیرالدین رونے لگا۔ اس کی سسکیاں نکل رہی تھیں مگر اس کی آنکھیں بالکل خشک اور تاثرات بھی رونے والے نہیں تھے۔

''اوکے، یہ تین کروڑ روپے کہاں ہیں؟''

''میرے ایک اکاؤنٹ میں جہاں سے اسے صرف تین منٹ میں تمہارے بتائے کسی بھی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کیا جاسکتا ہے۔''

آدمی کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے کہا۔''ٹھیک ہے الرٹ رہو۔ جیسے ہی میری طرف سے اکاؤنٹ نمبر بھیجا جائے تم اس پر دس منٹ میں رقم ٹرانسفر کرو گے۔ یاد رکھنا تاخیر کا مطلب ہوگا دھوکا اور اس کا مطلب ہوگا تانیا کی یقینی موت۔''

''کوئی دھوکا نہیں ہوگا۔'' منیرالدین نے کہا تو دوسری طرف سے کال کاٹ دی گئی۔ منیرالدین کے چہرے پر سخت تاثرات تھے، اس نے زیرلب کہا۔''آن لائن ٹرانسفر کا کہہ کر تم نے خود اپنے گلے میں پھندا ڈال لیا ہے، اب تم بچ نہیں سکو گے۔''

☆☆☆

پروفیسر واپس گاڑی میں آیا۔ تانیا کے موبائل میں منیرالدین کے دفتر کا فون نمبر بھی تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس پر کال کی۔ گاڑی رکی ہوئی تھی مگر اس کا انجن اور اے سی چل رہا تھا۔ باہر دھوپ کی وجہ سے کسی قدر تمازت تھی اور پروفیسر کے ماتھے پر ہلکا سا پسینا آیا ہوا تھا۔ اس نے اندر بیٹھ کر اپنا موبائل نکالا اور ایک ایس ایم ایس کر کے ہما کو اشارہ کیا کہ وہ اپنا موبائل دیکھے۔ اس نے موبائل نکال کر ایس ایم ایس دیکھا۔ پروفیسر نے لکھا تھا۔''مبارک ہو وہ خود ہی تین کروڑ والی بات پر آگیا اور میں مان گیا ہوں۔ اب کھیل کا سب سے اہم حصہ شروع ہونے والا ہے۔''

☆☆☆

رضا جیولر کا شمار جیولرز مارکیٹ کے بڑے جیولرز میں ہوتا تھا۔ وہ بڑے پیمانے پر سونے کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ لیکن ان کا یہ کام بغیر کسی لکھا پڑھی کے نقد کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے ان کا یہ کام دستاویزات میں نہیں آتا تھا اور اس کا انکم ٹیکس اور گولڈ کمپنی کے گوشواروں میں کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا حالانکہ ان کی سالانہ اربوں روپے کی خرید و فروخت تھی اور اس پر حاصل ہونے والا کروڑوں کا نفع بنا کسی ٹیکس کی ادائیگی کے خالص ان کی جیب میں جاتا تھا۔ شہر کی مرکزی گولڈ مارکیٹ کی دوسری منزل پر خاصے بڑے رقبے پر ان کا شوروم تھا اور یہیں عقب میں واقع دفتر میں سونے کی خرید و فروخت کا کام ہوتا تھا۔

رضا جیولر کا مالک محسن رضا تقریباً پچاس برس کا خوش رُو ... اور باوقار شخص تھا۔ سرخ و سفید رنگت کے ساتھ گول چہرہ اور اس پر ریم لیس عینک اچھی لگتی تھی۔ عام طور سے وہ اپنے دفتر میں ہوتا تھا اور وہیں سے کیمروں کی مدد سے اپنے سیلز

مین ٹیم کی کارکردگی پر نظر رکھتا تھا۔ سوا دو بجے جب لنچ کی وجہ سے مارکیٹ میں رش نہ ہونے کے برابر تھا، ایک جوڑا اندر داخل ہوا۔ مرد تقریباً پینتیس برس کا تھا اور عورت شاید چھبیس برس کی تھی۔ دونوں اپنے حلیے اور انداز سے اوپری طبقے کے نظر آرہے تھے۔ محسن کے ایک سیلز مین نے انہیں ریسیو کیا اور بولا۔ ''فرمایئے سر اور میڈم میں کیا خدمت کر سکتا ہے؟''

''کچھ کام اِن کو ہے۔'' مرد نے عورت کی طرف اشارہ کیا جو سرسری نظروں سے وہاں شوکیسوں میں سجے زیورات کا جائزہ لے رہی تھی۔ ''کچھ کام مجھے ہے۔''

''ہارون یہاں کچھ خاص نہیں ہے۔'' عورت نے آہستہ سے کہا۔ ''کہیں اور چلو۔''

سیلز مین نہیں سن سکا تھا مگر دکان میں لگا ہوا مائیک اتنا حساس تھا کہ اس نے محسن تک عورت کی آواز پہنچا دی۔ وہ فوری اٹھ کر باہر آیا۔ اس نے مرد سے ہاتھ ملایا۔ ''میں محسن رضا ہوں اس دکان کا اونر۔''

''ہارون احمد۔'' مرد نے تعارف کرایا۔ ''یہ میری مسز ہیں۔''

''نائس ٹو میٹ یو۔'' محسن نے کہا۔ ''میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟''

''دراصل ہماری شادی کی سالگرہ آرہی ہے اور میں ان کے لیے کچھ اسپیشل لینا چاہتا ہوں۔'' ہارون یعنی پروفیسر نے لفظ اسپیشل پر زور دیا۔

''کیوں نہیں، آپ میرے ساتھ آیئے۔ میں آپ کو اسپیشل آئٹمز دکھاتا ہوں۔ گولڈ میں پسند کریں گے یا پلاٹینیم کے ساتھ اسٹون میں؟''

''دونوں میں جو پسند آئے اور اسپیشل ہو۔''

محسن رضا انہیں اپنے خاص کمرے میں لے آیا۔ یہ اس کے دفتر سے متصل تھا اور اس نے اپنے منیجر سے کہا کہ وہ شاپ کے خاص آئٹمز ان کے سامنے پیش کرے۔ منیجر کو حکم دے کر محسن رضا نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔ ''اس کے علاوہ اور کوئی خدمت کرسکتا ہوں؟''

پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''مجھے کچھ گولڈ لینا ہے لیکن خالص اور گارنٹی والا۔''

محسن رضا مسکرایا۔ ''ہم خالص اور گارنٹی والا گولڈ ہی فروخت کرتے ہیں۔''

''مجھے بڑی مقدار میں چاہیے۔''

''ہم کے جی تک ہر مقدار میں فراہم کرتے ہیں۔''

محسن رضا نے اعتماد سے کہا۔ ''آپ مقدار اور معیار کی فکر نہ کریں۔''

کچھ دیر میں منیجر ایک سیلز مین کے ساتھ ڈبے اٹھائے اندر آیا۔ یہ خاص المونیم باکس تھے۔ جن میں اعلیٰ درجے کے قیمتی زیورات سجے ہوئے تھے۔ چھ گولڈ سیٹ تھے اور چھ ہی اسٹون سیٹ تھے۔ ان میں سے دو شفاف ہیروں والے سیٹ تھے۔ دو کلرڈ ڈائمنڈ تھے اور دو زمرد کے سیٹ تھے۔ محسن رضا نے تمام سیٹ کھلوا کر ہما کے سامنے رکھ دیے۔ اندر سے وہ کسی قدر نروس تھی۔ کیونکہ اس نے آج تک اتنے قیمتی زیورات نہیں دیکھے تھے مگر اوپر سے وہ پُراعتماد رہی۔ اس نے تمام سیٹ دیکھے اور نفی میں سر ہلایا۔ ''اس میں کچھ بھی اسپیشل نہیں ہے۔ ایسے ڈیزائن میں دوسروں کے پاس دیکھ چکی ہوں۔''

محسن رضا نے حیرت سے کہا۔ ''میڈم یہ بہت قیمتی سیٹ ہیں اور ان میں کوئی چار لاکھ سے کم کا نہیں ہے۔''

پروفیسر مسکرایا۔ ''مسٹر رضا، ہماری بیگم کے پاس سب سے کم قیمت والا سیٹ بھی پانچ لاکھ سے نیچے کا نہیں ہے۔ شاید آپ انڈر اسٹیمیٹ کررہے ہیں۔''

''سوری اگر آپ نے ایسا محسوس کیا ہے۔'' محسن رضا نے کہا اور منیجر کی طرف دیکھا اس نے فوری تمام باکس اٹھائے.... اور وہاں سے چلا گیا۔ کچھ دیر میں وہ صرف چار باکس لایا اور ان چار باکس میں سچ مچ بہت اعلیٰ درجے کے جڑاؤ سیٹ تھے۔ پروفیسر محسوس کررہا تھا کہ محسن رضا اس سے گولڈ کی بات کرنے کے لیے بیتاب ہے مگر وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر ہما کے ساتھ سیٹ دیکھنے میں معروف تھا۔ ہما نے ایک جڑاؤ سیٹ پسند کیا جس میں زرد آسٹریلین ہیرے لگے تھے۔ سیٹ میں دو قیراط کے ایک جیسے کوئی سو کے قریب ہیرے تھے اور یہ سیٹ پلاٹینیم سے بنا ہوا تھا۔ ہما نے پروفیسر کی طرف دیکھا۔

''مجھے یہ پسند آیا ہے۔''

''لاجواب ہے۔'' محسن رضا نے کہا۔

''ہماری بیگم کی پسند ہمیشہ لاجواب ہوتی ہے۔'' پروفیسر ہنسا۔ ''جیسے کہ ہم۔''

''مجھے یہی لینا ہے۔'' ہما نے ذرا نخرے سے کہا۔ پروفیسر کی بات پر اس کا چہرہ سرخ ہوا تھا۔

پروفیسر نے محسن کی طرف دیکھا۔ ''کیا قیمت ہے ہماری بیگم کی پسند کی؟''

''ان کی پسند تو لاجواب کے ساتھ انمول بھی ہے۔''

محسن رضا مسکرایا۔ ''اس وقت اس سیٹ کی مارکیٹ ویلیو بارہ لاکھ روپے ہے لیکن آپ کے لیے کچھ اور ہوگی۔''

''چلیے انہوں نے اپنا کام کر لیا۔'' پروفیسر بولا۔ ''اب میرے کام کی طرف آیئے۔''

''میں نے کہا نا کہ آپ معیار اور مقدار کی پروا نہ کریں۔''

''مجھے سات کے جی گولڈ بار چاہئیں۔'' پروفیسر نے نارمل انداز میں کہا۔ ''دس گرام، پچاس گرام اور سو گرام بارز کی صورت میں۔''

''سات کے جی؟'' محسن رضا چونکا۔ ''شاید اتنا نہ ہو لیکن میں کرلوں گا۔''

''کتنی دیر میں؟''

''مجھے ایک گھنٹا دیں۔ جب تک آپ گرم ٹھنڈا پیجیے۔'' محسن رضا نے کہا اور اٹھ کر وہاں سے چلا گیا۔ البتہ اس کا منیجر وہیں تھا۔ پروفیسر نے غیر محسوس انداز میں گھڑی دیکھی، دو بج کر چالیس منٹ ہو چکے تھے۔ ایک گھنٹے کا مطلب تھا کہ انہیں یہاں سے نکلتے ہوئے چار بج سکتے تھے۔ وہ یہاں تک اسی لگژری کار میں آئے تھے جو پروفیسر نے ڈرائیور سمیت رینٹ پر لی تھی اور ڈرائیور کی وجہ سے اسے ضمانت یا اپنے شناختی کارڈ دکھانے کو نہیں کہا گیا تھا۔ وہ ڈرائیور سمیت کار کا بارہ گھنٹے کا کرایہ ادا کر چکا تھا۔ محسن رضا نصف گھنٹے بعد واپس آیا۔ اس دوران میں ان کے لیے چائے اور دوسرے لوازمات آئے تھے۔ چائے نوشی کرتے ہوئے وہ دونوں آپس میں ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے جیسے سچ مچ میاں بیوی ہوں اور ان کے بچے ہوں۔ گھر کے چھوٹے موٹے فرضی مسئلے تھے۔ دونوں بہت روانی سے بات کر رہے تھے۔ محسن رضا آیا تو اس نے پروفیسر سے کہا۔

''بندوبست ہو گیا ہے۔ میرے پاس ایک معروف گولڈ کمپنی کی تصدیق شدہ سو گرام والی بارز آئی ہیں۔ تمام بارز سو گرام والی ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو یہ کاغذات کے ساتھ ہیں۔''

اس صورت میں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''مگر ان کے آج کی گولڈ پرائس کے ساتھ دس ہزار روپے فی کے جی سروس چارجز ہوں گے۔''

''میں کوئی چارجز نہیں دوں گا۔'' پروفیسر نے دوٹوک انداز میں کہا۔ ''صرف گولڈ پرائس دوں گا۔ سروس چارجز کس بات کے جبکہ آپ خریدتے ہوئے اپنا کمیشن کاٹ لیتے ہیں۔''

''اگر آپ نے واپس ہمیں نہ بیچا تو۔''

''تب بھی کوئی نہ کوئی آپ کو فروخت کرے گا اور میں جسے فروخت کروں گا کیا وہ کمیشن نہیں کاٹے گا۔'' پروفیسر نے برہمی سے کہا۔ ''شاید آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں پہلی بار گولڈ ڈیل کر رہا ہوں۔''

محسن رضا نے فوری پینترا بدلا۔ ''سوری سر، جیسے آپ چاہیں۔''

''بات میرے چاہنے کی نہیں، اصول کی ہے۔''

''آپ ادائیگی کیسے کریں گے؟''

''یہ میرا ہیڈک ہے جب میں گولڈ لے کر اٹھوں گا تو رقم آپ کو مل چکی ہوگی۔'' پروفیسر نے اپنا لہجہ کھردرا اور کاروباری رکھا تھا۔ ''ابھی آپ نے مجھے کچھ نہیں دکھایا ہے۔''

''بارز آرہے ہیں۔'' محسن رضا نے کہا۔ ''اس میں کچھ وقت لگے گا۔''

پروفیسر نے گھڑی دیکھی۔ ''میں چار بجے سے زیادہ نہیں رک سکتا۔ کوشش کریں ڈیل اس سے پہلے فائنل ہو جائے۔''

''اس سے زیادہ وقت نہیں لگے گا۔'' محسن رضا نے یقین دلایا۔ ساڑھے تین بجے ایک سیلز مین چاندی جیسے رنگ کا بریف کیس اٹھائے اندر آیا اور اس نے وہ محسن رضا کے سامنے رکھ دیا۔ اس کے جانے کے بعد محسن رضا نے بریف کیس کھولا اور اس کا رخ پروفیسر کی طرف کر دیا۔ اندر مضبوط پلاسٹک میں پیک گولڈ بارز تھے اور ہر گولڈ بار کے ساتھ اس کا گارنٹی کارڈ بھی تھا۔ پروفیسر نے... بارز کو سکون سے چیک کیا۔ اس نے جیب سے ایک میگنی فائنگ گلاس نکال لیا تھا اور اس سے سیل چیک کر رہا تھا۔ تمام بارز چیک کر کے اس نے بریف کیس بند کیا اور بولا۔

''ٹھیک ہے، مجھے پرائس بتایئے۔''

محسن رضا نے کیلکولیٹر پر آج کی قیمت کے حساب سے سو فیصد خالص سونے کی قیمت نکالی اور بولا۔ ''یہ بنتے ہیں دو کروڑ ستتر لاکھ بارہ ہزار نو سو نواسی روپے۔''

پروفیسر نے ریٹ کے حساب سے چیک کیا اور پھر اس نے ڈائمنڈ سیٹ کی قیمت پوچھی۔ محسن رضا نے کہا۔

''آپ کے لیے یہ ساڑھے دس لاکھ کا ہو جائے گا۔''

''یہ بنتے ہیں دو کروڑ ستاسی لاکھ باسٹھ ہزار نو سو نواسی روپے۔ آپ اسے تریسٹھ ہزار سمجھ لیں۔''

''درست ہے۔''

"مجھے سیٹ کی رسید بنوا دیجیے اور ساتھ ہی بارہ لاکھ سینتیس ہزار کیش کا بندوبست کر دیں۔"

محسن رضا چونکا۔ "وہ کیوں سر؟"

"میں آپ کو آن لائن رقم ٹرانسفر کروں گا۔ رقم پورے تین کروڑ ہوگی۔ دراصل بیگم کو مزید خریداری کرنی ہے اور مجھے اے ٹی ایم جانا پڑے گا۔ اس لیے میں آپ سے کیش کا کہہ رہا ہوں۔ آپ اتنا کیش تو رکھتے ہی ہوں۔"

"آن لائن۔" محسن رضا ہچکچایا۔ "آپ کیش..."

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ موجودہ حالات میں میں اپنے پرس میں پچاس ہزار سے زیادہ رقم نہیں رکھتا ہوں۔ کیش ہینڈلنگ ٹو مچ رسک۔"

محسن رضا آن لائن ٹرانسفر سے ہچکچا رہا تھا کیونکہ آج کل بھاری ٹرانزیکشن والے اکاؤنٹس چیک کیے جا رہے تھے۔ مگر پروفیسر نے دوٹوک انداز میں کہہ دیا تھا کہ وہ آن لائن ہی ادائیگی کرے گا۔ مجبوراً اس نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے۔"

"مجھے اکاؤنٹ نمبر بتائیے۔" پروفیسر نے میز پر رکھا ہوا نوٹ پیڈ اپنی طرف کیا اور پین نکالا۔ محسن رضا نے اسے ایک اکاؤنٹ نمبر بتایا۔ پروفیسر نے نوٹ کر کے تانیا کا موبائل نکال کر آن کیا اور والیوم کم کر کے منیر الدین کو کال کی۔ اس نے فوری کال ریسیو کی۔ "میں بات کر رہا ہوں۔ ایک اکاؤنٹ نمبر نوٹ کرو۔"

"میری بیٹی..." منیر الدین نے کہنا چاہا مگر پروفیسر نے اسے اکاؤنٹ نمبر نوٹ کروانا شروع کر دیا۔ نمبرز کے بعد آخر میں بینک کا نام بتا کر اس نے کہا۔ "اس میں تین کروڑ روپے ٹرانسفر کرو اور کام ہوتے ہی مجھے ویری فائی کرو۔"

منیر الدین کچھ کہنا چاہ رہا تھا مگر پروفیسر نے لائن کاٹ دی۔ اس نے مسکرا کر محسن رضا کی طرف دیکھا۔ "آن لائن ٹرانسفر نے بہت سہولت کر دی ہے، میں اپنی ساری ٹرانزیکشن اسی طرح کرتا ہوں۔"

محسن رضا بھی مسکرانے لگا۔ "اس کا مطلب ہے آپ پورا ٹیکس پے کرنے پر یقین رکھتے ہیں۔"

"ہاں کیونکہ ٹیکس چوری مجھے پسند نہیں ہے۔"

"پسند تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن ہمیں اس کا ری فنڈ نہیں ہوتا ہے۔"

"یہ تو ہے کہ ٹیکس کا زیادہ تر پیسا ضائع جاتا ہے اور زیادہ تر ٹیکس گزار اس کا فائدہ اٹھا پاتے ہیں لیکن عجیب بات ہے کہ ہم تاجر جو سب سے زیادہ فائدے میں رہتے ہیں اور ہم ہی ٹیکس ادا نہیں کرتے۔"

محسن رضا جھینپ گیا۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔"

پروفیسر نے موبائل ہاتھ میں ہی رکھا تھا۔ جیسے ہی بیل بجی اور اسکرین پر پاپا لکھا آیا، اس نے کال ریسیو کی۔

"یس۔"

"میں نے رقم ٹرانسفر کر دی ہے۔ اب تم میری بیٹی..."

"اوکے... اوکے۔" پروفیسر نے کہتے ہوئے کال کاٹ دی اور موبائل آف کرتے ہوئے محسن رضا کی طرف دیکھا۔ "رقم آپ کے اکاؤنٹ میں آگئی ہے، آپ تصدیق کریں اور مجھے اجازت دیں۔"

محسن نے اپنے ٹیب میں اپنا بینک اکاؤنٹ اوپن کیا اور تصدیق کرنے لگا۔ دو منٹ بعد اس نے سر ہلایا۔ "رقم آگئی ہے۔"

پروفیسر مسکرایا۔ "کتنا آسان ہے نا کوئی خطرہ نہیں ہے اور پروف بھی مل جاتا ہے۔"

"مگر اسے کہیں آزمانے کی کوشش مت کیجیے گا۔"

محسن نے ٹیب واپس رکھ دیا۔ اس دوران میں اس نے بارہ لاکھ سینتیس ہزار روپے کی رقم منگوا لی تھی۔ دو گڈیاں پانچ ہزار کے نوٹوں والی تھیں اور باقی سینتیس ہزار، ہزار کے نوٹوں کی صورت میں تھے۔ پروفیسر نے انہیں گنا اور رقم ہما کی طرف بڑھا دی۔

"یہ آپ رکھیں آپ نے ہی خرچ کرنے ہیں۔"

"میرے گارڈ آپ کو گاڑی تک چھوڑ آتے ہیں۔"

محسن رضا نے کہا مگر پروفیسر نے منع کر دیا۔

"نہیں اس طرح آدمی غیر ضروری طور پر نمایاں ہو جاتا ہے۔ میرا ڈرائیور بہترین گارڈ بھی ہے سابق آرمی کمانڈو ہے۔"

پروفیسر اور ہما باہر آئے تو ہما غیر ارادی طور پر تیز قدم اٹھانے لگی۔ پروفیسر نے آہستہ سے کہا۔ "آرام سے چلو۔"

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ڈرنے سے کیا ہوگا۔" پروفیسر نے کہا۔ "اب تک تو تم بہت بہادر بنی ہوئی تھیں۔ جبکہ ڈرنا وہاں چاہیے تھا۔"

"وہاں تو مجھے سب بہت دلچسپ لگ رہا تھا۔"

وہ پارکنگ میں آئے جہاں گاڑی موجود تھی۔ ڈرائیور نے ان کے لیے دروازہ کھولا اوران کے بیٹھنے کے بعد گاڑی وہاں سے نکالنے لگا چند منٹ بعد وہ فلیٹ کی طرف

جا رہے تھے۔ پروفیسر نے ڈرائیور کو اسی طرف چلنے کو کہا تھا۔ جہاں اس نے انہیں پک کیا تھا۔ مگر راستے میں پروفیسر نے جان بوجھ کر گاڑی سنسان سڑکوں پر مڑوائی۔ ڈرائیور کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ اس کی ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ جب پروفیسر کو اطمینان ہو گیا کہ ان کے پیچھے کوئی نہیں ہے تو اس نے ڈرائیور کو سیدھا چلنے کو کہا۔ ساڑھے چار بجے وہ اسی جگہ اترے۔ پروفیسر نے ڈرائیور کو ہزار کا نوٹ ٹپ میں دیا تو وہ خوش ہو گیا۔ ''کیا حکم ہے سر؟''

''کچھ نہیں، اب تم جا سکتے ہو۔''

ڈرائیور سلام کر کے رخصت ہو گیا اور وہ پیدل فلیٹ تک آئے۔ جب وہ اندر داخل ہوئے تو ہما نے سکون کا طویل ترین سانس لیا۔ ''شکر ہے خیر سے پہنچے ورنہ اب تک تو مجھے دھڑکا ہی لگا ہوا تھا۔ کہیں کوئی پیچھے نہ آ جائے اور بیچ بیچ کی گن دکھا کر روک لے۔''

''خطرہ تھا۔'' پروفیسر نے سر ہلایا۔ ''جیولرز کی شاپ سے مخبری کی جا سکتی تھی۔''

''میرے خدا ہمارے پاس تو تین کروڑ کا مال ہے۔''

''مال تو تین کروڑ کا ہے لیکن یہ اتنے کا جائے گا نہیں۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''لیتے وقت یہ لوگ خاصا کاٹتے ہیں۔''

''یہ تو گارنٹی والا سونا ہے۔''

''ہاں مگر پھر نہیں جائے گا۔'' پروفیسر نے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ لو کہ دس بارہ لاکھ کی رقم کم ہو جائے گی۔''

''مگر جنید کے لیے ڈھائی کروڑ تو پورے ہو جائیں گے۔''

''زیادہ ہی ہوں گے۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''یہ جتنی بھی رقم ہے خرچ نکال کر اس کے حوالے کر دیں گے۔''

''رقم آپ دیجیے گا۔''

''نہیں بہتر ہے تم لے جانا۔ اب کل سے گولڈ کیش کرانے کا کام بھی شروع ہو گا لیکن آج ہمیں یہ فلیٹ چھوڑنا ہے۔''

ہما چونکی۔ ''ایسے ہی؟''

''نہیں، میں نے ریاض علی سے کہہ دیا ہے، وہ آنے والا ہو گا۔''

کال بیل بجی تو ہما بریف کیس سمیت اندر چلی گئی۔ آنے والا ریاض علی ہی تھا۔ پروفیسر نے اسے اندر بلایا۔ سلام دعا کے بعد اس نے کہا۔ ''خیریت پروفیسر صاحب یوں اچانک جا رہے ہیں۔''

''یار رشتے داروں نے ناک میں دم کیا ہوا ہے اب واپس بلا رہے ہیں اور نہیں گئے تو برا مان جائیں گے۔ بس یہ وجہ ہے۔''

''آپ کی امانت ساتھ لایا ہوں۔'' ریاض علی نے ایک لاکھ روپے نکال کر پروفیسر کے سامنے رکھے۔

''آپ اس میں سے کرایہ کاٹ لیں۔''

''چھوڑیں جناب، سات آٹھ دن کا آپ سے کیا لوں۔ آپ کی مشکل آسان ہو گئی، مجھے اس کی خوشی ہے۔''

''میں شکر گزار ہوں۔'' پروفیسر نے حیرت آمیز خوشی سے کہا۔ ''آپ فلیٹ دیکھ لیں جیسا تھا ویسا ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ فریج میں کچھ سامان ہے وہ آپ ڈسپوز آف کر دیجیے گا۔''

ہما باہر آئی، اس نے اتنی دیر میں تمام چیزیں ان سوٹ کیسوں میں بند کر دی تھیں جو وہ ساتھ لائے تھے۔ اس نے بھی ریاض علی کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ایک سرسری سی نظر فلیٹ پر ڈالی تھی۔ پروفیسر نے چابی اس کے حوالے کی اور سامان لے کر وہاں سے نکل آئے۔ جب وہ گاڑی میں بیٹھے تو ہما کو خیال آیا۔ ''آپ نے منیر الدین کو بتانا ہے۔''

پروفیسر نے گھڑی دیکھی سوا پانچ بج رہے تھے۔ اس نے تانیا کا موبائل نکال کر آن کیا اور منیر الدین کو کال کی۔ اس نے کال ریسیو کی اور بولا۔ ''میری بیٹی؟''

''غور سے پتا سنو۔'' پروفیسر نے کہا۔ ''تمہاری بیٹی ساحلی تفریح گاہ پر واقع ہٹ نمبر سکسٹی ٹو کے ایک کمرے میں بیڈ تلے موجود ہے۔ امید ہے وہ ہوش میں آ گئی ہو گی۔ پتا سمجھنے میں مشکل ہو تو تانیا کے دوست سلمان کے گھر والوں سے رابطہ کرنا وہ بھی وہیں دوسرے بیڈ روم میں بیڈ تلے پڑا ہے۔ یہ ہٹ اس کے باپ اعظم کا ہے۔'' پروفیسر نے کہتے ہی کال کاٹ دی اور موبائل صاف کر کے اسے چلتی گاڑی سے گرین بیلٹ کی طرف اچھال دیا پھر اس نے یہی سلوک سلمان کے موبائل کے ساتھ کیا۔ کچھ آگے جا کر وہ بیگ بھی کچرے دان میں ڈال دیا جس میں سرنج، نقلی پستول اور ٹیپ وغیرہ موجود تھے۔ اب ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس واردات کی نشان دہی ہوتی۔ کچھ دیر بعد وہ پروفیسر کے گھر پر تھے۔ ہما نے حلیہ بدلا اور میک اپ صاف کیا تو اپنی اصل پر آ گئی۔ پروفیسر نے ہنس کر کہا۔

''تم دو منٹ میں اصل پر آ گئیں مگر مجھے اپنی اصلیت پر آنے میں شاید دو تین مہینے لگ جائیں۔''

''بہتر ہوگا تب تک آپ کسی کے سامنے مت آیئے گا۔''

پروفیسر نے سر ہلایا۔''باقی لوگوں کے لیے میں اس شہر سے باہر ہی ہوں گا۔ ویسے اچھی بات ہے ایک بنی بنائی کہانی مل گئی ہے، اس پر ناول لکھوں گا۔''

''نہیں یہ خطرناک ہوگا۔''

''بالکل بھی نہیں، تم یقین رکھو یہ معاملہ کبھی پولیس تک نہیں پہنچے گا۔ اگر پولیس یا کوئی ادارہ شامل بھی ہوا تو رضا جیولر والے اس معاملے کو ختم کرا دیں گے۔ ایف آئی آر اور عدالت تک منیرالدین بھی نہیں جانا چاہے گا۔ ورنہ وہاں اسے اس رقم کی وضاحت کرنا پڑے گی کہ اس کے پاس یہ کہاں سے آئی۔''

''آپ کا مطلب ہے کہ یہ بلیک منی ہوگی۔''

''بلیک بھی ہوسکتی ہے ورنہ کم سے کم بنا ٹیکس کے تو لازمی ہوگی۔''

''کیش کا کام کتنے دن میں ہو جائے گا۔'' ہما نے پوچھا۔ وہ بے تاب تھی کہ جنید جلد از جلد علاج کے لیے روانہ ہو جائے۔

''چند دن لگیں گے مگر میری کوشش ہوگی کہ جلد از جلد کیش ہو جائے۔ ویسے تم آج ہی جنید سے جا کر کہہ دو کہ وہ تیاری شروع کر دے۔ ٹکٹ کرا لے اور اسپتال انتظامیہ کو اپنی آمد کی اطلاع کر دے۔''

''میں آج ہی جاتی ہوں۔'' ہما بولی اگرچہ شام خاصی ہو چکی تھی اور سردیوں کی وجہ سے جلد اندھیرا ہو جاتا تھا مگر اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ آج یہ کام کر کے ہی گھر جائے گی۔

☆☆☆

فرحان، جنید کے سامنے بیٹھا ہوا تھا اور اس کی بات سن کر جنید کا زرد چہرہ مزید زرد ہو گیا تھا۔ جب فرحان خاموش ہوا تو اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ فرحان کچھ دیر بعد بولا۔''مجھے افسوس ہے دوست لیکن میں نے سوچا کہ حقیقت تمہارے علم میں آنی چاہیے۔ تم ہما اور پروفیسر کی طرف سے دھوکے میں نہ رہو۔''

''دھوکے میں، میں پہلے بھی نہیں تھا۔'' جنید نے آنکھیں کھول کر تلخ لہجے میں کہا۔''شک مجھے پہلے ہی ہو گیا تھا مگر آج تم نے تصدیق کر دی۔ ہما ایک ہفتے سے نہیں آئی ہے اور شاید وہ اب آئے بھی نہ۔''

مگر جنید کا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا۔ فرحان کچھ دیر اور بیٹھا اور پھر چلا گیا۔ اس کے جانے کے ایک گھنٹے بعد کوثر نے اطلاع دی۔''ہما باجی آئی ہیں۔''

جنید نے سرد مہری سے کہا۔''بھیج دو اُسے۔''

کوثر نے معنی خیز انداز میں آنکھیں گھمائی تھیں۔ اس نے فرحان اور جنید کی گفتگو سن لی تھی۔''بھائی میں تو پہلے ہی جان گئی تھی۔''

''بھجواسے آج میں اسے آئینہ دکھاؤں۔''

ہما، جنید کی ماں سے بات کر رہی تھی۔ کوثر نے آ کر عجیب سے انداز میں کہا۔''چلیے آپ کو بھائی بلا رہے ہیں۔ امی آپ بھی آیئے۔''

ہما حیران ہوئی تھی۔ جنید نے آج تک اسے نہیں بلایا تھا، وہ خود ہی اس کے کمرے میں جاتی تھی اور پھر ماں بہن کو بلانے کی کیا تک تھی۔ وہ جنید کے کمرے میں آئی تو وہ سرہانے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اس کے چہرے اور آنکھوں میں سختی تھی۔ ہما نے جھجک کر پوچھا۔''کیسے ہو تم؟''

''میں ٹھیک ہوں تم اپنی سناؤ۔'' جنید نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''سنا ہے آج کل بہت گھوم پھر رہی ہو۔''

ہما کی چھٹی حس نے چونکایا اور وہ سنجیدہ ہو گئی۔''کس سے سنا ہے اور کیا سنا ہے؟''

''جس سے بھی سنا ہے، بالکل درست سنا ہے۔ آج کل تم اس نام نہاد پروفیسر کے ساتھ گل چھرّے نہیں اُڑا رہی ہو۔''

''مائنڈ یور لینگویج۔'' ہما کو غصہ آ گیا۔''یہ تم کیسی بات کر رہے ہو؟''

''اور یہ بھی جھوٹ ہے کہ تم دونوں کا حلیہ بدلا ہوتا ہے تاکہ جاننے والے بے خبر رہیں۔''

''جنید تم بالکل بے خبر ہو۔''

''مجھے صرف جھوٹ اور سچ بتاؤ۔'' جنید چلّایا۔''یہ جھوٹ ہے یا سچ؟''

ہما نے گہری سانس لی۔''سچ ہے۔''

''تب میں بے خبر کہاں سے ہوا۔ بے خبر تو میں پہلے تھا اور میری آنکھوں پر پٹی بندھی تھی جو تمہارا اصل چہرہ نہیں پہچان سکا۔ اگر فرحان تمہیں اور پروفیسر کو ہوٹل میں نہ دیکھتا اور پھر کئی دن تمہارا پیچھا نہ کرتا تو مجھے پتا ہی نہیں چلتا۔ وہ جھوٹ بول کر یہیں ہے اور تم دفتر سے چھٹی لے کر اس کے ساتھ گھوم رہی تھیں۔ مجھے سب پتا چل گیا ہے۔''

ہما، جنید اور اس کی ماں و بہن کا انداز دیکھ رہی تھی۔ جنید کے چہرے پر نفرت اور وحشت تھی۔ جبکہ اس کی ماں بہن یوں خوش ہو رہی تھیں جیسے ہما کی اصلیت سامنے آنے سے انہیں دلی مسرت ہوئی ہو۔ جنید کی ماں نے کہا۔''ارے

میں تو پہلے جانتی تھی اس طرح پھرنے والی لڑکیاں اندر سے پوری...

"اب ایک لفظ مت کہیے گا۔" ہما نے بپھر کر کہا۔ "میں جو ہوں اپنے لیے ہوں۔"

"میرا اب تم سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔" جنید بولا۔ "دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

"شکریہ۔" ہما تلخی سے بولی۔ "شاید چند سال بعد مجھے یہی الفاظ سننے کو ملتے اور تب تک بہت دیر ہو جاتی۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے پہلے ہی کہہ دیا۔"

"میں زندہ ہوتا تو چند سال بعد کہتا۔" جنید زہریلے لہجے میں بولا۔ "اب تمہیں زیادہ عرصے انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

"نہیں، تم زندہ رہو گے۔" ہما نے کہا۔ وہ جنید کے گھر اور اس کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل آئی تھی۔ اس کے تین دن بعد رات کے وقت جب جنید کے گھر میں سناٹا تھا اچانک باہر صحن میں کوئی چیز زور سے گرنے کی آواز آئی۔ جنید کی ماں نے باہر آکر دیکھا تو اسے صحن میں گیٹ کے پاس سیاہ رنگ کا ایک لیدر بیگ پڑا نظر آیا۔ پہلے وہ ڈری پھر اس نے حماد کو بلایا اور اس نے بیگ کھول کر دیکھا تو اس میں پانچ ہزار کے نوٹوں کی پچاس گڈیاں تھیں۔ یہ ڈھائی کروڑ روپے کی رقم تھی۔ جنید کے علاج کے لیے بھی انہیں اتنی ہی رقم درکار تھی۔ حماد نے باہر نکل کر دیکھا مگر بیگ پھینکنے والا وہاں سے جا چکا تھا۔ وہ خاصی دیر سے نکلے تھے۔ جب یہ بات جنید کے علم میں آئی تو اسے ہما کا جملہ یاد آیا اور تب اس کے اندر پچھتاوے کی لہر سی اٹھی۔ اسے لگا کہ اس نے زندگی جیت لی ہے مگر ہما کو ہار گیا ہے۔ چند دن بعد وہ علاج کے لیے سنگاپور روانہ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

منیر الدین نے سارا بندوبست کر لیا تھا، اس نے پولیس اور ایک مقامی ادارے کی مدد سے اغوا کرنے والے کے خلاف پلان تیار کر لیا تھا۔ اسے یقین دلایا گیا تھا کہ جیسے ہی رقم کسی اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوگی، قانون نافذ کرنے والے ادارے نصف گھنٹے میں اس کے مالک تک پہنچ جائیں گے۔ منیر الدین نے رقم ٹرانسفر کرنے سے پہلے اکاؤنٹ نمبر متعلقہ افراد کو ایس ایم ایس کیا اور پھر رقم ٹرانسفر کرنے کی کارروائی کی۔ وہ بالکل بےفکر تھا کہ جلد مجرم پکڑا جائے گا اور نہ صرف تانیا بلکہ اس کی رقم بھی واپس ملے گی۔ رقم منتقل کر کے اس نے تانیا کے موبائل پر کال کر کے اس شخص کو اطلاع دی اور پھر بےچینی سے انتظار کرنے لگا۔ نصف گھنٹے بعد اسے اطلاع ملی کہ قانون نافذ کرنے والے متعلقہ فرد تک پہنچ گئے ہیں۔ اس سے تفتیش کا عمل جاری تھا اور امید تھی کہ جلد ہی تانیا بازیاب ہو جائے گی۔

مگر مزید نصف گھنٹے بعد جو انکشاف سامنے آیا، اس نے صرف قانون نافذ کرنے والوں کو ہی نہیں منیر الدین کو بھی دنگ رہ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ کوئی اس قدر عیاری بھی دکھا سکتا ہے اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ وہ اب تک مطمئن تھا مگر جب اسے پتا چلا کہ مذکورہ جیولر بھی اس کی طرح دھوکا کھا گیا ہے تو اس کا سکون غارت ہو گیا اور اسے پھر سے اپنی بیٹی کی فکر لاحق ہو گئی تھی۔ وہ بےتابی سے بار بار تانیا کے نمبر پر کال کر رہا تھا مگر وہ بند جا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے سوا پانچ بجے اس کی کال آئی اور اس نے منیر الدین کو بتایا کہ وہ اپنی بیٹی کو کہاں سے حاصل کر سکتا ہے؟ وہ سلمان کے باپ اعظم کو جانتا تھا، اس نے فوری اسے کال کی اور وہ خود اپنے بیٹے کے غائب ہونے پر پریشان تھا۔ پھر منیر الدین نے پولیس کو کال کی۔ وہ اعظم کے ساحلی ہٹ پہنچے تو سورج غروب ہونے والا تھا۔ تانیا اور سلمان ہوش میں لیکن مکمل طور پر بےبس اور بندھے ہوئے تھے۔

تانیا کی طرف سے اطمینان کے بعد اس نے اپنے واقف کار اعلیٰ پولیس افسر سے بات کی اور اپنی رقم کی واپسی کا پوچھا۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ رقم اس طرح سے نہیں ملے گی۔ محسن رضا کو بھی کیس میں شامل کرنا پڑے گا۔ معاملہ عدالت تک جائے گا اور جب وہاں سے آرڈر ہوگا تب اس کی رقم واپس ملے گی۔ اس نے مشورہ دیا کہ منیر الدین، محسن رضا سے بات کر کے اپنی رقم واپس حاصل کرے اور معاملہ یہیں ختم کر دے۔ باقی تانیا اور سلمان کی بازیابی پولیس نے اپنے کھاتے میں ڈال لی تھی اور اس کی واہ واہ ہو رہی تھی۔ منیر الدین نے محسن رضا سے بات کی تو اس نے ایک روپیہ بھی واپس کرنے سے انکار کر دیا۔ منیر الدین نے معاملہ پولیس اور عدالت تک لے جانے کی دھمکی دی تب بھی وہ ٹس سے مس نہیں ہوا۔ الٹا اس نے دھمکی دی۔

"شوق سے لے کر جاؤ صرف یہی معاملہ نہیں ہوگا بلکہ تمہارے بزنس کے معاملات بھی کھلیں گے اور تمہارے خلاف ٹیکس چوری کا کیس بھی بنے گا۔"

مجبوراً منیر الدین نے اپنی رقم پر صبر کیا البتہ اسے خیال آیا کہ اگر وہ جنید کے علاج کے لیے ڈھائی کروڑ دے دیتا تو شاید اس پر یہ مصیبت نہ آتی مگر اس نے فوراً ہی اس

سوچ کو ذہن سے جھٹک دیا۔ وہ اس طرح سوچنے والا آدمی ہی نہیں تھا۔ محسن رضا نے اسے یونہی دھمکی نہیں دی تھی بلکہ اسے کسی اجنبی نے کال کر کے ..... یہ ترکیب سمجھائی تھی کہ اگر منیرالدین اسے رقم کے حوالے سے دھمکی دے تو وہ اسے یہ جوابی دھمکی دے سکتا ہے۔ اس اجنبی کا کہا درست ثابت ہوا تھا۔ منیرالدین سچ مچ ڈر گیا تھا۔

☆☆☆

ہما کی آنکھ کھلی تو پروفیسر بستر پر نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر لاؤنج میں آئی جہاں چائے کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جدید طرز کا صاف ستھرا اور چمکتا ہوا کچن، اس کے ساتھ ہی مہاگنی کی پرانی لیکن پالش سے چمکتی میز کے گرد دس کرسیاں رکھی تھیں اور ان میں سے ایک پر پروفیسر بیٹھا ہوا تازہ اخبار دیکھ رہا تھا۔ لاؤنج میں ایک طرف ٹی وی کے آگے بلیک لیدر صوفے تھے۔ دیواروں پر ریک اور ہکس کی مدد سے بے شمار شوپیش اور آرٹ کے نمونے آویزاں تھے۔ فرش کی ٹائلز یوں چمک رہی تھیں جیسے ان پر تازہ پالش کی گئی ہو۔ لاؤنج کے بائیں طرف چھوٹے باغ میں کھلنے والی بڑی سی کھڑکی سے موتیے اور چنبیلی کی خوشبو آرہی تھی۔ ہما نے کھڑکی کے پاس آکر چند گہری سانسیں لیں اور میز پر آگئی۔ پروفیسر نے اخبار کے اوپر سے جھانک کر اسے دیکھا اس کے بال کسی قدر بڑھ گئے تھے مگر اب یہ بے ترتیب نہیں تھے۔ اس وقت وہ اپنے ناپ کے نائٹ سوٹ میں تھا۔ البتہ اس نے مونچھیں صاف کر دی تھیں کیونکہ یہ ہما کو پسند نہیں تھیں، اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"آج کیا پروگرام ہے؟"

"آرام کا۔" وہ بولی۔

ان کی شادی کو ایک مہینا ہونے کو آیا تھا اور اس ایک مہینے میں ہما نے گھر کا حلیہ بدل دیا تھا۔ اس نے کباڑ ہو جانے والی چیزیں باہر پھینکیں۔ بہت سے قیمتی شوپیس خراب ہو رہے تھے ان کو ٹھیک کرایا۔ لکڑی کے فرنیچر کو پالش کرایا۔ تمام کتابوں کو دو بیڈ رومز میں شفٹ کیا اور ڈرائنگ روم کے لیے نیا فرنیچر لائی تھی۔ اسی طرح لاؤنج پورا نئے سرے سے ڈیکوریٹ کیا تھا۔ کچن کی ساری چیزیں وہ جہیز میں لائی تھی مگر اس نے فرنیچر یا کوئی فالتو چیز نہیں لی تھی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ شادی کے بعد سب سوچ سمجھ کر نئے فیشن کے حساب سے لے گی۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ وہ دو بیڈ رومز میں کتابوں کے لیے سیٹنگ کرے گی لیکن پروفیسر نے اسے تجویز دی کہ وہ اپنی ماں کو بھی یہیں بلالے۔ وہ اکیلی

ہیں اور ان کے ساتھ رہیں گی تو یہ ان کے اور ہما دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔ ہما نے آمنہ سے بات کی تو وہ خوش ہو گئی تھی مگر اس نے بیٹی سے کہا۔

"ابھی تم دونوں اکیلے رہو تو بہتر ہے۔ میاں بیوی کو ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے اور اس سے زیادہ تنہائی چاہیے ہوتی ہے۔ ہاں جب تمہارے ہاں کوئی خوش خبری آئے گی تب میں آجاؤں گی۔"

جب وہ جنید کے گھر سے نکلی تو اس کی حالت بُری تھی، اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس سے محبت کا دعویٰ کرنے والا جنید اسے صفائی کا موقع دیے بغیر اس کے کردار پر یوں تہمت لگائے گا۔ وہ بہ مشکل گھر پہنچی اور اس ساری رات روتی رہی۔ اگلے دن اس نے پروفیسر سے کہا کہ وہ جس طرح چاہے رقم جنید کے گھر پہنچا دے اور اسے اس معاملے میں مزید شامل نہ کرے۔ پھر اس نے پروفیسر سے پوچھا بھی نہیں کہ اس نے جنید کو رقم بھیجی یا نہیں۔ البتہ اس واقعے کے پانچویں دن اسے جنید کی کالز آنے لگیں۔ اس نے ریسیو نہیں کیں۔ کالز لگاتار تین دن تک آتی رہیں اور پھر خاموش ہو گئیں۔ فرحان بھی اسے کال کر رہا تھا اور وہ اس کی کال بھی نہیں اٹھا رہی تھی۔ ہانیہ نے اسے کال نہیں کی مگر ایس ایم ایس کر کے اطلاع دے دی کہ جنید علاج کے لیے سنگاپور روانہ ہو گیا ہے۔ ہما نے اس ایس ایم ایس کا جواب بھی نہیں دیا۔ اس نے تیسرے دن سے دفتر جوائن کر لیا۔

دو ہفتے وہ پروفیسر کے ہاں نہیں گئی تو اس کی کال آگئی۔ "کیا بات ہے، تم بالکل لاتعلق ہو گئی ہو؟"

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"میں تم سے غلط بیانی کی توقع نہیں رکھتا ہوں۔ جو کہنا ہے مجھ سے صاف کہو میں سچ پر برا ماننے والا آدمی نہیں ہوں۔"

رات کا وقت تھا اور آمنہ سونے کے لیے جا چکی تھی۔ ہما کا دل بھرا ہوا تھا اور وہ پھوٹ پڑی۔ اس نے آنسوؤں کے ساتھ پروفیسر کو بتایا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ پروفیسر حیران ہوا اس نے تاسف سے کہا۔ "جنید نے اتنا بُرا کیا۔"

"اس نے برا نہیں، اچھا کیا۔ اس کو آج نہیں تو چند سال بعد یہی کرنا تھا۔ اچھا ہوا کہ آج کر دیا۔ مجھے دکھ اپنے کردار پر لگائی جانے والی تہمت کا ہے۔"

"اس کا تم سوچو بھی نہیں ...... اللہ جانتا ہے کہ تم کیا ہو اور کیسی ہو؟"

"اور تو کوئی نہیں جانتا۔"

"نہیں ایک فرد اور جانتا ہے جس کے بارے میں تم

دعویٰ کرتی ہو کہ تم اسے اندر سے جانتی ہو۔"
"وہ فرد آپ ہیں۔"
"باقی کسی اور کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"
پروفیسر نے اسے تسلی دی اور پھر اس کا دل بہلانے لگا۔ اس نے کہا کہ وہ اس کے لیے ایک سرپرائز تیار کر رہا ہے اور جلد اسے پیش کرے گا۔ ہما کا دل ہلکا ہو گیا تھا اور جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو جیسے مطمئن ہو گئی تھی۔ اگلے دن وہ دفتر سے آئی تو آمنہ نے دروازہ کھولا اور خوش ہو کر اسے اطلاع دی۔
"پروفیسر آئے ہیں۔"
"سچ میں۔" اسے یقین نہیں آیا۔
"ہاں اندر ہیں تو جلدی سے فریش ہو کر آجا۔"
ہما فریش ہو کر اور کپڑے بدل کر آئی تو پروفیسر چائے پی رہا تھا۔ آمنہ نے اس کی خاطر تواضع کے لیے بہت سا اہتمام کیا تھا۔ ہما آئی تو آمنہ اسے بٹھا کر چلی گئی۔ آمنہ کے جاتے ہی پروفیسر نے آہستہ سے کہا۔ "تم شاید حیران ہو رہی ہو کہ آج میں یہاں کیوں آیا ہوں۔ بات یہ ہے کہ مانگنے والے کو آنا پڑتا ہے۔"
ہما سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"
"ہما میں نے تمہاری امی سے بات کی ہے اور وہ مان گئی ہیں لیکن اصل اہمیت تمہاری رضامندی کی ہے۔ تم چند دن میرے ساتھ رہیں۔ بے شک تھوڑے وقت کے لیے رہیں لیکن جب گئیں تو مجھے لگا میری ساری زندگی خالی ہو گئی ہے اور میں اس خالی زندگی کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ یہ مت سمجھنا کہ یہ سب رات کی گفتگو کے بعد میرے ذہن میں آیا۔ سوچا تو میں نے پہلے ہی تھا جب تم آخری دن میرے پاس سے گئی تھیں۔ مگر میرے پاس کہنے کو زبان نہیں تھی۔ یہ زبان کل رات مجھے مل گئی۔"
ہما دم بہ خود رہ گئی تھی۔ پھر اس نے بہ مشکل کہا۔
"آپ مجھے پروپوز کر رہے ہیں؟"
"بالکل ہما میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور ہمیشہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔" پروفیسر نے کھل کر کہا تو وہ اٹھ کر وہاں سے بھاگ گئی۔ کچھ دیر بعد آمنہ آئی تو پروفیسر پریشان بیٹھا تھا۔ اس نے آمنہ سے کہا۔ "وہ راضی نہیں ہے۔"
آمنہ ہنسی۔ "تم پروفیسر ہو لیکن عورت کے بارے میں نہیں جانتے اگر اس نے منع کرنا ہوتا تو یہاں سے کیوں بھاگتی۔"
اس کے ایک مہینے بعد پروفیسر اور ہما کی شادی ہو گئی اور سہاگ رات میں پروفیسر نے اسے اس کا لکھا ہوا ناول کا ترجمہ کتابی صورت میں پیش کیا۔ یہ اس نے خود چھپوایا تھا۔ اس نے صرف چھپوایا نہیں تھا بلکہ ایک ڈسٹری بیوٹر کو اس کا پہلا ایڈیشن فروخت بھی کر دیا تھا اور اس سے خاصی رقم بھی وصول کی تھی۔ پروفیسر نے وہ رقم بھی ہما کو پیش کی تھی۔ اگلی صبح اس نے ہما کو بتایا کہ گولڈ اور ہیروں کا سیٹ سب ملا کر دو کروڑ ستاسی لاکھ میں گئے تھے اور جنید کے گھر ڈھائی کروڑ روپے پہنچا کر اس نے بچ جانے والی رقم سے اپنی خرچ کی ہوئی رقم منہا کر کے باقی رقم غریب بچوں کی تعلیم کے لیے کام کرنے والے ایک فلاحی ادارے کو دے دی تھی۔ وہ پروفیسر کی حیثیت سے اس ادارے کو عطیہ کرتا رہتا تھا مگر یہ رقم اس نے سامنے آئے بغیر دی تھی۔ اس میں سے اس نے ایک روپیہ بھی نہیں رکھا تھا۔ یہ سن کر ہما کے دل سے معمولی سا بوجھ بھی اتر گیا تھا۔
شادی کے بعد ہما نے غیر محسوس انداز میں پروفیسر اور اس کے گھر کو بدلنا شروع کیا۔ اندر باہر رنگ و روغن کرایا تھا۔ گھر سجایا، نئی چیزیں لیں اور پرانی چیزوں کو بھی نیا کیا۔ کسی قدر مرمت اور رنگ و روغن کے بعد کھنڈر نظر آنے والا گھر بالکل ہی بدل گیا تھا۔ البتہ پروفیسر نے اپنی گاڑی تبدیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کے باپ کی نشانی تھی۔ اس لیے جب تک چل سکتی تھی، وہ اسے ہی استعمال کرے گا۔ پروفیسر نے ہما کی کتاب ہما پبلشر کے نام سے شائع کی تھی۔ اس نے پبلشنگ کا لائسنس بھی لیا تھا اور ناشتے کے دوران میں ہما نے اس سے کہا۔ "اب آپ کی ساری کتابیں ہم خود شائع کریں گے۔"
"صرف میری نہیں، تمہاری کتابیں بھی۔" پروفیسر نے کہا۔ "آج ہی ڈسٹری بیوٹر کی کال آئی ہے اور اس نے تمہارے ناول کا دوسرا ایڈیشن مانگ لیا ہے۔"
ہما نے شادی سے پہلے ملازمت چھوڑ دی تھی۔ وہ مسکرانے لگی۔ "آپ نے مجبور کر دیا ہے۔ اب لکھنا ہی پڑے گا۔"
"ایک خبر اور بھی ہے۔" پروفیسر نے کہا۔ "کل رات فرحان کا میسج آیا تھا۔ جنید واپس آگیا ہے، اس کا آپریشن کامیاب رہا۔"
"مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ میرا ایک یونیورسٹی فیلو بیماری سے صحت یاب ہو گیا ہے۔" ہما نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "میرے نزدیک اس خبر کی اس سے زیادہ اہمیت نہیں ہے۔"